تفسیر مظہری

جلد چہارم

بقیہ سورۂ مائدہ سے سورۂ اعراف تک

پارہ ۷ تا پارہ ۹ رکوع ۱۴

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی

تشریحی ترجمہ مع ضروری اضافات

مولانا سید عبد الدائم الجلالی

رفیق ندوۃ المصنفین

ناشر

دار الاشاعت

اردو بازار کراچی ۱ — فون ۲۱۳۷۶۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

عرض ناشر

اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ کئی ماہ کی کوشش کے بعد دارالاشاعت کراچی کی جانب سے تفسیر مظہری اردو کا ایڈیشن زیور طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

میرے والد ماجد جناب الحاج محمد رضی عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں اشاعت دین کے پیش نظر قرآن وحدیث، فقہ و تصوف، سیرت و تاریخ کی متعدد گرانقدر کتب کی طباعت کی خدمات انجام دی وہاں ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ تفسیر مظہری کی طباعت واشاعت کا شرف بھی حاصل کریں کیونکہ حضرت قاضی ثناء اللہ عثمانی پانی پتی ؒ نے اس تفسیر میں ایک خاص طرز یہ بھی اختیار فرمایا کہ مسلک کے اعتبار سے احناف اور شافعی مسلک کے نظریاتی اختلافات بھی واضح فرمائے ہیں اور یہ بھی بتایا کہ احناف کا اس سلسلے میں کیا مقام ہے۔ اس وجہ سے اس کی افادیت اور بھی بہت بڑھ گئی ہے، نیز مصنف رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف قرآن وحدیث اور فقہ میں اپنے وقت کے نامور علماء میں شامل تھے تو دوسری طرف باطنی علوم اور تزکیہء سلوک میں بھی شیخ وقت سمجھے جاتے تھے، شاید اسی وجہ سے یہ تفسیر تمام دینی حلقوں میں مستند سمجھی جاتی ہے۔

اس تفسیر کا اردو ترجمہ مولانا سید عبدالدائم جلالی رحمۃ اللہ علیہ نے ندوۃ المصنفین دہلی کے زیر اہتمام فرمایا تھا، لیکن یہ تفسیر اب تک عوام کو بسہولت دستیاب نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم نے (حسب اجازت حکومت سندھ پاکستان DPR (NO /2/PB/91.213.24.3.1991) سے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

حتی الامکان اس کی اشاعت میں کوشش کی ہے کہ اغلاط نہ رہ جائیں، لیکن پھر بھی تمام حضرات سے درخواست ہے کہ کوئی غلطی نظر آئے تو ادارے کو مطلع فرما کر مشکور فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کو شرف قبولیت سے نوازیں اور دنیا و آخرت کے لئے نافع بنائیں، آمین

طالب دعا **خلیل اشرف عثمانی**

ولد محمد رضی عثمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

نوٹ:۔ پہلے یہ تفسیر ہاتھ کی کتابت اور لیتھو طریقہ طباعت پر دستیاب تھی اب الحمد للہ کمپیوٹر کی عمدہ کتابت اور آفسٹ طریقہ طباعت کے ساتھ اور آیات کے نمبر کے ساتھ اور عنوان کے مقامات کو انڈر لائن کر کے پیش خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری کوششوں کو قبول فرمائے۔ آمین

تفسیر مظہری اور اس کے مصنف

قرآن کریم بنی نوع انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وہ آخری کتاب ہے جو رہتی دنیا تک مشعل راہ اور ہدایت کا سامان ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس کا ایک ایک لفظ اور نقطہ محفوظ اور اس کا ایک ایک جملہ دریا بکوزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا پڑھنا اتنا آسان کہ دنیا کے ہر خطے میں دس بارہ سال کے معصوم بچے باسانی پورے قرآن کو اپنے سینوں میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ اس کی تعلیمات اتنی ہمہ گیر کہ جن کی مثال کہیں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ اس کے احکام اس قدر مستحکم کہ صدیوں پر صدیاں گزرنے کے باوجود ان کی حقانیت روز بروز مسلم ہوتی جاتی ہے۔ اس کے الفاظ اتنے جامع کہ مفسرین و محققین اپنی پوری کوشش کے باوجود ان کے معانی و مفاہیم کو اپنے قابو میں لانے سے عاجز نظر آتے ہیں۔ یہ وہ کلام اللہ ہے جسے خالق دو جہان نے خاتم النبیین سیدنا احمد مصطفیٰ محمد مجتبیٰ ﷺ پر تیئس سال میں نازل فرمایا اور دنیا بھر کے تمام فصیح و بلیغ انسانوں کو اس کے مقابلے کا چیلنج دے کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے معجزہ بنادیا۔

قرآن مجید کا اعجاز اس کے الفاظ میں بھی ہے اور اس کے معانی میں بھی۔ الفاظ کی بندش، نشست و برخاست، روانی و تسلسل، شوکت و دبدبہ کے ساتھ لطافت و حلاوت کا حیران کن امتزاج، صوتی تاثرات کی ہم آہنگی اور دلوں پر بجلی کی طرح گرنے والی تاثیر، حسن تلاوت اور حسن استماع کی ناقابل بیان خوبصورت کیفیات، آفتاب قرآن کی چند کرنیں ہیں، جن سے اعجاز قرآنی کی کچھ جھلک نمودار ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معانی کی سحر آفرینی، ان کی ہمہ گیری و وسعت، انسانی زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں واضح ہدایات، انباء الغیب کی منہ بولتی صداقت، ترغیب و ترہیب کی دلوں پر غیر معمولی تاثیر، آفاقی رہنما اصول اور ان کی صداقت، معانی کے اعجاز کی وہ چند پنکھڑیاں ہیں جن سے قرآن کا معجزہ ہونا کھلی آنکھوں نظر آتا ہے۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ ہر انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں، مگر ان کی ذات و صفات کا مکمل ادراک، محدود انسانی عقل کے بس سے باہر ہے، اسی طرح اللہ کے کلام کا پڑھنا آسان، اسے یاد کرنا آسان، اس سے نصیحت حاصل کرنا اور پھر اس پر عمل پیرا ہونا آسان، مگر اس کے معانی و مطالب کا مکمل استیعاب اور اس کے جملہ پہلوؤں کا زبان و قلم سے احاطہ کر لینا اسی طرح ناممکن ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات اور اس کی دیگر صفات کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

رحمت عالم حضور اقدس ﷺ نے اپنے اقوال وافعال کے ذریعے سے نہ صرف قرآن حکیم کی تشریح و تفسیر کی بلکہ آپ کی ذات اقدس قرآن مجید کا عملی نمونہ تھا اور آپ کی احادیث طیبہ قرآن حکیم کی مکمل تفسیر۔ علم و عمل کی یہ تفسیر اور اس کا نمونہ پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور اس کے بعد تابعین، تبع تابعین رحمہم اللہ کی عملی زندگی اور ان کے اقوال کی شکل میں منتقل ہوا اور پھر اس مقصد کے لئے بے شمار مفسرین نے تفاسیر لکھیں، جن میں کلام خداوندی کے معانی و مفاہیم کو اجاگر کر کے لوگوں کے لئے راہ عمل کو آسان بنایا گیا۔ ان میں ہر طرح کی تفاسیر تھیں، مختصر بھی طویل بھی۔ یہ تفاسیر مختلف ادوار میں مختلف مفسرین اپنے اپنے ذوق علمی کے پیش نظر تحریر کرتے رہے اور خدمت قرآن کی سعادت حاصل کرتے رہے، مگر ان سب میں صرف وہ تفاسیر ممتاز رہیں جنہیں قبولیت عامہ نصیب ہوئی اور جن پر جمہور اہل سنت والجماعت نے بھرپور اعتماد کیا، انہیں تفاسیر میں سے ایک تفسیر "تفسیر مظہری" ہے جس کا ترجمہ شائع کرنے کی سعادت دارالاشاعت کو حاصل ہو رہی ہے۔

مصنف :- اس تفسیر کے مصنف علامہ قاضی محمد ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، یہ مشائخ چشت کے مشہور بزرگ حضرت شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی قدس سرہ کی اولاد میں سے ہیں، اور ان کا سلسلۂ نصب سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے جس کی وجہ سے انہیں عثمانی بھی لکھا جاتا ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پت میں پیدا ہوئے، وہیں قرآن مجید حفظ کر کے ابتدائی درجات کی دینی تعلیم مکمل کی، جس کے بعد دہلی جاکر

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ جیسی جلیل القدر شخصیت سے حدیث کا باقاعدہ علم حاصل کیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں تحصیل علوم سے فارغ ہو کر تزکیہ باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اولاً شیخ محمد عابد سنامیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور مدارج طے کئے، ان کی وفات کے بعد اس وقت کے نامور ولی اللہ حضرت میرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ (۱۱۹۵ھ) کے دست مبارک پر بیعت کا شرف حاصل کیا اور ان کے نامور خلفاء میں شامل ہوئے۔ حضرت میرزا مظہر جان جاناں ان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے کسی تحفے کا مطالبہ فرمائیں تو میں ثناء اللہ کو پیش کردوں گا، یہ بھی فرماتے تھے کہ ثناء اللہ کی دیانت و تقویٰ اور ان کی نیکی کی وجہ سے میرے دل پر ہیبت رہتی ہے۔ یہ پیشین گوئی بھی فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان سے ترویج شریعت اور اظہار طریقت کا کام لیں گے۔ یہی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے حضرت میرزا صاحب قدس سرہ نے اپنے اس چہیتے خلیفہ کا لقب "علم الہدیٰ" رکھا ہوا تھا۔

نزہۃ الخواطر کے مصنف لکھتے ہیں کہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کے علم و تدبر اور فقہ و حدیث میں مہارت کی وجہ سے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ نے انہیں "بیہقی وقت" کا خطاب دیا ہوا تھا۔

آپ کے پیر بھائی شیخ غلام علی دہلویؒ (۱۲۴۰ھ) اپنی کتاب مقامات میں بیان کرتے ہیں کہ قاضی ثناء اللہ تقویٰ و تدین کے اندر اپنے دور میں اپنی مثال آپ تھے، دن بھر میں درس و تدریس، وعظ و تصنیف، مراقبہ و اشغال، ذکر و اذکار کے علاوہ سو رکعت نوافل اور قرآن مجید کی سات منزلوں میں سے روزانہ ایک منزل کا معمول تھا، خداداد ذہانت اور سلامت طبع ان کا خاص وصف تھا۔

تلامذہ اور مسترشدین کی کثیر تعداد کے علاوہ مختلف موضوعات پر وقیع دینی تصانیف حضرت قاضی صاحبؒ اپنے بعد بطور صدقۂ جاریہ چھوڑ کر گئے۔ تفسیر میں "تفسیر مظہری" سات جلدوں میں اور حدیث میں "کتاب مسبوط" دو جلدوں میں تحریر کی۔ فقہ حنفی میں مشہور درسی کتاب "مالابد منہ" ان ہی کی تحریر کردہ ہے۔ تردید شیعہ میں "السیف المسلول"۔ تصوف و سلوک میں "ارشاد الطالبین"، "تذکرۃ الموتی والقبور"، "تذکرۃ المعاد" اور "حقیقت الاسلام" ان کی معروف تصانیف ہیں، ان کے علاوہ موسیقی کی حرمت، متعہ کی حرمت اور عشر خراج کے احکام پر ان کے رسائل بھی مفید خواص و عام رہے ہیں۔ حضرت قاضی صاحب کا انتقال یکم رجب ۱۲۲۵ھ کو پانی پت میں ہوا اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی، رحمۃ اللہ واسعۃ۔

تفسیر مظہری:۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں سب سے نمایاں حیثیت ان کی تفسیر مظہری کو حاصل ہے، جسے انہوں نے عربی زبان میں سات بڑی جلدوں میں تحریر کیا اور اپنے مربی و شیخ حضرت میرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ کے نام پر اس کا نام "مظہری" رکھا۔ اس تفسیر کو منجانب اللہ قبولیت عامہ حاصل ہوئی، عربی میں تو اس سے استفادہ ہوتا ہی رہا، اردو ترجمہ کے بعد اس کا افادہ اور عام ہو گیا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم (فرزند ارجمند حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ) دور حاضر کی مقبول و معروف تفسیر معارف القرآن کے مقدمے میں رقم طراز ہیں۔

> "تفسیر مظہری علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کی تصنیف ہے...... ان کی یہ تفسیر بہت سادہ اور واضح ہے اور اختصار کے ساتھ آیات قرآنی کی تشریح معلوم کرنے کے لئے نہایت مفید، انہوں نے الفاظ کی تشریح کے ساتھ متعلقہ روایات کو بھی کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور دوسری تفسیروں کے مقابلے میں زیادہ چھان پھٹک کر روایات لینے کی کوشش کی ہے۔"
>
> (معارف القرآن اول صفحہ ۵۸ جلد ۱)

امید ہے کہ دارالاشاعت کے زیر اہتمام چھپنے والا تفسیر مظہری کا یہ نیا ایڈیشن انشاء اللہ عوام و خواص میں مقبول ہوگا اور قرآن حکیم کی تعلیمات کو عام کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگا، اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے، آمین۔

احقر محمود اشرف عفی عنہ

استاد دارالعلوم کورنگی کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست عنوانات

تفسیر مظہری اردو جلد چہارم "واذا سمعوا"



نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ

تفسیر مظہری اردو جلد چہارم "وَاِذَا سَمِعُوْا، وَلَوْ اَنَّنَا"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ (اور جب وہ اس (کلام) کو سنتے ہیں جو رسول ﷺ کے پاس بھیجا گیا ہے تو آپ ان کی آنکھوں کو آنسو بہاتے دیکھتے ہیں۔ طبرانی نے بھی نسائی کی مذکورہ بالا روایت کی طرح بیان کیا ہے مگر واقعہ کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔

میں کہتا ہوں نجاشی یا وفد نجاشی کے متعلق آیت کا نزول حکم کی تخصیص کو نہیں چاہتا کہ انہی کے ساتھ حکم مخصوص ہو کیونکہ الفاظ کا عموم معتبر ہوتا ہے، واقعہ کی خصوصیت ناقابل اعتبار ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوْا کا عطف لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ پر ہے۔ رونے کا ذکر کرنے سے مقصود ہے ان کے دلوں کی رقت کا، خوف الٰہی کی شدت کا، قبول حق کی طرف سبقت کرنے کا اور پیام حق سے سرکشی نہ کرنے کا اظہار۔

فیض کا معنی ہے کسی چیز کا بھرنے کے بعد چھلک جانا۔ بھرنے کی جگہ چھلکنے کا لفظ کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے استعمال کیا۔ یا یوں کہا جائے کہ کثرت گریہ کی وجہ سے (بجائے آنسوؤں کے) آنکھوں کو چھلکنے والا قرار دینے میں کثرت بکاء کو ظاہر کرنا مقصود ہے (بہنے والی چیز پانی ہے۔ آنکھ یا نہر نہیں بہتی مگر مجازاً ظرف بول کر مظروف مراد لے لیا جاتا ہے یا ظرف کی طرف فعل کی نسبت مبالغتہً کر دی جاتی ہے)

مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ (اس سبب سے کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا۔) مِمَّا عَرَفُوْا میں مِنْ ابتدائیہ ہے یا تعلیلیہ، یعنی حق کو پہچاننے کی وجہ سے۔ اور ما موصولہ ہے اور مِنَ الْحَقِّ میں من بیانیہ ہے، یعنی جو حق انہوں نے پہچان لیا اس کے سبب سے ان کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ یا من الحق میں من تبعیضیہ ہے، یعنی حق کو کسی قدر پہچاننے کے بعد ان پر گریہ طاری ہو گیا۔ اگر پورے حق کو پہچان لیتے تو کیا حال ہوتا۔ عطاء کی روایت میں حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کا قول آیا ہے کہ سننے والوں سے مراد ہیں نجاشی اور ان کے ساتھی حبش میں (نجاشی کے دربار میں) حضرت جعفرؓ نے ان کو کٓهٰيٰعٓصٓ پڑھ کر سنائی تھی تو جب تک آپ پڑھتے رہے وہ لوگ روتے رہے۔

يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم نے (تیرے رسول محمد اور اس کتاب کو جو تو نے محمد ﷺ پر نازل کی ہے) مان لیا تو ہم کو بھی انہی لوگوں کے ساتھ لکھ لے جو تصدیق کرنے والے ہیں) (اٰمَنَّا سے مراد گزشتہ ایمان کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ) ایمان لانے سے مراد ہے اب ایمان لانا اور دائرہ مومنین میں داخل ہونا۔ رَبَّنَا کا لفظ کہنا ظاہر کر رہا ہے کہ وہ منافقوں کی طرح ایمان نہیں لائے بلکہ سچے دل سے انہوں نے تصدیق کی۔ اَلشّٰهِدِيْن سے مراد ہے امت محمدیہ جو (قیامت کے دن) پیغمبروں کی طرف سے شہادت دے گی (کہ ان پیغمبروں نے اپنی اپنی امتوں کو پیام ہدایت پہنچا دیا تھا)۔

نو مسلم عیسائیوں نے اپنی دعا میں یہ لفظ اسلئے کہا کہ انکو انجیل پڑھنے سے معلوم ہو گیا تھا کہ امت محمدیہ پیغمبروں کی طرف سے شہادت دیگی۔ یا شاھدین سے مراد ہیں نبوت محمدیہ اور حقانیت قرآن کی شہادت دینے والے یعنی مسلمان۔ شہادت (سے مراد تصدیق ہے کیونکہ شہادت) وہی ہوتی ہے جو اندرون قلب اور سچے دل سے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے متعلق (باوجودیکہ وہ زبانی اقرار کرتے تھے) فرمایا ہے وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ گویا اَلشّٰهِدِيْنَ کا لفظ کہہ کر انہوں نے

اس امر کا اظہار کیا کہ ہمارا ایمان سچے دل سے ہے منافقوں کی طرح نہیں اور اسکی دلیل آیت میں اس طرح بیان کی۔

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾

اور کیا وجہ کہ ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہمارے پاس آگیا ہے ایمان نہ لائیں اور اس بات کی امید نہ کریں کہ ہمارا رب ہم کو نیک لوگوں کے گروہ میں شامل کردے۔

اَلْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ سے مراد ہیں ایماندار مسلمان جن کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (ہم نے نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے)۔

نَطْمَعُ کا عطف نُؤْمِنُ پر ہے (یعنی حرف نفی کے تحت ہے اسی کے موافق ہم نے ترجمہ کیا ہے) یعنی کیا عذر ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں اور امید نہ کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لَا نُؤْمِنُ پر عطف ہو یعنی کیا وجہ کہ ہم اللہ پر اور کلام حق پر ایمان بھی نہ لائیں اور پھر نیک لوگوں کے زمرہ میں شامل کئے جانے کی امید بھی رکھیں۔ عدم ایمان کے ساتھ تو امید جمع نہیں ہو سکتی یہ بھی ممکن ہے کہ نُؤْمِنُ کی ضمیر سے نَطْمَعُ حال ہو یعنی کیا وجہ کہ ہم ایمان نہ لائیں ایسی حالت میں کہ ہم کو زمرۂ صالحین میں شامل ہونے کی امید بھی لگی ہوئی ہے۔ مطلب یہ کہ جب انعام خداوندی کی ہم کو امید ہے تو اس امید کا تو تقاضا یہ ہے کہ ہم ایمان لائیں۔ مقتضی موجود ہے تو مقتضٰی کا نہ ہونا بعید از عقل ہے۔

بغویؒ نے لکھا ہے یہ سوال کا جواب ہے یہودیوں نے عار دلائی تھی اور کہا تھا تم ایمان لے آئے اس کی کیا وجہ، تو انہوں نے مذکورہ بالا جواب دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب وہ لوگ اپنی قوم کے پاس مسلمان ہونے کے بعد لوٹ کر گئے تو انہوں نے ملامت کی، اس وقت ان لوگوں نے مذکورہ جواب دیا۔ لیکن جواب بالکل فصل و قطع کلام کو چاہتا ہے، اسلئے اس پر حرف عطف نہیں لایا جاسکتا اور یہاں حرف عطف موجود ہے اس لئے کچھ تاویل کرنی ہوگی مثلاً کچھ کلام محذوف مان کر اس پر عطف قرار دیا جائے گا۔

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ "سو اللہ ان کے اس قول کی جزا میں جنتیں عطا فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی (اور) ہمیشہ ان جنتوں میں رہیں گے۔" یعنی خلوص اعتقاد کے بعد جو انہوں نے اظہار ایمان کیا اس کے عوض اللہ ان کو جنت عطا فرمائے گا۔ خلوص اعتقاد کا ظہور ان کے رونے سے ہو رہا ہے کہ کلام حق کو سننے کے بعد وہ رونے لگے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول کا (حقیقی) معنی ہی یہ ہے کہ عقیدہ کے بعد قول ہو جیسے بولتے ہیں یہ فلاں شخص کا قول ہے یعنی پختہ خیال ہے۔

وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ اور یہ (جنت) نیکوکاروں کی جزا ہے۔

یعنی ان نیکوکاروں کی جزاء اعمال ہے جو حضور قلب اور انتہائی خشوع سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا احسان (عبادت کی انتہائی خوبی) یہ ہے کہ تم اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا (وہ تمہارے سامنے ہے اور) تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اور اگر یہ نہ ہو تو پھر یہ (یقین رکھو) کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

قرآن مجید کا ضابطہ ہے کہ ترغیب کے بعد خوف بھی دلاتا ہے، دونوں کو جوڑ کر بیان کرتا ہے اس لئے آئندہ آیت میں کافروں کی سزا کا ذکر کیا۔ اور چونکہ اہل ایمان کے ذکر میں قلبی تصدیق، معرفت حق اور اقرار قولی کو بیان کیا تھا اس لئے (اس کے مقابل) انکار حق اور تکذیب کا ذکر کیا اور فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾ (اور جن لوگوں نے (اللہ اور اللہ کے پیام حق کو) نہ مانا (یعنی دل سے انکار کیا) اور (زبانوں سے) تکذیب کی وہی لوگ دوزخی ہیں۔ ع ۱۵

ترمذی وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جب میں گوشت کھا لیتا ہوں تو میری خواہش مردانہ میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے اس لئے میں نے اپنے

لئے گوشت حرام کرلیا ہے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ اے ایمان والو! اللہ نے جو چیزیں تمہارے لئے حلال کردی ہیں ان میں سے (خصوصیت کے ساتھ) پسندیدہ مرغوب اشیاء کو حرام نہ بنالو۔

طَيِّبٰتِ سے مراد ہیں پسندیدہ مزے دار چیزیں جو مرغوب طبع ہوں۔ ترتیب آیات میں ایک خاص خوبی ہے۔ اول نصاریٰ کی تعریف فرمائی اور ان کی رہبانیت کو قابل مدح صفت قرار دیا اور نفسانی جوش کو توڑنے کی ترغیب دی پھر اس کے بعد حد مقررہ سے آگے بڑھنے اور حلال کو حرام کی حدود میں داخل کردینے کی ممانعت فرمادی۔

وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾ اور (حلال کو حرام بنا کر) حدود مقررہ سے آگے نہ بڑھو اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا یا یہ مطلب ہے کہ حلال کی حد سے آگے بڑھ کر حرام کے دائرہ میں نہ داخل ہو (یعنی حرام کے مرتکب نہ ہو) اس وقت آیت میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنانے کی ممانعت اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی دعوت ہوگی۔ یہ مقصد بھی ہوسکتا ہے کہ پاکیزہ چیزوں کو استعمال کرنے میں اسراف (اعتدال سے زیادتی) اختیار نہ کرو۔ ابن جریر نے بسند عوفی بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون اور بعض دوسرے صحابیوں نے عورتوں اور گوشت کو اپنے لئے حرام بنالیا تھا اور چھریاں لے کر مردانہ آلات کو کاٹ ڈالنے کا محکم ارادہ کرلیا تھا تاکہ نفسانی خواہش کی جڑ ہی کٹ جائے اور عبادت کے لئے فراغت دل حاصل ہوجائے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن جریر نے ایسا ہی قصہ مرسلاً عکرمہ، ابو قلابہ، مجاہد، ابو مالک، نخعی اور سدی وغیرہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ سدی کی روایت میں اتنا اور بھی ہے کہ یہ صحابی دس تھے جن میں حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت علی بن ابی طالبؓ بھی شامل تھے۔ سدی کی روایت میں ان حضرات کی تعداد دس آئی ہے جن میں حضرت ابن مظعون اور حضرت علی بن ابی طالبؓ کا بھی ذکر ہے۔ عکرمہ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے ان میں سے ابن مظعون، علی، ابن مسعود، مقداد بن اسود اور حذیفہ رضی اللہ عنہم کے آزاد کردہ سالم رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ مجاہد کی روایت میں صرف ابن مظعون اور عبداللہ بن عمرو (بن عاص) کی صراحت ہے۔

ابن عساکر نے تاریخ میں سدی صغیر کے سلسلے سے بروایت کلبی بحوالہ ابو صالح حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول صحابہ کی ایک جماعت کے متعلق ہوا تھا اس جماعت میں ابوبکر، عمر، علی، ابن مسعود، عثمان بن مظعون، مقداد بن اسود اور حذیفہ رضی اللہ عنہم کے آزاد کردہ سالم شامل تھے۔ سب نے باتفاق آراء طے کرلیا تھا کہ آلات مردانگی قطع کردیں گے، عورتوں سے کنارہ کش ہوجائیں گے، گوشت اور چکنائی نہیں کھائیں گے کمبل کا لباس پہنیں گے، کھانا بقدر بقاء زندگی کھائیں گے اور سادھوؤں کی طرح سیاحت میں بسر کریں گے۔

بغویؒ نے اہل تفسیر کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے وعظ فرمایا اور قیامت کا تذکرہ کیا جس کو سن کر لوگوں کے دلوں میں رقت پیدا ہوئی اور رونے لگے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن مظعون کے مکان میں دس صحابی جمع ہوئے۔ عثمان بن مظعون جمحی، ابوبکر صدیق، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو، ابوذر غفاری، ابوحذیفہ کے آزاد کردہ سالم، مقداد بن اسود، سلمان فارسی، معقل بن مقرن رضی اللہ عنہم مشورہ کے بعد بالاتفاق طے پایا کہ سب کے سب تارک الدنیا ہوکر ٹاٹ کا لباس پہن لیں گے۔ آلات مردانگی کو قطع کرلیں گے، ہمیشہ روزے رکھیں گے، رات بھر نمازیں پڑھیں گے، بستر پر نہیں سوئیں گے، گوشت اور چربی نہیں کھائیں گے، عورتوں کے اور خوشبو کے پاس بھی نہیں جائیں گے اور سیاحت میں بسر کریں گے۔ جونہی اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو پہنچی۔ حضور اقدس ﷺ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بن مظعون کے مکان پر تشریف لے گئے، عثمان رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ عثمان رضی اللہ عنہ کی بیوی خولاء ام حکیم بنت ابی امیہ موجود تھیں۔ خولاء عطر ساز تھیں حضور اقدس ﷺ نے اس سے دریافت کیا مجھے تمہارے شوہر کے متعلق جو

اطلاع ملی ہے کیا وہ صحیح ہے خولاء رسول اللہ ﷺ سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھیں اور نہ شوہر کا راز فاش کرنا مناسب سمجھتی تھیں اس لئے کہنے لگیں یارسول اللہ ﷺ اگر عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ بات آپ سے کہی ہے تو صحیح کہا ہے رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لے آئے۔

حضرت ابن مظعون جب گھر پہنچے تو بیوی نے اطلاع دی۔ فوراً عثمان اور ان کے ساتھی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، سرکار والا نے ارشاد فرمایا مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم لوگوں کا فلاں فلاں باتوں پر اتفاق ہو گیا ہے کیا یہ صحیح نہیں ہے۔ ابن مظعون نے کہا بے شک صحیح ہے لیکن حضور ہمارا مقصد صرف نیکی ہے حضور نے فرمایا مجھے اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ پھر فرمایا تم پر کچھ تمہاری جانوں کا بھی حق ہے روزے رکھو اور ناغہ بھی کرو، قیام (رات کی عبادت) کرو اور نیند بھی کرو میں (رات کے کچھ حصہ میں) اٹھتا ہوں (یعنی نماز پڑھتا ہوں) اور (کچھ حصہ میں) سوتا بھی ہوں۔ روزے بھی رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں۔ گوشت اور چکنائی بھی کھاتا ہوں اور عورتوں سے قربت بھی کرتا ہوں۔ جو میرے طریقہ سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے (متعلق) نہ ہوگا۔ پھر لوگوں کو جمع کر کے حضور ﷺ نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا کیا وجہ کہ کچھ لوگوں نے عورتوں کو اور کھانے کو اور خوشبو کو اور نیند کو اور دنیوی خواہشات کو بالکل حرام قرار دے رکھا ہے، میں تم کو سنیاسی اور سادھو بن جانے کا حکم نہیں دیتا میرے دین میں گوشت اور عورتوں کو ترک کر دینے اور خانقاہ نشین بن جانے کا حکم نہیں ہے میری امت کی سیاحت روزہ اور ان کی رہبانیت صرف جہاد ہے۔ اللہ کی عبادت کرو کسی چیز کو اس کا ساجھی نہ قرار دو، حج کرو عمرہ کرو، نمازیں قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور سیدھی چال چلو تمہارے امور درست ہو جائیں گے۔ تم سے پہلے والے لوگ شدت پسندی کی وجہ سے ہی تباہ ہوئے انہوں نے اپنے اوپر خود سختیاں عائد کیں تو اللہ نے بھی ان پر سختیاں کر دیں، گرجاؤں اور یہودی خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے لوگ انہی کے پس ماندہ (نشانات) ہیں۔ اس پر اللہ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔

بغویؒ نے سعد بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مجھے خصی بننے کی اجازت دیدیجئے، حضور نے فرمایا جس نے دوسرے کو خصی کیا اور جو خصی بنا (کوئی بھی) ہم سے (متعلق) نہیں ہے۔ میری امت کے لئے خصی ہونے کی جگہ روزے رکھنا ہے۔ عثمانؓ نے عرض کیا یارسول اللہ مجھے سیاحت (یعنی کسی جگہ توطن پذیر نہ ہونے کی) اجازت دیدیجئے، فرمایا میری امت کے لئے سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہی ہے۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ہم کو راہب (سادھو) بن جانے کی اجازت دیدیجئے، فرمایا میری امت کے لئے رہبانیت مسجدوں میں بیٹھنا اور نماز کا انتظار کرنا ہے۔

صحیحین (بخاری و مسلم) میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیا ہے کہ تین شخص امہات المومنین کی خدمت میں رسول اللہ ﷺ کی عبادت کے متعلق دریافت کرنے حاضر ہوئے جب ان کو رسول اللہ ﷺ کی عبادت (کی مقدار) بتائی گئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اس مقدار کو قلیل سمجھا اور کہنے لگے ہمارا رسول اللہ ﷺ سے کیا مقابلہ حضور کے تو اگلے پچھلے قصور معاف کر دیئے گئے تھے۔ اس پر ایک شخص بولا میں تو ہمیشہ رات بھر نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزے رکھوں گا ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرا بولا میں عورتوں سے کنارہ کش رہوں گا، کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ اتنے میں حضور ﷺ تشریف لے آئے اور فرمایا تم لوگوں نے ایسا ایسا کہا تھا سن لو، خدا کی قسم میں تم سے زیادہ اللہ کا خوف اور اس کی خشیت رکھتا ہوں، لیکن روزے بھی رکھتا ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں (رات کو) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میرے طریقہ سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے (متعلق) نہیں ہے۔

ابوداؤد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے خود اپنے اوپر سختیاں نہ ڈالو ورنہ اللہ تم پر سختیاں ڈال دے گا، جن لوگوں نے خود شدت پسندی کی اللہ نے بھی ان پر شدت ڈال دی۔ یہ یہودی خانقاہوں اور عیسائی گرجاؤں والے ان ہی کے پس ماندہ (آثار) ہیں۔ (اللہ فرماتا ہے) رہبانیت خود ان کی ایجاد کردہ تھی ہم نے ان پر

رہبانیت فرض نہیں کی تھی۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان منقول ہے کہ (ایک بار) رسول اللہ ﷺ نے کوئی کام کیا اور لوگوں کو بھی اس کی اجازت دیدی لیکن کچھ لوگوں نے اس کام سے علیحدہ رہنا پسند کیا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع پہنچ گئی آپ نے (لوگوں کو جمع کر کے) ایک تقریر کی اور اللہ تعالیٰ کی حمد کے بعد فرمایا کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ اس کام سے بچتے ہیں جو میں خود کرتا ہوں، خدا کی قسم میں ان سے زیادہ خدا کو جانتا بھی ہوں اور اللہ کا خوف بھی ان سے زیادہ رکھتا ہوں۔

ابن ابی حاتم نے زیدؓ بن اسلم کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ نے ایک مہمان کی ضیافت پر اپنے گھر والوں کو مامور کیا اور (کھانے کے وقت) خود رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہے۔ جب (رات کو) گھر پہنچے تو دیکھا کہ ان کے انتظار میں اہل خانہ نے مہمان کو کھانا نہیں کھلایا تھا۔ بیوی سے بولے تم نے میری وجہ سے میرے مہمان کو بھی کھانے سے روکے رکھا۔ اب یہ کھانا مجھ پر حرام ہے بیوی نے کہا تو مجھ پر بھی حرام ہے۔ مہمان نے کہا تو میرے لئے بھی حرام ہے۔ حضرت عبداللہ نے جب یہ معاملہ دیکھا تو (قسم توڑ کر) کھانے میں ہاتھ ڈال دیا اور کہا کھاؤ بسم اللہ۔ پھر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کر دیا، اس پر آیت یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ نازل ہوئی۔

وَ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا۪ (اور اللہ نے جو چیزیں تم کو دی ہیں ان میں سے حلال دل پسند چیزیں کھاؤ)۔

عبداللہ بن مبارک نے کہا حلال وہ رزق ہے جو شرعی طریقوں سے حاصل کیا گیا ہو اور طیب وہ رزق ہے جو غذا بخش اور نمو آفریں ہو۔ باقی غیر نباتی جامد چیزیں جیسے کیچڑ، مٹی وغیرہ اور وہ چیزیں جو غذا بخش نہیں ہیں صرف دوا کے لئے تو ان کو کھانا جائز ہے اور بغیر دوا کے مکروہ ہے۔ حَلٰلًا۔ كُلُوْا کا مفعول ہے اور مِمَّا رَزَقَكُمْ حال ہے جس کو حَلٰلًا کے نکرہ ہونے کی وجہ سے مقدم کر دیا گیا ہے اور مِمَّا میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ مما میں اس امر کی صراحت ہے کہ کچھ رزق حلال ہوتا ہے اور کچھ حلال نہیں ہوتا۔ اہل حق کا یہی قول ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ من ابتدائیہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مِمَّا مفعول ہو اور حَلٰلًا حال ہو اور موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہو یا حلالا کا موصوف محذوف ہو۔ بہر حال ترکیب عبارت کچھ بھی قرار دی جائے اگر حرام کو رزق نہ کہا جائے (اور معتزلہ کے قول کو اختیار کیا جائے کہ حرام رزق نہیں ہوتا) تو پھر خصوصاً لفظ حَلٰلًا کو ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ (اور اللہ سے ڈرو) یہ امر سابق کی تاکید ہے۔

الَّذِیْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ۝۸۸ (جس پر تم ایمان رکھتے ہو)، اس فقرہ میں مزید تاکید ہے کیونکہ تمام اوامر و نواہی میں تقویٰ کو ملحوظ رکھنا تقاضائے ایمان ہے۔

بغوی نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ شیرینی یا شہد رسول اللہ ﷺ کو مرغوب خاطر تھا۔ رواہ البخاری۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ مرغوب روٹی کا ثرید اور دلیے کا ثرید تھا رواہ ابوداؤد۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھانا کھا کر شکر ادا کرنے والا صابر روزہ دار کی طرح ہے۔ رواہ الترمذی۔ ابن ماجہ اور دارمی نے یہ حدیث سنان بن سنہ کی روایت سے بیان کی ہے۔ بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جب آیت لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ نازل ہوئی تو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم ان قسموں کا کیا کریں جو حلال چیزوں کے سلسلے میں ہم کھا چکے ہیں۔ صحابہؓ نے مذکورہ بالا (تین) امور کو ترک کرنے کے متعلق آپس میں بقسم معاہدہ کر لیا تھا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

(لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ) اللہ

تم سے مواخذہ نہیں کرتا تمہاری قسموں میں لغو قسم پر بلکہ مواخذہ اس قسم پر کرتا ہے جو تم نے مستحکم کی ہو)۔

اس آیت کی تفسیر اور قسموں کے اصناف و احکام کی تفصیل سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ مواخذہ سے مراد ہے آخرت کی گرفت اور مَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ سے وہ قسمیں مراد ہیں جن کو مستحکم کرنے کا عزم کر لیا گیا ہو خواہ کسی فعل کو کرنے کی قسم ہو یا نہ کرنے کی اور دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کا نام لے کر استحکام کیا گیا ہو۔ بہر حال قسم کا تعلق کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے ہوتا ہے۔ اس طرح کی قسم کو پورا کرنا واجب ہے اللہ نے فرمایا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۔[ل]

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ کا مطلب یہ ہے کہ پختہ قسموں کو اگر توڑو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری گرفت کریگا۔ یا یوں کہو کہ پختہ قسموں کو توڑنے پر تم سے مواخذہ کرے گا (اول صورت میں شرط محذوف ہو گی اور دوسری صورت میں ماعقدتم سے پہلے مضاف محذوف ہو گا)۔

مسئلہ :- چاروں ائمہ اور جمہور علماء کے نزدیک انعقاد قسم کے لئے حرف قسم ضرور ہونا چاہئے خواہ تلفظ کیا گیا ہو یا محذوف ہو۔ پھر حرف قسم کا اللہ کے کسی نام کے ساتھ یا کسی ایسے لفظ کے ساتھ آنا بھی ضروری ہے جو اللہ کی ذات پر دلالت کر رہا ہے جیسے قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، قسم ہے دلوں کو پھیر دینے والے کی، قسم ہے آسمان و زمین کے رب کی وغیرہ۔

بعض علماء احناف کا قول ہے کہ اگر ایسے وصفی نام لے کر قسم کھائی جائے جو اللہ کے لئے مخصوص ہیں تو قسم ہو جاتی ہے اور اگر ایسے وصفی صیغوں کا ذکر کیا جائے جن کا استعمال دوسروں کے لئے بھی ہوتا ہے جیسے حلیم، علیم، قادر، وکیل، رحیم وغیرہ تو انعقاد قسم نیت یا عرف یا قرینۂ حال پر موقوف ہے (بغیر نیت کے یا بغیر دلالت حال کے یا بغیر عرف کے قسم کا انعقاد نہ ہو گا) امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اللہ کی جن صفات کی عرفاً قسم کھائی جاتی ہے ان کی قسم کھانے سے انعقاد قسم ہو جاتا ہے۔ جیسے اللہ کی عزت و جلال اور عظمت و بزرگی کی قسم لیکن جن صفات کی عرفاً قسم نہیں کھائی جاتی ان کو ذکر کرنے سے قسم نہیں ہوتی جیسے اللہ کے علم ارادہ اور مشیت کی قسم۔

مشائخ عراق نے صراحت کی ہے کہ صفات ذات کی قسم کھانے سے قسم کا انعقاد ہو جاتا ہے اور صفات فعل کی قسم کھانے سے انعقاد نہیں ہوتا۔ ان مشائخ کے نزدیک صفات ذات سے مراد وہ صفات ہیں جن کی ضد اللہ میں موجود نہیں ہے جیسے قدرت و جلال، بزرگی، عظمت (کہ ان کی ضد یعنی عجز، ذلت، حقارت وغیرہ سے اللہ پاک ہے) اور صفات فعل سے مراد وہ اوصاف ہیں کہ ان کی ضد بھی اللہ میں موجود ہے جیسے رحمت اور غضب، خوشنودی اور ناراضی، رزق کی تنگی اور فراخی وغیرہ۔

مسئلہ :- قرآن کی قسم تینوں اماموں کے نزدیک ہو جاتی ہے لیکن امام اعظمؒ کے نزدیک عرف نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتی (شاید امام صاحب کے زمانہ میں قرآن کی قسم عرفاً نہیں کھائی جاتی ہو گی) ابن ہمام نے کہا ہے اب قرآن کی قسم کھائی جاتی ہے لہٰذا امام صاحبؒ کے نزدیک قرآن کی قسم قسم قرار دی جائے گی۔ مصحف کی قسم کا حکم بھی قرآن کی قسم کی طرح ہے کیونکہ مصحف سے مراد بھی قرآن ہی ہے کاغذ مراد نہیں ہے۔ ابن عبد البر نے مسئلۂ قسم میں صحابہؓ اور تابعین کے اقوال نقل کر کے صراحت کی ہے کہ سب کے نزدیک قرآن کی قسم کا کفارہ واجب ہے اس کے خلاف کسی کا قول قابل اعتبار نہیں۔

قرآن کی جھوٹی قسم کھانے کا کفارہ کتنا ہونا چاہئے اس میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ امام مالک اور امام شافعیؒ کے نزدیک ایک کفارہ ہو گا۔ امام احمد کے دو قول منقول ہیں۔ ایک قول میں صرف ایک کفارہ ہونا منقول ہے اور دوسرے قول میں آیا ہے کہ ہر آیت کا ایک کفارہ ہو گا۔ اگر اللہ کے حق کی قسم کھائی تو امام صاحبؒ کے نزدیک قسم نہیں ہو گی، باقی تینوں اماموں کے نزدیک

[ل] ابو الشیخ اور عبد بن حمید نے سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ اگر قسم میں حلال کو حرام کر لیا گیا تو یہ قسم لغو ہے اس کو توڑ کر کفارہ دینا لازم ہے اللہ اس پر مواخذہ نہیں کرے گا۔ مواخذہ صرف ان قسموں پر ہو گا جن کا تعلق قصد و ارادہ سے ہو گا۔ (مولف)

ہو جائے گی۔

اگر لعمر اللہ اور ایم اللہ کہا تو امام صاحبؒ کے نزدیک قسم ہو جائے گی قسم کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ امام احمدؒ کا بھی ایک قول یہی ہے۔ بعض شوافع کا قول ہے کہ بغیر نیت کے ان الفاظ سے قسم نہیں ہو گی، امام احمدؒ کا قول بھی دوسری روایت میں یہی آیا ہے۔

مسئلہ :۔ اگر کعبہ یا نبی کی قسم کھائی تو امام احمدؒ کے علاوہ تینوں اماموں کے نزدیک قسم نہیں ہو گی نہ کفارہ واجب ہو گا۔ امام احمدؒ کا قوی روایت میں قول اس کے خلاف آیا ہے امام احمد فرماتے ہیں کہ نبی کی قسم کھائی تو قسم ہو جائے گی۔

ہمارے قول کا ثبوت اس فرمان نبوی سے ہوتا ہے کہ قسم کھانا ہی ہو تو اللہ کی قسم کھائے ورنہ خاموش رہے (صحیحین) ابوداؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اللہ کے سوا کسی اور کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔ حضرت ابن مسعود کا قول موقوفاً منقول ہے اللہ کی جھوٹی قسم کھانا میرے نزدیک کسی اور کی سچی قسم کھانے سے بہتر ہے۔

صاحب ہدایہؒ نے لکھا ہے یہ حکم اس صورت میں ہو گا جب نبی کی قسم کھائی ہو لیکن اگر اس طرح کہا ہو کہ اگر میں نے یہ کام کیا ہو تو میں نبی سے یا کعبہ سے بیزار ہوں یا کافر ہوں یا یہودی یا عیسائی ہوں تو لا محالہ اس کو قسم مانا جائے گا کیونکہ جب وقوع شرط کو کفر کی نشانی اس نے خود قرار دے دیا تو لا محالہ وقوع شرط سے باز رہنا واجب ہے لہٰذا اس کو قسم مانا جائے گا جیسے بعض دوسری صورتوں میں (حرف قسم یا شرط ذکر نہ کرنے کی صورت میں) بھی قسم قرار دیا جاتا ہے مثلاً کسی حلال چیز کو کسی نے اپنے لئے حرام بنا لیا تو یہ قسم ہو جائے گی۔ البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک تحریم حلال قسم نہیں ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ماریہ (رسول اللہ ﷺ کی ایک مملوکہ) کو اور شہد پینے کو اپنے لئے حرام کر لیا تھا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ قَدْ فَرَضَ اللّٰہُ لَکُمْ تَحِلَّۃَ اَیْمَانِکُمْ (کذا فی الصحیحین) اس کی تفصیل سورۂ تحریم میں انشاء اللہ آئے گی۔

مسئلہ :۔ اگر میں نے ایسا کیا ہو تو یہودی ہوں یا اسلام سے خارج ہوں یہ الفاظ یمین غموس کے ہیں (یعنی گزشتہ واقعہ کے متعلق دانستہ بالارادہ جھوٹی قسم ہے) اگر اس نے ماضی میں وہ فعل کر بھی لیا ہو گا تو امام صاحب کے نزدیک اس قسم سے کافر نہیں ہو جائے گا کیونکہ مستقبل کے متعلق اگر یہی الفاظ استعمال کرے (اور یوں کہے اگر میں ایسا کروں تو اسلام سے خارج ہو جاؤں اور پھر وہ کام کر لے) تو کافر نہیں ہو جاتا ہے پس ماضی کو مستقبل پر قیاس کیا جائے گا۔

بعض لوگ کافر ہو جانے کے قائل ہیں کیونکہ اس نے دانستہ کفر کو اپنے اوپر لاگو کیا ہے۔ صاحب ہدایہؒ نے لکھا ہے صحیح یہ ہے کہ ایسا کہنے والا اگر اس قول کو صرف قسم جانتا ہے تو کافر نہ ہو گا اور اگر سمجھتا ہے کہ اس حلف سے وہ کافر ہو جائے گا تو چونکہ حلف کھا کر اس نے خود کفر کو پسند کیا ہے اس لئے کافر ہو جائے گا۔ حضرت بریدہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کسی نے کہا کہ میں اسلام سے الگ ہوں پس اگر وہ جھوٹا ہے (واقع میں مؤمن ہوتے ہوئے اس نے اپنے کو خارج از اسلام کہا) تو اپنے قول کے مطابق ہو جائے گا۔ اور سچا ہے تو اسلام کی طرف خالص طور پر نہیں لوٹے گا، (روہ ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ)۔

مسئلہ :۔ اگر اللہ تعالیٰ کے نام یا اس کی کسی صفت کے ذکر کے ساتھ بصیغۂ ماضی قسم کھائی مثلاً اَقْسَمْتُ بِاللّٰہِ یا حَلَفْتُ بِاللّٰہِ یا شَھِدْتُ بِاللّٰہِ یا عَزَمْتُ بِاللّٰہِ کہا تو باتفاق علماء یہ قسم ہو گئی اور اگر بصیغۂ مضارع قسم کھائی مثلاً اُقْسِمُ بِاللّٰہِ یا اَحْلِفُ بِاللّٰہِ یا اَشْھَدُ بِاللّٰہِ یا اَعْزِمُ بِاللّٰہِ کہا تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مضارع کا معنی حال کا لیا جائے گا اور یہ قسم ہو جائے گی کیونکہ مضارع کا حال میں استعمال ہی حقیقی ہے استقبال کا معنی مراد لینا مجازی ہے جس کے لئے کوئی قرینہ ہونا ضروری ہے خواہ سین ہو یا سوف یا اور کچھ۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بغیر نیت کے قسم نہ ہو گی کیونکہ (صیغۂ مضارع کا استقبالی معنی میں استعمال حقیقی ہے اور) احتمال ہے کہ صیغۂ مضارع بول کر اس نے آئندہ قسم کھانے کا وعدہ کیا ہو (اس صورت میں اُقْسِمُ

اور اَشْهَدُ کا ترجمہ ہوگا میں قسم کھالوں گا، میں شہادت دوں گا کہ ایسا کروں گا)۔
مسئلہ:- اگر اللہ کا نام اور صفت ذکر نہیں کی بلکہ صرف اَقْسَمْتُ یا اُقْسِمُ یا حَلَفْتُ یا اَحْلِفُ کہا (یعنی میں نے قسم کھالی ہے یا قسم کھاتا ہوں) تو امام اعظمؒ کے نزدیک یہ قسم ہوگی قسم کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو اور اگر اس لفظ کو بول کر اس نے قسم کی نیت نہیں کی ہو تو قاضی اس کے قول کو تسلیم نہیں کرے گا (یعنی یہ بات نہ مانے گا کہ لفظ قسم وحلف سے میری مراد قسم نہیں تھی) ہاں اللہ کے ہاں وہ ماخوذ نہ ہوگا یعنی عدالت میں اس کو سچا نہیں قرار دیا جائے گا۔ عدالت میں اس کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ قسم کو قسم ہی قرار دیا جائے گا البتہ دیانۃً وہ سچا ہوگا اور دیانت کا تعلق صرف اللہ سے براہ راست ہے (جو دلوں کے احوال کا جاننے والا ہے) امام زفرؒ کے اور ایک قول میں امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک بھی اگر صرف لفظ قسم بول کر اس نے اللہ کی قسم مراد لی ہوگی تو قسم ہو جائے گی اور اللہ کی قسم کی نیت نہ کی ہوگی تو اسلامی قسم نہ ہوگی کیونکہ لفظ میں غیر شرعی قسم کا احتمال ہے (اور غیر شرعی قسم قسم نہیں ہوتی) امام شافعیؒ کے نزدیک صرف لفظ قسم کہنے سے قسم ہی نہیں ہوتی خواہ قسم کی نیت کرلی یا نہ کرلی ہو۔

ہم کہتے ہیں اللہ کی قسم ہی مسلمانوں کا دستور اور مشروع ہے اللہ کے سوا دوسرے کی قسم کھانا ممنوع ہے اس لئے نیت غیر مشروع نہ ہونے کی صورت میں مشروع ہی کی طرف کلام کو لوٹایا جائے گا۔ اس کا ثبوت حدیث میں آیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ ایک شخص نے خواب دیکھا اور رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے اجازت دیجئے میں اس کی تعبیر دوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی اور حضرت ابو بکر نے تعبیر دی اور عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں نے صحیح تعبیر دی فرمایا (کچھ) صحیح دی اور (کچھ) غلط دی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں قسم کھاتا ہوں کہ حضور ﷺ (میری غلطی) مجھے بتائیں گے، حضور ﷺ نے فرمایا اس طرح قسم نہ کھاؤ امام احمد کی روایت میں اس حدیث کے الفاظ اسی طرح آئے ہیں لیکن صحیحین میں یہ الفاظ ہیں (حضرت ابو بکرؓ نے کہا) اللہ کی قسم آپ ضرور مجھے بتائیں گے کہ میں نے کیا غلطی کی ہے حضور ﷺ نے فرمایا قسم نہ کھاؤ۔ واللہ اعلم۔

فَكَفَّارَتُهٗٓ (تو اس کا اتار)۔ یعنی قسم توڑنے کا کفارہ یا توڑنے کی صورت میں یمین منعقدہ کا کفارہ۔

کفارہ یعنی ایسا فعل جو قسم کے گناہ کو ساقط کردے اور اتار دے، اور چھپا دے (کفر کا لغوی معنی ہے چھپانا)۔

اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے)۔ اطعام کھانے پر قادر بنا دینا خواہ اس طرح ہو کہ کسی کو کھانے کا مالک بنا دے یا اس طرح ہو کہ اس کو کھانے کی اجازت دیدے۔ اسی لئے امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اگر صبح شام دو وقت پیٹ بھر کر کھلا دیا اور مالک نہیں بنایا (یعنی کھانا اس طرح نہ دیا کہ چاہے وہ گھر کو لے جائے اور چاہے خود وہیں کھالے) تو جائز ہے خواہ انہوں نے تھوڑا کھایا ہو یا بہت (یعنی مقدار طعام دینا شرط نہیں ہے پیٹ بھر کر کھلا دینا کافی ہے) کرخی نے حسن بن زیاد کی روایت سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک کھانے کا مالک بنا دینا ضروری ہے (کہ چاہے وہ سب لے جائے، چاہے کچھ کھائے کچھ لے جائے، چاہے سب کھالے) کیونکہ زکوٰۃ اور صدقۂ فطر میں بھی تملیک ہی شرط ہے (اور دونوں کی مقدار مقرر ہے جو مسکین کو دیدی جاتی ہے خواہ وہ کچھ بھی کرے لہٰذا کفارہ کی مقدار کا بھی مسکین کو مالک بنا دینا ضروری ہے وہ جیسا چاہے تصرف کرے) اس کے علاوہ مالک بنا دینے یعنی مسکین کو دیدینے سے اس کی ضرورتیں بھی زیادہ پوری ہو جاتی ہیں صرف کھانے کی اجازت دینے سے ضرورتوں کی تکمیل ممکن نہیں۔

ہم کہتے ہیں زکوٰۃ کے لئے تو لفظ اٰتُوْا آیا ہے اور صدقۂ فطر کے لئے بھی لفظ ادا استعمال کیا گیا ہے اور اِیتاء ہو یا اَداء دونوں کا حقیقی معنی مالک بنا دینا (ہر قسم کے تصرف کا کامل حق دے دینا) ہی ہے مگر اطعام کا حقیقی معنی کھانا دینا نہیں ہے بلکہ کھانے پر قادر بنا دینا ہے (یعنی کھانا کھلانا اطعام کا حقیقی مفہوم ہے۔

......ایک شبہ......

اگر اِطْعَام کا حقیقی مفہوم کھانے پر قادر بنادینا (یعنی کھانا کھانے سے نہ روکنا) ہی ہے تو مالک بنادینا (یعنی اس طرح دیدینا کہ وہ خود نہ کھائے بلکہ لے جائے اور اس کھانے کا جس طرح چاہے استعمال کرے) جائز نہ ہونا چاہئے کیونکہ (تملیک کا مفہوم مجازی ہوگا) اس صورت میں حقیقت و مجاز دونوں کا بیک وقت مراد ہونا لازم آئے گا۔

ازالہ :- ہم کہتے ہیں تملیک کے اندر بھی کھانے کی اجازت اور اعطاء قدرت ہوتی ہے یا یوں کہا جائے کہ تملیک کا جواز دلالت النص کے سبب سے ہے اور اباحت کا مفہوم حقیقی ہے اور دلالت النص حقیقت پر عمل کرنے سے مانع نہیں ہوتی جیسے (ماں باپ کو) اُف کرنے کی ممانعت (حقیقی ہے اور مارنے، گالی دینے کی ممانعت بدلالت نص ہے اور مارنے، گالی دینے کی ممانعت اف کرنے کی ممانعت سے مانع نہیں، کیونکہ ورود نص کی اصل غرض ہی کھانے کی ضرورت کو پورا کرنا اور تملیک سے ہر ضرورت پوری ہو جاتی ہے لہٰذا کھانے کی ضرورت کا اس میں شمول بدرجۂ اولیٰ ہے۔ عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے کہ آیت فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ کی تشریح میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے فرمایا مسکینوں کو صبح شام کا کھانا کھلادے، روٹی گوشت ہو یا روٹی اور روغن زیتون یا روٹی اور گھی یا روٹی اور کھجوریں۔

مسئلہ :- کھانے والے مسکینوں میں اس بچہ کی گنتی نہ ہوگی جس کا دودھ حال میں چھڑا لیا گیا ہو کیونکہ وہ پورے طور پر (کھانا) نہیں کھا سکتا۔

مسئلہ :- اگر گیہوں کی روٹی نہ ہو تو سالن ہونا بھی ضروری ہے تاکہ پیٹ بھر کر پورے طور پر کھائی جاسکے۔ گیہوں کی روٹی میں یہ شرط نہیں ہے بشرطیکہ کھانا کھلانے والا بغیر سالن کے گیہوں کی روٹی معمولاً کھاتا ہے۔

مسئلہ :- امام صاحبؒ کے نزدیک ایک ہی مسکین کو دس دن تک کھانا دینا جائز ہے لیکن ایک دن میں ایک ہی شخص کو دس مرتبہ کھانا دینا جائز نہیں ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ دن میں دس مرتبہ کھلانا کافی نہیں ہے، لیکن ایک دن میں دس مرتبہ کھانا دینا (یعنی دس مرتبہ میں دس آدمیوں کی خوراک کا ایک شخص کو ایک ہی دن میں مالک بنادینا) جائز ہے کیونکہ تملیک کی ضرورت ایک دن میں نو بنو ہو سکتی ہے مگر کھانے کی ضرورت ایک دن میں دس بار نہیں ہوتی۔ اگر یکدم دس مسکینوں کا کھانا ایک مسکین کو دے دیا تو جائز نہیں یہ تمام اقوال امام صاحبؒ کے ہیں۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا قول ہے کہ دس مساکین کا کھانا ایک مسکین کو کھلانا جائز ہے نہ دینا۔ (نہ یک دم، نہ دس مرتبہ میں، نہ دس دن میں) کیونکہ آیت میں عَشَرَةِ مَسَاكِينَ (دس مسکینوں) کی نص ہے اور ایک مسکین اگر بار بار حاجتمند ہوتا رہے تو دس مسکین نہیں ہو سکتا (رہے گا ایک ہی مسکین) امام اعظمؒ نے فرمایا کہ اصل مقصد ہے حاجت کو پورا کرنا اور کھانے کی حاجت ہر روز نئی ہوتی ہے لہٰذا دوسرے روز بھی پہلے مسکین کو ہی دینا ایسا ہی ہے جیسے کسی دوسرے مسکین کو دینا (گویا حاجت کے تجدد سے امام صاحبؒ کے نزدیک مساکین کا تعدد حکماً ہو جاتا ہے) اور ایک دن میں دس مرتبہ کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی (اس لئے مساکین کا تعدد نہ حقیقی ہوگا نہ حکمی، اسی وجہ سے یہ صورت ناجائز ہے) امام شافعیؒ نے فرمایا اگر ضرورت طعام پوری کرنے کو اصل علت قرار دیا جائے گا اور مذکورہ بالا توجیہ کی جائے گی تو نص کا تقاضا پورا نہ ہوگا (لفظ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ بے معنی اور بے مقصد قرار پائے گا)۔

مسئلہ :- اگر دس مسکینوں کو کھانا دیا جائے تو ہر مسکین کے لئے اہل عراق کے نزدیک دومد (تقریباً دوسیر) یعنی آدھا صاع ہونا چاہئے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول بھی روایت میں یہی آیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا گندم کا نصف صاع اور جو یا چھواروں کا پورا صاع ہونا چاہئے۔ شعبی، نخعی، سعید بن جبیر، مجاہد اور حکم کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک مد سے مراد ہے بغدادی دو رطل۔ امام احمدؒ نے فرمایا گیہوں یا (گیہوں کا) آٹا ایک مد اور جو یا چھوارے دو مد اور روٹی یعنی گیہوں کی روٹی دو رطل ہونی چاہئے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا مد سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کا مد جو ۱/۳ ۱ رطل کے برابر تھا اور جنس وہ ہونا چاہئے جس کو شہر میں اکثر لوگ کھاتے ہیں روٹی اور آٹا دینا صحیح نہیں ہے، ثابت غلہ دینا

چاہئے۔ بغویؒ نے لکھا ہے زید بن ثابت، ابن عباس، ابن عمر، سعید بن المسیبؒ، قاسم، سلیمان بن یسار، عطاء اور حسن کا بھی یہی قول ہے۔

تمام کفارات میں ائمہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین کا اختلاف قسم کے کفارہ کی طرح ہے۔ امام صاحبؒ کے نزدیک درہم و دینار کی شکل میں قیمتِ جنس لگانے کے بعد کفارہ ادا کرنا صحیح ہے دوسرے علماء کے نزدیک درست نہیں۔

کرخی نے حضرت عمر کا قول بیان کیا ہے کہ چھواروں اور جو کا ایک صاع اور گیہوں کا آدھا صاع ہونا چاہئے۔ کرخی نے اپنی اسناد سے یہ بھی بیان کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا قسم کا کفارہ گیہوں کا نصف صاع ہے یہ بھی کرخی نے بیان کیا کہ مجاہد نے فرمایا قرآن میں جو کفارہ ہے اس کی مقدار فی مسکین نصف صاع گندم ہے۔

ابن جوزی نے التحقیق میں لکھا ہے کہ سلیمان بن یسار نے کہا میں نے لوگوں کو طعام مساکین میں ایک ایک مد دیتے ہوئے پایا۔ دوسری روایت میں اتنا زائد آیا ہے کہ یہ مقدار کافی ہوتی تھی (یعنی کفارہ ادا کرنے کے لئے کافی سمجھی جاتی تھی)۔

کفارہ کے سلسلے میں حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی روایت آئی ہے کہ سلیمان بن صخر نے (جن کو سلمہؓ بن صخر کہا جاتا تھا) اپنی بیوی سے رمضان کے لئے ظہار کر لیا یعنی بیوی سے کہہ دیا کہ تو میرے لئے رمضان میں ایسی ہے جیسی میری ماں کی پیٹھ۔ لیکن آدھا رمضان گزرنے پر ہی رات کو قربت کر بیٹھے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر گزارش واقعہ کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک بردہ آزاد کر دو۔ سلمہ نے عرض کیا بردہ تو مجھے میسر نہیں۔ فرمایا دو مہینے کے پیہم روزے رکھو۔ عرض کیا اس کی بھی مجھ میں طاقت نہیں۔ فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا دو۔ عرض کیا یہ بھی مجھے توفیق نہیں۔ اس وقت حضور ﷺ نے عروہ بن عمرو سے فرمایا اس کو ایک فرق دے دو۔ فرق ایک پیمانہ ہوتا تھا جس کے اندر پندرہ سولہ صاع (غلہ) آتا تھا کہ ساٹھ مسکینوں کو یہ کھلا دے۔ رواہ الترمذی۔

ابوداؤد ابن ماجہ اور دارمی نے بھی راوی مذکور کی روایت میں سلمہ بن صخر کا بیان حسب روایت ترمذی نقل کیا ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں عورتوں میں وہ چیز پاتا تھا جو دوسرے نہیں پاتے۔ امام شافعی اور دوسرے فقہاء جو ہر مسکین کے لئے مذکورۂ حدیث مقدار (یعنی ربع صاع) کافی قرار دیتے ہیں، حدیث سلمہ سے استدلال کرتے ہیں۔ لیکن امام ابو حنیفہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو طبرانی نے حضرت اوس بن صامت کی روایت سے بیان کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا۔ ساٹھ مسکینوں کو تیس صاع کھانا دیدے۔ اس نے عرض کیا میرے پاس تو یہ نہیں ہاں اگر آپ مدد کر دیں تو ایسا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اس کو پندرہ صاع کی مدد دی اور باقی دوسروں نے اعانت کر دی کہ تیس صاع ہو گئے، انتہی۔

میں کہتا ہوں غالباً (وہ پندرہ صاع) گیہوں ہوں گے۔ ابوداؤد نے بطریق ابن اسحاق بروایت معمر بن عبداللہ بن حنظلہ، از یوسفؒ بن عبداللہ بن سلام حدیث مذکور کی روایت ان الفاظ کے ساتھ کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا میں اس کی مدد ایک فرق چھواروں سے کر دوں گا۔ حضرت اوس بن صامت نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ایک فرق سے میں مدد کر دوں گا۔ فرمایا اَحْسَنْتَ۔ راوی نے کہا فرق ساٹھ صاع کا تھا اور مکتل تیس صاع کا۔ ابن ہمام نے لکھا ہے موخر الذکر قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ اگر مکتل ساٹھ صاع کا ہوتا تو کفارہ کے لئے دوسرے فرق کی ضرورت ہی نہ تھی۔

ابوداؤد نے ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کی روایت سے بیان کیا ہے کہ فرق پندرہ صاع کا ایک زنبیل ہوتا تھا۔

ابوداؤد نے سلمہ بن صخر بیاضی کے قصہ میں بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق چھوارے دیدو۔ اس شخص (یعنی سلمہ بن صخر) نے عرض کیا، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو برحق بھیجا ہے ہم دونوں رات کو بھوکے رہے ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو بنی زریق کی زکوٰۃ وصول کرنے والے عامل کے پاس چلا جاوہ تجھے

دے دے گا اس میں سے ایک وسق چھوارے تو ساٹھ مسکینوں کو دیدینا اور باقی تو اور تیرے بال بچے کھالیں۔ (الحدیث) اخرجہ احمد وابوداؤد۔

مسئلہ :- بچہ کو کھانا کھلانا اور دے دینا دونوں جائز ہیں اور قبول بچہ کا ولی کرے گا۔ کیا ایسا بچہ جس نے ابھی کھانا نہ کھایا ہو اس قابل ہے کہ اس کو کفارہ کا کھانا دیا جائے۔ امام اعظمؒ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک غیر صحیح۔

مسئلہ :- امام اعظمؒ کے نزدیک ذمی کافر کو دینا جائز ہے کیونکہ نص (میں لفظ مَسَاكِيْن) مطلق ہے اور دوسری آیت میں اللہ نے خود فرمادیا ہے لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ الخ (یعنی جو کافر تم سے دین کے معاملہ میں نہ لڑے ہوں ان سے دنیوی معاملات میں حسن سلوک کرنے سے اللہ تم کو نہیں روکتا الخ) جمہور کے نزدیک ناجائز ہے کیونکہ ذمی کو زکوٰۃ دینا ناجائز ہے اور زکوٰۃ لینے کا اہل کافر ذمی نہیں ہے۔ یہ مسئلہ اجماعی ہے، لہٰذا کفارہ کو بھی زکوٰۃ پر قیاس کیا جائے گا۔

مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ "اوسط درجہ کا جو اپنے گھر والوں کو کھانے کو دیا کرتے ہو۔" بغوی نے لکھا ہے مراد یہ ہے کہ اپنے بال بچوں کی بہترین خوراک میں سے۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ درمیانی درجہ کی غذا ہو، نہ اعلیٰ، نہ ادنیٰ۔ پس جو دولت مند آدمی اپنے گھر والوں کو لذیذ کھانا کھلاتا ہو اس پر لازم ہے کہ مسکینوں کو بھی وہی کھلائے جو عموماً اپنے گھر والوں کو کھلاتا ہو۔ آیت مذکورہ امام ابوحنیفہؒ کے قول کی تائید کر رہی ہے کہ فقیر کو کھانے کی اجازت دیدینا (یعنی بغیر مالک بنائے ہوئے صرف کھانے کی اجازت دے دینا) جائز ہے۔

عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے من اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے اپنی تنگدستی اور فراخ دستی میں۔ دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے نہ سب سے بڑھیا نہ بالکل گھٹیا۔ اھل کی جمع یاء نون کے ساتھ شاذ ہے کیونکہ لفظ اَهْل (زید کی طرح) علم نہیں ہے۔

اَوْ كِسْوَتُهُمْ (یا ان کا کپڑا) یا اس طرح ترجمہ کیا جائے "یا اوسط درجہ کا ان کا لباس" اول صورت میں اِطْعَام پر عطف ہوگا اور دوسری صورت میں من اوسط کے محل پر۔

امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک کم سے کم اتنا کپڑا ہونا چاہئے جس کو پہن کر نماز صحیح ہو جائے۔ ایک قول امام محمدؒ کا بھی یہی آیا ہے۔ اس صورت میں مرد کے لئے صرف پائجامہ یا تہبند یا (گھٹنوں سے نیچا) کرتہ کافی ہوگا اور عورت کے لئے دو کپڑے ضروری ہیں (لمبا) کرتہ اور اوڑھنی۔ امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک کم سے کم اتنا کپڑا ہونا چاہئے جس سے بدن کا بیشتر حصہ چھپایا جا سکے اس لئے صرف پائجامہ کافی نہیں اگرچہ صرف پائجامہ سے نماز ہو جاتی ہے کیونکہ صرف پائجامہ پہننے والے کو رواج میں برہنہ کہا جاتا ہے اور ضرورت ہے لباس پوش بنا دینے کی۔ اور عورت کے لئے ایک لمبا کرتہ بغیر اوڑھنی کے کافی ہے اگرچہ عورت کی نماز بغیر اوڑھنی کے صحیح نہیں کیونکہ عرف میں ایسی عورت کو برہنہ نہیں کہتے، لباس پوش کہتے ہیں۔ ابن مردویہ نے لکھا ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اَوْ كِسْوَتُهُمْ سے کیا مراد ہے فرمایا عباء (لمبا ڈھیلا کرتہ) طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے کہ ہر مسکین کے لئے ایک عباء (ہونا چاہئے)۔

(امام شافعیؒ کے نزدیک كِسْوَتُهُمْ سے مراد ہے کم سے کم وہ کپڑا جس پر لفظ کسوت کا اطلاق ہوتا ہے اس لئے صرف عمامہ یا صرف پائجامہ یا صرف معمولی کرتہ جائز ہے۔ صرف ٹوپی کے متعلق شافعیہ کے دو قول آئے ہیں۔

اگر پانچ مسکینوں کو کھانا اور پانچ کو کپڑا دیا تو امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ناکافی ہے۔

اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ (یا بردہ آزاد کرنا رَقَبَةٌ گردن کو کہتے ہیں مراد ہے) انسان (مرد ہو یا عورت) امام اعظمؒ

کے نزدیک قسم اور ظہار کے کفارہ میں کافر غلام یا باندی آزاد کرنا جائز ہے کیونکہ نص (میں رقبة کا لفظ) مطلق ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک کافر کو آزاد کرنا کافی نہیں مؤمن ہونا ضروری ہے۔ کفارۂ قتل میں غلام باندی کا مومن ہونا ضروری ہے (کیونکہ وہاں مومن کی قید آیت میں موجود ہے) اسی پر قیاس کر کے اس جگہ بھی مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ ہم کہتے ہیں مطلق کو اطلاق پر اور مقید کو تقیید پر رکھا جائے گا کوئی وجہ نہیں کہ ایک کو دوسرے پر قیاس کیا جائے۔

مسئلہ :- لفظ اَوْ کا تقاضا ہے کہ کفارہ کی تینوں قسموں میں سے کوئی ایک قسم واجب ہے اور تعین کا اختیار کفارہ دینے والے کو ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ جب آیت کفارہ نازل ہوئی تو حضرت حذیفہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا تعین کا ہم کو اختیار ہے فرمایا تم بااختیار ہو چاہو کپڑا دو، چاہو کھانا دو اور جس کو (اتنا) کچھ نہ ملے تو پیہم تین روزے ہیں۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ (اب اگر کسی کو (تینوں چیزوں میں سے) کچھ میسر نہ آئے) یعنی اتنی چیز اس کو نہ ملے کہ قرض ادا کرنے اور اپنے گھر والوں کے کھانے پہننے کے مصارف کے بعد مسکینوں کو کھانا یا کپڑا دے سکے یا بردہ آزاد کر سکے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ اہل وعیال کی ضروری حاجات پوری کرنے کے بعد اگر اتنا مال باقی ہو کہ کفارہ کی تینوں قسموں میں سے کوئی قسم ادا کر سکے اور اداء کفارہ کے بعد مزید کچھ باقی نہ رہے تو ایسے شخص کو عاجز نہیں قرار دیا جائے گا۔ حسن اور سعید بن جبیر کا یہی قول ہے۔ ابوالشیخ نے قتادہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جس شخص کے پاس پچاس درہم ہوں وہ صاحب توفیق ہے اس پر کفارہ کی ادائیگی لازم ہے۔ پچاس درہم سے کم رکھنے والا صاحب توفیق نہیں اس کو (قسم کے کفارہ کے لئے) روزے رکھنے چاہئیں۔ ابوالشیخ نے ابراہیم نخعی کا قول نقل کیا ہے کہ بیس درہم رکھنے والا صاحب توفیق ہے مساکین کو (بطور کفارہ) کھانا دینا اس پر واجب ہے۔

مسئلہ :- غلام کے لئے سوائے روزے رکھنے کے قسم کا کوئی کفارہ نہیں کیونکہ اس کا مال اپنا مال نہیں اس لئے نہ کھانا دے سکتا ہے، نہ لباس، نہ بردہ آزاد کر سکتا ہے۔ اگر آقا اپنے غلام کی قسم کے کفارہ میں کھانا دے گا یا لباس یا بردہ آزاد کرے گا تو کفارہ نہ ہوگا مکاتب اور مستسعی کا بھی یہی حکم ہے۔[1]

مسئلہ :- اگر غلام نے کفارہ کے روزے رکھنے شروع کئے اور روزے پورے ہونے سے پہلے اس کو آزاد کر دیا گیا خواہ ختم صوم سے ایک ساعت پہلے ہی آزادی ملی ہو اور مال بھی (بقدر کفارہ) ہاتھ آ گیا ہو تو از سر نو کفارہ ادا کرنا ضروری ہے یہی حکم اس نادار آدمی کا ہے جو (ناداری کی وجہ سے) کفارہ کے روزے رکھ رہا ہو لیکن روزے پورے ہونے سے پہلے (بقدر کفارہ) مال اس کے ہاتھ آجائے تو از سر نو کفارہ ادا کرے گا۔

مسئلہ :- ہمارے نزدیک ادائے کفارہ کا ارادہ کرنے کے وقت صاحب مال ہونا شرط ہے (قسم توڑنے کے وقت مالدار ہو یا نہ ہو) کیونکہ روزہ بجائے مال کے مشروع کیا گیا ہے جیسے تیمم وضو کے قائم مقام ہے۔ لہٰذا وقت ادا کا اعتبار ہے (وقت وجوب کا اعتبار نہیں) امام شافعیؒ کے نزدیک قسم توڑنے کے وقت مالدار ہونا چاہئے۔

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ (تو (اس کا کفارہ) تین دن کے روزے رکھنے ہیں۔)

مسئلہ :- امام مالکؒ کے نزدیک مسلسل روزے رکھنے ضروری نہیں (بیچ میں ناغہ کر کے بھی روزہ رکھ سکتا ہے تین کی گنتی پوری کرے) کیونکہ نص (میں لفظ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ) میں کوئی قید نہیں البتہ پیہم بغیر ناغہ کئے روزے رکھنا مستحب ہے۔ امام شافعیؒ کے دو قول آئے ہیں۔ جدید راجح قول یہی ہے کہ تسلسل صیام مستحب ہے واجب نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک تسلسل واجب ہے۔ امام شافعی کا بھی قول قدیم یہی ہے۔ کیونکہ قتل اور ظہار کے کفارہ میں تسلسل کی قید نص

[1] اگر غلام کو اس شرط پر آزاد کرنے کا معاہدہ کر لیا کہ جس وقت تو اتنا روپیہ مجھے دے دے گا تو آزاد ہو جائے گا تو ایسے غلام کو مکاتب کہا جاتا ہے اگر ایک غلام دو آدمیوں کا مشترک ہو اور ایک آقا اپنا حصہ آزاد کر دے تو غلام پورا آزاد ہو جائے گا اور غلام سے کہا جائے گا کہ آزاد نہ کرنے والے آقا کے حصہ کی قیمت کچھ محنت مزدوری کر کے ادا کر دے ایسا غلام مستسعی کہلاتا ہے۔

میں آئی ہے اس لئے اس مطلق میں بھی اسی شرط کو ضروری قرار دیا جائے گا۔ امام شافعیؒ کے قول راجح کی دلیل یہ ہے کہ کفارۂ یمین میں دو قاعدوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ ایک تو قتل اور ظہار کے کفارہ کے قاعدہ کو کہ وہاں تسلسل صیام منصوص ہے۔ دوسرا صوم تمتع کو کہ وہاں روزوں میں تفریق ضروری ہے (امام شافعی صوم تمتع کو حج میں دم جبر قرار دیتے ہیں) اول صورت کا تقاضا ہے کہ تسلسل ضروری قرار دیا جائے اور دوسری صورت کا تقاضا ہے کہ عدم تسلسل کو واجب کہا جائے۔ اس لئے ہم نے اس جگہ مطلق کو مطلق ہی رہنے دیا (نہ تسلسل کو واجب کہا نہ تفریق کو)۔

امام صاحبؒ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ کے بعد متتابعات کا لفظ آیا ہے اور یہ قرأت شہرت کے درجہ پر فائز ہے اور (قید) مشہور سے (متواتر) مطلق کو مقید کر دینا جائز ہے کیونکہ اس قید کا ورود حکم پر ہوگا سبب پر نہ ہوگا۔

مسئلہ :۔ امام اعظمؒ کے نزدیک کافر کی قسم کا انعقاد ہی نہیں ہوتا اسی لئے کفارہ بھی لازم نہیں۔ باقی تینوں اماموں کے نزدیک کافر کی قسم منعقد ہو جاتی ہے اور قسم شکنی پر کفارہ لازم ہے۔ ہماری پہلی دلیل یہ ہے کہ کافر قسم کھانے کا اہل ہی نہیں ہے۔ قسم کا انعقاد اللہ کے نام کی عظمت کی وجہ سے ہوتا ہے اور کافر کے نزدیک اللہ کے نام کی کوئی عظمت ہی نہیں۔ اس دلیل پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر کافر کسی دعویٰ کا منکر ہو تو اس سے باجماع علماء قسم لی جائے گی (معلوم ہوا کہ کافر کی قسم قابل انعقاد اور معتبر ہے)۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ قسم کا کفارہ ایک طرح کی عبادت ہے اور کافر عبادت کا اہل نہیں۔ میں کہتا ہوں اس دلیل کا اقتضاء تو یہ ہے کہ اگر کسی کافر نے قسم کھائی ہو پھر مسلمان ہو گیا ہو اور مسلمان ہونے کے بعد قسم شکنی کی ہو تو اس پر کفارہ لازم ہو جائے گا (کیونکہ اسلام کی حالت میں اس نے قسم شکنی کی ہے اور اس وقت وہ اہل کفارہ بھی ہے)۔ واللہ اعلم۔

ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ (جب تم نے قسم کھائی ہو (اور قسم کے خلاف کیا ہو) تو یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے) قسم شکنی کی شرط اس لئے لگائی گئی کہ بغیر شکست قسم کے باجماع علماء (محض قسم کھانے سے) کفارہ واجب نہیں ہو جاتا۔

امام احمدؒ و شافعیؒ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ قسم شکنی سے پہلے کفارہ ادا کر دینا جائز ہے۔ ایک قول امام مالکؒ کا بھی اسی طرح منقول ہے کیونکہ آیت میں کفارہ کی نسبت قسموں کی طرف کی گئی ہے، قسم شکنی کی طرف نہیں کی گئی۔ اور اضافت اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ مضاف الیہ مضاف کا سبب ہوتا ہے خواہ مضاف مضاف الیہ کا کوئی شرعی حکم ہو یا حکم شرعی سے تعلق رکھنے والا کوئی امر ہو اور اس جگہ کفارہ (اگرچہ خود حکم شرعی نہیں مگر) وجوب سے تعلق رکھنے والا ہے اور وجوب حکم شرعی ہے اور جب یمین (قسم) کفارہ کا سبب قرار پائی تو قسم شکنی سے پہلے کفارہ کی ادائیگی درست ہونی چاہئے کیونکہ شکست قسم تو شرط ہے (سبب نہیں ہے) اور سبب موجود ہونے کے بعد شرط پر تقدیم شرعاً جائز ہے۔ دیکھو اگر نصاب زکوٰۃ موجود ہو (جو سبب وجوب زکوٰۃ ہے) اور سال پورا نہ ہوا ہو (جو شرط ہے) تو زکوٰۃ ادا کرنا جائز ہے یا اگر کسی نے کسی کو زخمی کر دیا اور مجروح ابھی مرا نہیں تو مرنے سے پہلے ادائے خوں بہا درست ہے۔

اس دلیل کی روشنی میں (قسم شکنی کا) کفارہ بصورت مالی ہو یا بصورت صوم دونوں کی تقدیم جائز ہے۔ امام مالکؒ اور امام احمد کا مسلک اور امام شافعیؒ کا قدیم قول یہی ہے۔ امام شافعی کا جدید قول یہ ہے کہ مالی کفارہ کی تقدیم جائز ہے اور قسم توڑنے سے پہلے کفارہ کے روزے رکھنا درست نہیں کیونکہ وجود سبب کے بعد وجوب پر اداء کی تقدیم صرف مالی عبادت میں شرعاً موجود ہے (بدنی عبادت کے وجوب سے پہلے ادا کی اجازت کی کوئی نظیر نہیں ملتی) دیکھو وجوب سے پہلے نماز، روزہ کی ادائیگی جائز نہیں۔

امام اعظمؒ کے نزدیک قسم شکنی سے پہلے کسی قسم کے کفارہ کی ادائیگی جائز نہیں۔ امام صاحبؒ کے نزدیک کفارہ کا سبب

قسم شکنی نہیں، قسم ہے۔ اس لئے قسم شکنی سے پہلے ادا کفارہ جائز نہیں کیونکہ کفارہ کا قانون گناہ کو دور کرنے اور قصور کی معافی کے لئے بنایا گیا ہے اور گناہ سے پہلے گناہ دور کرنے کے کوئی معنی نہیں۔ گناہ تو قسم شکنی سے پیدا ہوتا ہے۔ رہا قسم کا معاملہ تو وہ نہ کفارہ کا سبب ہے نہ شکست قسم کا بلکہ قسم نیکی کرنے کے لئے ہوتی ہے کوئی امر سبب اسی چیز کا ہو سکتا ہے کہ (اگر علت موجبہ نہ ہو تو) کم سے کم اس چیز تک پہنچانے والا ہو اور قسم کی حالت ایسی نہیں ہے۔ جس چیز پر قسم کھائی جاتی ہے اس کے عدم سے قسم مانع ہوتی ہے پھر اس کے عدم تک مفضی کیسے ہو سکتی ہے۔ ہاں اتفاقاً کبھی قسم کے بعد قسم شکنی ہو جاتی ہے (اگرچہ قسم شکنی سے قسم مانع ہے لیکن شکست کی نہ قسم موجب ہے نہ علت مفضیہ)۔

پھر (یہ بھی ضروری نہیں کہ اضافت سبب ہی کی جانب ہو کبھی) اضافت شرط کی جانب بھی ہوتی ہے جیسے صَدَقَةُ الفِطْرِ (میں فطر صوم صدقہ کے وجوب کی شرط ہے) اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ قسم سبب ہے تب بھی قسم شکنی وجوب کفارہ کی شرط ہوگی اور شرط سے پہلے کفارہ کا وجوب ہی نہ ہوگا، اب اگر قسم شکنی سے پہلے کفارہ دیا ہے تو نہ قسم شکنی سے پہلے ادائیگی ہوگی نہ قسم شکنی کے بعد۔ وجوب سے پہلے ادائیگی کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ رہی زکوٰۃ اور صدقہ فطر کی قبل وجوب ادائیگی تو عقلی دلیل کا تقاضا تو یہی تھا کہ یہ بھی صحیح نہ ہو مگر قیاس کے خلاف ان دونوں کے جواز کے متعلق نص آگئی لہٰذا نص کا حکم اسی مسئلہ میں محدود رکھا جائے گا جس کے متعلق نص آئی ہے، خلاف قیاس نص پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ زکوٰۃ کے متعلق حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے زکوٰۃ ادا کرنے کا مسئلہ دریافت کیا جب کہ اداء کا وقت نہ آیا ہو حضور نے ان کو اجازت دیدی۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ والدارمی) اور صدقہ فطر کے متعلق بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت لکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقہ فطر واجب قرار دیا۔ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ لوگ فطر سے ایک دو روز پہلے صدقہ فطر دے دیا کرتے تھے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہوگی بلکہ پہلے سے اجازت دے دی گئی ہو کیونکہ وجوب سے پہلے ادا خلاف عقل ہے (اس لئے صحابہ نے اپنی عقل سے خود ایسا نہیں کیا ہوگا) لامحالہ رسول اللہ ﷺ سے ضرور سنا ہوگا (کذا قال ابن ہمام)

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ قسم کفارہ کا سبب ہے۔ اضافت کا یہی تقاضا ہے اور قسم کے سبب بننے کی شرط قسم شکنی ہے، اصول فقہ میں صراحت کر دی گئی ہے کہ امام صاحبؒ کے نزدیک اِنْ دَخَلْتِ الدَّارَ فَاَنْتِ طَالِقٌ میں تعلیق بالشرط سبب سے مانع ہے حکم سے مانع نہیں اور امام شافعیؒ کے نزدیک حکم سے مانع ہے۔ گویا یہ کلام طلاق کا سبب صرف اس وقت ہوگا جب عورت گھر میں داخل ہو جائے اور مانع زائل ہو جائے۔ داخلہ سے پہلے یہ کلام عورت کو داخل ہونے سے باز رکھنے کے لئے کہا گیا تھا۔ اسی طرح قسم باللہ اصل میں تو قسم کو پورا کرنے کا سبب تھی لیکن جب قسم پوری نہ کی گئی اور توڑ دی گئی تو یہ ہی قسم کفارہ کا سبب ہو گئی، پس شکست سے پہلے کفارہ دینا جو سبب سے پہلے ادا ہو گیا۔ زکوٰۃ کی حالت اس سے جدا ہے زکوٰۃ کا سبب ہے مال اور صدقہ فطر کی حالت بھی الگ ہے صدقہ فطر کا سبب ہے ذات اور شخص۔

قسم شکنی سے پہلے کفارہ دینے کے جواز میں مندرجہ ذیل روایت بھی پیش کی گئی ہے۔ عوف بن مالک کے والد کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرا ایک چچا کا بیٹا ہے میں اس کے پاس کچھ مانگنے جاتا ہوں تو وہ کچھ نہیں دیتا اور مجھ سے سلوک قرابت نہیں کرتا۔ پھر جب وہ حاجت مند ہوتا ہے تو میرے پاس مانگنے آتا ہے، میں نے قسم کھالی کہ اس کو کچھ نہیں دوں گا اور نہ سلوک قرابت کروں گا۔ آپ مجھے کوئی ایسی بات بتا دیجئے جو میرے لئے بہتر ہو میں اپنی قسم کا کفارہ دیدوں گا۔ (رواہ النسائی وابن ماجہ) دوسری روایت اس طرح ہے: میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرا چچا کا بیٹا میرے پاس آتا ہے اور میں قسم کھا چکا ہوں کہ اس کو کچھ نہیں دوں گا اور سلوک قرابت نہیں کروں گا فرمایا اپنی قسم کا کفارہ دیدو۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خدا کی قسم اگر میں کسی بات کی قسم کھالوں اور پھر اس سے بہتر کام مجھے دکھائی دے تو انشاء اللہ ضرور قسم کا کفارہ دیدوں گا اور اس بہتر کام کو کر لوں گا۔ (متفق علیہ) حضرت عبدالرحمٰن

بن سمرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تو قسم کھالے اور پھر اس سے بہتر کام تجھے نظر آجائے تو اپنی قسم کا کفارہ دیدے اور اس بہتر کام کو کرلے۔ دوسری روایت اس طرح ہے اس بہتر کام کو کرلے اور اپنی قسم کا کفارہ دیدے، متفق علیہ۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی کسی بات کی قسم کھالے اور پھر اس سے بہتر بات اس کو نظر آجائے تو قسم کا کفارہ دیدے اور وہ کام کرلے۔ (رواہ مسلم) یہ تمام روایات دلالت کررہی ہیں کہ قسم شکنی سے پہلے کفارہ دینا جائز ہے کیونکہ بعض روایات میں قسم کو توڑنے سے پہلے کفارہ ادا کرنے کا ذکر کیا گیا۔ مگر یہ استدلال ہیچ ہے کیونکہ واؤ مطلق عطف کے لئے آتا ہے (عطف ترتیبی کے لئے نہیں آتا) اس لئے قسم شکنی کا ذکر کفارہ سے پہلے ہو یا کفارہ کا ذکر قسم شکنی سے۔ دونوں صورتوں میں ترتیب نہیں ثابت ہو سکتی۔

ایک شبہ

بعض روایات میں لفظ ثم آیا ہے (جو ترتیب اور تراخی کے لئے آتا ہے) ابوداؤد نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پھر اپنی قسم کا کفارہ دیدے اس کے بعد وہی کام کر جو بہتر ہو۔

مستدرک میں حضرت عائشہؓ کا بیان منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب قسم کھالیتے تھے تو اس کو توڑتے نہ تھے یہاں تک کہ اللہ نے قسم کے کفارہ کا حکم نازل فرمایا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا اگر میں قسم کھاؤں گا اور اس سے بہتر عمل مجھے کوئی اور دکھائی دے گا) تو قسم کا کفارہ دیدوں گا پھر وہی عمل کروں گا جو بہتر ہوگا۔

جواب

ابوداؤد کی روایت شاذ ہے اور صحیحین میں حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کی وہ روایت مذکور ہے جو ہم نے اوپر نقل کردی اور حضرت عائشہؓ کی روایت جو مستدرک میں ہے وہ بھی شاذ ہے۔ بخاری کی روایت میں (ثم نہیں ہے بلکہ) واؤ کے ساتھ عطف ہے۔ ثم والی روایت کے صحیحین اور سنن اور مسانید کی روایات خلاف ہیں (ان کے مقابلہ میں شاذ روایت ناقابل عمل ہے۔

وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ (اور اپنی قسموں کی حفاظت رکھو) بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ہر بات میں قسمیں نہ کھایا کرو۔ صحیح مطلب یہ ہے کہ قسموں کے خلاف کرنے سے آیت میں روکا گیا ہے یعنی قسموں کو نہ توڑو قسم کے مطابق عمل کرو اور قسم کو پورا کرو۔ اس مطلب کی تائید آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ سے ہو رہی ہے۔

احکام قسم

جس چیز پر قسم کھائی ہو اگر وہ طاعت (یعنی نیکی) ہو تو پورا کرنا واجب ہے لیکن قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا بھی جائز ہے یا نہیں، امام اعظمؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک چونکہ قسم توڑنا اس آیت کے حکم کے خلاف ہے اس لئے قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا درست نہیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا قسم کی خلاف ورزی نہ کرنا اولیٰ ہے لیکن اگر قسم توڑ دی تو کفارہ لازم ہو جائے گا۔ امام مالکؒ کے دونوں قول آئے ہیں اول بھی اور دوسرا بھی۔ اگر کسی امر مباح پر قسم کھائی (جس کا نہ کرنا کرنے سے بہتر نہ ہو) تو اس کا حکم بھی مذکور کی طرح ہے۔

اگر کوئی گناہ کرنے پر قسم کھائے تو قسم توڑنا اور کفارہ دینا واجب ہے کیونکہ قسم توڑنے کا گناہ تو کفارہ دے کر دور ہو سکتا ہے اور اگر گناہ کرلیا تو اس کے اتار کی کوئی شکل نہیں۔

اگر امر مستحب کو ترک کرنے کی قسم کھالی تو قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا اولیٰ ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ یعنی اپنی قسموں کو نیکیوں سے مانع اور رکاوٹ نہ بناؤ۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا تھا میں قسم کھالیتا ہوں کہ بعض لوگوں کو کچھ نہیں دوں گا پھر میری رائے دینے کی ہو جاتی

ہے تو (دے دیتا ہوں اور کفارہ میں) دس مسکینوں کو (ایک) ایک صاع جو یا چھوارے یا (آدھا) آدھا صاع گیہوں دیدیتا ہوں۔
حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ قسم کھا کر کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتے تھے آخر جب آیت کفارہ نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا میں اللہ کی عطا کی ہوئی اجازت قبول کرتا ہوں۔ اب اگر کبھی قسم کھاؤں گا اور کوئی بات قسم کے خلاف مجھے بہتر نظر آئی تو وہ کروں گا جو بہتر ہوگا۔ رواہ ابن ابی شیبۃ و عبد الرزاق والبخاری وابن مردویہ۔

فصل

نذر (منت) ماننا

اگر کسی ایسی شرط سے مشروط کر کے نذر مانی جس کے ہو جانے کی دلی خواہش ہو تو باجماع علماء غیر مشروط نذر کی طرح پورا کرنا ضروری ہے، مثلاً یوں کہا کہ اگر بیمار اچھا ہو گیا تو ایک روزہ رکھوں گا (ظاہر ہے کہ بیمار کے شفا پانے کی تمنا موجود ہے، اس لئے اگر بیمار شفایاب ہو جائے گا تو ایک روزہ رکھنا واجب ہوگا) اور اگر ایسی شرط کے ساتھ مشروط کیا جس کے نہ ہونے کی خواہش ہے۔ مثلاً یوں کہا کہ اگر میں نے یہ کام کیا تو مجھ پر حج لازم ہے۔ امام صاحبؒ کے نزدیک اس صورت میں بھی وقوع شرط کے بعد وفاء نذر واجب ہوگی۔ امام صاحبؒ کا دوسرا قول جو صحیح ترین روایت سے ثابت ہے یہ ہے کہ (بغیر نذر پوری کئے) کفارہ ادا کرنا کافی ہے۔ امام محمد اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔ اس صورت میں نذر پوری کرے یا کفارہ ادا کرے دونوں میں سے جو صورت چاہے اختیار کرے۔ دوسری روایت میں امام احمد کا قول آیا ہے کہ صرف کفارہ دینا ضروری ہے۔
امام شافعیؒ کا قول مؤخر الذکر دونوں روایات کی طرح ہے۔ امام مالک نے فرمایا اگر مالی خیرات کرنے کی نذر مانی ہے تو ایک تہائی مال خیرات کرنا واجب ہے اور اگر مالی صدقہ کی نذر نہ ہو تو وفاء نذر ضروری ہے کیونکہ روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابولبابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا، میری توبہ (کے تکمیلی اجزاء) میں سے یہ بھی ہے کہ اپنی قوم کی جس بستی میں مجھ سے گناہ کا صدور ہوا ہے اس کو چھوڑ دوں اور اپنے (کل) مال سے کنارہ کش ہو جاؤں، میرا کل مال خیرات ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تیری طرف سے ایک تہائی مال (کی خیرات) کافی ہے۔ رہا کفارہ کا جواز تو اس کا ثبوت حضرت عقبہؓ بن عامر کی روایت سے ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے، رواہ مسلم۔
حضرت عمرانؓ بن حصین کی روایت ہے کہ غضب کی حالت میں نذر نہیں۔ ایسی نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ رواہ احمد والنسائی۔
مسئلہ :- اگر ایسی نذر مانی جس کو پورا کرنا ممکن نہیں خواہ اس وجہ سے کہ اس کو پورا کرنے کی طاقت نہیں۔ جیسے پیادہ حج کرنے کی نذر یا ہمیشہ روزے رکھنے کی نذر۔ یا اس وجہ سے کہ نذر کو پورا کرنے سے گناہ لازم آتا ہے (جیسے اقرباء سے سلوک نہ کرنے کی نذر یا رمضان کا روزہ نہ رکھنے کی نذر) تو قسم کے کفارہ کی طرح کفارہ ادا کردے۔ کیونکہ نذر کا معنی ہے کسی بات کو اپنے اوپر فرض کر لینا اور کسی بات کو فرض کر لینے کا معنی ہے اس بات کی ضد کو اپنے لئے حرام کر لینا اور کسی چیز کو حرام کر لینا قسم ہے۔ عربی میں نذر کے موقع پر جو لام لفظ اللہ پر آتا ہے (مثلاً لِلّٰهِ عَلَىَّ صَوْمٌ) تو وہ لام مفید قسم ہوتا ہے جیسے لعمرک میں لام قسمیہ ہے حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے لانذر فی معصیۃ گناہ کی نذر (نذر) نہیں اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ رواہ احمد و ابوداؤد والترمذی والنسائی۔ نسائی نے عمرانؓ بن حصین کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث لکھی ہے۔
حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے نذر غیر معین مانی اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اور جس نے گناہ کی نذر مانی اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے اور جس نے ایسی نذر مانی جس کو پورا کرنے کی طاقت نہیں تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہے اور جس نے قابل برداشت نذر مانی تو اس کو ضرور پورا کرے۔ رواہ ابوداؤد وابن ماجہ۔ بعض علماء نے اس کو حضرت ابن عباسؓ کا قول قرار دیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مالکؓ کی روایت ہے کہ عقبہ بن عامر کی بہن نے برہنہ پا برہنہ سر

ہونے کی حالت میں پیدل چل کر) حج کرنے کی نذر مانی تھی۔ عقبہؓ نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس کو حکم دیدو کہ سر ڈھانک لے اور سوار ہو جائے اور تین روزے رکھ لے۔ رواہ اصحاب السنن الاربعہ والدارمی۔

مسئلہ:۔ جس نے قسم کیساتھ انشاء اللہ کہہ دیا تو قسم منعقد نہیں ہوگی اگر قسم کیخلاف کریگا تو قسم شکنی نہ ہوگی، حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قسم کھائی اور انشاء اللہ بھی کہہ دیا تو اس پر قسم شکنی عائد نہیں ہوتی، رواہ اصحاب السنن الاربعتہ والدارمی۔ ترمذی نے لکھا ہے کہ ایک جماعت نے اس کو حضرت ابن عمر کا قول قرار دیا ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ (یونہی تمہارے لئے اللہ تعالیٰ اپنی آیات یعنی شریعت کے بیانات کھولتا ہے)

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾ (تاکہ تم اس نعمت تعلیم کا شکر ادا کرو) یا اس نعمت کا شکر ادا کرو کہ واجب کو ادا کرنے اور فارغ الذمہ ہونے اور اللہ کی مرضی حاصل کرنے اور درجات قرب پر فائز ہونے کی تم کو توفیق نصیب ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ (اے اہل ایمان شراب اور جوا) (اور انصاب وازلام گندگی ہیں) خمر و میسر کی تفسیر اور حکم سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔[1]

وَالْاَنْصَابُ (اور پوجا کے بت)۔

وَالْاَزْلَامُ (اور جوئے کے تیر) ازلام کی تفسیر شروع سورت میں گزر چکی ہے۔

رِجْسٌ (گندگی جس سے سلیم دانش اور صحیح طبیعتوں والے نفرت کرتے ہیں)۔

---

[1] ترمذی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے دعا کی اے اللہ شراب کے متعلق ہمارے لئے کوئی تسکین بخش بیان نازل فرما۔ اس پر سورۂ بقرہ والی آیت يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ الخ نازل ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی اے اللہ شراب کے متعلق ہمارے لئے کوئی تسلی بخش حکم نازل فرمادے۔ اس پر سورۃ النساء والی آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى نازل ہوئی۔ حضرت عمرؓ کو بلوا کر یہ آیت سنائی گئی۔ آپؓ نے پھر دعا کی الٰہی شراب کے متعلق کھول کر ہمارے لئے کوئی بیان شافی نازل فرمادے۔ تو سورۃ المائدہ والی آیت اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ ...... فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ تک شراب اور قمار کے متعلق نازل ہوئی۔ اور حضرت عمرؓ کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہم باز آئے۔ ہم باز آئے (یعنی شراب اور قمار سے باز آئے)۔

عبد الرحمٰنؒ بن حارث کا بیان ہے میں نے حضرت عثمانؓ بن عفان کو فرماتے سنا شراب سے بچو، یہ تمام بری باتوں کی جڑ ہے۔ پچھلے زمانہ میں ایک عابد تھا ایک بدچلن عورت اس پر شیفتہ ہو گئی جس نے عابد کو بلانے کے لئے اپنی باندی کو بھیجا۔ باندی نے آکر عابد سے کہا ہم گواہی کے لئے آپ کو بلانے آئے ہیں۔ عابد باندی کے ساتھ چل دیا (باندی ایک محل سرائے کے دروازے میں داخل ہوئی اور ایک دروازہ کے بعد دوسرے دروازے میں اور دوسرے کے بعد تیسرے میں داخل ہوتی چلی گئی) جس دروازہ سے آگے بڑھتی تھی اس کو بند کرتی چلی جاتی تھی آخر ایک گورے رنگ کی عورت کے سامنے پہنچ گئی عورت کے پاس ایک بچہ تھا اور شراب رکھی ہوئی تھی عابد سے کہنے لگی میں نے تم کو گواہی کے لئے نہیں بلوایا بلکہ تم کو تین کاموں میں سے ایک کام کرنا ہوگا یا تو مجھ سے قربت کرو یا شراب پیو یا اس بچہ کو قتل کرو۔ عابد نے کہا (جب کوئی صورت نجات کی نہیں) تو مجھے شراب پلادے۔ عورت نے ایک جام پلادیا۔ عابد نے جام پی کر کہا اب ذرا توقف کرو جب کچھ دیر میں نشہ چڑھا تو اس نے عورت سے قربت بھی کی اور بچہ کو بھی قتل کر دیا۔ للذا تم لوگ شراب سے پرہیز رکھو۔ بخدا، ایمان اور شراب خواری کی عادت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔ ایک کے آنے سے دوسرے کا نکل جانا ضروری ہے، رواہ النسائی۔

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں شرابیوں کو ہاتھوں، جوتوں اور لاٹھیوں سے پیٹا جاتا تھا۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے شرابیوں کی سزا مقرر کرنی چاہی اور عہد رسالت کی سزا کو دیکھ کر چالیس کوڑوں کی سزا مقرر کی اور چالیس کوڑے مارنے لگے۔ حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ نے اس کو کوڑوں کی سزا دینے کا حکم دیا تو اس نے کہا آپ میرے کس طرح کوڑے مار سکتے ہیں۔ میرا آپ کا فیصلہ کتاب اللہ سے ہونا چاہئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کوڑے نہ مارنے کا حکم کس کتاب میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ (شیطانی عمل (کا نتیجہ) ہیں) یعنی شیطان کے بہکاوے اور فریب کاری (کا نتیجہ) ہیں تو گویا شیطانی عمل ہیں۔

فَاجۡتَنِبُوۡهُ (پس اس گندگی سے بچو)

لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ۝۹۰ (تاکہ (اس اجتناب کی وجہ سے) تم کامیاب ہو جاؤ)۔ اللہ نے بڑے پرزور طریقہ سے اس آیت میں شراب اور جوئے کی ممانعت فرمائی ہے۔ جملہ کا آغاز لفظ اِنَّمَا سے کیا گیا (جو کلمہ حصر ہے) انصاب وازلام) کے ساتھ ملا کر خمر و میسر کا ذکر کیا۔ خمر و میسر کو گندگی فرمایا، عمل شیطانی قرار دیا گویا اس امر پر تنبیہ کی کہ یہ دونوں چیزیں خالص شر یا بیشتر شر ہیں۔ دونوں سے بالکل الگ رہنے کا حکم دیا۔ ان سے اجتناب کو امید گاہِ فلاح قرار دیا۔ پھر آخر میں ان دینی اور دنیوی خرابیوں کا ذکر کیا۔ جو شراب اور جوے سے وابستہ ہیں فرمایا۔

اِنَّمَا يُرِيۡدُ الشَّيۡطٰنُ اَنۡ يُّوۡقِعَ بَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةَ وَالۡبَغۡضَآءَ فِى الۡخَمۡرِ وَالۡمَيۡسِرِ (شیطان تو بس یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے آپس میں دشمنی اور بغض ڈلوادے)۔ جیسے اس انصاری نے کیا تھا جس نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی سے حضرت سعدؓ بن وقاص کا سر زخمی کر دیا تھا۔ یہ قصہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

قتادہ نے کہا بعض لوگ مال و عیال کو داؤ پر لگا دیتے تھے پھر ہار جاتے تھے تو پریشان و غمگین ہو کر جیتنے والوں پر غصہ کرتے (اور ان کے دشمن ہو جاتے) تھے۔ دوبارہ شراب و قمار اور ان کی خرابیوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے سے اس امر پر تنبیہ ہو رہی ہے کہ آیت میں انصاب وازلام کا ذکر تو ذیلی طور پر کر دیا گیا ہے، اصل مقصد شراب اور جوئے کا بیان ہے۔ انصاب وازلاء کا ذیلی ذکر کر کے یہ بتانا غرض ہے کہ ان کی حرمت بھی شراب و قمار کی طرح ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ شراب پینے والا بت پرست کی طرح ہے۔ رواہ البزاز من حدیث عبداللہ بن عمرو بن عاص۔ ابن ماجہ کی روایت میں شراب خور کی جگہ، شراب کا دوامی خوگر کا لفظ آیا ہے۔ حارث کی روایت میں ہے، شراب خور لات و عزیٰ کے پجاری کی طرح ہے۔

وَيَصُدَّكُمۡ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ‌ۚ (اور (شراب و قمار میں مبتلا کر کے) شیطان تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے روکتا ہے جب آدمی شراب پینے اور جوا کھیلنے میں منہمک ہوتا ہے تو شیطان اس کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیتا ہے اور نماز کو ابتر بنا دیتا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف کے مہمانوں کا ایسا ہی واقعہ ہوا تھا۔ سب نے شراب پی اور شراب پی کر نماز پڑھنے کھڑے ہوئے اور ایک شخص کو امام بنایا، امام نے قُلۡ يٰۤاَيُّهَا الۡكٰفِرُوۡنَ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ پڑھ دیا۔ یہ قصہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ صلوۃ کا ذکر نماز کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے کیا کیونکہ نماز ہی اہل ایمان کا شعار اور دین کا ستون ہے۔ نماز سے روکنے والا ایمان سے روکنے والے کی طرح ہے۔ مؤمن و کافر میں ظاہری امتیاز پیدا کرنے والی نماز ہی ہے اللہ نے نماز کی تعبیر لفظ ایمان سے کی ہے فرمایا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيۡعَ اِيۡمَانَكُمۡ اللہ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یعنی (حرمت

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) لکھا ہے۔ مہاجر نے کہا اللہ فرماتا ہے لَيۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيۡمَا طَعِمُوۡۤا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوۡا الخ (نیکو کار مؤمن تقویٰ اور ایمان کے بعد جو کچھ کھائیں کوئی گناہ نہیں) اور میں اس آیت کا مصداق ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب بدر، احد، خندق اور دوسرے جہادوں میں حاضر رہا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تم لوگ اس کی بات کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے میں نے کہا یہ آیات گزشتہ لوگوں کے لئے دلیل بن سکتی ہیں کیونکہ شراب کی حرمت سے پہلے وہ اللہ سے جا ملے لیکن جو لوگ باقی رہ گئے ان کے لئے ان آیات کے اندر کوئی وجہ عذر نہیں کیونکہ اللہ فرماتا ہے اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَيۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ ...... ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحۡسَنُوۡا۔ اب اللہ نے ان آیات میں شراب پینے کی ممانعت فرما دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تو آپ لوگوں کی کیا رائے ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اسی کوڑے مارے جائیں کیونکہ اس نے شراب پی تو اس کو نشہ چڑھا اور نشہ چڑھا تو اس نے بیہودہ بکواس کی اور بکواس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اللہ پر دروغ بندی کی اور دروغ بندی کرنے والے کی سزا اسی ۸۰ کوڑے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے حکم سے اس کے اسی کوڑے لگوائے گئے۔ رواہ ابوالشیخ ابن مردویہ والحاکم حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

شراب سے پہلے کی) نماز کو اکارت کردے۔
حضرت جابر کی روایت سے مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ (مومن) بندے اور کافر کے درمیان ترک صلوٰۃ کا فرق ہے۔ حضرت عبداللہ بن بریدہ کی روایت سے امام احمد نے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے اس روایت میں ہے جس نے نماز کو چھوڑا وہ کافر ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی راویت سے احمدؒ نے بیان کیا ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے نماز کے تذکرہ کے ذیل میں فرمایا جس نے اس کی پابندی کی تو قیامت کے دن نماز اس کیلئے نور اور برہان اور نجات بن جائے گی اور جس نے پابندی نہیں کی نہ اس کیلئے نور ہو گی نہ نجات اور قیامت کے دن وہ قارون، فرعون، ہامان اور ابیّ بن خلف کا ساتھی ہو گا۔
فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ﴿٩١﴾ (سواب بھی باز آجاؤ گے)۔ اس آیت میں بہت ہی بلیغ انداز میں بصورت استفہام باز رہنے پر ابھار آگیا ہے۔ گویا یوں کہا گیا کہ مذکورہ بالا مفاسد خمر و میسر سننے کے بعد کیا اب تم ان سے باز رہو گے یا سنی ان سنی کردو گے اور باز نہ آؤ گے۔
وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ یعنی شراب جوا اور تمام ممنوعات سے پرہیز اور واجبات کی ادائیگی کے معاملہ میں (اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کا حکم مانو)۔
وَاحْذَرُوا (اور (خدا اور رسول کی نافرمانی سے) ڈرو)۔
فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ (اب اگر تم نے (اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت سے) روگردانی کی)۔
فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ﴿٩٢﴾ (تو سمجھ لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچانے کی ذمہ داری ہے) (ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے) تمہاری نافرمانی سے ہمارے پیغمبر کا کچھ نقصان نہ ہو گا تم کو ہی ضرر پہنچے گا۔
حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے جو بندہ دنیا میں اس کو پئے گا اللہ کا قطعی فیصلہ ہے کہ (قیامت کے دن) اس کو طینۃ الخبال پلائے گا۔ تم جانتے بھی ہو طینۃ الخبال کیا چیز ہو گی، دوزخیوں کا پسینہ، (رواہ البغوی)، حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں شراب پی پھر توبہ نہیں کی (یونہی مر گیا) اللہ اس کو آخرت کی شراب سے محروم کردے گا۔ رواہ البغوی۔
حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اللہ کی لعنت شراب پر، شراب پینے والے پر، پلانے والے پر، بیچنے والے پر، خریدنے والے پر، نچوڑنے والا پر، بنوانے والے، اٹھانے والے پر، اور اس پر جس کے لئے اٹھا کر لی جاتی ہو اور شراب کی قیمت کھانے والے پر، (رواہ ابن ماجہ) ابوداؤد کی روایت میں شراب کی قیمت کھانے والے کا ذکر نہیں ہے اس مبحث کی روایت حضرت انسؓ بن مالک سے بھی آئی ہے۔
ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اور حاکم نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے اس مبحث کی احادیث بیان کی ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے شراب پی اللہ اس کی چالیس صبح تک نماز قبول نہیں فرماتا اس کے بعد اگر وہ توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ پھر دوبارہ اگر وہ شرابخوری کرتا ہے تو چالیس صبح (چالیس دن) تک نماز قبول نہیں فرماتا ہے اس کے بعد اگر توبہ کرلیتا ہے تو اللہ توبہ قبول فرمالیتا ہے۔ پھر (تیسری بار) اگر لوٹ کر پہلی حرکت کرتا ہے تو چالیس دن کی نماز قبول نہیں فرماتا لیکن اگر پھر توبہ کرلیتا ہے تو توبہ قبول فرمالیتا ہے۔ چوتھی مرتبہ میں چالیس دن کی نماز قبول نہیں فرماتا اور اگر توبہ کرتا ہے تو توبہ بھی قبول نہیں کرتا اور نہر خبال (کا پانی) اس کو پلائے گا۔ رواہ الترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے۔
حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں نہیں جائے گا ماں باپ کا نافرمان، نہ جواری نہ دائمی شراب خور، رواہ الدارمی۔ حضرت ابوامامہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے مجھے جہان کیلئے رحمت اور ہدایت بنا کر بھیجا ہے میرے رب نے مجھے ساز باجے، بت، صلیب اور امور جاہلیت کو مٹانے کا حکم دیا ہے اور میرے رب نے قسم کھا کر فرمایا ہے

قسم ہے اپنی عزت کی کہ جو بندہ ایک گھونٹ شراب کا پئے گا میں اتنا ہی اس کو کچ لہو پلاؤں گا اور جو بندہ میرے خوف سے شراب چھوڑ دیگا۔ میں اس کو قدس کے حوضوں سے (شربت) پلاؤں گا، (رواہ احمد) حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخص ہیں جن پر اللہ نے جنت حرام کردی ہے۔ دائمی شراب خور، ماں باپ کا نافرمان اور بھاڑو، رواہ احمد والنسائی۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت میں آیا ہے دائمی شراب خور اور رشتہ داری کاٹنے والا اور جادو کی تصدیق کرنے والا۔ (رواہ احمد) سورۂ بقرہ میں امام احمد کے حوالہ سے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہم نے نقل کردی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو لوگ شراب پیا کرتے تھے۔ (الحدیث) اس حدیث کے آخر میں ہے پھر اس سے بھی زیادہ سخت آیت نازل ہوئی فرمایا یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ...... فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ تک۔ یہ حکم سن کر صحابہؓ نے کہا۔ اے ہمارے رب ہم باز آئے۔ بعض لوگ کہنے لگے کہ کچھ لوگ شراب پیتے اور جوئے کی کمائی کھایا کرتے تھے پھر وہ اللہ کی راہ میں مارے گئے یا اپنے بستر پر مرگئے (ان کا کیا ہوگا) اللہ نے تو شراب اور جوئے کو گندگی اور عمل شیطان قرار دیا ہے اس پر آیت لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ نازل ہوئی۔

نسائی اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ انصار کے دو قبیلوں کے معاملہ میں شراب کی حرمت ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے شراب پی تھی اور نشہ میں مست ہوکر آپس میں گتھم گتھا کی تھی جب نشہ اترا تو چہروں، سروں اور داڑھیوں کی حالت غیر دیکھ کر کہنے لگے یہ حرکت فلاں بھائی کی ہے اگر اس کو میرا پاس لحاظ ہوتا تو ایسی حرکت نہ کرتا۔ یہ انصاری سب بھائی بھائی تھے کسی کے دل میں کسی کی طرف سے کینہ نہ تھا۔ لیکن اس شرابخوری سے ان کے دلوں میں کینے پڑگئے۔ اس پر آیت یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ الخ نازل ہوئی۔ اس پر کچھ لوگ کہنے لگے یہ تو گندگی ہے مگر فلاں شخص کے پیٹ میں تھی جب کہ احد کی لڑائی میں وہ مارا گیا (اس کا کیا ہوگا) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْۤا (جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے تو جو شراب انہوں نے (حرمت سے پہلے) پی لی اور جو جوئے کا مال (حرمت سے پہلے) کھالیا اس کا کوئی گناہ ان پر نہیں ہے)۔

اِذَا مَا اتَّقَوْا (جب کہ وہ شرک سے بچ گئے)

وَّاٰمَنُوْا (اور انہوں نے اللہ کو مان لیا)۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (اور (ایمان کے بعد) نیک کام کئے)۔

ثُمَّ اتَّقَوْا (پھر (شراب اور جوئے کی حرمت کے بعد دونوں سے) بچے رہے)۔

وَّاٰمَنُوْا (اور (دونوں کی حرمت کو) مان لیا)۔

ثُمَّ اتَّقَوْا (پھر (تمام ممنوعات سے) بچے رہے)۔ یا اول بچنے سے مراد ہے شرک سے بچا رہنا اور دوسرے تقویٰ سے مراد ہے ممنوعات سے بچنا اور تیسرے تقویٰ سے مراد سے شبہ کی چیزوں سے بچا رہنا۔

وَّاَحْسَنُوْا (اور (لوگوں سے) بھلائی کی) یا یہ مراد ہے کہ انہوں نے اپنے اعمال خوبی سے ادا کئے رب کی عبادت کے وقت ایسا محسوس کرتے رہے کہ گویا اپنے رب کو دیکھ رہے ہیں۔ [1]

وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۹۳﴾ (اور اللہ بھلائی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے)، ان کی پکڑ کسی بات پر نہیں کرے گا۔ اس آیت میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ جو مذکورہ صفات کا حامل ہوگا وہ محسن ہوگا اور جو محسن ہوجائے گا وہ اللہ کا محبوب ہوجائے گا۔ ع ۱۲

[1] صحیح بخاری وغیرہ میں آتا ہے کہ جبرئیلؑ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا احسان (عبادت کی خوبی) کیا ہے حضور ﷺ نے فرمایا اپنے رب کی اس طرح عبادت کرنا کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اگر یہ نہ ہو تو (کم سے کم اتنا یقین رکھنا کہ) وہ تم کو دیکھ رہا ہے، حضرت مفسرؒ کی آخری تفسیر کی بنا اسی حدیث پر ہے۔

ماہ ذیقعدہ ۶ ھجری میں حدیبیہ کے سال مسلمان عمرہ کا احرام باندھے ہوئے (اور حضور اقدس ﷺ) کے ہم رکاب مقام حدیبیہ کی طرف جارہے تھے) اس وقت آیت ذیل نازل ہوئی۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ (اے ایمان والو اللہ کچھ شکار (بھیج کر اس) سے تمہاری ضرور آزمائش کرے گا)۔ شَیْئٍ (میں تنوین تحقیر کے لئے ہے اس) سے مراد ہے حقیر چیز جو ایسی بڑی نہیں کہ پاؤں ڈگمگا جائیں، نہ جان خرچ کرنے کا امتحان ہے، نہ مال دینے کا۔ مِنَ الصَّیْدِ، شَیْئٍ کی صفت ہے۔

تَنَالُهٗۤ اَیْدِیْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ (جن تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکیں گے)۔ یہ جملہ شَیْئٍ کی دوسری صفت ہے (اس پیشین گوئی کے مطابق) جنگلی شکار لوگوں کے پڑاؤ اور فرودگاہوں کے اندر گھس آتا تھا اور اتنا قریب آجاتا تھا کہ لوگ اس کو ہاتھوں سے پکڑ سکتے تھے اور برچھے سے بھی شکار کر سکتے تھے۔[۱]

لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّخَافُهٗ بِالْغَیْبِ (تاکہ اللہ معلوم کرے کہ کون شخص اس سے بن دیکھے ڈرتا ہے لِیَعْلَمَ کا تعلق یَبْلُوَ سے ہے کیونکہ امتحان کی مراد ہی یہ ہے کہ اللہ کے بن دیکھے عذاب سے ڈرنے والوں کو نہ ڈرنے والوں سے الگ کر دیا جائے اس صورت میں علم سے مراد ہوگا معلوم کا وقوع یا ظہور یا یَعْلَمَ کا یہ مطلب ہے کہ وقوع خوف کے بعد اللہ ڈرنے والے کے خوف کو اسی طرح جان لے جس طرح وقوع سے پہلے جانتا تھا (کسی واقعہ کے ظہور سے پہلے بھی اللہ کو اس واقعہ کا پورا پورا علم ہوتا ہے۔ اس علم کو اجمالی کہتے ہیں۔ جو اللہ کی صفت کمالیہ اور قدیم ہے اور واقعہ کے ظہور و وجود کے بعد بھی اللہ کو اس واقعہ کا پورا پورا علم ہو جاتا ہے یہ علم تفصیلی کہلاتا ہے اور یہ صفت کمالیہ نہیں ہے نہ یہ قدیم ہے بلکہ واقعہ کے ظہور پر موقوف ہے اور وجود واقعہ کے بعد ہوتا ہے آیت میں یہ ہی علم مراد ہے۔ حضرت مفسر کی تفسیر کا یہی مطلب ہے اللہ کے علم اجمالی پر عذاب و ثواب مرتب نہیں ہوتا۔ ظہور واقعہ سے پہلے عذاب ظلم ہے ہاں علم تفصیلی چونکہ بعد از وجود فعل ہوتا ہے اس لئے ثواب و عذاب کا اسی پر مدار ہے) بِالْغَیْبِ کا مطلب دو طرح سے ہوتا ہے ایک یہ کہ بن دیکھے خدا سے کون ڈرتا ہے، دوسرا یہ کہ عذاب کے سامنے آنے اور دیکھنے سے پہلے اس سے کون ڈرتا ہے۔

اللہ نے آئندہ امتحان کی پہلے سے اطلاع مؤمنوں کی اعانت کے طور پر دیدی تاکہ نافرمانی سے کامل طور پر بچتے رہیں۔

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ (اس (امتحان یا اطلاع) کے بعد جو شخص زیادتی کرے گا) یعنی شکار کرلے گا۔

فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۹۴﴾ (اس کو (خصوصیت کے ساتھ) دردناک عذاب ہوگا) کیونکہ حقیر چیز سے جب وہ اپنے نفس کو نہ روک سکا اور اللہ کے حکم کا اس نے پاس لحاظ نہیں کیا تو ایسی چیزوں سے اپنے کو کیسے روک سکے گا۔ جن کی طرف طبعی میلان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ (آیت مذکورہ کے نزول کے بعد) ایک شخص نے جس کو ابوالیسر کہا جاتا تھا (احرام کی حالت میں) ایک گورخر پر حملہ کر کے قتل کر دیا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ط (اے مسلمانو! بحالت احرام شکار کو نہ مارو، یعنی اس حیوان کو قتل نہ کرو جو اصل خلقت کے لحاظ سے جنگلی اور محفوظ القتل ہو۔ خواہ اس کا گوشت کھایا جاتا ہو یا نہ کھایا جاتا ہو۔ کذا فی القاموس۔ امام ابوحنیفہؒ نے صید کی یہی تعریف کی ہے اور یہی مراد لی ہے لیکن ان جانوروں کو حکم سے الگ قرار دیا ہے جن کے قتل کا جواز احادیث میں آگیا ہے یعنی سانپ، بچھو، چوہا، چیل، کوا، اور لاگو درندہ۔ جو لاگو نہ ہو اس کو قتل کرنا جائز نہیں۔ اسی بنا پر کتے کو خصوصاً کٹ کھنے کتے کو قتل کرنا جائز قرار دیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ہر کتا شکار ہے (یعنی اصل خلقت کے اعتبار سے جنگلی ہے) کتے کا پالتو بن جانا عارضی ہے (سکھانے سے پالتو بن جاتا ہے) کچھ لوگ کہتے ہیں کتا طبعاً جنگلی نہیں ہے اس لئے اس کو

---

[۱] ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حبان کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول عمرہ حدیبیہ میں ہوا، جنگلی چوپائے اور پرندے اتنی کثرت سے لوگوں کی فرودگاہوں میں گھس آئے تھے جس کی نظیر کبھی پہلے دیکھنے میں نہیں آئی لیکن لوگ احرام باندھے ہوئے تھے اللہ نے ان کو شکار کرنے سے منع کر دیا تھا اور امتحان لیا تھا کہ کون اندرونی طور پر اللہ کے حکم کی مخالفت سے ڈرتا ہے۔

شکار نہیں قرار دیا جا سکتا۔
صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا محرم کن جانوروں کو قتل کر سکتا ہے فرمایا ان (مندرجہ ذیل) جانوروں کو (بحالت احرام) قتل کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ بچھو، چوہا، کوا، چیل، کٹ کھنا کتا۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت میں بھی انہی پانچ کا ذکر ہے۔ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ کلب سے مراد درندہ ہے۔ کلب کا اطلاق عام درندہ پر ہوتا ہے۔ عتبہ بن ابی لہب کے قصہ میں رسول اللہ ﷺ نے دعا کی تھی الٰہی اپنے کتوں میں سے کسی کتے کو (یعنی کسی درندہ کو) اس پر مسلط فرمادے (چنانچہ عتبہ کو شیر نے پھاڑ کھایا) اللہ نے فرمایا ہے مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ۔
امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا اگر لغتہً لفظ کلب کا اطلاق ہر درندہ پر تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی عرفاً اس لفظ کا غالب استعمال صرف کتے ہی کے لئے ہوتا ہے اور حدیث مذکورہ بالا (یعنی جس حدیث میں پانچ جانوروں کو قتل کرنے کی اجازت ہے) کو عرف عام پر محمول کرنا اولیٰ ہے (لہٰذا کلب سے مراد کتا ہی ہے ہر درندہ مراد نہیں ہے) ابو عوانہ نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے چھ جانوروں کا ذکر کیا ہے۔ سانپ کا ذکر مزید ہے۔ یہ روایت بطریق بخاری ہے۔ ابو داؤد نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی راویت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا محرم سانپ کو، بچھو کو، چوہے کو، کٹ کھنے کتے کو، چیل کو اور عادی درندہ کو قتل کر سکتا ہے۔ کوے کو قتل نہ کرے کوئی اینٹ پتھر اس پر پھینک سکتا ہے۔ ترمذی نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے مگر اس روایت میں عادی درندہ کا ذکر نہیں ہے۔
حسن نے کہا جس کوے کو قتل کرنے کی ممانعت ہے اس سے مراد کھیتی کا کوا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن المنذر نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے جو حدیث نقل کی ہے اس میں سات جانوروں کا ذکر ہے۔ پانچ وہی مشہور اور دو مزید یعنی بھیڑیا اور چیتا کہا ہے۔ سعید بن مسیب کی مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا محرم سانپ اور بھیڑیے کو قتل کر دے۔ یہ روایت ابن ابی شیبہ اور سعید بن منصور اور ابو داؤد نے نقل کی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ مسلم نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے صرف چار کا ذکر کیا ہے مشہور پانچ میں سے بچھو کا ذکر ساقط کر دیا ہے۔

ایک شبہ

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حدیث احاد سے حکم قرآن کی تخصیص جائز نہیں (یعنی اگر حکم قرآن عام ہوگا اور حدیث نے اس میں کچھ تخصیص کی ہوگی تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تخصیص نہیں ہوگی) پھر اس جگہ قرآن میں لفظ صید عام ہے حدیث احاد سے اس کی تخصیص کس طرح جائز ہوگئی۔

جواب

اس حدیث کو تمام علمائے امت نے صحیح مانا اور قبول کیا ہے اس لئے اس کا مرتبہ حدیث مشہور کی طرح ہو گیا اور حدیث مشہور سے تخصیص قرآن جائز ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ باجماع صحابہ یہ بات تو ثابت ہے کہ بعض قسم کے شکار محرم قتل کر سکتا ہے گویا قرآن مجید کا لفظ صید عام ہے مگر مخصوص بالبعض اور اس بعض مخصوص کی تعین احادیث سے ہوگئی۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک جس جانور کا گوشت کھانا حلال ہے اس کو محرم قتل نہیں کر سکتا اور جس جانور کا گوشت حلال نہیں اس کو قتل کر سکتا ہے، ممانعت صرف ماکول اللحم صید کو قتل کرنے کی ہے۔ کیونکہ احادیث میں کچھ جانوروں کی حکم حرمت سے تخصیص کی گئی ہے، جن میں سے کچھ تو شکاری درندے ہیں کچھ ہلاک کر دینے والے کیڑے مکوڑے ہیں، کچھ ایسے پرندے ہیں جو درندے اور شکاری نہیں ہیں (جیسے چیل، کوا) مگر گوشت ان کا بھی ناپاک (حرام) ہے۔ اس پر غور کرنے سے ہم کو معلوم ہوا کہ خبیث اللحم ہونا جواز صید کی علت ہے لہٰذا تخصیص بالحدیث کرنے کے بعد ہم نے علت قیاسیہ نکال کر قیاس سے حکم جواز انہی جانوروں پر محدود کر دیا جو خبیث اللحم ہیں (اور آیت کا حکم حرمت اس شکار پر محدود ہو گیا جو ماکول اللحم ہے)۔

میں کہتا ہوں خبثِ لحم کو جواز قتل کی علت قرار دینا ہی غلط ہے کیونکہ گوشت کی ناپاکی کی وجہ سے اباحت قتل کسی مصلحت پر مبنی نہیں ہو سکتی (گوشت کی ناپاکی یا پاکی محرم کے لئے شکار کا جواز یا عدم جواز نہیں پیدا کر سکتی) اس لئے قیاس ہی جائز نہیں ہے۔

میرے نزدیک قابل فتویٰ وہ قول ہے جس کو صاحب بدائع نے اختیار کیا ہے کہ صحرائی جانور کچھ ماکول ہوتے ہیں (یہ تو سب صید ہیں ان کو بحالت احرام شکار کرنا حرام ہے) اور کچھ غیر ماکول۔ غیر ماکول کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ انسان کو ابتدائی طور پر دکھ پہنچانے والے ہیں کچھ ایسے نہیں ہوتے ابتدائی دکھ پہنچانے والے، غیر ماکول جانوروں کو قتل کرنا جائز ہے جواز صید کی علت مرجحہ ابتدائی اذیت رسانی ہے (یعنی جو جانور عموماً ابتدائی طور پر اذیت رساں ہوتے ہیں ان کو بحالت احرام قتل کرنا درست ہے) ایک روایت میں امام ابو یوسفؒ کا بھی یہی قول آیا ہے کذافی فتاویٰ قاضی خاں۔

ایذاء کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں (۱) بدن میں زہر پہنچانا جیسے بچھو کرتا ہے، اس علت میں عقرب (بچھو) کے تحت تمام زہریلے جانور جو ڈنک مارتے اور ڈستے ہیں آ گئے۔ (۲) کترنا، سوراخ کرنا۔ جیسے چوہا کرتا ہے چوہے کے تحت اس علت کی وجہ سے نیولا آ گیا ہے۔ (۳) جھپٹا مارنا جیسے کوا اور چیل جھپٹا مار کر لے جاتے ہیں۔ اس علت کی وجہ سے شکرا باز، شاہین وغیرہ چیل کوے کے ذیل میں آ گئے۔ (۴) حملہ کر کے کاٹنا اس مناسبت سے کٹ کھنے کتے کے تحت ہر درندہ آ گیا۔ پالتو بلا چونکہ جنگلی جانور نہیں ہے اس لئے امام صاحبؒ کے نزدیک وہ صید میں داخل نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ پالتو بلا بھی اصلاً جنگلی جانور ہی ہے اس کا پالتو ہونا عارضی ہے اس کے برخلاف وہ چوپائے ہیں جو خلقۃً تو پالتو ہیں لیکن کبھی بھاگ کر جنگلی بن جاتے ہیں (جیسے کوئی گائے بھینس گھوڑا، بیل جنگلی بن جاتا ہے) اس کا شمار جنگلی جانوروں میں نہیں ہو سکتا۔

مسئلہ :- شکاری کو اشارہ سے شکار بتانا یا ایسی حرکت کرنا جس سے شکاری شکار کو دیکھ لے باجماع علماء قتل کے حکم میں ہے۔ شکار کا جانور جنگلی ہونے اور آنکھوں سے دور رہنے کی وجہ سے قتل ہونے سے محفوظ ہوتا ہے لیکن اشارہ کرنے والے کے اشارہ کی وجہ سے اس کا امن سے رہنا ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے اشارہ بھی قتل کا حکم رکھتا ہے۔ صحیحین کی حدیث ہے کہ سب صحابہؓ نے احرام باندھا ہوا تھا۔ حضرت ابو قتادہؓ محرم نہ تھے۔ اثناء سفر میں لوگوں نے ایک گورخر دیکھا اور ابو قتادہ نے حملہ کر کے اس کو قتل کر دیا اور ذبح کر کے اس کا گوشت لائے اور سب نے وہ گوشت کھایا۔ اس حدیث کے آخر میں ہے کہ صحابہؓ جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے دریافت فرمایا کیا تم میں سے کسی نے ابو قتادہ کو حملہ کرنے کیلئے کہا تھا یا گورخر کی طرف اشارہ کیا تھا، صحابہؓ نے عرض کیا جی نہیں۔ فرمایا تو جو گوشت باقی رہ گیا ہے اس کو (بھی) کھا سکتے ہو۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے کھانے کے جواز کے لئے اشارہ نہ کرنے کی شرط لگائی (جس سے معلوم ہوا کہ محرم کے لئے شکار کی طرف اس طرح اشارہ کرنا کہ غیر محرم کو معلوم ہو جائے اور وہ شکار کر لے جائز نہیں ہے)۔

مسئلہ :- پرندہ کے انڈوں کا حکم بھی شکار کا ہے۔ داؤد ظاہری کے نزدیک انڈوں کو توڑنے کا کچھ ضمان نہیں۔ اب آگے حدیث اور اقوال صحابہؓ کا ذکر کریں گے جن سے ثابت ہو رہا ہے کہ انڈوں کو توڑنے کا محرم پر ضمان ہے۔

مسئلہ :- محرم نے اگر شکار کیا یا ذبح کیا تو جمہور کے نزدیک وہ مردار ہے اس کا کھانا نہ احرام والے کو جائز ہے نہ غیر محرم کو۔

ثوریؒ اور ابو ثورؒ اور کچھ دوسرے علماء کے نزدیک اس کو کھانا جائز ہے وہ ایسا ہی ہے جیسے چور کسی چوری کے جانور کو ذبح کر دے۔ شافعیہ کا قول بھی یہی ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ محرم کا ذبح کرنا ہی گناہ ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی قصداً ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لے لہٰذا محرم کا ذبیحہ ایسا ہی ہوگا جیسے غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ۔ چور کی حالت اس سے غیر ہے چور اپنے لئے چوری کے جانور کو ذبح کرتا ہے۔ ذبح میں کوئی خرابی نہیں لیکن چونکہ اس جانور سے دوسرے شخص کے حق کا تعلق ہے اس لئے ذبیحہ صحیح ہونے کے باوجود حق غیر کا ضمان دینا پڑے گا اور اس طرح حق غیر کی تلافی ہو جائے گی۔

مسئلہ :۔ اگر غیر محرم نے شکار کیا مگر محرم نے اس کو شکار کرنے کو کہا تھا یا اشارہ کیا تھا یا اپنی کسی حرکت سے رہنمائی کی تھی تو محرم کے لئے اس کا کھانا حرام ہے۔ حضرت ابو قتادہؓ والی حدیث ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ لیکن غیر محرم کے لئے اس کو کھانا جمہور کے نزدیک حلال ہے۔

وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ (اور تم میں سے (یعنی احرام بند مسلمانوں میں سے) جس نے شکار کو قتل کر دیا)۔

مُّتَعَمِّدًا (جان بوجھ کر) سعید بن جبیر، داؤد، ابو ثور اور ابو منذر، شافعی کا قول ہے اور ایک روایت میں امام احمد کا بھی یہی قول آیا ہے کہ متعمداً کی شرط اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اگر غلطی سے یا اپنے احرام کو بھول کر یا کسی کے جبر کرنے سے یا اسی قسم کے کسی اور عذر کی وجہ سے محرم نے شکار کو قتل کر دیا تو مندرجۂ آیت ضمان اس پر واجب نہ ہوگا۔ مجاہد اور حسن کا قول ہے کہ مندرجۂ آیت ضمان اس وقت واجب ہوگا جب قتل قصداً جان بوجھ کر کیا ہو اور اپنے احرام کو بھولا ہوا ہو لیکن اگر احرام کی حالت بھی پیش نظر ہو اور جانتا ہو کہ میں محرم ہوں تو اس کا کوئی کفارہ نہیں۔ ضمان ادا کرنے سے جرم کی تلافی نہیں ہوگی ایسے آدمی کا معاملہ اللہ کے سپرد رہے گا (خواہ وہ آخرت میں عذاب دے یا رحمت سے معاف فرما دے)۔

جمہور علماء اور چاروں امام قائل ہیں کہ مندرجہ آیت پاداش بہر حال واجب ہے خواہ قصداً قتل کیا ہو یا اپنے احرام کو بھول کر قتل کیا ہو یا غلطی سے مارا ہو یا حرمت نہ معلوم ہونے کی حالت میں شکار کیا ہو یا کسی کے اکراہ سے ایسا کیا ہو۔

زہری نے کہا قصداً قتل کرنے والے پر پاداش کا وجوب قرآن سے ثابت ہے اور غلطی سے قتل کرنے والے پر وجوب حدیث میں موجود ہے اور مفہوم مخالفت حنفیہ کے نزدیک حجت نہیں ہے (یعنی مُتَعَمِّداً کے لفظ سے یہ مفہوم اخذ کرنا کہ جس نے قصداً نہ قتل کیا ہو اس پر پاداش واجب نہیں۔ حنفیہ کے نزدیک ناقابل تسلیم ہے) اور جو لوگ مفہوم مخالف کے قائل ہیں ان کے نزدیک بھی مفہوم مخالف ایک ظنی دلیل ہے اور حدیث کی صراحت (خواہ دلیل ظنی کی حیثیت رکھتی ہو مگر) مفہوم مخالف کی ظنیت سے زیادہ قوی ہے (اس لئے حدیث میں جو غلطی سے قتل کرنے والے کے لئے پاداش کو واجب قرار دیا ہے اسی پر عمل کیا جائے گا) پھر اجماع تو سب سے قوی دلیل ہے (اور مخطی یا ناسی کے قتل کو موجب جزا اجماع نے قرار دیا ہے) کیونکہ اجماع دلیل قطعی ہے (ظنی نہیں ہے)۔

ابن جوزی نے حضرت جابرؓ کی روایت کردہ حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بجو (کو قتل کرنے) کا مسئلہ دریافت کیا گیا۔ آپ نے فرمایا وہ شکار ہے اگر محرم بجو کو قتل کر دے تو حضور ﷺ نے اس کی پاداش میں ایک مینڈھے کی قربانی واجب قرار دی۔ (رواہ الترمذی) ترمذی نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے جو لوگ حکم جزاء کو مطلق قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک مُتَعَمِّداً کی قید (احترازی نہیں ہے بلکہ) آئندہ آیت وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ کی تمہید ہے۔

مسئلہ :۔ اگر کوئی شخص شکار کرنا چاہتا ہو اور کوئی محرم اس کو زبان سے یا ہاتھ کے اشارہ سے شکار بتا دے اور وہ قتل کر دے تو امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک بتانے والے محرم پر پاداش عائد ہوگی۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک بتانے والا گناہ گار ہوگا پاداش اس پر عائد نہ ہوگی جیسے کوئی شخص کسی روزہ دار کو کسی عورت کی طرف زبان یا اشارہ سے رہنمائی کرے اور روزہ دار اس سے جا کر جماع کر لے تو بتانے والے پر کفارہ نہیں پڑے گا نہ روزہ دار کے جماع کرنے سے بتانے والے کا روزہ ٹوٹے گا۔ ہاں بتانے والا گناہ گار ضرور ہوگا رہنمائی قتل نہیں ہے اور کفارہ قاتل پر عائد ہوتا ہے۔

ہم کہتے ہیں بتانا درحقیقت قتل ہی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اشارہ کو قتل کے مساوی قرار دیا ہے جیسا کہ ابو قتادہؓ والی حدیث سے ظاہر ہے پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر بتانے والے پر پاداش عائد نہیں کی جائے گی تو بتانے کا گناہ بتانے والے پر باقی رہے گا۔ کیونکہ بتانا باجماع امت ممنوع ہے اور قتل کا گناہ کفارہ سے دور ہو جاتا ہے اس صورت میں قتل سے زیادہ بتانے کا گناہ قرار پائے گا (جو بداہت کے خلاف ہے)۔

......ایک شبہ......

اگر بتانا قتل کے مساوی ہے تو بتانے کے بعد بتانے والے پر پاداش کا وجوب ہونا چاہئے خواہ بتانے کے بعد شکاری شکار کو قتل کرے یا نہ کرے۔

...... جواب ......

بتانا قتل کا سبب ہے جیسے تیر مارنا قتل کا سبب ہے لیکن صرف تیر مارنا موجب پاداش نہیں جب تک شکار مارا نہ جائے اسی طرح بتانے کے بعد اگر شکار قتل نہ کیا جائے تو موجب پاداش نہیں کیونکہ جب تک قتل نہ ہوگا نہ بتانے کو سبب قتل کہا جا سکتا ہے نہ تیر یا پتھر مارنے کو۔

فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ (تو اس پر پاداش واجب ہے برابر اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا ہے)۔ جَزَاءٌ پر فاء اس لئے لایا گیا کہ مبتدا معنی شرط کو مشتمل ہے یعنی اس پر پاداش واجب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قربانی کا جانور قیمت میں شکار کے برابر ہونا چاہئے (یعنی مثل معنوی مراد ہے) کیونکہ مطلق مثل تو وہی ہوتا ہے جو صورت اور حقیقت دونوں میں مثل ہو یعنی قربانی کا جانور شکار کا ہم نوع ہو اور یہ بالا جماع مراد نہیں ہے۔ لامحالہ مثل معنوی ہی مراد ہو گا یعنی جو قیمت میں شکار کے برابر ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بعض قسم کے شکار کی تو بالا جماع قیمت ہی کا حساب لگانا ضروری ہے مثلاً اس جانور کا شکار کیا ہو جس کا اونٹ، گائے، بھینس، بکری، مینڈھے وغیرہ میں سے کوئی مثل نہ ہو یا کبوتر سے چھوٹا ہو مثلاً چڑیا نڈی وغیرہ ہو لہٰذا مثل معنوی مراد لینا ہی ضروری ہے ورنہ (اگر بعض اقسام میں مثل معنوی اور بعض اقسام میں مثل صوری مراد لیا جائے گا تو) ایک وقت میں ایک لفظ کا حقیقی اور مجازی دونوں معنی مراد لینا یا عموم مشترک مراد لینا لازم آئے گا (یعنی اگر لفظ مثل کو صوری اور معنوی مثلیت میں مشترک قرار دیا جائے گا اور اس لفظ کو ایک ایسے معنی کے لئے موضوع مانا جائے گا جو صوری و معنوی دونوں کے درمیان مشترک ہے اور دونوں معنی بیک وقت مراد لئے جائیں گے تو عموم اشتراک مراد لینا پڑے گا یا اگر مثل صوری کو حقیقی اور مثل معنوی کو مجازی معنی کہا جائے گا اور دونوں معنی بیک وقت مراد ہوں گے تو حقیقت و مجاز کا اجتماع لازم آئے گا اور احناف کے نزدیک دونوں ناجائز ہیں)۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ شرع میں جہاں لفظ مِثْلُ بلا قید آیا ہے اس سے مراد یا نوعی مثل ہوتا ہے یا وہ چیز جو قیمت میں برابر ہو۔ اللہ فرماتا ہے فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ اگر کسی نے تم پر زیادتی کی ہو تو جیسی اور جتنی زیادتی اس نے کی ہو اتنا اور ویسا ہی انتقام تم لے سکتے ہو۔ اب اگر ہلاک کردہ چیز کوئی مثلی ہے کہ اس کا نوعی مثل مل سکتا ہے تو ایسی جگہ مثل سے مراد نوعی مثل ہو گا اور نوعی مثل ممکن نہ ہو تو قیمت کے لحاظ سے مثل مراد ہو گا کیونکہ مثل کا لفظ مشترک معنوی ہے (یعنی اس کے معنی کے دو فرد ہیں نوعی اور قیمتی) اور چونکہ حیوانات میں اوصاف کے لحاظ سے تفاوت ہوتا ہی ہے خواہ ایک ہی نوع کے ہیں اس لئے بالا جماع کامل بہمہ جہت مساوات و مثلیت کا تو اعتبار ہی نہیں ہے بلکہ ایک نوع میں داخل ہونے کے باوجود قیمت کی مماثلت کا اعتبار ہے۔ پھر جہاں نوعی اشتراک بھی نہ ہو صرف ظاہری شکل کی مشابہت ہو۔ مثلاً شتر مرغ اور اونٹ کہ دونوں کی گردنیں اور ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں یا شکل میں بھی مشابہت نہ ہو مثلاً کبوتر کو شکار کرنے کے کفارہ میں بکری کی قربانی (حاصل یہ کہ صوری مشابہت کی کوئی ضرورت نہیں خواہ ظاہری شکل میں مشابہت ہو جائے یا نہ ہو جائے اور نوعی اشتراک ہو یا نہ ہو بہر حال قیمت میں مماثلت ہونی چاہئے)۔

امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے کہ مثل سے مراد ہے وہ پالتو چوپایا (بکری، بھیڑ، گائے، بھینس (اونٹ) جو تخلیقی طور پر (اور جسمانیت میں) شکار کے مشابہ ہو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا، بجو شکار ہے اور اس کو مارنے میں ایک بکری (کی قربانی) ہے۔ (رواہ ابو داؤد بروایت عبد اللہ) حاکم نے مستدرک میں اور امام احمد اور ابن حبان اور اصحاب سنن نے یہ حدیث حضرت جابرؓ کی روایت سے نقل کی ہے۔ حاکم کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ بجو شکار ہے اگر احرام بند شخص

نے اس کو مارا ہو تو اس کے شکار (کے کفارہ) میں ایک مینڈھا (یعنی اس کی قربانی) ہے حاکم نے اس روایت کو صحیح الاسناد کہا ہے۔ امام مالکؒ نے موطا میں نیز امام شافعی نے صحیح سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بجو کے شکار میں ایک مینڈھا اور ہرن کے شکار میں بکری (بطور کفارہ قربانی کرنے) کا فیصلہ کیا تھا۔

امام شافعی اور بیہقی نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے جنگلی چوہے کے شکار کے عوض بکری کا نر یا مادہ بچہ قربانی کرنے کا فیصلہ کیا۔ بیہقی کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا حرم کا کبوتر شکار کرنے میں ایک بکری ہے اور دو انڈوں کو توڑنے میں ایک درہم اور شتر مرغ کے شکار میں ایک اونٹ ہے اور نیل گائے میں پالتو گائے (یا بھینس) اور گورخر کے شکار میں ایک گائے (کی قربانی) ہے۔

ایک دلیل موالکہ اور شوافع کی یہ ہے کہ اللہ نے آگے مِنَ النَّعَمِ فرمایا ہے۔ نعم سے مراد ہیں اونٹ یا گائے یا بکری، یہ مثل کی صفت ہے اور ظاہر ہے کہ قیمت چوپایا نہیں ہوتی (اس لئے مثل سے مراد قیمت نہیں ہو سکتی) حنفیہ نے مالکؒ وشافعیؒ کے استدلال کا یہ جواب دیا ہے کہ مثلیت کے جو اندازے رسول اللہ ﷺ کے فرمان اور صحابہؓ کے آثار میں بیان کئے گئے ہیں ان میں ظاہر شکل کی مشابہت کو دخل نہیں صرف قیمت کا اعتبار کیا گیا ہے۔ رہا من النعم کے لفظ سے استدلال تو یہ بھی غلط ہے مِنَ النَّعَمِ مِثْلُ کی صفت نہیں ہے بلکہ قَتَلَ کا مفعول محذوف ہے ضمیر مفعول سے مِنَ النَّعَمِ حال ہے یعنی مقتول شکار اگر چوپایوں میں سے ہو مطلب یہ کہ اگر مقتول چوپایہ ہو تو اس کی مثل دینا واجب ہے لفظ نعم کا اطلاق جیسے پالتو چوپایوں پر ہوتا ہے اسی طرح جنگلی چوپایوں پر بھی ہوتا ہے۔ کذا قال ابو عبیدہؒ صاحب قاموس نے بھی یہی لکھا ہے۔

حنفیہ کی اس تفسیر پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ کلام کا مقصود تو ہر شکار کی پاداش کا وجوب ہے خواہ شکار چوپایہ ہو یا پرندہ اگر ضمیر مفعول سے مِنَ النَّعَمِ کو حال کہا جائے گا تو پھر پاداش کا وجوب چوپایا کو شکار کرنے کے ساتھ مخصوص ہو گا اور یہ مقصود کے خلاف ہے۔

میرے نزدیک صحیح تفسیر یہی ہے کہ مِنَ النَّعَمِ، مِثْلُ کی صفت ہے اور مِثْلُ سے مراد وہ پالتو چوپایہ ہے جو قیمت میں شکار کی مثل ہو بعض اوصاف میں مماثلت مراد نہیں ہے۔ شکار کرنے والا محرم اگر جرم کے کفارہ میں قربانی دے تو پالتو چوپایوں میں سے جس کی قیمت شکار کے برابر ہو یا شکار سے زائد ہو اسکی قربانی کرے۔ گورخر، نیل گائے اور ہر وہ شکار جس کی قیمت بکری کی قیمت سے زائد ہو۔ گائے کی قربانی کرنا چاہئے خواہ شکار کی قیمت بکری سے تو زائد ہو مگر گائے کی قیمت سے کم ہو اور گائے میں کوئی شرط نہیں کہ بہت بڑھیا ہو یا گھٹیا مگر اتنی گھٹیا بھی نہ ہو کہ اس کی قیمت شکار کی قیمت سے بھی کم ہو اور اگر شکار کی قیمت گائے سے زائد ہو تو اونٹ کی قربانی کرنا چاہئے۔ خواہ شکار کی قیمت گائے کی قیمت سے زائد ہونے کے باوجود اونٹ کے برابر نہ ہو۔ اور اگر شکار اونٹ سے بھی زائد قیمتی ہو تو ایک اونٹ اور ایک بکری یا ایک گائے اور ایک بکری یا ایک اونٹ اور ایک گائے یا دو اونٹ یا دو گائے یا دو بکریاں۔ غرض شکار جتنا قیمتی ہو اس کی قیمت کا لحاظ کر کے قربانی کرے۔ شکار کی قیمت سے کم نہ ہونا چاہئے۔

اگر شکار کی قیمت اس بکری کی برابر ہو جس کی قربانی جائز ہے (یعنی ناک، کان، آنکھ، ہاتھ، پاؤں، دم سب سالم ہر طرح سے بے عیب اور شریعت کی قائم کردہ معیار عمر کے مطابق) تو ایسی ہی بکری کی قربانی دے جس کی قربانی جائز ہے۔

اگر شکار کی قیمت پوری بکری کی قیمت سے کم ہو، مثلاً بجو، جنگلی چوہا، ہرن، گرگٹ، گوہ، لومڑی وغیرہ تو بکری کے بچے مختلف عمر کے (جیسے شکار کی قیمت ہو) قربانی میں پیش کرے لیکن بکری کے بچے ایسے ہوں کہ ان کی قیمت شکار کی قیمت سے کم نہ ہو۔

کبوتر اور کبوتر سے کم درجہ کے شکار کے عوض اگر قربانی دینا چاہے تو بکری کی قربانی دے مگر بکری ایسی ہو جس پر لفظ بکری کا اطلاق ہو سکتا ہو (یعنی نہ بے عیب کی شرط ہے، نہ کسی عمر کی، نہ تندرست کی) ہمارا یہ قول ہمارے نزدیک قابل فتویٰ ہے اور جمہور کے مسلک کے مطابق بھی ہے کیونکہ کفارہ کی قربانی میں جمہور کے نزدیک ایسا جانور ہونے کی شرط نہیں ہے کہ اس کی قربانی بھی جائز ہو۔ مگر امام صاحبؒ کے نزدیک کفارہ کی قربانی ایسی ہونی چاہئے جس کی قربانی شرعاً درست ہو اس لئے جس شکار کی قیمت بکری سے کم ہو مثلاً بجو، گرگٹ۔ اس کے کفارہ کے لئے ایسی بکری ہونی ضروری ہے جس کی قربانی جائز ہو۔

امام مالکؒ کا قول ہے کہ شکار چھوٹا ہو یا بڑا صحیح سالم ہو یا عیب دار، بہر حال کفارہ کی قربانی میں اس جانور کو دینا صحیح ہو گا جس کی قربانی شرعاً درست ہے (یعنی مقرر کردہ معیار عمر کے مطابق تندرست، بے عیب)۔

امام اعظمؒ اور امام مالکؒ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ (لفظ) ہَدۡیِ (مطلق ہے اور مطلق کا رجوع کامل کی طرف ہوتا ہے اور ہَدۡیِ کامل) وہی ہے جس کی قربانی درست ہو اسی لئے ہدی تمتع میں اور حج کے دوران ان تمام جرائم کے کفارہ میں جن میں قربانی ضروری ہے صرف وہی قربانی دینا جائز ہے جس کی قربانی شرعاً درست ہو۔ ہماری (یعنی جمہور کی) دلیل یہ ہے کہ صحابہؓ نے بکری کا چھوٹا بچہ واجب قرار دیا ہے اور چھوٹے بچے کی قربانی شرعاً درست نہیں ہے) پھر آیت میں لفظ ہَدۡیِ مطلق نہیں ہے کہ فرد کامل کی طرف رجوع کیا جائے جیسا کہ ہدی تمتع وغیرہ میں ہوتا ہے بلکہ ہَدۡیِ سے وہ ہَدی مراد ہے جو مقتول چوپایہ کی مثل ہو خواہ صورت میں مماثلت ہو جیسا کہ امام شافعی کا قول ہے یا قیمت میں برابری ہو جیسا کہ احناف کا قول ہے۔ لہٰذا قربانی کے قابل جانور ضروری قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

ہم نے آیت کی جو تفسیر کی ہے اس سے صحابہؓ کے اقوال کا ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ صحابہؓ نے خرگوش کے معاوضہ میں بھیڑیے کو قرار دیا تھا اور بھیڑیے کی قیمت خرگوش کی قیمت کے برابر ہوتی ہے اور چونکہ اونٹ اور گائے میں سب سے کم درجہ کی قربانی بکری ہے اور بکری (یعنی اس کے بچہ) کی قیمت بھی کبوتر کے قریب ہے (یعنی گائے اور اونٹ کی قیمت کبوتر کی قیمت سے بہت زیادہ ہوتی ہے بکری کی قیمت اتنی زائد نہیں ہوتی) اس لئے کبوتر کے عوض بکری کی قربانی کو قرار دیا۔ رہا جسمانی مماثلت کا فقدان تو جسمانی مماثلت کی ضرورت پر کوئی دلیل نہیں۔

بیہقی نے عطاء خراسانی کی روایت سے جو حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت معاویہؓ کے اقوال بیان کئے ہیں کہ محرم اگر شتر مرغ کا شکار کرلے تو کفارہ میں اونٹ کی قربانی دی جائے اور امام مالک نے ابو عبیدہ بن عبداللہ بن مسعودؓ کا قول بیان کیا کہ میرے باپ کا تحریری قول یہی ہے، امام مالک نے یہ بھی فرمایا میں برابر سنتا رہا ہوں کہ شتر مرغ کے عوض اونٹ کی قربانی ہے اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ شتر مرغ کے عوض اونٹ کی تعیین صرف جسمانی مشابہت یعنی لمبی گردن اور لمبی ٹانگیں ہونے کی وجہ سے کی گئی قیمت کو اس تعیین میں کوئی دخل نہیں ہے۔

یہ آثار ضعف اور انقطاع سے خالی نہیں ہیں (اس لئے ناقابل استدلال ہیں) امام شافعیؒ نے کہا یہ روایات علماء حدیث کے نزدیک ثابت نہیں۔ نہ قیاس اس کا شاہد ہے کہ ہم نعامہ کا عوض اونٹ کو قرار دیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض قسم کے شتر مرغ بعض زمانوں میں اونٹ کی برابر قیمت رکھتے ہوں اسی لئے بعض صحابہؓ نے شتر مرغ کا عوض اونٹ کو قرار دیا اور صحابہؓ کے بعد آنے والے لوگوں نے خیال کرلیا کہ صحابی نے شتر مرغ کا عوض اونٹ کو صرف جسمانی مشابہت کی وجہ سے قرار دیا پھر تابعین کے اس خیال کی اتنی شہرت ہوئی کہ امام مالکؒ نے فرمادیا میں برابر سنتا رہا ہوں کہ شتر مرغ کے عوض اونٹ کی قربانی ہے۔

ایک شبہ

بیہقی نے عکرمہؒ کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، میں نے بحالت احرام ایک خرگوش مار ڈالا آپ کا میرے متعلق کیا حکم ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا خرگوش چار ہاتھ پاؤں سے چلتا ہے اور بکری کا بچہ بھی چار ارکان سے چلتا ہے۔ خرگوش جگالی کرتا ہے بکری کا بچہ بھی جگالی کرتا ہے۔ خرگوش پتیاں کھاتا ہے بکری کا بچہ بھی سبزی کھاتا ہے لہٰذا خرگوش کے عوض تم بکری کے بچہ کی قربانی دو۔ یہ اثر صاف بتا رہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ظاہری مشابہت کا اعتبار کیا۔ ابن ابی شیبہ نے عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے ایک کبوتر اور دو کبوتر کے چوزوں کو حجرہ کے اندر بند کردیا، بند کر کے عرفات اور مناء چلا گیا واپس آیا تو دیکھا تینوں مر چکے ہیں، وہ شخص حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کیا، آپ نے اس پر تین بکریوں کی قربانی لازم قرار دی اور آپ کے ساتھ ایک اور شخص نے بھی یہی فیصلہ کیا (کیونکہ قرآنی آیت میں مثلیت کی جانچ کے لئے دو صالح مسلمانوں کی رائے کو ضروری قرار دیا ہے)۔

ثوریؒ، ابن ابی شیبہؒ، شافعیؒ اور بیہقیؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث بھی اسی جیسی نقل کی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے

کہ کبوتر کے عوض بکری کی قربانی کا وجوب قیمت کی یکسانی کے لحاظ سے نہیں ہے ورنہ دو چوزوں اور ایک کبوتر کے عوض ایک بکری بھی کافی تھی بلکہ اس سے زائد کبوتروں کے لئے ایک بکری کافی ہو جاتی۔

جواب

ہم کہتے ہیں بعض آثار صحابہؓ بے شک دلالت کر رہے ہیں کہ صورت وجسمانیت کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن یہ بات صحابہؓ کی رائے پر مبنی ہے کسی روایت (یعنی حدیث) پر اس کی بنا نہیں اور جب قرآنی آیت کی مخالفت ہو رہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بعض صحابہ کی رائے مانی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور یہ یقینی امر ہے کہ نہ اونٹ شتر مرغ کی مثل ہے نہ بکری کبوتر کی مثل، نہ جسمانی بناوٹ وصورت میں، نہ حقیقت میں۔ اگر بعض اوصاف میں مشابہت بھی ہے تو وہ ایسی مشابہت ہے جو نہ قابل اعتبار ہے نہ عرف میں اس کا اعتبار ہے، نہ لغت میں ورنہ تمام حیوانات باہم مثل ہو جائیں گے کسی نہ کسی صفت میں تو ہر ایک کو دوسرے سے مشابہت ہوتی ہی ہے۔

یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ (جس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں) یعنی پاداش کا فیصلہ یا مثل ہونے کا فیصلہ دو معتبر مسلمان کر دیں۔ اکثر حنفیہ قائل ہیں کہ مثل ہونے کی جانچ کے لئے ایک شخص کا فیصلہ بھی کافی ہے۔ بکثرت صحابہؓ نے انفرادی فیصلے کئے ہیں یہ انفرادی فیصلے روایات میں آئے ہیں اگر دو کا اجتماعی فیصلہ ہو تو زیادہ اچھا ہے تاکہ غلطی سے بخوبی احتیاط ہو جائے۔

امام شافعیؒ اور جمہور علماء کے نزدیک فیصلہ کے لئے تعداد یعنی دو ہونا بھی ضروری ہے اور دونوں کا صالح ہونا بھی۔ فتویٰ بھی اسی پر ہونا چاہئے حکم آیت کا بھی یہی تقاضا ہے اور عمل صحابہ بھی اسی کا شاہد ہے۔ [۱]

امام مالکؒ نے محمد بن سیرین کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہرن کو شکار کرنے کا کفارہ دریافت کیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے فرمایا، آپ بھی آجائیے تاکہ ہم دونوں مل کر فیصلہ کریں چنانچہ دونوں نے مل کر بکرے کی قربانی دینے کا فیصلہ کیا۔ سائل نے کہا یہ امیر المؤمنین ہیں کہ ایک ہرن کے شکار کا بھی خود فیصلہ نہیں کر سکتے کہ دوسرے کو فیصلہ کی شرکت کے لئے بلوایا۔ حضرت عمرؓ نے اس کا قول سن پایا اور فرمایا کیا تو سورۃ المائدہ پڑھتا ہے اس شخص نے جواب دیا نہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر تو کہہ دیتا کہ سورۂ مائدہ پڑھتا ہوں تو میں تجھے دکھ کی مار دیتا۔ اللہ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ۔

مسئلہ:- جو لوگ مثل جسمانی کے قائل ہیں ان میں خود اس کی تشریح میں اختلاف ہے۔ امام مالک قائل ہیں کہ ہر

---

[۱] میمون بن مہران کی روایت ہے کہ ایک بدو حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں نے بحالت احرام ایک شکار مار دیا میں کیا پاداش ادا کروں۔ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے دریافت کیا آپ کی کیا رائے ہے۔ بدو بولا میں آپ کے پاس آیا ہوں آپ اللہ کے رسول کے جانشین ہیں، میں آپ سے پوچھتا ہوں اور آپ دوسروں سے پوچھتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کیا تم کو اللہ کے اس فرمان کا انکار ہے اللہ نے فرمایا ہے یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اس حکم کی تعمیل میں میں اپنے ساتھی سے مشورہ لے رہا ہوں جب دونوں کی رائے متفق ہو جائے گی تو ہم ویسا ہی تجھے حکم دیدیں گے۔

ابو بکر مزنی کی روایت ہے کہ دو آدمی احرام بند تھے ایک نے ایک ہرن کو ہنکا دیا اور دوسرے نے قتل کر دیا پھر دونوں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے ان کی رائے دریافت کی حضرت عبدالرحمٰن نے کہا میری رائے میں بکری ہونی چاہئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میری بھی یہی رائے ہے پھر فرمایا دونوں بکری کی قربانی دو جب دونوں واپس لوٹے تو ایک نے دوسرے سے کہا امیر المؤمنین کو جواب معلوم نہ تھا تب ہی تو اپنے ساتھی سے دریافت کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات سن پائی فوراً واپس بلوایا اور کہنے والے کا استقبال درہ کی ضرب سے کرتے ہوئے فرمایا، حالت احرام میں شکار بھی مارتے ہو اور شرعی فیصلہ سے آنکھیں بھی بند رکھتے ہو، اللہ نے فرمایا ہے یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اللہ نے فیصلہ کے لئے تنہا عمرؓ کو پسند نہیں کیا اس لئے میں نے اپنے ساتھی سے مدد لی۔

زمانہ میں دو صالح مسلمان اس مثلیت کا نو بنو فیصلہ کریں گے (خواہ فیصلہ صحابہؓ کے فیصلہ کے خلاف ہو کیونکہ زمانہ کے اختلاف سے مثلیت میں اختلاف ہوتا رہے گا)۔

اکثر علماء قائل ہیں کہ سلف نے اگر کسی کو کسی کے مثل قرار دیدیا ہے تو وہ واجب التسلیم ہے اس کے خلاف (کسی زمانہ میں) حکم نہیں دیا جاسکتا اور اگر کسی کی مثلیت کا سلف نے کوئی فیصلہ نہ کیا ہو تو دو اہل الرائے از سر نو خود فیصلہ کر سکتے ہیں اور اگر مسئلہ اجتہادی ہو تو اس میں بھی اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ ثوری نے کہا جس مسئلہ میں سلف کا باہم اختلاف ہو اس کے متعلق ہر زمانہ میں دو اہل الرائے کا فیصلہ نافذ ہوگا (خواہ بعض اسلاف کے فیصلہ کے خلاف ہو)۔

قرآنی آیت مذکورہ بالا تمام اقوال کی تردید کر رہی ہے کیونکہ اگر تخلیقی اور جسمانی مماثلت کا اعتبار کر لیا جائے تو ہر زمانہ میں جدید فیصلہ کا فائدہ ہی کیا ہے (مماثلت جسمانی ہر زمانہ میں قائم رہے گی کسی زمانہ کے اہل الرائے کی رائے مماثلت جسمانی کو بدل نہیں سکتی) رہا سلف کے فیصلہ کو (ہر زمانہ کیلئے) واجب التسلیم قرار دینا تو اس کی تردید خود آیت کر رہی ہے۔ دو عادل مسلمانوں کا فیصلہ ہر زمانہ میں جدا جدا ہونا چاہئے۔ اگر ایک مرتبہ کا فیصلہ ہمیشہ کیلئے ہو سکتا تو تمام یا اکثر شکاروں کے متعلق رسول اللہ ﷺ خود ہی قطعی فیصلہ فرما دیتے، دو عادل مسلمانوں کے فیصلہ کی ضرورت ہی نہ ہوتی (اس سے معلوم ہوا کہ سلف کا فیصلہ خلف کیلئے حجت نہیں بلکہ ہر زمانہ میں دو عادل مسلمان مستقل فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں) اس سے ثابت ہوا کہ آیت میں مثلیت سے بلحاظ قیمت مثلیت مراد ہے جس کے اندازہ کرنے کیلئے دو عادل مسلمانوں کی ضرورت ہے اور چونکہ زمان و مکان کے اختلاف سے قیمت کا اختلاف ہوتا رہتا ہے اسلئے ہر زمانہ اور ہر مقام میں دو صاحب رائے مسلمانوں کے فیصلہ کی احتیاج لازم ہے۔

هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (خواہ وہ پاداش خاص چوپایوں میں سے ہو بشرطیکہ) نیاز کے طور پر کعبہ تک پہنچائی جائے۔ لفظ هَدْيًا حال ہے خواہ ضمیر جَزَاءٌ سے ہو یا جَزَاءٌ سے یا ضمیر مِثْلُ سے یا محل کے اعتبار سے مِثْلُ سے بدل ہے۔

امام شافعیؒ وغیرہ لفظ هَدْيًا سے اس امر پر استدلال کرتے ہیں کہ مثل سے مراد قیمت نہیں ہو سکتی کیونکہ قیمت کعبہ کو بطور نیاز نہیں بھیجی جاتی۔

لیکن ہم نے تشریح کر دی ہے کہ مثل سے مراد وہ چوپایہ ہے جس کی قیمت شکار کے برابر ہو اور اس جانور کو بطور نیاز کعبہ کو بھیجا جائے اس تشریح پر امام شافعی کا اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امام اعظمؒ کے مسلک سے مراد قیمت ہی ہو اور لفظ هَدْيًا حال مقدر ہو یعنی وہ قیمت جو ھدی بن جانے والی ہو، مطلب یہ کہ اس قیمت سے کوئی جانور خرید کر بھیج دیا جائے تو (گویا) قیمت ہی ھدے ہو جائے گی۔

ایک سوال :- امام اعظمؒ کی تاویل پر بے وجہ بعض الفاظ محذوف ماننا پڑتے ہیں یعنی مثلاً صَائِرًا هَدْيًا کہنا پڑے گا۔

جواب :- بے ضرورت نہیں بلکہ بضرورت مذکورہ پھر امام شافعی کے قول پر بھی تو بعض الفاظ کو محذوف ماننا پڑتا ہے کیونکہ جس وقت دو عادل مثلیت کا فیصلہ کریں گے اس وقت تو وہ جانور کعبہ کو پہنچا ہوا نہ ہوگا بلکہ آئندہ پہنچنے والا ہوگا اس لئے وقت حکم میں نہیں بلکہ حکم و فیصلہ کے بعد اس جانور کو بطور نیاز کعبہ کو بھیجا جائے گا۔ بہر حال دونوں اماموں کی تشریح پر تقدیر لفظی ضروری ہے صرف محل تقدیری کا اختلاف ہے۔

مسئلہ :- کیا یہ ضروری ہے کہ جانور مکہ سے باہر خرید کر بھیجا جائے یا مکہ کے اندر ہی خرید کر قربانی کرنا کافی ہے چونکہ بٰلِغَ الْكَعْبَةِ میں لفظی اضافت ہے اس لئے ظاہر لفظ کا اعتبار کر کے امام مالک نے اول قول کو پسند کیا ہے اور باہر سے بھیجنے کو واجب قرار دیا ہے۔ لیکن جمہور کا قول ہے کہ باہر سے بھیجنا ضروری نہیں۔ بٰلِغَ الْكَعْبَةِ کا یہ مطلب ہے کہ قربانی کے لئے حرم شرط ہے، حرم سے باہر قربانی نہ ہونی چاہئے، یہ مطلب نہیں کہ باہر سے خرید کر ہی بھیجی جائے۔ اسی پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ حجۃ الوداع کے قصہ میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ میں تشریف لائے تو لوگوں سے فرمایا جس نے قربانی بھیج دی ہو وہ حج پورا کرنے سے پہلے باندھا ہوا احرام نہ کھولے اور جس نے قربانی نہ بھیجی ہو وہ کعبہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کر کے بال

کتروا کر احرام کھول دے پھر حج کا احرام باندھے اور قربانی کرے اور جس کو قربانی کا جانور نہ ملے وہ روزے رکھے۔ اس حدیث میں صاف صراحت ہے کہ بعض صحابیوں نے باہر سے قربانی کا جانور نہیں بھیجا تھا بلکہ مکہ میں خریدا تھا اور جن لوگوں کو مکہ میں قربانی کا جانور نہیں ملا تھا انہوں نے روزے رکھے تھے۔ دیکھو مکہ کے اندر خریدے ہوئے قربانی کے جانور کو رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں ھدی فرمایا اور صراحت فرمادی ثم لیھل بالحج ولیھد۔ اللہ نے بھی تمتع کے سلسلہ میں فرمایا ہے فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (اس آیت میں ہر قربانی کے جانور کو ھَدِی فرمایا ہے خواہ اس کو باہر سے نہ بھیجا گیا ہو)۔

امام مالکؒ نے خواہ مخواہ ایک شرط لگائی ہے کہ اگر قربانی کا جانور مکہ میں خریدا ہو تو واجب ہے کہ اس کو بوقت ارادہ حج عرفہ کو لے جائے (اور وہاں سے بھیجے) امام مالک کے اس قول کی کوئی دلیل نہیں۔

مسئلہ :- کیا قربانی کے جانور کا گوشت صرف مکہ کے فقراء کو تقسیم کر دیا جائے۔ جمہور کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے کیونکہ کعبہ تک پہنچنے کی شرط بتا رہی ہے کہ حرم کے مسکینوں کو ہی تقسیم کرنا واجب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ عموم جواز کے قائل ہیں حرم کے فقراء ہوں یا بیرون حرم کے سب کو تقسیم کرنا جائز ہے۔ آیت میں مساکین حرم کی کوئی تخصیص نہیں صرف حرم کے اندر ذبح کرنے کی شرط ہے اگر بیرون حرم ذبح کرے گا تو کافی نہ ہوگا اور ذبح کے لئے مکان کی خصوصیت خلاف قیاس ہے (لیکن آیت میں آگئی ہے لہٰذا ذبح سے آگے بڑھ کر تقسیم تک یہ حکم متجاوز نہ ہوگا جتنا آیت میں آیا ہے اسی حد پر حکم محدود رکھا جائے گا) اور گوشت کی تقسیم بہر حال ایسی عبادت ہے جو موافق عقل ہے اس سے فقراء کی پرورش ہوتی ہے جو عقلاً مستحسن ہے)۔

أَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسَاكِينَ اس آیت میں لفظ او بتا رہا ہے کہ قصور کرنے والے کو اختیار ہے قربانی کرے (یا بطور کفارہ مسکینوں کو کھانا دیدے) یا روزے رکھے۔ شعبی اور نخعی نے کہا کہ شکار کرنے کا عوض اسی ترتیب سے ادا کیا جائے گا جس ترتیب سے آیت میں آیا ہے (اول قربانی، قربانی کا جانور نہ ملے تو طعام مساکین اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو روزے) لیکن آیت میں لفظ او ہمارے قول کی تائید اور شعبی کے قول کی تردید کر رہا ہے۔[1]

مسئلہ :- یہ امر اجماعی ہے کہ کھانا قیمت کے مطابق دیا جائے گا اگر شکار کی مثل کوئی چوپایہ نہ ہوگا تو شکار کی قیمت لگا کر اس قیمت کا کھانا دیا جائے گا اور اگر شکار مثلی ہوگا تو شکار کی مثل جس چوپایہ کو قرار دیا گیا ہوگا۔ اس چوپایہ کی قیمت لگا کر اس کا کھانا خرید کر دیا جائے گا اس وقت شکار کی قیمت کا اعتبار نہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں شکار کی قیمت واجب نہیں ہے بلکہ شکار کی مثل چوپایہ واجب ہے کھانا دینا تو چوپایہ کے قائم مقام ہے۔ یہ قول جمہور کا ہے۔ اس قول پر کبوتر کے شکار کے عوض اگر کھانا دینا ہو تو کبوتر کی قیمت کا نہیں بلکہ ایک بکری کی قیمت لگا کر اس کا کھانا دینا ہوگا کیونکہ اصل میں وجوب نظیر کا ہے (لہٰذا نظیر کی قیمت کا کھانا دینا ہوگا) امام اعظمؒ کے نزدیک شکار کی قیمت لگا کر اس کا کھانا دینا ہوگا (مثلی اور غیر مثلی میں کوئی فرق نہیں ہے) کیونکہ (نظیر واجب نہیں بلکہ) شکار کی قیمت واجب ہے شکار کی مثل کسی چوپایہ کی قربانی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس چوپایہ کی قیمت شکار کی قیمت کے برابر ہو اس کی قربانی دی جائے اگر قربانی کی قیمت زائد ہو تو اس زیادتی کا وجوب (شرعاً نہیں ہے بلکہ) تطوعاً اور خود

---

[1] شکار کرنے کی سزا کو ہلکا کرنے کے لئے اللہ نے محرم کو تینوں باتوں میں سے کسی ایک کو پسند کر لینے کا اختیار دیا جیسے قسم کے کفارہ میں اختیار دیا ہے، یہ قول امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کا ہے۔ امام محمد اور امام شافعی قائل ہیں کہ (محرم کو بطور خود تینوں امور میں سے ایک امر کو پسند کر لینے کا اختیار نہیں ہے بلکہ ان دونوں مسلمانوں کو جو مثلیت کی جانچ کرنے والے ہوں یہ حق ہے کہ تینوں امور میں کسی ایک امر کی مجرم کے لئے تعیین کر دیں۔ مگر آیت میں اس قول کی کوئی دلیل نہیں بلکہ آیت کا مفہوم تو یہ ہے کہ مثل سے مراد قیمت ہے اور قیمت کا اندازہ دو عادل مسلمانوں کی رائے پر موقوف ہے اور جب وہ قیمت کا اندازہ کر دیں تو اب مجرم کو اختیار ہے کہ تینوں صورتوں میں سے کسی ایک صورت کو پسند کر لے اس قیمت سے قربانی کا جانور خرید کر کعبہ کو بھیج دے یا کھانا خرید کر مساکین کو دیدے یا ہر مسکین کے کھانے کے عوض ایک روزہ رکھے دو صاحب الرائے مسلمانوں کو ان تینوں میں سے کسی ایک کی تعیین کا حق نہیں ہے یہ حق تو صرف اللہ کو ہے وہ حاکم مطلق ہے اسی نے تینوں صورتیں بیان فرما کر مجرم کو سہولت عطا فرمائی ہے اور یہ اس کی رحمت ہے۔

آوردہ ہے یا یوں کہو کہ اگر قربانی کرنا چاہتا ہو اور قربانی کی قیمت زائد ہو تو چونکہ قربانی کے ٹکڑے نہیں کئے جاسکتے (کہ آدھے جانور کی قربانی کر سکے) اس لئے ضرور تا پوری قربانی دینی ہوگی لیکن اگر قربانی کرنا نہ چاہے اور کھانا دینا چاہے تو کوئی ضرورت نہیں کہ پوری قربانی کی قیمت کا کھانا کھلائے نہ اس کا التزام اس نے خود کیا ہے (بلکہ قربانی کی قیمت میں اسے اتنے حصہ کا کھانا دے گا جتنا حصہ شکار کی قیمت کے برابر ہو) لہٰذا بکری کی قیمت نہیں لگائی جائے گی، کبوتر کی قیمت لگائی جائے گی ضمان و تاوان اسی چیز کا دینا ہوگا جس کو تلف کیا ہے تلافی کے لئے دوسری چیز کی قیمت لگا کر تلف شدہ کے تاوان میں دینے کا کوئی معنی نہیں۔

رہا یہ خیال کہ در حقیقت مثلی شکار میں واجب نظیر ہے یہ خیال ہی غلط ہے دیکھو اگر کبوتر کے شکار کے عوض اونٹ کی قربانی کر دے گا تو کافی ہوگا اگر نظیر واجب ہوتی تو بکری کے علاوہ دوسرے بڑے جانور کی قربانی تاوان جرم کے لئے کافی نہ ہوتی۔ مزید یہ کہ نظیر کا وجوب عینی تو اسی وقت ممکن ہوگا جب شعبی اور نخعی کی طرح تینوں امور میں ترتیب کو واجب قرار دیا جائے۔ اول قربانی اور قربانی ممکن نہ ہو تو مساکین کو کھانا دینا اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو روزے رکھنا۔ گویا نمبر دوم نمبر اول کی اور نمبر سوئم نمبر دوم کی قضاء غیر معقول ہے۔ مگر ہمارے نزدیک تو ترتیب واجب ہی نہیں ہے بلکہ مجرم کو کسی ایک سزا کو پسند کرنے کا اختیار ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ بغیر کسی شرعی دلیل کے ایک قسم کی سزا کو دوسری قسم کی سزا میں دخیل قرار دیا جائے۔

ایک شبہ

اگر ایک نوع کی سزا دوسری نوع کی سزا میں دخیل نہیں ہو سکتی تو مسکینوں کی تعداد کے برابر روزوں کی تعداد کیوں واجب ہے۔

جواب

مسکینوں کی تعداد کا دخل روزوں کے وجوب میں تو اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

اَوْعَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا (یا اس (کھانے) کے مساوی روزے) فراء نے کہا جو مثل ہم جنس بھی ہو وہ عِدْلٌ بکسر عین ہے اور جو مثل غیر جنسی ہو وہ عَدْلٌ بالفتح ہے۔

مسئلہ :- فی مسکین کتنا کھانا دیا جائے؟۔ امام شافعیؒ کے نزدیک فی مسکین ایک مد طعام (تقریباً ایک سیر) دیا جائے۔ کفارۂ صوم، کفارۂ ظہار اور کفارۂ یمین میں بھی امام شافعیؒ کا یہی قول ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک فی مسکین گیہوں آدھا صاع (تقریباً دو سیر) اور جو یا چھوارے ایک صاع دیئے جائیں۔ صدقۂ فطر کی مقدار بھی امام صاحبؒ کے نزدیک یہی ہے اور تمام کفارات میں یہی مقدار واجب ہے۔

اولیٰ یہ ہے کہ شہر میں عام طور سے جو غلہ کھایا جاتا ہو اس کا آدھا صاع فی مسکین دیا جائے کیونکہ تمام جنایات میں کھانا دینے کی مقدار یہ ہی بالاجماع مقرر ہے اگر حج میں کوئی معذور بحالت احرام سر منڈا دے تو یہی مقدار واجب ہے۔ سورۂ بقرہ میں حدیث گزر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت کعب کو (سر منڈانے کے کفارہ میں) ایک فرق غلہ چھ مسکینوں کو تقسیم کرنے کا حکم دیا (صدقۂ فطر پر تاوان شکار کو محمول کرنے سے اس حدیث پر محمول کرنا اولیٰ ہے کیونکہ صدقۂ فطر کسی جنایت و جرم کی وجہ سے واجب نہیں ہوتا اور شکار کی جنایت اور معذور کی جنایت دونوں ہم جنس ہیں (اگرچہ نوع جنایت میں فرق ہے)۔

جمہور کے نزدیک جس طرح قربانی کے گوشت کے مستحق صرف مساکین حرم ہیں اسی طرح کھانا بھی صرف فقراء حرم ہی کو دیا جائے گا۔ امام صاحبؒ کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے (قربانی کے گوشت کی طرح کھانے کے لئے بھی مساکین حرم کی تخصیص نہیں ہے)۔

مسئلہ :- اگر شکار کی قیمت میں ایک مسکین کے لائق پورا کھانا نہ مل سکے یا اتنا کھانا ملے جو ایک مسکین یا چند مساکین کو بمقدار مقرر دینے کے بعد کچھ بچ رہے مگر بچا ہوا کھانا ایک مسکین کے لائق پورے طور پر نہ ہو (مثلاً آدھا سیر بچ رہے) تو جتنا باقی

رہا ہو اتنا ہی کسی ایک مسکین کو دے دیا جائے اپنی طرف سے بڑھا کر پوری مقدار کر دینا ضروری نہیں ہے اور اگر بچا ہوا کھانا دینے کے بجائے روزہ رکھے تو ایک روزہ رکھے روزے کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے یہ مسئلہ اجماعی ہے اور اگر قربانی دے گا تو کسی قسم کی اور کسی عمر کی بکری ہو قربانی میں دے سکتا ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک ایسی بکری کی قربانی کافی ہو گی جس کی قربانی شرعاً ضروری قرار دی گئی ہے (یعنی بے عیب سالم الاعضاء اور عمر مقرر کے مطابق ہو، ہر بکری کی قربانی کافی نہ ہو گی)۔

لِّيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ ۗ (ہم نے یہ سزا یا کفارہ اس لئے واجب کیا) کہ مجرم اپنے کئے کی سزا چکھے۔ وَبَالَ أَمْرِ کئے کا بوجھ فعل کا برا نتیجہ۔ وبل کا لغوی معنی ہے ثقل طعام و بیل ثقیل کھانا۔ آیت أَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا میں وَبِيلًا کا معنی سخت ثقیل اسی لغوی مناسبت کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

عَفَا اللَّهُ عَمَّا سَلَفَ ۚ (جو کچھ پیچھے ہو گیا اللہ نے اس کو تو معاف کر دیا)۔ یعنی محرم نے بحالت احرام جو شکار اسلام سے پہلے یا حکم حرمت نازل ہونے سے پہلے کر لیا جو شکار اس مرتبہ کر لیا اللہ نے اس کو تو معاف کر دیا۔

وَمَنْ عَادَ (لیکن اس بار کے بعد جو شخص دوبارہ ایسا کرے گا)۔

فَيَنْتَقِمُ اللَّهُ مِنْهُ ۚ (تو اللہ اس کو سزا دے گا)۔ فَيَنْتَقِمُ اللَّهُ جزا نہیں ہے کیونکہ فعل مضارع اگر جزا واقع ہوتا ہے تو اس پر فاء نہیں آتی بلکہ یہ خبر ہے اور هُوَ مبتدا محذوف ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی محرم شکار کر لیتا تو آپ اس سے پوچھتے کیا تو نے اس سے پہلے کبھی حالت احرام میں شکار کیا ہے (یا یہ پہلا جرم ہے) اگر وہ کہتا یہ پہلا جرم ہے تو آپ اس کو (قربانی کرنے یا کھانا دینے یا روزے رکھنے کا) حکم دیدیتے اور اگر وہ کہتا پہلے بھی مجھ سے ایسا جرم ہوا ہے تو آپ کوئی حکم نہ دیتے اور ظاہر آیت کے مطابق فرماتے اللہ تجھ سے انتقام لے گا، پھر اس کی پشت اور سینہ پر دردرساں ضرب رسید کرتے کذا قال البغوی۔

میں کہتا ہوں آیت کی تفسیر اس طرح کرنا اولیٰ ہے کہ جو کچھ گزر چکا اس کو تو اللہ نے معاف کر دیا یعنی جس شخص نے اس کا تاوان (بصورت قربانی یا بصورت طعام یا بصورت صیام) ادا کر دیا ہو اللہ نے اس کو معاف کر دیا لیکن جو شخص دوبارہ ایسی حرکت کرے گا اللہ اس سے انتقام لے گا یعنی مندرجہ بالا سزا اس پر عائد کرے گا اور اگر وہ تاوان ادا نہ کرے گا تو قیامت کے دن اس کو عذاب دے گا۔

وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿٩٥﴾ یعنی جو شخص اللہ کی نافرمانی پر جما رہے گا (اللہ اس کو عذاب دینے والا اور انتقام لینے والا ہے)۔

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ (تمہارے لئے سمندر سے شکار کرنا حلال کر دیا گیا ہے)۔

وَطَعَامُهُ (اور اس کی غذا) (حلال کر دی گئی ہے) طَعَامُهُ کی ضمیر یا صَيْد کی طرف راجع ہے یعنی شکار سے بنا ہوا کھانا یا البحر کی طرف راجع ہے یعنی سمندر سے حاصل کیا ہوا کھانا۔[1]

بعض علماء کا قول ہے کہ صَيْدُ الْبَحْرِ سے مراد وہ آبی حیوان ہے جو پانی سے باہر زندہ نہیں رہتا۔ اور طَعَامُ الْبَحْرِ سے

[1] حضرت انسؓ راوی ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا صَيْدُ الْبَحْرِ وہ (خوردنی) اشیاء ہیں جو سمندر کے اندر موجود ہوں اور طعام سے مراد وہ (خوردنی) اشیاء ہیں جن کو سمندر نے اگل کر باہر پھینک دیا ہو۔ حارث بن نوفلؓ راوی ہیں کہ دوران حج میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اس شکار کا گوشت پیش کیا گیا جس کو غیر محرم نے شکار کیا تھا۔ آپ نے اس میں سے کھا لیا مگر حضرت علیؓ نے نہیں کھایا۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا بخدا ہم نے یہ نہ خود شکار کیا نہ حکم دیا نہ اشارہ کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا۔

حسنؒ راوی ہیں کہ اگر محرم کیلئے شکار نہ کیا گیا ہو بلکہ غیر محرم نے کسی دوسرے غیر محرم کے لئے شکار کیا ہو تو ایسے شکار کے گوشت کو حضرت عمر بن خطاب محرم کے لئے بھی حلال جانتے تھے لیکن حضرت علی مکروہ قرار دیتے تھے۔ رواہ ابن ابی شیبہ

مراد ہے سمندری کھانا۔ امام مالکؒ نے ہر سمندری جانور کے کھانے کے جواز پر اسی سے استدلال کیا ہے مسئلہ کی پوری تفصیل سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا صَيْدُ الْبَحْرِ وہ ہے جس کو (سمندر سے) شکار کیا جائے اور طَعَامُ الْبَحْرِ وہ ہے جس کو سمندر خود باہر پھینک دیتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے کہ طَعَامُ الْبَحْرِ وہ ہے جس کو پانی مردہ حالت میں کنارہ پر پھینک دیتا ہے۔ سعید بن جبیر سعید بن مسیبؒ، عکرمہ قتادہ نخعی اور مجاہد نے کہا صَيْدُ الْبَحْرِ وہ ہے جو تازہ پکڑا گیا ہو اور طَعَامُ الْبَحْرِ وہ ہے جس کو نمک لگا دیا گیا ہو۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ (مذکورہ بالا صَيْدُ الْبَحْرِ کو حلال کیا گیا ہے) (تمہارے (یعنی اہل اقامت کے) اور مسافروں کے فائدہ کیلئے) اہل اقامت تازہ تازہ پکڑ کر کھاتے ہیں اور مسافر اسکے ٹکڑے کر کے توشہ سفر کے طور پر لے جاتے ہیں۔

وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا (اور جب تک تم احرام بند ہو خشکی کا شکار کرنا تم پر حرام کر دیا گیا ہے)۔ بعض علماء کے نزدیک آیت کا مطلب اس طرح ہے کہ خشکی کا شکار (کھانا) محرم کے لئے مطلقاً حرام کر دیا گیا ہے خواہ غیر محرم نے اس کو شکار کیا ہو اور محرم نے حکم نہ دیا ہو، نہ مدد کی ہو، نہ اشارہ کیا ہو، بلکہ محرم کے لئے شکار بھی نہ کیا گیا ہو۔ بہر حال محرم کے لئے حرام ہے۔ یہ قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے۔ طاؤسؒ اور سفیانؒ ثوری کا یہی قول ہے حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابواء یا ودان میں فروکش تھے صعب بن جثامہ لیثی نے حضور کے لئے گور خر کا گوشت بطور ہدیہ بھیجا۔ آپ نے واپس کر دیا اور صعب کے چہرہ پر کچھ رنج کے آثار دیکھ کر فرمایا ہم نے کسی اور بات کی وجہ سے واپس نہیں کیا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ ہم احرام بند ہیں (متفق علیہ) نسائی کی روایت میں (اتنا زائد) آیا ہے کہ ہم شکار نہیں کھائیں گے۔ سعید نے ابن عباس کا قول اتنا مزید بیان کیا ہے کہ ہم اگر احرام بند نہ ہوتے تو قبول کر لیتے۔

اس کے جواب میں امام بخاریؒ کی وہ صراحت نقل کی ہے جس میں آیا ہے کہ گور خر زندہ تھا اور زندہ شکار کو ذبح کرنا محرم کے لئے جائز نہیں۔ اہل روایت نے امام مالکؒ سے بھی یہی تاویل نقل کی ہے مگر یہ توجیہ درست نہیں ہے کیونکہ اسحاق نے مسند میں اپنی سند سے بروایت موسیٰ از محمد بن عمرو بن علقمہ از زہری بیان کیا ہے کہ گور خر کا گوشت پیش کیا تھا (اور گوشت زندہ کا نہیں ہو سکتا) طبرانی نے زہری کی روایت سے لکھا ہے کہ گور خر کی ٹانگ پیش کی تھی۔ مسلمؒ کی روایت میں ہے کہ گور خر کا سرین تھا جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ مسلمؒ کی دوسری روایت میں سرین کی جگہ ٹانگ کا لفظ آیا ہے۔ مسلمؒ کی تیسری روایت میں سعید کی روایت دو طرح سے آئی ہے ایک میں گور خر کا لفظ آیا ہے اور دوسری میں گور خر کا پہلو۔ بہر حال تمام روایات میں اس امر پر اتفاق ہے کہ وہ شکار رسول اللہ ﷺ نے قبول نہیں فرمایا۔ ہاں وہب اور بیہقی نے عمرو بن امیہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جحفہ میں فروکش ہوئے کہ ایک گور خر کا سرین پیش کیا گیا آپ نے اس میں سے خود بھی کھایا اور لوگوں نے بھی کھایا اس روایت کی سند حسن ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ دونوں قصوں کا تعلق جدا جدا دو واقعوں سے تھا۔ صحیحین میں جو واقعہ منقول ہے وہ ابواء یا ودان کا ہے اور وہب کے بیان کئے ہوئے قصہ کا تعلق جحفہ سے ہے جحفہ اور ابواء کا فاصلہ ۱۳ میل ہے اور جحفہ سے ودان آٹھ میل پر ہے۔

اسی موضوع کی ایک حدیث حضرت علیؓ کی روایت سے بھی آئی ہے حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کیا تم واقف ہو کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کسی شکار کا ایک عضو بطور ہدیہ پیش کیا گیا آپ نے قبول نہیں کیا اور فرمایا میں احرام بند ہوں۔ حضرت علیؓ نے یہ خطاب قبیلہ اشجع کے ایک شخص سے کیا تھا اور اس کو قسم دی تھی۔ اس شخص نے جواب میں کہا جی ہاں رواہ ابوداؤد الطحاوی۔ مسلمؒ نے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔

لیکن قرن اول کے بعد مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہو گیا تھا کہ اگر غیر محرم اپنے لئے شکار کرے تو محرم کے لئے اس کا کھانا حلال ہے۔ صحیح احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود بھی ایسے شکار کا گوشت کھایا اور صحابہؓ کو بھی کھانے کی اجازت

دی۔ حضرت ابو قتادہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس (شکار) کا جو گوشت بچ گیا ہو وہ تم (لوگ) کھالو۔ بعض صحیح روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود بھی اس کو کھایا۔ صعبؓ بن جثامہ کی بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ نے خود بھی اس میں سے کھایا۔

مسلم نے نقل کیا ہے کہ معاذ بن عبدالرحمٰنؒ بن عثمان تیمی کے باپ (عبدالرحمٰن) نے بیان کیا کہ ہم احرام کی حالت میں حضرت طلحہ بن عبداللہؓ کے ساتھ تھے۔ حضرت طلحہؓ کو ایک پرندہ (یعنی شکار کیا ہوا) ہدیہ میں پیش کیا گیا آپ اس وقت سو رہے تھے۔ ہم میں سے بعض آدمیوں نے تو اس کو کھالیا اور بعض نے کھانے سے پرہیز رکھا۔ طلحہ بیدار ہوئے تو آپ نے کھانے والوں کی موافقت کی اور فرمایا ہم نے رسول اللہ ﷺ کی ہم رکابی میں شکار کھایا تھا۔

عمرو بن سلمہ حمیری نے بہزی کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ جانے کے ارادہ سے احرام بند برآمد ہوئے۔ روحاء کے مقام میں پہنچے تو ایک زخمی گورخر پر نظر پڑا (جو ذبح کیا ہوا تھا) رسول اللہ نے فرمایا اس کو رہنے دو ممکن ہے اس کو شکار کرنے والا آجائے کچھ دیر کے بعد بہزی آ گئے۔ بہزی نے اس کا شکار کیا تھا۔ بہزی نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ آپ کو اختیار ہے جیسا چاہیں اس میں تصرف کریں۔ حضور ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو حکم دیا (کہ اس کو تقسیم کردو) حسب الحکم حضرت ابو بکرؓ نے قافلہ والوں کو اس کا گوشت بانٹ دیا (رواہ مالک واصحاب السنن) ابن خزیمہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

تقریر سابق سے ظاہر ہو گیا کہ آیت میں صید سے مراد ہے شکار کرنا۔

مسئلہ :- اگر غیر محرم، محرم کے لئے شکار کرے تو کیا حکم ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک غیر محرم کا شکار کیا ہوا سب کے لئے جائز ہے یہاں تک کہ وہ محرم بھی اس کو کھا سکتا ہے جس کے لئے شکار کیا گیا ہو۔ امام مالکؒ کے نزدیک اگر محرم کے لئے غیر محرم نے شکار کیا تو کسی کے لئے حلال نہیں یہاں تک کہ غیر محرم بھی اس کو نہیں کھا سکتا۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا قول ہے کہ اگر غیر محرم نے محرم کے لئے شکار کیا خواہ احرام باندھنے کے بعد کیا یا احرام باندھنے سے پہلے بہر حال محرم کے لئے اسکو کھانا درست نہیں۔ البتہ غیر محرم اس کو کھا سکتا ہے اور وہ محرم بھی کھا سکتا ہے۔ جس کی نیت سے شکار نہ کیا گیا ہو۔ حضرت عثمان کا قول بھی یہی بیان کیا گیا ہے۔ امام مالکؒ نے موطا میں حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن عامر نے فرمایا میں نے مقام العرج میں حضرت عثمانؓ بن عفان کو دیکھا گرمی کا زمانہ تھا آپ احرام بند تھے اور چہرہ کو چادر سے ڈھانکے ہوئے تھے کچھ دیر کے بعد شکار کا گوشت پیش کیا گیا آپ نے ساتھیوں سے فرمایا تم لوگ کھاؤ۔ عرض کیا گیا کیا آپ نہیں کھائیں گے۔ فرمایا میری حالت تمہاری طرح نہیں ہے میرے لئے شکار کیا گیا ہے (اس لئے میرے لئے حلال نہیں)۔

(مذکورہ بالا) بعض روایات میں آیا ہے کہ غیر محرم کا شکار کیا ہوا رسول اللہ ﷺ نے کھایا اور بعض روایات میں آیا ہے کہ نہیں کھایا بلکہ لوٹا دیا۔ تینوں اماموں نے ان دونوں روایتوں کو تطبیق دینے کیلئے یہ توجیہ کی کہ حضور ﷺ نے وہ گوشت تو کھالیا جو غیر محرم نے اپنے لئے شکار کیا تھا اور اس شکار کا گوشت نہیں کھایا جو حضور ﷺ کے لئے یا کسی دوسرے محرم کیلئے شکار کیا گیا تھا۔

ہم کہتے ہیں کسی حدیث میں اس تفصیل کا کہیں پتہ نہیں (لہٰذا یہ تفصیل خود ساختہ ہے) ہمارے نزدیک دونوں میں تطبیق دینے کی بہترین توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ اگر غیر محرم نے شکار کیا ہو تو اس کا کھانا (محرم اور غیر محرم) سب کیلئے جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ محرم اس کو نہ کھائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے کھا کر جواز کا اظہار فرمادیا اور نہ کھا کر تنبیہ فرمادی کہ نہ کھانا مستحب ہے۔

...... ایک سوال ......

اگر احادیث میں باہم تعارض ہو اور ایک حدیث کو (روایۃً) دوسری پر ترجیح نہ ہو تو قیاس کا تقاضا ہے کہ تحریم پر احتیاطاً عمل کیا جائے۔

...... جواب ......

ہم کہتے ہیں بیشک یہ ضابطہ ہے لیکن ہم نے اس جگہ اس قول کو اختیار نہیں کیا تاکہ اجماع کی مخالفت لازم نہ آئے کیونکہ بعض قسم کے شکار محرم کے لئے باجماع علماء حلال ہیں۔ محرم کے لئے اگر شکار کیا جائے تو تینوں اماموں کے نزدیک وہ حرام ہے۔

حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خشکی کا شکار تمہارے لئے حلال ہے جب کہ تم احرام بند ہو بشرطیکہ تم نے خود شکار نہ کیا ہو اور نہ تمہارے لئے شکار کیا گیا ہو، (اخرجہ الترمذی والنسائی وابن خزیمہ واحمد)، امام مالکؒ نے فرمایا کہ جو شکار محرم نے خود کیا ہو یا کسی غیر محرم کے لئے جو شکار کیا گیا ہو اس کا حکم بھی اسی شکار کی طرح ہے جو محرم نے خود کیا ہو اور محرم کا خود کیا ہوا شکار تو سب کے لئے حرام ہے لہٰذا) جو شکار محرم کے لئے اس کے احرام بند ہونے کی حالت میں دوسروں نے کیا ہو وہ بھی مردار کی طرح سب لوگوں کے لئے حرام ہے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے فرمایا احاد کی احاد پر ترجیح چاہتی ہے کہ محرم کے لئے خود اسی کا کیا ہوا شکار یا اس کے لئے غیر محرم کا کیا ہوا شکار حرام ہو لیکن اگر کسی غیر محرم نے یا کسی دوسرے محرم نے شکار کیا ہو یا غیر محرم کے لئے شکار کیا گیا ہو یا کسی دوسرے محرم کے لئے شکار کیا گیا ہو تو ان تمام مسائل کا حکم حدیث کے اندر مذکور نہیں ہے باہر سے معلوم ہوتا ہے۔

ہم کہتے ہیں یہ حدیث اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس کو دلیل میں پیش کیا جاسکے کیونکہ اس کی روایت کا مدار عمرو بن ابی عمرو پر ہے۔ امام احمد کی روایت میں عمرو از مرد انصاری از جابرؓ کا سلسلہ ہے اور ترمذی وغیرہ کی روایت میں عمرو از مطلب از جابرؓ آیا ہے گویا امام احمد کی روایت میں عمرو کا راوی ایک نامعلوم انصاری ہے اور ترمذی کی روایت میں عمرو کا راوی مطلب ہے اور ترمذی نے خود صراحت کی ہے کہ حضرت جابرؓ سے مطلب کا سماع ثابت نہیں۔ پھر عمرو بن ابی عمرو جو مطلب کا آزاد کردہ غلام تھا (ثقہ نہیں ہے) یحییٰ بن معین نے کہا ہے کہ اس کی حدیث ناقابل دلیل ہے نیز یحییٰ اور ابوداؤد دونوں نے اس کے متعلق صراحت کی ہے کہ یہ قوی نہیں ہے البتہ امام احمد نے فرمایا کہ اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

پھر استدلال مذکور استدلال بالمفہوم ہے اور استدلال بالمفہوم ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔

حضرت ابوقتادہ کی حدیث کو بھی اس امر کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ اگر غیر محرم، محرم کے لئے شکار کرے تو جس کے لئے شکار کیا گیا ہو اس کے لئے کھانا جائز نہیں ہے۔ ابوقتادہؓ کا بیان ہے کہ حدیبیہ کے زمانہ میں میں رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب نکلا میرے ساتھی احرام بند تھے مگر میں نے احرام نہیں باندھا تھا، مجھے ایک گورخر نظر آیا اور حملہ کر کے میں نے اس کا شکار کر لیا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس کا تذکرہ کر دیا اور یہ بھی عرض کر دیا کہ میں نے احرام نہیں باندھا تھا غیر محرم ہونے کی حالت میں حضور ﷺ کے لئے میں نے یہ شکار کیا ہے۔ حضور ﷺ نے صحابہؓ کو کھانے کا حکم دے (یعنی غیر محرم صحابہؓ کو کھانے کی اجازت دیدی۔ حسب اجازت صحابہؓ نے کھایا مگر حضور نے نہیں کھایا کیونکہ میں نے حضور ﷺ کو اطلاع دیدی کہ آپ ﷺ کے لئے میں نے یہ شکار کیا ہے۔ اخرجہ اسحاق وابن خزیمہ والدار قطنی۔

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ ابن خزیمہ اور ابوبکر نیشاپوری اور دار قطنی سب نے بالاتفاق صراحت کی ہے کہ صرف معمر نے اس روایت میں یہ الفاظ زیادہ بیان کئے ہیں کہ آپ کے لئے میں نے یہ شکار کیا ہے اور حضور ﷺ نے خود اس میں سے نہیں کھایا۔ معمر کے علاوہ یہ الفاظ کسی نے نقل نہیں کئے، شاید یہ معمر کے واہمہ کی ایجاد ہے۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ معمر بن راشد کے (نقل احادیث میں) کچھ اوہام (خود ساختہ ذہول) ہیں۔

میں کہتا ہوں تمام صحیح روایات میں باتفاق آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اس شکار کا گوشت کھایا تھا۔ پھر معمر والی روایت تو امام مالکؒ کے مسلک کے خلاف جا رہی ہے اس میں صراحت ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہؓ کو کھانے کا حکم دیا اور انہوں نے کھایا اس سے معلوم ہوا کہ اگر محرم کے لئے شکار کیا گیا ہو تو دوسرے سب لوگوں کے لئے وہ شکار حلال ہے حالانکہ امام مالکؒ سب لوگوں کے لئے اس کو حرام کہتے ہیں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾ (اور اس اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے پاس تم جمع کئے جاؤ گے)۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (اور اللہ نے کعبہ کو جو ادب کا مکان ہے لوگوں کے قائم رہنے کا سبب قرار دیا ہے)۔

کعبہ مربع ہے اس لئے اس کو کعبہ کہا جاتا ہے ہر مربع گھر کو عرب "کعبہ" کہتے ہیں۔ مقاتل نے کہا کعبہ دوسرے مکانوں سے منفرد ہے اس لئے اس کو کعبہ کہا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک اونچا ہونے کی وجہ سے کعبہ کو کعبہ کہا جاتا ہے۔ کعبہ کا لغوی معنی ہے ابھرنا اور بلند ہونا۔ پاؤں کے ٹخنے کو اسی لئے کعب کہا جاتا ہے۔ جو لڑکی بالغ ہونے کے قریب ہو اور اس کے پستان اٹھ آئے ہوں اس کے لئے عرب کہتے ہیں تَكَعَّبَتْ۔ اَلْبَيْتُ الْحَرَامُ یعنی اللہ نے اس کو حرم بنایا اور اس کی حرمت کی عظمت ظاہر فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا آسمان و زمین کی پیدائش کے دن ہی اللہ نے کعبہ کو حرم بنا دیا تھا۔ قیاما یعنی لوگوں کے دین اور دنیا کی درستگی کا ذریعہ، دین کی درستی کا ذریعہ ہونا تو ظاہر ہے کہ اس کا حج کیا جاتا ہے اور دوسرے شعائر کی ادائیگی اس کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور دنیوی درستی کا ذریعہ ہونا اس لئے ہے کہ حرم کے اندر لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت کی ممانعت کر دی گئی ہے اور یہاں پہنچ کر لوگوں کا مال جان محفوظ ہو جاتا تھا۔

وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ (اور حرمت والے مہینوں کو) اللہ نے لوگوں کے دین دنیا کی درستگی کا ذریعہ بنایا۔ اَلشَّهْرُ سے مراد ہے جنس شہر (یعنی واحد مراد نہیں ہے) حرمت والے چار ماہ ہیں۔ رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم۔ اللہ نے ان چاروں مہینوں کو لوگوں کے لئے پر امن رہنے کے مہینے بنا دیا ان مہینوں میں (عرب) لڑنے مرنے کٹنے لٹنے سے محفوظ رہتے تھے۔

وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ (اور نیاز کے جانوروں کو اور قلائد کو) اللہ نے باعث امن بنایا هَدْيَ وَ قَلَآئِدَ کی تفسیر اسی سورت کے شروع میں گزر چکی۔

ذٰلِكَ (یہ) یعنی باعث درستی بنانا۔ یا احرام وغیرہ کی حرمت کا حکم دینا۔ زجاج نے کہا ذٰلِكَ سے اشارہ ان غیبی اطلاعات اور پیشین گوئیوں کی جانب ہے جن کا کچھ بیان اسی سورت میں کر دیا گیا ہے مثلاً فرمایا ہے سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ یا جیسے ان کی تحریف کتب کی اطلاع دی گئی ہے۔

لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (اس لئے ہے تاکہ تم کو معلوم ہو جائے کہ اللہ ان تمام چیزوں سے واقف ہے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں) ضرر واقع ہونے سے پہلے ایسے احکام جاری کرنا کہ آنے والا ضرر دفع ہو جائے اور منافع حاصل ہو جائیں بتاتا ہے کہ شارع کا علم کامل اور اس کا حکم پر حکمت ہے، اسی طرح غیب کی خبریں دینے سے خبر دینے والے کے علم کی ہمہ گیری معلوم ہوتی ہے۔

وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾ اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ (اللہ ہر شئے سے بخوبی واقف ہے)۔ یہ خاص کے بعد عام کا ذکر اور اطلاق کے بعد مبالغہ ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾ (جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے اور (یہ بھی جان لو کہ) اللہ بڑا معاف کرنے والا مہربان (بھی) ہے)۔ اس آیت میں (ثواب کا) وعدہ اور (عذاب کی) دھمکی ہے جو اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرے اور خلاف ورزی پر جما رہے اس کے لئے عذاب کی دھمکی ہے اور جو احکام کی پابندی کرے اور خلاف ورزی سے باز رہے اس کے لئے ثواب کا وعدہ ہے۔

ابو الشیخ نے بروایت حسن بیان کیا کہ وفات کے قریب حضرت ابو بکرؓ صدیق نے فرمایا کہ اللہ نے نرمی کی آیت سختی کی آیت کے ساتھ اور سختی کی آیت نرمی کی آیت کے ساتھ ذکر فرمائی تاکہ مومن کے دل میں رغبت بھی پیدا ہو اور خوف بھی۔ اللہ سے تمناء باطل نہ کرنے لگے اور خود اپنے کو تباہی میں نہ ڈالے۔

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ (پیغمبر کی ذمہ داری صرف (اللہ کا پیام) پہنچانے کی ہے)۔ اور وہ اپنا فرض تبلیغ ادا کر چکے اور تمہارے خلاف حجت تمام ہو گئی، اب تعمیل میں کوتاہی کرنے کا تمہارے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ رسول اللہ

ﷺ کو جو حکم دیا گیا ہے اس پر پابند ہونے کی اس آیت میں پر زور تاکید ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ ﴿۹۹﴾ تم لوگ جو کچھ ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو اللہ سب سے بخوبی واقف ہے خواہ تصدیق ہو یا تکذیب عمل ہو یا ارادہ۔

اصبہانی نے ترغیب میں نیز واحدی نے حضرت جابرؓ کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب کی حرمت کا ذکر کیا۔ یہ سن کر ایک اعرابی نے عرض کیا، میری تو یہی تجارت تھی، اسی سے میں نے مال کمایا ہے اگر اسی مال میں سے میں کچھ اللہ کی اطاعت میں صرف کروں تو کیا مجھے (آخرت میں) کچھ فائدہ ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ صرف پاک (کمائی) کو قبول فرماتا ہے اس پر رسول اللہ ﷺ کے قول کی تائید میں آیت ذیل نازل ہوئی۔[1]

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ ("کہہ دیجئے ناپاک اور پاک برابر نہیں۔) الفاظ کا عموم دلالت کر رہا ہے کہ اللہ کے نزدیک برا اچھا برابر نہیں خواہ برے اور کھرے آدمی ہوں یا اعمال۔ اس فقرہ میں اچھے اور حلال مال کی ترغیب دی گئی ہے۔

وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ (اگرچہ ناپاک کی کثرت تمہارا دل لبھائے۔) اخلاص کے ساتھ تھوڑا عمل بھی بے دلی کے زیادہ عمل سے بہتر ہوتا ہے اور تھوڑا حلال مال راہ خدا میں خرچ کرنا زیادہ حرام مال خرچ کرنے سے افضل ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس نے چھوارے کا ایک ٹکڑا (پاک کمائی کا) خیرات کیا اور اللہ پاک (مال) کو ہی قبول کرتا ہے تو اللہ اپنے دائیں ہاتھ سے اس کو لیتا ہے اور اس کو بڑھاتا چلا جاتا ہے جیسے تم لوگ اپنے بکری کے بچہ (پر ہاتھ پھیر کر اس) کو بڑھاتے ہو، یہاں تک کہ وہ چھوارے کا ٹکڑا پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ (متفق علیہ) اور مخلص نیکوکار (خواہ تھوڑے ہوں) زمین بھر بدکاروں سے اللہ کے نزدیک بہتر ہیں۔

حضرت سہل بنؓ سعد راوی ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی طرف سے گزرا۔ حضور ﷺ کے پاس اس وقت ایک آدمی اور بیٹھا ہوا تھا، آپ نے اس سے فرمایا اس (گزرنے والے) آدمی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ اس شخص نے جواب دیا یا رسول اللہ ﷺ یہ شخص شریف لوگوں میں سے ہے، اس قابل ہے کہ اگر کہیں اپنے نکاح کا پیام بھیجے تو اس کا پیام قبول کر لیا جائے اور اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش مانی جائے۔ رسول اللہ ﷺ یہ کلام سن کر خاموش رہے، اتنے میں ایک اور آدمی ادھر سے گزرا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ صحابی نے عرض کیا حضور یہ تو ایک غریب مسلمان ہے بس اس قابل ہے کہ اگر کہیں نکاح کی درخواست بھیجے تو قبول نہ کی جائے اور سفارش کرے تو اس کی سفارش مانی نہ جائے اور اگر کچھ کہے تو اس کی بات سنی نہ جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ شخص اس جیسے زمین بھر لوگوں سے بہتر ہے۔ متفق علیہ

فَاتَّقُوا اللّٰهَ (پس اللہ سے تقوی رکھو) تاکہ اللہ کے نزدیک تمہارا شمار پاک لوگوں میں ہو جائے اور پاک عمل و مال کو خواہ کتنا ہی تھوڑا ہو ناپاک کے مقابلہ میں (خواہ کتنا ہی زائد ہو) اختیار کرو۔

بغویؒ نے لکھا ہے فَاتَّقُوا اللّٰهَ کا مطلب (اس جگہ) یہ ہے کہ حاجیوں (کے جان مال) سے کچھ تعرض نہ کرو خواہ وہ حاجی مشرک ہی ہوں (فتح مکہ سے پہلے مشرک بھی کعبہ کا حج کرنے آتے تھے) شریح کا قصہ شروع سورت میں گزر چکا ہے۔

يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ اے دانشمندو! یعنی اے صحیح عقل والو۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ (اس امید پر کہ تم کامیاب ہو جاؤ) یعنی تقوی کی وجہ سے کامیاب ہونے کی امید کرتے ع ۱۳ رکوع ۴

[1] ابن ابی حاتم نے یعقوب اسکندرانی کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کو کسی گورنر نے تحریر بھیجی کہ لگان کی آمدنی ٹوٹ گئی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جواب میں لکھا۔ اللہ فرماتا ہے ناپاک اور پاک برابر نہیں خواہ ناپاک کی کثرت تمہارے دل کو ابھار ہی ہو۔ اگر انصاف، بھلائی اور اصلاح میں تم اس درجہ پر پہنچ سکو جس پر تمہارا سابق ظلم، گناہ اور اللہ کی نافرمانی میں پہنچ گیا تھا تو ایسا کرو۔ ولا قوۃ الا باللہ۔

ہوئے (اللہ کا تو کوئی فعل امید کے زیر اثر نہیں ہو سکتا کیونکہ امید غیر یقینی حالت میں ہوتی ہے اور اللہ کا کوئی عمل قطعی اور یقینی نتیجہ سے خالی نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن مجید میں جہاں لفظ لَعَلَّ آیا ہے اس سے پیدا ہونے والی امید کا رجوع اللہ کی طرف نہیں ہوتا بلکہ بندہ کی طرف ہوتا ہے اسی لئے مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کا ترجمہ اس طرح کیا کہ اللہ سے تقویٰ رکھو یہ امید رکھتے ہوئے کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے)۔

احمد اور ترمذی اور حاکم نے حضرت علیؓ کی روایت سے اور ابن جریر نے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوامامہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ جب آیت وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ نازل ہوئی، تو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہر سال حج فرض ہے۔ حضور خاموش رہے۔ صحابہؓ نے پھر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہر سال۔ فرمایا نہیں اگر میں ہاں کہہ دیتا تو (ہر سال) واجب ہو جاتا۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضور نے فرمایا تم کو اندیشہ نہ ہوا کہ (شاید) میں ہاں کہہ دوں اگر میں ہاں کہہ دیتا تو (ہر سال) حج واجب ہو جاتا اور ہر سال واجب ہو جاتا تو پھر تم سے اس کی ادائیگی ہو نہ سکتی اگر میں تم کو چھوڑے رکھوں تو تم بھی مجھے (بغیر سوال کئے) چھوڑے رکھو۔ تم سے پہلے کے لوگ زیادہ پوچھ پاچھ اور انبیاء سے زیادہ سوالات کرنے سے ہی برباد ہوئے۔ اگر میں تم کو کسی بات کا حکم دوں تو تم سے جہاں تک ہو سکے اس کی تعمیل کرو اور جب کسی بات کی ممانعت کر دوں تو اس سے باز رہو۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ (اے ایمان والو ایسی فضول باتیں مت پوچھو) یعنی ایسی باتیں مت پوچھا کرو جن کا کرنا تم پر دشوار ہو جیسے ہر سال حج کرنے کا سوال حج کے متعلق سوال کرنے والے حضرت عکاشہ بن محصن تھے۔ ابن جریر نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے یہی لکھا ہے۔

خلیل، سیبویہ اور جمہور اہل بصرہ کے نزدیک لفظ اشیاء اسم جمع ہے یعنی لفظاً مفرد اور معنیً جمع ہے۔ اس لفظ کی اصل شیئاء تھی بروزن فعلاء جیسے حمراء ۔ دونوں ہمزوں کے درمیان الف تھا اور چونکہ دوسری ہمزہ تانیث کی ہے اس لئے یہ لفظ غیر منصرف ہے۔ دو ہمزوں کا اجتماع چونکہ ثقیل تھا اس لئے اول ہمزہ کو (جو لام کلمہ کی جگہ پر تھی) اس کی جگہ سے ہٹا کر شروع میں لے آئے اب اس کا وزن لفعاء ہو گیا۔ بعض اشیاء کی اصل اَشْيِئَاءُ بروزن اَفْعِلَاءُ تھی یہ شَيِّئٌ کی جمع ہے۔ شئی اصل میں شَيِّئٌ تھی یا شیئی بروزن صِدِّيْقٌ تھی۔ بعض لوگوں نے کہا جس طرح ابیات، بیت کی جمع ہے اسی طرح اَشْيَاءُ بروزن اَفْعَالٌ شَيْئٌ کی جمع ہے اور شَيْئٌ بغیر کسی تعلیل کے اپنی اصل پر ہے، چونکہ غیر منصرف ہونے کے دو سبب اس میں موجود نہیں ہیں اس لئے اس لفظ کا عدم انصراف شاذ ہے۔

اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (کہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تم کو ناگوار گزریں)۔ یعنی اگر تم کو ان باتوں کے کرنے کا حکم دے دیا جائے تو تم پر دشواری آ پڑے۔

وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ (اور قرآن اترنے کے زمانہ میں تم ایسی باتیں دریافت کرو تو تم سے ظاہر کر دی جائیں) یعنی رسول کی زندگی میں اگر تم ایسی باتیں پوچھو تو احتمال ہے کہ ظاہر کر دی جائیں اور تم کو ان سخت احکام کی تعمیل پر مامور کر دیا جائے۔ دونوں شرطیہ جملے یعنی اِنْ تُبْدَ لَكُمْ اور اِنْ تَسْـَٔلُوْا، اَشْيَآءَ کی صفت ہیں۔ مطلب یہ کہ ایسی باتیں نہ پوچھو کہ تمہارے پوچھنے کے بعد یہ دو نتیجے بر آمد ہونے کا احتمال ہو۔

مسئلہ:- امر کا صیغہ بغیر قید کے احناف کے نزدیک نہ تکرار عمل کا موجب ہے نہ تکرار کا احتمال رکھتا ہے (یعنی بغیر قید کے امر کا صیغہ ہو تو صرف ایک مرتبہ تعمیل حکم کو چاہتا ہے، دوبارہ تعمیل کا مقتضی نہیں، اگر ایک مرتبہ امر کے مطابق عمل کر لیا جائے تو وجوب ساقط ہو جاتا ہے بلکہ دوبارہ وجوب عمل کا احتمال بھی نہیں ہوتا) پس رسول اللہ ﷺ کا ارشاد لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ اور آیت اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ حج کا وجوب (جو عمر بھر میں ایک بار تھا اور دوسرے احکام کا وجوب جن کی ادائیگی عمر بھر میں ایک دفعہ کافی تھی) رسول اللہ ﷺ کے نعم فرمانے اور تمہارے سوال کی وجہ سے احکام کے

بوضاحت بیان کے بعد منسوخ ہو جاتی۔ آیت مذکورہ کو امر مطلق کا بیان نہیں قرار دیا جاسکتا کیونکہ اگر اس کو بیان کہا جائے گا تو ظاہر ہے کہ قبل از سوال بیان نہ ہو گا بلکہ سوال کے بعد ہو گا حالانکہ بیان کی ضرورت سوال سے پہلے بھی تھی اور وقت ضرورت سے بیان کا تاخر جائز نہیں۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ بیان (جدید نزول حکم پر موقوف نہیں بلکہ) عقل، غور اور تلاش لغت سے بھی ہو جاتا ہے (مگر نسخ بغیر حکم جدید کے نہیں ہوتا) اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ مجمل یا مشکل یا خفی کے متعلق سوال کرنے میں کوئی حرج نہیں (نہ اس کی ممانعت آیت سے مستفاد ہے) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے عاجز کی شفا پوچھ لینا ہے۔ در حقیقت ممانعت ایسے حکم کو دریافت کرنے کی ہے جو (مثبت، منفی کسی طور پر) شریعت میں نہیں آیا (اور خواہ مخواہ سوال کرنے کا یہ نتیجہ نکلے کہ حکم نازل ہو جائے) جیسے ہر سال حج کرنے کے متعلق سوال یا بنی اسرائیل کو جو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا اس کے رنگ کے متعلق سوال۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا (ایسی چیزیں جن کو کرنے کا حکم دینے سے اللہ نے درگزر کی ہو) یہ بھی ترجمہ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ تم سوال کر چکے اللہ نے اس کو تو معاف کر دیا آئندہ پھر ایسا نہ کرنا۔ اس صورت میں یہ جملہ استینافیہ ہو گا (یعنی ترکیب لفظی کے اعتبار سے کلام سابق سے مربوط نہ ہو گا۔

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿١٠١﴾ (اور اللہ بڑی مغفرت اور بڑے علم والا ہے) یعنی معاف کر دیتا ہے اگر تمہاری طرف سے قصور یا زیادتی ہو جائے تو فوراً سزا نہیں دیتا۔

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ (تم [1] سے پہلے بھی کچھ لوگوں نے ایسے سوال کئے تھے۔) [2] سَاَلَهَا کی ضمیر اَشْيَآءَ کی طرف راجع ہے اور عن محذوف ہے (یعنی ان چیزوں کے متعلق سوال کئے تھے) یا ھا ضمیر مسئلہ کی طرف راجع ہے جس پر لفظ لَا تَسْاَلُوْا دلالت کر رہا ہے (اس وقت عن کو محذوف قرار دینے کی ضرورت نہ ہو گی)۔

بیضاوی نے مِنْ قَبْلِكُمْ کا تعلق سَاَلَهَا سے قرار دیا ہے۔ قومٌ کی صفت نہیں قرار دیا (ہمارا ترجمہ بھی اس کے موافق ہے) کیونکہ ظرف زمان نہ صفت ہو سکتا ہے نہ حال نہ خبر، لیکن یہ استدلال قابل اعتراض ہے ظرف کی اسناد ایسی چیز کی طرف درست ہے جس کے اندر اس چیز کا وقوع متعین نہیں جیسے لهلال یوم الجمعه ہلال کا ظہور یوم جمعہ میں متعین نہیں اس لئے اس مثال میں تعین کو ظاہر کرنے کے لئے یوم جمعہ کی اسناد وقوع ہلال کی طرف کی گئی۔

بنی اسرائیل کو جب گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے گائے کی کیفیت اور رنگ دریافت کرنا شروع کیا۔ ثمود نے حضرت صالح سے (پہاڑ سے) اونٹنی برآمد کرنے کی درخواست کی تھی اور کچھ لوگوں نے حضرت عیسیٰ سے درخواست کی کہ خوان آسمان سے اتر کر آئے۔ حضرت موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل نے پیغمبر وقت سے سوال کیا کہ ہمارے لئے کوئی بادشاہ مقرر کرو جس کے جھنڈے کے نیچے رہ کر ہم اللہ کی راہ میں جالوت سے لڑیں۔

---

[1] حضرت ابی بن کعب کی قرأت میں اس طرح آیا ہے قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ بینت لَهُمْ فَاَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ اخرجہ ابن جریر و ابن المنذر۔

[2] حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ غضب ناک حالت میں باہر تشریف لائے غصہ سے چہرہ مبارک سرخ ہو رہا تھا پھر جا کر ممبر پر تشریف فرما ہو گئے اس وقت ایک آدمی نے کھڑے ہو کر پوچھا میرے باپ دادا کہاں ہیں، حضور نے ارشاد فرمایا دوزخ میں۔ پھر دوسرا آدمی کھڑا ہوا اور عرض کیا میرا باپ کون ہے، فرمایا تیرا باپ فلاں شخص ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے (ناراضگی کی یہ کیفیت دیکھی تو) کھڑے ہو کر عرض کیا ہم اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر، محمد کے نبی ہونے پر اور قرآن کے دستور ہونے پر راضی ہیں یا رسول اللہ ہمارا دور جاہلیت شرک ابھی گزرا ہے اور اسلام میں ابھی داخل ہوئے ہیں اس لئے ہماری گستاخی قابل معافی ہے) اور اللہ ہی خوب واقف ہے کہ ہمارے باپ دادا کون تھے (اور کہاں ہیں) یہ سن کر حضور ﷺ کا غصہ فرو ہوا اور آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْاَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ الخ نازل ہوئی۔ (از مفسر رحمۃ اللہ علیہ)

ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ (پھر اس سوال کی وجہ سے وہ کافر ہوگئے) کیونکہ سوال کے بعد جو ان کو حکم دیا گیا اس کی انہوں نے اطاعت نہیں کی۔

ابو ثعلبہ خشنی نے فرمایا اللہ نے کچھ فرائض مقرر کردیئے ہیں تم (سوال کر کے) اس سے آگے نہ بڑھو کچھ باتوں کی ممانعت کردی ہے اس کی (خلاف ورزی کر کے) پردہ دری نہ کرو۔ کچھ حدود بندی کردی ہے ان حدود سے تجاوز نہ کرو کچھ چیزوں (کے ظاہر کرنے) سے بغیر نسیان کے اس نے درگزر کی ہے تم ان کو (سوال کر کر کے) نہ اکھاڑو۔ بخاری نے بحوالہ قتادہؓ حضرت انس بن مالکؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ سوالات کئے اور اتنے مبالغہ کے ساتھ کئے کہ آپ غضب ناک ہوگئے اور ممبر پر تشریف لے جاکر فرمایا آج جس چیز کے متعلق تم سوال کرو گے میں اس کا جواب کھول کر دیدوں گا۔ (پوچھو کیا پوچھتے ہو) یہ سن کر میں دائیں بائیں دیکھنے لگا میں نے دیکھا کہ ہر شخص کپڑے میں سر لپیٹے رو رہا ہے ایک آدمی تھا جو اپنا نسب غیر باپ سے جوڑتا تھا۔ اس نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میرا باپ کون ہے فرمایا حذافہ۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے عرض کیا ہم اللہ کے رب ہونے سے، اسلام کے دین ہونے سے اور محمد ﷺ کے رسول ہونے سے راضی ہیں اور فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آج کی طرح کوئی دن کبھی میں نے نہیں دیکھا نہ خیر میں نہ شر میں، میرے سامنے جنت اور دوزخ کی تصویر لائی گئی (یعنی میری نظر کے سامنے دونوں کو لایا گیا) یہاں تک کہ دیوار سے پرے میں نے دونوں کو دیکھ لیا۔ قتادہؓ اس حدیث کو بیان کرتے وقت آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ الخ کا ذکر کررہے تھے۔

یونس نے بروایت زہری عبید اللہ بن عبد اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ عبد اللہ بن حذافہ کی ماں نے عبد اللہ سے کہا میں نے تجھ سے زیادہ ماں کا نافرمان بیٹا کوئی نہیں سنا، تجھے کچھ اندیشہ نہ ہوا اگر دور جاہلیت کی عورتوں کی طرح تیری ماں سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہوگئی تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے تو اس کو رسوا کرنے لگا۔ عبد اللہ نے کہا خدا کی قسم اگر وہ حبشی غلام سے میرا جوڑ ملادیتے تو میں اسی سے اپنے کو ملادیتا۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ہم دور جاہلیت سے ابھی نکلے ہیں آپ ہم سے درگزر فرمائیے، اللہ آپ سے درگزر فرمائے گا۔ یہ سن کر حضور ﷺ کا غصہ فرو ہوا۔

بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ سے بطور استہزاء سوال کررہے تھے ایک کہہ رہا تھا میرا باپ کون ہے دوسرا کہہ رہا ہے میری اونٹنی گم ہوگئی ہے بتائیے میری اونٹنی کہاں ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے دونوں واقعات ہوسکتے ہیں اور دونوں کے متعلق آیت کا نزول ہوسکتا ہے۔ مگر حضرت ابن عباسؓ کی روایت کی سند تمام روایات سے زیادہ صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں اگر آیت کا نزول حج کے سوال کے متعلق قرار دیا جائے تو سیاق قرآنی کے زیادہ مناسب ہے لیکن اگر آیت کے نزول کا تعلق باپ کا نام دریافت کرنے سے جوڑا جائے تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ایسی چیزیں دریافت نہ کرو کہ اگر تم پر ان کا اظہار کردیا جائے تو تم کو برا لگے یعنی اگر تمہارا صحیح نسب ظاہر کردیا جائے اور غیر باپ کا نام بتادیا جائے تو تمہاری رسوائی ہو اور تم کو دکھ پہنچے۔ مجاہد نے کہا اس آیت کا نزول اس وقت ہوا جب لوگوں نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کا حکم دریافت کیا تھا دیکھو متصل آیت میں انہی کا حکم بیان فرمایا ہے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ (اللہ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے، نہ سائبہ کو، نہ وصیلہ کو، نہ حام کو۔) یعنی اللہ نے ان کی اجازت نہیں دی نہ ان کا حکم جاری کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جو اونٹنی پانچ مرتبہ بیاہ چکتی تھی اس کا کان چیر کر آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا، نہ اس پر بوجھ لادا جاتا تھا، نہ کوئی اس پر سوار ہوتا تھا، نہ اس کا اون کاٹا جاتا تھا، نہ کسی پانی اور چراگاہ سے اس کو روکا جاتا تھا۔ اگر پانچویں گیابھ میں نر بچہ پیدا ہوتا تھا تو بچہ کو ذبح کر کے مرد عورتیں سب ملکر کھا سکتے اور اگر بچہ مادہ ہوتا تو اس کا بھی کان چیر دیتے تھے ایسی سانڈھنی کو بحیرہ کہا جاتا تھا۔

ابو عبیدہ نے کہا منت پر چھوڑے ہوئے سانڈھ اونٹ کو سائبہ کہا جاتا تھا اگر کسی بیمار کی صحت یا مسافر کی واپسی کے لئے منت مانی جاتی تھی تو مراد پوری ہونے پر اونٹ کو سانڈھ بنا کر چھوڑ دیا جاتا تھا اور کسی چراگاہ یا چشمہ سے اس کو نہیں روکا جاتا تھا، نہ اس پر کوئی سوار ہوتا تھا گویا بحیرہ کی طرح اس کو بھی سانڈھ بنا دیا جاتا تھا سائبہ نر بھی ہوتا اور مادہ بھی۔

بعض اہل لغت نے لکھا ہے کہ اگر کسی اونٹنی کے بارہ جھول تک مادہ بچہ پیدا ہوتا رہتا تھا تو اس کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا، نہ اس پر کوئی سوار ہوتا تھا، نہ اس کا اون کاٹا جاتا تھا اور سوائے مہمان کے نہ اس کا دودھ کوئی پی سکتا تھا۔ اس کے بعد (تیرھویں گیابہ میں) جو بچہ پیدا ہوتا اس کا کان چیر کر ماں کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا اور جو سلوک ماں کے ساتھ کیا جاتا وہی بچہ کے ساتھ کیا جاتا تھا ایسی ماں کو سائبہ اور ایسے بچہ کو بحیرہ کہتے تھے۔

علقمہ نے کہا غلام کو (ہر چیز سے) آزاد قرار دیا جاتا تھا نہ اس کا حق ولاء مانا جاتا تھا، نہ خوں بہا نہ، میراث۔ اس کے خلاف رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حق ولاء اس شخص کے لئے ہے جس نے آزاد کیا ہو۔ سَائِبَۃٌ بروزن فَاعِلَۃٌ بمعنی مفعول ہے یعنی آزاد کردہ جیسے عِیْشَۃٌ رَّاضِیَۃٌ میں رَاضِیَۃٌ بمعنی مَرْضِیَّۃٌ ہے یعنی پسندیدہ یا پسند کردہ۔ اگر کوئی بکری سات بار بیاہ چکتی اور ساتواں بچہ نر ہوتا تو اس کو ذبح کرتے اور مرد عورتیں سب کھا سکتے تھے اور اگر ساتواں بچہ مادہ ہوتا تو اس کو ذبح نہ کرتے۔ بلکہ بکریوں میں چھوڑ دیتے تھے اور اگر ساتویں بیاہت میں نر مادہ دونوں پیدا ہوتے تو مادہ کے ساتھ نر کو چھوڑ دیتے اور ذبح نہ کرتے تھے اور کہتے تھے اس مادہ نے نر کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا ایسے مادہ کو وصیلہ کہا جاتا تھا، اس مادہ کا دودھ عورتوں کے لئے حرام قرار دیا جاتا تھا اگر دونوں میں سے کوئی مر جاتا تو پھر مرد اور عورتیں سب اس کو کھا سکتے تھے۔

اگر کسی نر اونٹ کے تخم سے دس بچے پیدا ہو چکتے تو کہتے اب اس کی پشت (سوار ہونے اور بار اٹھانے سے) محفوظ ہو گئی اس کے بعد اس پر کوئی سوار نہ ہوتا، نہ اس پر بوجھ لادا جاتا، نہ کسی چراگاہ اور چشمہ سے اس کو روکا جاتا اس کو حام کہا جاتا تھا، اگر حام مر جاتا تو مرد اور عورتیں سب اس کو کھا سکتے تھے۔

بخاری نے سعید بن مسیب کا قول نقل کیا ہے کہ بحیرہ وہ اونٹنی ہوتی تھی جس کا دودھ بتوں کے لئے محفوظ مانا جاتا تھا کوئی اس کو دوہتا نہ تھا اور سائبہ وہ سانڈھنی ہوتی تھی جو دیوتاؤں کے نام پر آزاد چھوڑ دی جاتی تھی کوئی اس پر سوار نہ ہوتا تھا اور وصیلہ وہ اونٹنی ہوتی تھی جس کے پہلے بیاہت میں نر اور دوسرے گابھ میں مادہ پیدا ہوتی تھی اگر مادہ کے بعد تیسری مرتبہ میں بھی مادہ بچہ پیدا ہوتا تو بتوں کے نام پر اس کو آزاد چھوڑ دیتے تھے اس کو وصیلہ کہتے تھے۔ حام وہ اونٹ ہوتا تھا جو محدود معین عدد میں جب جفتی کر چکتا اور اس کی نسل سے مقررہ عدد (میں بچے پیدا ہو چکتے تو اس کو بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے تھے پھر اس پر کسی قسم کا بوجھ نہیں لادا جاتا تھا اس کو حام کہتے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے دیکھا کہ عمرو بن عامر خزاعی دوزخ کے اندر اپنی انتڑیاں گھسیٹے پھر رہا تھا اسی نے سب سے پہلے سائبہ بنانے کی رسم قائم کی۔

بغوی نے محمد بن اسحاق کی روایت سے حضرت ابوہریرہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اکثم بن جون خزاعی سے فرمایا اکثم میں نے دیکھا کہ عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف اپنی انتڑیاں دوزخ کے اندر کھینچے پھر رہا ہے۔ میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی کسی کا اتنا ہم شکل ہو جتنا تو عمرو سے اور عمرو تجھ سے مشابہ تھا۔ عمرو بن لحی نے ہی سب سے پہلے دین اسماعیلی کو بگاڑا۔ استھان قائم کئے، بحیرہ اور سائبہ بنانے کی رسم ایجاد کی۔ وصیلہ کو وصیلہ اور حامی کو حامی بنانے کی بنیاد ڈالی میں نے دیکھا کہ اس کی آنتوں کی بدبو سے دوزخیوں کو بھی اذیت ہو رہی تھی۔ اکثم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا اس کا ہم شکل ہونے سے مجھے کچھ ضرر پہنچے گا۔ فرمایا نہیں۔ تو یقیناً مؤمن ہے اور وہ کافر تھا۔

وَلٰکِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ ط (لیکن یہ کافر اللہ پر دروغ بندی کرتے ہیں۔) یعنی کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم کو یہ باتیں کرنے کا حکم دیا ہے۔

وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۳ (اور ان میں سے اکثر جانتے بھی نہیں ہیں) کہ حلال اور حرام قرار دینے کی وجہ کیا ہے، بلکہ اپنے جاہل بزرگوں کی تقلید کرتے ہیں۔ آیت میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ بعض لوگ اپنے طریقہ کی غلطی کو جانتے ہیں مگر سرداری کی محبت اور باپ دادا کی تقلید ان کو اقرار حق سے روکتی ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (حلت و حرمت کے متعلق) اللہ نے جو حکم نازل کیا اور رسول نے جو کچھ فرمایا اس کی طرف آؤ (اس کو مانو اور عمل کرو)۔)

قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ (تو کہتے ہیں جس طریقہ پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے وہی ہمارے لئے کافی ہے) یہ کافروں کی کوتاہ فہمی کا اظہار ہے اور اس امر کی صراحت ہے کہ سوائے باپ دادا کی تقلید کے ان کے پاس اور کوئی دلیل نہیں ہے۔

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝۱۰۴ (کیا اس حالت میں بھی تقلید اسلاف ان کے لئے کافی ہوگی جبکہ ان کے باپ دادا کچھ (صحیح) علم نہیں رکھتے تھے اور نہ ہدایت یافتہ تھے۔ اَو میں واو حالیہ ہے اور ہمزہ انکاریہ۔ یعنی کیا باپ دادا کی جہالت اور گمراہی کی تقلید بھی ان کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ تقلید تو صرف ہدایت یافتہ علماء ہی کی مناسب ہے (نادان گمراہوں کی پیروی جہالت اور گمراہی ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ (اے ایمان والو! اپنی فکر رکھو یعنی اپنی اصلاح کو لازم قرار دو۔) [1]

لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ (جب تم راہ راست پر قائم رہو گے تو جو گمراہ ہے وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔)

بعض علماء نے لکھا ہے کہ آیت کا نزول اس وقت ہوا تھا جب مسلمان کافروں کی حالت پر افسوس کرتے اور ان کے مسلمان ہو جانے کی تمنا کرتے تھے۔ احمد اور طبرانی نے حضرت ابو عامر اشعری کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کی تشریح دریافت کی (کہ مَنْ ضَلَّ سے کون لوگ مراد ہیں) فرمایا کافر جو گمراہ ہیں تم کو کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے جب کہ تم راہ راست پر رہو گے۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا مَنْ ضَلَّ سے مراد یہودی اور عیسائی ہیں یعنی اے مسلمانو! اگر تم راہ راست پر قائم رہو گے تو اہل کتاب تم کو ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔ لہٰذا تم ان سے جزیہ لو اور ان کو چھوڑ دو۔

بعض علماء کا بیان ہے کہ (دور صحابہ میں) جب بعض لوگ مسلمان ہوتے تھے تو (بھائی بندوں کی طرف سے) ان سے کہا جاتا تھا تو نے اپنے باپ کو بے وقوف سمجھ رکھا ہے (اس کی تفصیل) عفرہ کے آزاد کردہ غلام حضرت عمر نے بیان کی ہے جس کو ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ کی وجہ نزول یہ تھی کہ بعض لوگ جب مسلمان ہو جاتے اور ان کے باپ یا بھائی کافر ہوتے تو چونکہ ایمان کی چاشنی اس مسلمان کے دل نشین ہو چکتی تھی اس لئے وہ اپنے باپ اور بھائی کو بھی مسلمان ہو جانے کی دعوت دیتا تھا۔ جواب میں وہ لوگ کہتے تھے، باپ دادا کا طریقہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اس پر آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

آیت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ بھلائی کا حکم اور برائی سے بازداشت ترک کر دو (اور تبلیغ کو ختم کر دو) کیونکہ بقدر طاقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر خود اھتداء کے ذیل میں داخل ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا تھا لوگو! تم آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

---

[1] عفرہ کے آزاد کردہ غلام عمر کی روایت سے ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ کی وجہ نزول یہ ہے کہ بعض لوگ خود تو مسلمان ہو جاتے تھے مگر ان کے باپ بھائی کافر رہتے تھے ایسے مسلمانوں کو جب ایمان کی چاشنی مل گئی تو انہوں نے باپ اور بھائیوں کو بھی اسلام کی دعوت دی لیکن انہوں نے جواب دیا ہم کو باپ دادا کا طریقہ کافی ہے اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ پڑھتے ہو اور اس کا مطلب غلط سمجھتے ہو۔ میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے، لوگ اگر برائی کو دیکھ کر اس کو نہ بدلیں گے (یعنی بدلنے کی کوشش نہیں کریں گے) تو ہوسکتا ہے کہ اللہ سب کو عذاب میں عموماً مبتلا کردے۔ رواہ ابن ماجہ والترمذی، ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

ابوداؤد کی روایت میں ہے اگر لوگ ظالم کو (ظلم کرتے) دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو ممکن ہے اللہ سب کو عموماً عذاب میں مبتلا کردے۔ ایک اور روایت میں آیا ہے جن لوگوں کے اندر گناہ کئے جائیں اور لوگ ان کو بدل سکتے ہوں لیکن (باوجود قدرت کے) نہ بدلیں تو ہوسکتا ہے کہ اللہ عموماً سب پر عذاب لے آئے۔ دوسری روایت میں آیا ہے جس قوم میں گناہ کئے جاتے ہوں اور گناہ نہ کرنے والے کرنے والوں سے زیادہ ہوں الخ۔ تیسری روایت میں آیا ہے لوگ بھلائی کا حکم دیں اور برائی سے بازداشت کریں ورنہ شریر لوگوں کو اللہ تم پر مسلط کردے گا پھر وہ تم کو بدترین عذاب کی تکلیفیں دیں گے اس وقت تم میں کے نیک لوگ بھی اگر تمہارے لئے دعا کریں گے تو ان کی دعا قبول نہ ہوگی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو جب تک تمہاری بات مانی جائے اگر تمہاری بات لوٹادی جائے تو پھر (تنہا) اپنی (اصلاح کی) فکر کرو۔ قرآن میں کچھ آیات ایسی نازل ہوئیں جن کا مصداق نزول سے پہلے ہی گزر چکا، کچھ آیات ایسی نازل ہوئیں جن کا مصداق رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود ہوگیا، کچھ آیات کا مصداق رسول اللہ کے تھوڑے زمانہ بعد واقع ہوگیا۔ کچھ آیات کا مصداق اب سے کچھ بعد آجائے گا۔ کچھ آیات کا مصداق آخر زمانہ میں واقع ہوگا اور کچھ آیات کا مصداق جن میں حساب، جنت اور دوزخ کا ذکر ہے قیامت کے دن آئے گا۔ پس جب تک تمہارے دل اور خواہشات متحد ہوں اور فرقہ بند ہوکر آپس میں گتھم گتھا نہ ہو جاؤ اور ایک دوسرے پر حملہ آور نہ ہو اس وقت تک بھلائی کی تبلیغ اور برائی سے بازداشت کرو اور جب دلوں میں اور خیالات میں پھوٹ پڑجائے اور فرقہ بند ہوکر آپس میں گتھم گتھا ہو جاؤ اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگے اس وقت ہر شخص کو صرف اپنی (اصلاح کی) فکر کرنی چاہئے ایسے وقت میں اس آیت کا مصداق محقق ہوگا۔ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ اور بیہقی نے شعب الایمان میں بحوالہ ابوالعالیہ مذکورہ بالا بیان کی نسبت حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی طرف کی ہے۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوثعلبہ خشنی کا بیان نقل کیا ہے حضرت ابوثعلبہ نے کہا خدا کی قسم میں نے اس آیت کا مطلب رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تھا۔ حضور نے فرمایا (اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امر و نہی ترک کرکے بیٹھ رہو) بلکہ مطلب یہ ہے کہ بھلائی پر چلو اور برائی سے باہم روکتے رہو اور خود بھی باز رہو، لیکن جب دیکھ لو کہ لوگ ہوا و ہوس کے بندے ہوگئے ہیں، خواہشات کے پیچھے پڑے ہیں، دنیا کو (دین پر) ترجیح دی جارہی ہے اور ہر شخص خود رائے ہوگیا ہے، اپنے خیال میں مست ہے اور تم کو بھی کچھ کرنا ہی ہو (کچھ کرنے پر تم مجبور ہو) تو ایسے وقت میں صرف اپنے نفس (کی اصلاح) کی فکر کرو اور عوام کی فکر چھوڑ دو۔ یہ امر یقینی ہے کہ تمہارے آگے کچھ مصائب کا زمانہ آئے گا۔ ان شدائد میں صبر رکھنا اتنا مشکل ہوگا جیسے انگاروں کو مٹھی میں دبانا اس وقت نیک عمل کرنے کا ثواب ان پچاس آدمیوں کے برابر ہوگا جنہوں نے اسی جیسی نیکی کی ہو۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا اس شخص کا اجر ان میں سے ہی پچاس آدمیوں کے برابر ہوگا فرمایا تمہارے پچاس آدمیوں کے برابر۔

بعض اہل روایت کا قول ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول اہل بدعت کے حق میں ہوا تھا۔ ابوجعفر رازی نے ذکر کیا ہے کہ صفوان بن محرز کے پاس ایک بدعتی جوان آیا اور اپنی کسی بات کا ذکر کرنے لگا۔ صفوان نے کہا میں تم کو کلام اللہ کی ایک خاص آیت بتاتا ہوں جس میں اللہ نے اپنے اولیاء کا مخصوص طور پر ذکر کیا ہے فرمایا ہے یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ۔

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا (تم سب کی (یعنی گمراہ اور ہدایت یافتہ لوگوں کی) اللہ ہی کی طرف واپسی ہے۔)

فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۰۵﴾ (پھر وہی تم کو ان اعمال کی اطلاع دے گا جو تم کرتے رہے تھے۔)
یعنی ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا کسی کو دوسرے کے قصور پر نہیں پکڑے گا۔ اس فقرہ میں گمراہ اور ہدایت یافتہ دونوں گروہوں کے لئے وعدہ اور وعید ہے۔ بغوی نے ذکر کیا ہے اور بخاری، ابوداؤد اور ترمذی نے بھی بغوی کے بیان کی طرح حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ تمیم داری اور عدی بن بدر تجارت کے لئے شام کو گئے اس زمانہ میں یہ دونوں عیسائی تھے۔ ان کے ساتھ عمرو بن عاص کے آزاد کردہ غلام بدیل بھی تھے۔ بدیل مسلمان تھے شام پہنچ کر بدیل بیمار ہو گئے (موت کا یقین ہو گیا تو) اپنے موجودہ سامان کی ایک فہرست لکھ کر سامان میں ہی ڈال دی اور ساتھیوں کو اطلاع نہیں دی بلکہ دونوں ساتھیوں کو وصیت کر دی کہ میرا سامان میرے گھر پہنچا دینا، پھر مر گئے۔ دونوں ساتھیوں نے سامان کی تلاشی لی تو سامان میں چاندی کا ایک برتن ملا جس کا وزن تین سو مثقال تھا اور اس پر سنہری کام کیا ہوا تھا دونوں نے وہ برتن لے کر چھالیا اور اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر جب مدینہ لوٹے تو بدیل کے گھر والوں کو بدیل کا سامان پہنچا دیا۔ بدیل کے گھر والوں نے سامان کی جانچ کی تو اس کے اندر موجودات کی ایک فہرست لکھی ہوئی ملی، انہوں نے تمیم اور عدی سے آکر پوچھا تو کیا اس نے کوئی تجارت کی تھی، دونوں نے جواب دیا نہیں۔ گھر والوں نے کہا تو کیا اس کی بیماری اتنی لمبی ہو گئی تھی کہ اس کو کوئی چیز خرچ کرنی پڑی تھی، دونوں نے کہا نہیں اس وقت گھر والوں نے کہا ہمیں سامان میں ایک تحریر ملی ہے جس میں پورے سامان کی فہرست ہے مگر سامان میں چاندی کا ایک پیالہ سونے کے ملمع والا جس کا وزن تین سو مثقال تھا موجود نہیں ہے دونوں نے جواب دیا، ہمیں معلوم نہیں ہم سے اس نے کہا تھا کہ سامان تمہارے پاس پہنچا دیں ہم نے پہنچا دیا ہم کو برتن کا کچھ علم نہیں، غرض انہوں نے انکار کر دیا اور معاملہ کی رپورٹ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کی گئی اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ (اے مسلمانو! تمہارے آپس میں دو آدمیوں کا وصی ہونا مناسب ہے جب کہ تم میں سے کسی کو موت آنے لگے وصیت کے وقت۔)
شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ مبتدا ہے اور اثْنَانِ خبر، اثْنَانِ سے پہلے لفظ شہادت محذوف ہے۔ الفاظ کے اعتبار سے جملہ خبریہ ہے لیکن معنی امر کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وصیت کے وقت دو آدمی موجود ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اثْنَانِ، شَهَادَةُ (مصدر) کا فاعل ہو اور شَهَادَةُ مبتدا ہو اور اس کی خبر اس سے پہلے محذوف ہو یعنی جس چیز کی وصیت مردہ نے کی ہے اس پر دو آدمیوں کی شہادت ہو۔ شہادت سے مراد ہے گواہ بنانا یعنی دو آدمیوں کو بلا لینا تاکہ میت ان سے کہہ دے۔ قصہ کی رفتار اسی مفہوم پر دلالت کر رہی ہے جیسے دوسری آیت میں آیا ہے وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ۔
دو کی قید احتیاطی ہے (ضروری اور لازم نہیں) ورنہ باجماع علماء وصیت کے وقت ایک وصی ہونا بھی کافی ہے إِذَا حَضَرَ، شہادت کا ظرف زمان ہے یعنی جب موت کا وقت آجائے، مطلب یہ کہ جب موت کی علامات نمودار ہو جائیں، حِينَ الْوَصِيَّةِ حَضَرَ کا ظرف ہے یا إِذَا حَضَرَ سے بدل ہے۔ بدل قرار دینے سے اس طرف اشارہ ہو جائے گا کہ موت کے وقت وصیت کو حقیر سمجھ کر ترک نہ کر دیا جائے موت آنے کا وقت لازمی وصیت کا وقت ہے (بدل) اصل مقصود ہوتا ہے اور مبدل منہ اس کی تمہید ہوتا ہے حَضَرَ مفسر نے اسی ضابطہ کی طرف ایماء کیا ہے)۔

ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ (جو تم میں سے ہوں اور (نیک آدمی ہوں تم میں سے) یعنی مسلمان میں سے کیونکہ نیک مسلمان ہی امانت دار بنائے جانے کا زیادہ اہل ہے۔

أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ (یا غیر مسلموں میں سے کوئی دوسرے دو آدمی ہوں۔)

إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةُ الْمَوْتِ (اگر تم کہیں سفر میں گئے ہو اور تم پر موت کا حادثہ آپڑے) پھر تم نے ان کو وصی بنایا ہو اور ان کو اپنا مال دے دیا ہو اور بعض وارث ان پر خیانت کا شبہ کریں اور وہ دونوں خیانت کے منکر ہوں۔ یہ تمام امور محذوف ہیں، قصہ بدیل ان کے حذف پر دلالت کر رہا ہے۔

تَحْبِسُوْنَهُمَا تم خیانت کا انکار کرنے والے (دونوں وصیوں کو روکے رکھو) یہ لفظ اِثْنَانِ کی بھی صفت ہو سکتا ہے اور آخَرَانِ کی بھی۔ یعنی وصیت کے وقت جو دونوں شخص موجود تھے ان میں سے ہر ایک کو روکے رکھو۔

مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ (نماز کے بعد) یعنی عصر کی نماز کے بعد کیونکہ یہی وقت لوگوں کے بھی زیادہ اجتماع کا ہے اور شب و روز کے ملائکہ کے ملنے کا بھی بعض کے نزدیک عام نماز مراد ہے۔

فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۞ (اگر تم کو شبہ ہو تو (نماز کے بعد دونوں میں سے ہر ایک کو روک رکھو) پھر وہ اللہ کی قسم کھائیں (اور کہیں) کہ اس قسم کے عوض ہم کوئی دنیوی نفع لینا نہیں چاہتے اگرچہ کوئی قرابت دار ہی ہو اور اللہ کی بات کو ہم پوشیدہ نہیں رکھیں گے (ورنہ) اس حالت میں سخت گناہ گار ہوں گے)۔

یعنی اگر کسی وارث کو شبہ ہو اور وہ دونوں وصیوں کو خائن قرار دے اور وصی خیانت کا انکار کریں تو حاکم وصیوں سے قسم لے اور دونوں وصی قسم کھائیں۔ لیکن اگر وارثوں کو خیانت کا شبہ نہ ہو تو وصیوں کو قسم دینے کی ضرورت نہیں۔

اِنِ ارْتَبْتُمْ کی شرط بطور جملہ معترضہ ہے قسم کا جواب لَا نَشْتَرِيْ ہے۔ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ یعنی ہم قسم باللہ کے عوض نہیں لیں گے۔ ثَمَنًا یعنی دنیوی مال مراد یہ ہے کہ ہم لالچ میں آکر جھوٹی قسم نہیں کھاتے۔ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى سے یہ مراد ہے کہ وصی خواہ میت کا قرابتدار ہی ہو اور وارث اس پر خیانت کا شبہ کریں تو اس سے بھی قسم لی جائے گی قسم لینے کا حکم صرف اجنبی اور غیر کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ شَهَادَةَ اللّٰهِ یعنی وہ شہادت جس کو ادا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ شہادت سے مراد ہے حق کو ظاہر کرنا اور سچ سچ کہنا خواہ اپنی ذات کے خلاف پڑے۔ اِنَّآ اِذًا یعنی اگر ہم حق پوشی کرینگے تو اس حالت میں ہم پکے گناہ گار ہونگے۔

اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے عصر کی نماز کے بعد تمیم اور عدی کو بلوا کر ممبر کے پاس اس طرح قسم لی کہ قسم ہے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ ہم نے اس چیز میں کوئی خیانت نہیں کی جو بدیل نے ہم کو دیا تھا۔ دونوں نے یہ قسم کھائی اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا۔ پھر ایک طویل مدت کے بعد وہ برتن ان دونوں کے پاس پایا گیا۔ سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ وہ برتن مکہ میں ملا اور جن لوگوں کے پاس ملا تھا انہوں نے کہا کہ تمیم وعدی سے یہ خریدا ہے یہ خبر بنی سہم کو پہنچی تو وہ تمیم وعدی کے پاس گئے۔ تمیم وعدی نے کہا ہم نے یہ برتن بدیل سے خرید لیا تھا۔ بنی سہم نے کہا تم نے تو پہلے یہ کہا تھا کہ بدیل نے کوئی چیز نہیں فروخت کی۔ کہنے لگے فروخت کرنے کا کوئی ثبوت تو ہمارے پاس تھا نہیں، اس لئے ہم نے پسند نہیں کیا کہ اس کے موجود ہونے کا تم سے اقرار کریں پوشیدہ رکھنے کی یہی وجہ ہوئی۔ بنی سہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مرافعہ کیا تو آیت ذیل نازل ہوئی۔

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا (پھر اگر اطلاع ملے کہ وصی گناہ کے مستوجب ہوئے ہیں) یعنی انہوں نے اپنی خیانت کی وجہ سے ایسا فعل کیا ہے جو موجب گناہ ہے مطلب یہ کہ الزام خیانت کو اپنے اوپر سے دفع کرنے کے لئے انہوں نے جھوٹی قسمیں کھائی ہوں یا خریدنے کا دعویٰ کیا ہو یا ایسی ہی کوئی اور حرکت کی ہو عثر کا اصل معنی ہے کسی چیز پر گر پڑنا۔ یہاں مراد ہے اطلاع ملنا۔

فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا (تو دونوں وصیوں کے مقام پر (قسم کھانے کے لئے) دو آدمی دوسرے کھڑے ہوں)۔

وارثوں میں سے دو (مدعی) شخصوں کو شاہد اس لئے قرار دیا کہ انہوں نے اپنے حق کا دعویٰ کیا ہے اور شریعت نے بھی ان کے حق کو تسلیم کیا ہے اور وہ دونوں سابق شاہدوں (وصیوں) کے گناہ کو ظاہر کر رہے ہیں تو گویا وصیوں کے گناہ کی شہادت دے رہے ہیں۔ میت کے اقرباء میں دو گواہوں کی شرط صرف اس وجہ سے لگائی گئی کہ مذکورہ بالا واقعہ میں ایسا ہی تھا ورنہ اگر میت کا

وارث ایک ہوگا تو اسی سے قسم لی جائے گی یا اگر دو سے زائد وارث ہوں گے تو سب سے قسم لی جائے گی (گویا دو ہونے کی شرط اس وقت ضروری ہے جب وارث صرف دو ہوں ورنہ ضروری نہیں، ایک بھی قسم کھانے والا ہو سکتا ہے اور دو سے زائد بھی) کیونکہ وصی میت سے خریدنے یا کسی اور طرح سے نزاعی چیز کے مالک ہونے کے مدعی ہوتے ہیں اور وارث ان کے دعویٰ کا انکار کرتے ہیں (اور وصیوں کے پاس گواہ نہیں ہوتے لہٰذا مدعی علیہ پر قسم عائد ہوگی)

مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ (ان وارثوں میں سے جن کے اندر سے قریب ترین رشتہ رکھنے والے دو آدمی مستحق ہوئے ہیں) یعنی وارثوں میں سے جو دو شخص میت سے قریب ترین رشتہ رکھنے کی وجہ سے اس امر کے مستحق ہوں کہ تمام وارث اپنے اندر سے انتخاب کر کے ان کو ادائے شہادت کے لئے مقرر کردیں اور ان کے ذریعہ سے وصیوں کی دروغ بانی ظاہر کردیں۔ اس مطلب پر عَلَيْهِمْ کی ضمیر وارثوں کی طرف راجع ہوگی اور اس کا تعلق اِسْتَحَقَّ سے ہوگا اور اَلْاَوْلَيٰنِ، اِسْتَحَقَّ کا فاعل قرار پائے گا۔

بعض قراءتوں میں اُسْتُحِقَّ فعل مجہول آیا ہے اس صورت میں عَلَيْهِمْ کا معنی ہوگا یعنی ان کے معاملہ میں ان کے سبب سے جیسے عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمَانَ کا معنی فِىْ مُلْكِ سُلَيْمَانَ ہے۔ مطلب یہ کہ جن کے معاملہ کی وجہ سے دونوں قسم کھانے والے گناہ کے مستوجب ہوئے۔ اَلْاَوْلَيٰنِ، اٰخَرَانِ کی صفت ہے کیونکہ اٰخَرَانِ اگرچہ نکرہ اور اَلْاَوْلَيٰنِ معرفہ ہے لیکن اٰخَرَانِ کی صفت مِنَ الَّذِيْنَ ہے اور نکرہ موصوفہ معرفہ کا حکم رکھتا ہے یا اَلْاَوْلَيٰنِ، اٰخَرَانِ یا يَقُوْمَانِ کی ضمیر سے بدل ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی هُمَا الْاَوْلَيٰنِ۔

اَلْاَوْلَيٰنِ سے مراد ایسے قریبی رشتہ دار جن سے زیادہ میت کا کوئی قرابت دار نہ ہو۔

فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَآ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

(پھر یہ دونوں رشتہ دار اللہ کی قسم کھائیں کہ بالیقین ہماری یہ قسم ان دونوں (وصیوں) کی قسم سے زیادہ راست ہے اور ہم نے ذرا تجاوز نہیں کیا ہم اس حالت میں سخت ظالم ہوں گے)۔ یعنی وصیوں کی خیانت ظاہر کرنے اور دعویٰ خرید کی تردید کرنے کے لئے وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ ان وصیوں کی قسم سے ہماری قسم زیادہ قابل قبول ہے اور قسم کھانے میں ہم حق سے تجاوز نہیں کر رہے ہیں اگر ہم حق سے ہٹیں گے تو بیجا حرکت کے مرتکب ہوں گے، حق کی جگہ باطل کو اختیار کرنے والے ہو جائیں گے۔ آیت میں شہادت سے مراد ہے قسم جیسے دوسری آیت میں آیا ہے فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ بخاری کی روایت میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو بدیل سہمی کے قریب ترین اقرباء میں سے دو آدمیوں نے کھڑے ہو کر قسم کھائی۔ ترمذی کی روایت ہے کہ عمرو بن عاص اور ان کے ساتھ ایک دوسرے آدمی نے کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی۔ بغوی نے دوسرے آدمی کا نام مطلب بن وداعہ سہمی ذکر کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ عصر کے بعد ان دونوں نے قسم کھائی۔ شاید ان دونوں نے اس بات کی قسم کھائی ہوگی کہ ہم کو بدیل کا وصیوں کے ہاتھ برتن فروخت کرنا معلوم نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے تمیم داری کا ایک بیان ترمذی نے نقل کیا ہے لیکن دوسرے اہل حدیث نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ تمیم داری نے کہا میں اور عدی بن بدا عیسائی تھے اور شام کو آجایا کرتے تھے چنانچہ ہم دونوں تجارت کی غرض سے شام کو گئے ہوئے تھے وہاں ہمارے پاس بنی سہم کا ایک آزاد کردہ غلام جس کا نام بدیل بن ابی مریم تھا کچھ تجارت کا مال لے کر پہنچا اس کے پاس چاندی کا ایک پیالہ بھی تھا اتفاقاً وہاں وہ بیمار ہو گیا اور اس نے ہم کو وصیت کی کہ اس کا متروکہ سامان اس کے گھر والوں کو پہنچادیں۔ یہ وصیت کر کے وہ مر گیا اور ہم دونوں نے وہ پیالہ لے کر ہزار درہم کو فروخت کر کے قیمت تقسیم کرلی پھر جب بدیل کے گھر والوں کے پاس پہنچے تو بدیل کا جو سامان ہمارے پاس تھا ہم نے وہ ان کو دیدیا سامان میں پیالہ ان کو نہیں ملا تو ہم سے پوچھا ہم نے کہا اس کے علاوہ تو بدیل نے ہم کو کوئی اور چیز دی نہیں۔ کچھ مدت کے بعد جب میں مسلمان ہو گیا اور مجھے اس گناہ کا احساس ہوا تو میں بدیل کے رشتہ داروں کے پاس گیا اور اظہار واقعہ کے بعد پانچ سو درہم ان کو دیدیئے اور کہہ دیا کہ اتنے ہی

میرے ساتھی کے پاس ہیں لوگ اس کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے حضور نے ان سے گواہ طلب کیے ان کو گواہ نہ ملے تو حضور ﷺ نے حکم دیا کہ عدی سے قسم لے لیں عدی نے قسم کھالی اس پر آیت یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَیْنِكُمْ سے اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌۢ بَعْدَ اَیْمَانِهِمْ تک نازل ہوئی تو عمروؓ بن العاص اور ان کے ساتھ ایک اور آدمی نے کھڑے ہو کر قسم کھالی اور عدی بن بدا سے پانچ سو درہم نکلوا لئے گئے۔

ذٰلِكَ (یہ) یعنی وارثوں کے شبہ کی صورت میں وصیوں سے قسم لینا اور وصی خرید نے کا دعویٰ کریں تو وارثوں کو قسم کھلوانا۔

اَدْنٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ یَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌۢ بَعْدَ اَیْمَانِهِمْ ؕ (قریب ترین ذریعہ ہے اس امر کا کہ وہ (وصی) واقعہ کو ٹھیک طور پر ظاہر کریں یا اس بات سے ڈر جائیں کہ اس سے قسمیں لینے کے بعد بھی قسمیں لوٹائی جائیں گی)۔

یَّاْتُوْا کی ضمیر وصیوں کی طرف راجع ہے اور شہادت سے مراد ہے اظہار حق اور میت کی کی ہوئی وصیت کا بیان۔ عَلٰى وَجْهِهَا سے مراد یہ ہے کہ جیسی وصیت تھی بغیر خیانت کے ویسا ہی ظاہر کر دیں۔ یَخَافُوْا کا عطف یَاْتُوْا پر ہے۔ تُرَدَّ اَیْمَانٌ کا یہ مطلب ہے کہ وصیوں کے انکار کے بعد پھر وارثوں سے قسم لی جائے گی۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ (اور اللہ سے ڈرو) اس جملہ کا عطف محذوف جملہ پر ہے یعنی اللہ کے احکام کی پابندی کرو اور اللہ سے ڈرو۔

وَاسْمَعُوْا ؕ (اور (اللہ نے تم کو جو حکم دیا ہے اس کو گوش قبول سے) سنو)۔

وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۠ ۱۰۸ (اگر تم اللہ سے نہیں ڈرو گے اور اس کا حکم نہیں سنو گے تو اللہ کے دائرہ طاعت سے خارج ہو جاؤ گے) اور دائرہ طاعت سے خارج ہونے والے لوگوں کو اللہ ہدایت نہیں فرماتا) یعنی (دنیا میں کسی دلیل کی ہدایت نہیں کرتا یا (آخرت میں) جنت کا راستہ نہیں بتائے گا۔

ہماری اس تشریح پر آیات مذکورہ کی شان نزول سے مطابقت ہو جائے گی اور کسی جملہ کو منسوخ قرار دینے کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ وارثوں کے دعوے کا اگر وصی انکار کرے تو اس پر قسم کا عائد ہونا اور وصی اگر مال خیانت کو میت سے خرید لینے وغیرہ کا دعویٰ کرے اور وارث منکر ہوں تو وارثوں پر قسم کا عائد ہونا غیر منسوخ اور محکم حکم ہے اور علماء کے نزدیک یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ سورۂ مائدہ کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔

لیکن حسن، زہری اور عکرمہ نے آیت کا تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ میت مرنے کے وقت اگر کسی کے متعلق کچھ وصیت کرنا چاہے تو دو آدمیوں کو گواہ بنالے تاکہ موصی لہ کے لئے وہ حاکم کے سامنے جاکر شہادت دے سکیں بظاہر آیت لَا نَشْتَرِیْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى اسی مطلب پر دلالت کر رہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ گواہ کہیں کہ موصی لہ اگرچہ ہمارا قرابت دار ہے مگر ہم کسی لالچ میں آکر زیادہ مال کی وصیت کی شہادت نہیں دیں گے اس صورت میں ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِكُمْ کا مطلب یہ ہوگا کہ دو گواہ وصیت کرنے والے کے قبیلہ کے ہوں یا کسی اور قبیلہ خاندان کے۔

مسئلہ :- کسی معاملہ میں مسلمان کے خلاف کافر کی شہادت قابل قبول نہیں۔ یہ مسئلہ مسلمہ ہے۔ لیکن اکثر اہل تفسیر یہاں تک کہ حضرت ابن عباس، حضرت ابو موسیٰ اشعری، سعید بن مسیب، ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، مجاہد اور عبیدہ نے آیت کی تفسیر میں مِنْكُمْ سے مراد مسلمانوں میں سے اور مِنْ غَیْرِكُمْ سے مراد کافروں میں سے ہونے کی صراحت کی ہے (اس تفسیر پر لازم آتا ہے کہ مسلمان پر کافر کی شہادت قابل قبول ہو) للذا نخعی اور علماء کی ایک جماعت نے تو اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ ابتدائی دور میں یہ حکم تھا مسلمان پر کافر کی شہادت مان لینے کا جواز تھا لیکن پھر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا اب مسلمان پر کافر کی شہادت نا قابل سماعت ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ آیت محکم ہے اگر مسلمان نہ ملیں تو کافروں کو شاہد بنانا درست ہے۔ قاضی شریح نے کہا سفر کی حالت میں اگر وصیت پر گواہ بنانے کے لئے مسلمان نہ ملیں تو کافروں کو گواہ بنایا جاسکتا ہے مگر یہ حکم صرف وصیت کا گواہ بنانے کا ہے وصیت کے علاوہ اور کسی مسئلہ کا گواہ کافروں کو نہیں بنایا جاسکتا۔

شعبی نے بیان کیا کہ دقوقا میں ایک مسلمان کا وقت وفات آپہنچا اور اس نے کچھ وصیت کرنا چاہا مگر کوئی مسلمان گواہ ملا نہیں، آخر اس نے اہل کتاب میں سے دو آدمیوں کو وصیت کا گواہ بنادیا اور دونوں شخص اس کا متروکہ سامان لے کر کوفہ میں پہنچے اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کی خدمت میں حاضر ہو کر سامان پیش کر دیا اور وصیت کی اطلاع دیدی۔ اشعری نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے بعد ایسا واقعہ کوئی اور پیش نہیں آیا۔ پھر آپ نے دونوں سے قسم لی اور ان کی شہادت کے مطابق حکم نافذ کر دیا۔

میں کہتا ہوں اگر آیت کو محکم مانا جائے تو اگر کسی وجہ سے غیر مسلم گواہوں کے بیان میں کوئی جھوٹ محسوس ہو تو وارثوں سے قسم لی جائے (کہ یہ غیر مسلم گواہ غلط کہتے ہیں)

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ (جس روز اللہ پیغمبروں کو جمع کرے گا) یعنی قیامت کے دن یَوْمَ یَجْمَعُ کا تعلق یا تو لَا یَهْدِیْ سے ہے یعنی جس روز اللہ پیغمبروں کو جمع کرے گا اس روز کافروں کو جنت کا راستہ نہیں دکھائے گا یا اِتَّقُوْا کے مفعول سے بدل ہے یا اِسْمَعُوْا کا مفعول ہے اور مضاف محذوف ہے یعنی روز قیامت کی خبر سنو یا فعل محذوف کا مفعول ہے یعنی یاد کرو اور ڈرو روز قیامت سے۔

فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ (پھر فرمائے گا تم کو (امت کی طرف سے) کیا جواب دیا گیا)۔ مَاذَآ، اُجِبْتُمْ کا مفعول مطلق ہے (یعنی کس قسم کا تم کو جواب دیا گیا) قوم کو سرزنش کرنے کے لئے انبیاء سے یہ سوال کیا جائے گا جیسے دوسری آیت میں ہے اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ کہ زندہ در گور کی ہوئی لڑکی سے سوال کیا جائے گا کہ کس قصور پر تجھے قتل کیا گیا (یہ سوال بھی قاتل کو سرزنش کرنے کے لئے کیا جائے گا)۔

قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا (پیغمبر) عرض کریں گے ہم کو اس کا کچھ علم نہیں)۔

حضرت ابن عباسؓ، حسنؒ، مجاہد اور سدی نے کہا قیامت کی ہولناکیاں اور لرزہ انگیزیاں دلوں کو ان کی جگہ سے ہلا دیں گی اور پیغمبر گھبرا جائیں گے۔ گھبراہٹ میں کوئی جواب نہ بن پڑے گا اور عرض کریں گے ہم کو کچھ علم نہیں۔ پھر جب ہوش و حواس کچھ ٹھکانے آئیں گے تو اپنی اپنی امتوں کے متعلق شہادت دیں گے۔ ابن جریج نے کہا آیت کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر عرض کریں گے ہم کو معلوم نہیں کہ امت والوں کا مآل کار کیا رہا ہمارے بعد انہوں نے (دین میں) کیا کیا نئی باتیں ملا دیں اور دلوں کے اندر کیا کیا خیالات چھپائے رکھے۔

اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۰۹﴾ (بس تو ہی ڈھکی چھپی باتوں کو بخوبی جاننے والا ہے) ہم جس سے لاعلم ہیں اس سے تو واقف ہے اور ہم کو تو صرف اپنے سامنے کی باتوں سے واقفیت ہے۔ ابو بکرؒ اور حمزہؒ نے قرآن میں ہر جگہ غِیُوْب بکسر غین پڑھا ہے باقی قراء کے نزدیک غُیُوْب بضم غین ہے۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (قیامت کے دن) حوض پر میرے پاس کچھ لوگ آرہے ہوں گے کہ میں ان کو پہچان لوں گا لیکن ان کو میرے پاس پہنچنے سے پرے ہی روک لیا جائے گا۔ میں کہوں گا یہ تو میرے پیارے صحابی ہیں، یہ تو میرے پیارے ساتھی ہیں۔ جواب ملے گا تم کو علم نہیں کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا نئی باتیں دین میں نکال رکھی تھیں۔ رواہ البخاری وغیرہ۔ اسی کے ہم معنی وہ آیت ہے جس میں حضرت عیسیٰ کے قول کو نقل کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ہے كُنْتُ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہم کو کوئی علم نہیں صرف اتنا علم

ہے جس سے تو ہم سے زیادہ واقف ہے۔ بعض علماء نے کہا مطلب یہ ہے کہ تیرے علم کے مقابلہ میں ہم کو کوئی علم نہیں۔ بعض نے کہا مطلب یہ ہے۔ جس امر کو تو ہم سے زیادہ جانتا ہے اس کو ہم سے دریافت کرنے کی کیا حکمت ہے اس کا ہم کو علم نہیں۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ (جب اللہ نے فرمایا) یہ یَوْمَ یَجْمَعُ سے بدل ہے یعنی اس روز پیغمبروں سے جواب طلبی کر کے کافروں کو سرزنش کی جائے گی اور پیغمبروں کے ہاتھ پر جو معجزات ظاہر کئے گئے تھے جن کو بعض لوگوں نے جادو قرار دیا تھا اور علامت نبوت ماننے سے انکار کر دیا تھا اور بعض نے نشان الوہیت سمجھ کر پیغمبروں کو معبود بنا رکھا تھا ان معجزات کو شمار کر کے کافروں کو تو بیخ کی جائے گی۔

یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْكَ وَعَلٰی وَالِدَتِكَ ۘ (اے عیسیٰؑ بن مریم میرے اس احسان کو یاد کر جو تیرے اوپر اور تیری ماں پر تھا)۔ نعمت کا لفظ اگرچہ مفرد ہے لیکن معنی جمع کے ہیں کیونکہ اس سے مراد اسم جنس ہے۔

والدہ سے مراد مریم ہیں جن کو اللہ نے پاک کر دیا تھا اور سارے جہان کی عورتوں پر ان کو فضیلت دی تھی۔ حسن نے کہا نعمت کو یاد کرنے سے مراد ہے شکر کرنا۔

اِذْ اَیَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ (جب روح القدس کے ذریعہ سے میں نے تجھے طاقت عطا کی تھی)۔ اِذْ اَیَّدْتُّ، نِعْمَتِیْ کا مفعول فیہ ہے یا حال ہے۔ روح القدس سے مراد ہے جبرئیل یا وہ کلام جو لوگوں کو ابدی زندگی عطا فرمانے والا اور دلوں کو گناہوں سے پاک کرنے والا تھا۔ روح القدس پاکی پیدا کرنے والا کلام اور وہ کلام جس سے مردے زندہ ہو جاتے تھے۔

تُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ (کہ تو گہوارے میں ہونے کی حالت اور ادھیڑ عمر ہونے کی حالت میں (برابر ایک ہی طرح کا) کلام لوگوں سے کرتا تھا) یعنی بچپن اور شیر خوارگی کی عمر میں بھی تیرا کلام ویسا ہی پر حکمت اور عاقلانہ ہوتا تھا جیسا متوسط عمر کا کلام۔ اس آیت سے لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ آسمان سے اتریں گے کیونکہ جس وقت ان کو اٹھایا گیا اس وقت ان کی عمر متوسط نہ تھی (غالباً ۳۳ برس تھی) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے تیس سال کی عمر میں عیسیٰؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا، تیس ماہ آپ نے رسالت کی حالت میں گزارے پھر اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔

بعض افاضل کا قول ہے کہ آیت سے بچپن اور متوسط عمر کے کلام کا ایک جیسا ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ کَهْلًا کے لفظ کو تشبیہ بلیغ قرار دیا جائے یعنی حضرت عیسیٰؑ بچپن میں اسی طرح لوگوں سے کلام کرتے تھے جیسا اس عمر میں کرتے تھے جبکہ وہ ادھیڑ عمر والے کی طرح ہو گئے تھے (یعنی ۳۲ یا ۳۳ برس کے) اس مطلب پر آیت سے نزول عیسیٰؑ پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۚ (اور جب میں نے تجھے سکھائیں کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور توریت اور انجیل) اِذْ اَیَّدْتُّكَ پر اس کا عطف ہے۔

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ (اور جب تو پرندہ کی شکل ایسی شکل گارے کی بناتا تھا)۔

بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِیْ (میرے حکم سے پھر اس پر پھونک مارتا تھا اور وہ میرے حکم سے (زندہ) پرندہ بن جاتا تھا)۔

وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ ۚ (اور میرے حکم سے مادرزاد اندھے کو اور برص کے بیمار کو اچھا کر دیتا تھا)۔

وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی بِاِذْنِیْ ۚ (اور (یاد کے قابل ہے وہ وقت) جب میرے حکم سے تو مردوں کو (زندہ کر کے قبروں کے اندر سے) باہر نکال کھڑا کرتا تھا)۔

وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَنْكَ (اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تیرے قتل سے باز رکھا اور پھیر دیا)

اس جملہ کا عطف اِذْعَلَّمْتُکَ پر ہے۔ بنی اسرائیل سے مراد ہیں وہ یہودی جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔
اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ (جب تو ان کے پاس معجزات (مذکورہ بالا) لے کر پہنچا تھا)۔ یہ کَفَفْتُ کا مفعول فیہ ہے (یعنی بنی اسرائیل کو قتل کرنے سے اللہ نے اس وقت باز رکھا تھا جب تو نے ان کے سامنے معجزات ظاہر کئے تھے
فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾ (اور ان میں کے کافروں نے کہا تھا کہ یہ تو صرف کھلا ہوا جادو ہے اس کے سوا کچھ نہیں)۔
حمزہ اور کسائی نے اس جگہ اور سورہ ہود اور الصف میں اِلَّا سَاحِرٌ پڑھا ہے اس قرأت پر یہاں حضرت عیسیٰؑ کی طرف اور سورہ ہود میں رسول اللہ ﷺ کی طرف اشارہ ہو جائے گا۔
وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ (اور جب میں نے حواریوں کے دل میں ڈالا) اس کا عطف اِذْ کَفَفْتُ پر ہے، وحی کرنے سے اس جگہ مراد ہے دل میں ڈالنا۔ عبد بن حمید نے قتادہؒ کا اور ابوالشیخ نے سدی کا یہی قول بیان کیا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک وحی سے مراد ہے حضرت عیسیٰؑ کی زبانی حکم بھیجنا۔
اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ (کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ)۔ اَنْ مصدریہ ہے یا اَوْحَیْتُ کی تفسیر ہے۔
قَالُوْٓا اٰمَنَّا (تو انہوں نے کہا ہم ایمان لائے)۔
وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ (اور (اے عیسیٰؑ) آپ گواہ رہیں کہ ہم مخلص ہیں)۔
اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ (جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰؑ بن مریمؑ کیا آپ کا رب مان لے گا)۔ یہ مفعول فیہ ہے اذکرْ محذوف کا یا قَالُوْا کا۔ استطاعت کا معنیٰ (یہاں) اطاعت ہے (مان لینا درخواست کے مطابق کر دینا) جیسے اِسْتَجَابَ بمعنی اَجَابَ کے آیا ہے (فَاسْتَجَابَ لَهُمُ اللّٰهُ نے قبول کر لیا) ابن ابی حاتم نے عامر شعبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ کی تلاوت فرمانے کے بعد (اس کی تشریح میں) هل یطیع ربک فرمایا تھا۔
آثار میں آتا ہے مَنْ اَطَاعَ اللّٰهَ اَطَاعَهٗ جو اللہ کی اطاعت کرتا ہے اللہ اس کی درخواست مان لیتا ہے۔ کسائی کی قرأت میں هَلْ تَسْتَطِيْعُ رَبَّكَ آیا ہے۔ یہ عیسیٰؑ کو خطاب ہے اور رَبَّکَ مفعول ہے۔ یعنی اے عیسیٰ کیا آپ اپنے رب سے یہ درخواست کر دیں گے اور آپ کے لئے یہ دعا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی اور آپ کا رب آپ کی یہ درخواست قبول کر لے گا۔ حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ کی بھی یہی قرأت ہے اور حاکم نے حضرت معاذؓ بن جبل کی بھی یہی قرأت نقل کی ہے، اس قرأت سے بھی تفسیر مندرجہ بالا کی تائید ہوتی ہے (کہ يَسْتَطِيْعُ بمعنی يُطِيْعُ کے ہے)۔
(حضرت عائشہؓ نے فرمایا حواری اللہ (کے مرتبہ) سے خوب واقف تھے يَسْتَطِيْعُ (رَبُّکَ) اَنْ تَدْعُوْ (کیا آپ کا رب طاقت رکھتا ہے کہ آپ اس سے دعا کر دیں اور وہ دعا پوری کر سکے) کہنے سے بہت بعید تھے۔ رواہ ابن ابی شیبۃ وابوالشیخ وغیرہما۔ (حضرت عائشہؓ کی قرأت میں تَسْتَطِيْعُ رَبَّكَ آیا ہے يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ نہیں آیا یعنی استطاعت کا مخاطب حضرت عیسیٰؑ ہیں استطاعت کا فاعل اللہ نہیں ہے۔ اس لئے آپ نے اس قرأت کی تَغْلِيْط کی جس میں يَسْتَطِيْعُ آیا ہے اور استطاعت کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے) بعض علماء نے کہا کہ اس جگہ استطاعت سے مراد ہے حکمت وارادہ کا تقاضا ہو سکنا، قدرت رکھنے کا مفہوم مراد نہیں ہے اللہ کی قدرت میں تو حواریوں کو شک نہیں تھا (مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ کی حکمت وارادہ بھی ایسا ہو سکتا ہے یا نہیں کہ آسمان سے خوان نازل فرما دے) جیسے کوئی شخص اپنے ساتھی سے کہے کیا آپ میرے ساتھ اٹھ کر بازار کو جا سکتے ہیں (اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ آپ میں اٹھ کر جانے کی طاقت بھی ہے یا نہیں بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اٹھ کر چلنے کو مناسب سمجھتے ہیں یا نہیں)۔

بعض علماء نے کہا کلام کا وہی مطلب ہے جو ظاہر الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ (ابتدائی ایمان تھا) اس وقت تک ان کے دلوں میں معرفت کا استحکام نہیں ہوا تھا جاہلیت اور کفر کا زمانہ ماضی قریب میں ہی ختم ہوا تھا، اسی لئے حضرت عیسیٰؑ نے ان کے قول کو بڑی گستاخی قرار دیتے ہوئے فرمایا اِتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یعنی اگر مؤمن ہو تو اللہ کی قدرت میں شک نہ کرو۔

اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (کہ آسمان سے ہمارے لئے ایک خوان اتار دے) مائدہ وہ خوان جس پر کھانا چنا ہوا ہو۔ مَائِدَةٌ بروزن فَاعِلَةٌ مَادَ، يَمِيْدُ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ مَيْد دینا اور کھانا کھلانا۔ گویا خوان بھی کھانا دینے والا ہوتا ہے اس لئے اس کو مائدہ کہا جاتا ہے مجازاً کھانا جو خوان پر ہوتا ہے اس کو بھی مائدہ کہہ لیا جاتا ہے۔ جیسے بہنے کی نسبت نہر کی طرف مجازاً کی جاتی ہے۔ اہل کوفہ نے کہا کہ (مَيْد کا معنی حرکت کرنا، ہلنا) کھانے والوں کی وجہ سے مائدہ حرکت میں آجاتا ہے اس لئے اس کو مائدہ کہا جاتا ہے۔ اہل بصرہ کے نزدیک مَائِدَةٌ (اسم فاعل) مُمِيْدَةٌ (اسم مفعول) کے معنی میں ہے یعنی کھانے والوں کی وجہ سے حرکت پانے والا۔

قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ (عیسیٰؑ نے (کہا اللہ سے ڈرو) یعنی ایسے سوال کرنے سے خدا کا خوف کرو کہ جن کی طرح گزشتہ امتوں نے بھی نہیں کئے۔ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو طلب معجزات نے منع کر دیا۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ (اگر تم ایماندار ہو) کیونکہ اہل ایمان کے لئے معجزات کی طلب جائز نہیں یا یہ مطلب ہے کہ اگر اللہ کی قدرت کی ہمہ گیری اور میری نبوت پر تمہارا ایمان ہے تو اللہ سے ڈرو اور اس کی قدرت میں شک نہ کرو یا یہ مطلب ہے کہ اگر ایمان کے دعوے میں تم سچے ہو تو ایسے سوالات کرنے سے بچو۔

ابن ابی حاتم نے اور حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اور ابو الشیخ نے العظمۃ میں اور ابو بکر شافعی نے الفیلانیات میں حضرت سلمان فارسی کی روایت سے لکھا ہے کہ جب حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ سے نزول مائدہ کی درخواست کی تو آپ کو سخت ناگوار ہوا اور آپؑ نے فرمایا اللہ نے زمین میں جو کچھ عطا فرما دیا ہے اسی پر قناعت کرو۔ مائدہ کی درخواست نہ کرو کیونکہ مائدہ اگر نازل ہو گیا تو اللہ کی طرف سے وہ ایک نشان ہو گا اور ثمود نے جب اپنے پیغمبر سے نشانی طلب کی تھی تو وہ تباہ ہو گئی اور اسی نشانی سے ان کی جانچ کی گئی (جس کی وجہ سے ان پر عذاب آگیا) بنی اسرائیل نے آپ کی فہمائش نہ مانی اس لئے۔

قَالُوْا (کہنے لگے) ہم نے مائدہ کی درخواست صرف اس لئے کی ہے کہ

نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا (ہم اس میں سے کھائیں)

وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا (اور ہمارے دلوں کو اطمینان ہو،) دلیل سے تو قدرت کی ہمہ گیری کو مانتے ہی ہیں مشاہدہ دلیل کے ساتھ مل جائے گا تو علم شہودی ہو کر اطمینان پیدا ہو جائے گا۔

وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا (اور ہم جان لیں کہ (نبوت کے دعوے میں) آپ سچے ہیں) یعنی ہمارا ایمان اور نبوت پر یقین بڑھ جائے۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ ۳۰ روزے رکھو اور پھر نزول مائدہ کی درخواست کی اور کہا ہم یقین رکھتے ہیں کہ آپ نے ہم سے یہ بات سچ فرمائی کہ ۳۰ روزے رکھنے کے بعد اللہ ہماری دعا قبول فرمالے گا۔

وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ (اور ہم اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہو جائیں) یعنی ایمان بالغیب تو ہم کو حاصل ہی ہے، نزول مائدہ کے بعد اللہ کی وحدانیت و قدرت اور آپ کی نبوت کا ایمان شہودی ہم کو حاصل ہو جائے گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہم جب بنی اسرائیل کے پاس لوٹ کر جائیں گے تو جا کر اس کی شہادت دے سکیں گے۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے غسل کر کے کمبل کا لباس پہن کر دو رکعت نماز پڑھی اور سر جھکا کر آنکھیں بند کر کے رونے لگے۔

قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ (پھر عرض کیا اے اللہ اے ہمارے رب) رَبَّنَا مکرر نداء ہے۔ اَللّٰهُمَّ کی صفت نہیں ہے نہ بدل ہے کیونکہ اَللّٰهُمَّ نہ موصوف ہوتا ہے نہ مبدل منہ۔ علامہ تفتازانی نے اس کی صراحت کی ہے۔

اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (ہم پر آسمان سے ایک خوان نازل فرمادے)۔

تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا (جو ہمارے لئے ایک خوشی کی بات ہو جائے)۔

لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا (یعنی ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے)۔ سدی نے کہا یعنی ہمارے زمانہ والوں کے لئے اور آئندہ لوگوں کے لئے خوشی کا دن ہو جائے، ہم اس کو تہوار کا دن بنالیں۔ جو خوشی غم کے بعد آئے اس کو سرور کہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا عید خوشی کے دن کو کہتے ہیں، کیونکہ اس میں آدمی رنج سے خوشی کی طرف لوٹتا ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ وہ اتوار کا دن تھا اسی لئے عیسائیوں نے اتوار کا دن تہوار کا دن مقرر کر رکھا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا عید کا معنی ہے عائدہ یعنی اللہ کی طرف سے حجت اور برہان۔

لِاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا، لَنَا سے بدل ہے۔ اول سے مراد ہیں اہل زمانہ اور اخر سے مراد ہیں مستقبل میں آنے والے لوگ جو مذہب عیسوی پر ہوں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا (عِيْدًا لِاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا سے یہ مراد ہے کہ) اس میں سے جس طرح پہلے لوگ کھائیں اسی طرح آخری لوگ بھی کھائیں (یعنی خوان بابرکت ہو جو سب کے لئے کافی ہو اور اول سے آخر تک سب لوگ اس میں سے کھائیں)۔

بظاہر لنا، کَانَ کی پہلی اور عِيْدًا دوسری خبر ہے اور لِاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا، عِيْدًا کی صفت ہے۔

وَاٰيَةً مِّنْكَ (اور تیری طرف سے ایک نشان ہو جائے) یعنی ایسی دلیل ہو جائے جو تیری قدرت کی ہمہ گیری اور میری نبوت کی صداقت پر دلالت کرے۔ لفظ مِنْکَ، اٰيَةً کی صفت ہے اور اٰيَةً کا عطف عِيْدًا پر ہے۔

وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ (اور ہم کو عطا فرما تو بہترین عطا فرمانے والا ہے)۔

قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ (اللہ نے فرمایا میں اس کو تم پر (بار بار) ضرور اتاروں گا)۔ مُنَزِّلُ باب تفعیل کا اسم فاعل ہے اور باب تفعیل کثرت اور تواتر فعل پر دلالت کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری درخواست کو منظور فرما کر میں متواتر طور پر کتنے ہی مرتبہ خوان نازل کروں گا۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا (پھر تم میں سے جو حق شناسی نہ کریگا۔ اس کو ایسی سزا دوں گا)۔

لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ (کہ ویسی سزا دنیا میں کسی کو نہیں دوں گا)۔ ع ۱۵ / ۵

عَذَابًا بمعنی تعذیب ہے یعنی عذاب دینا یہ مفعول مطلق ہے یا مجازاً مفعول بہ ہے یا عذاب سے مراد ہے سزا کا طریقہ اور عذاب کا ڈھنگ یعنی اور ایسی سخت سزا دوں گا کہ کسی کو نہ دوں گا۔ اَلْعٰلَمِيْنَ سے مراد ہیں عذاب پانے والے کافروں کے ہم عصر یا آئندہ ہر زمانہ والے، کیونکہ نزول مائدہ کے بعد جن لوگوں نے کفر کیا اللہ نے ان کو سور اور بندر بنا دیا اور آئندہ کسی اور پر ایسا عذاب نہیں آیا۔

حضرت سلمان فارسی کی مذکورۂ بالا حدیث کا تتمہ

جب حضرت عیسیٰؑ نے دعا کی تو ایک سرخ رنگ کا خوان لوگوں کی نظروں کے سامنے اوپر سے اترنے لگا، ابر کا ایک ٹکڑا خوان سے اوپر تھا اور ایک نیچے۔ خوان آکر لوگوں کے سامنے گر پڑا۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت عیسیٰؑ رونے لگے اور عرض کیا اے اللہ مجھے شکر گزاروں میں سے کردے اور اس کو رحمت بنادے، عذاب نہ بنانا۔ یہودی بھی ایسی چیز اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے

جس کی نظیر انہوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی اور خوان میں سے نکلتی ہوئی ایسی خوشبو محسوس کر رہے تھے جس کی مثل بھی کوئی خوشبو نہیں پائی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تم میں سے جو سب سے زیادہ نیک اعمال ہو وہ کھڑا ہو اور بسم اللہ کہہ کے اس کا سرپوش کھولے۔ حواریوں کے سردار شمعون صفار نے عرض کیا اے اللہ کے رسول آپ ہی اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کھڑے ہوئے اور وضو کر کے ایک لمبی نماز پڑھی اور خوب روئے۔ پھر بسم اللہ کر کے سرپوش ہٹایا اور فرمایا بِسْمِ اللّٰهِ خَیْرِ الرّٰزِقِیْنَ۔ خوان میں ایک بریاں مچھلی تھی، جس پر نہ کوئی سِنا تھا، نہ کانٹا۔ مچھلی سے روغن بہہ رہا تھا، اس کے سر کی طرف نمک رکھا تھا اور دم کے پاس سرکہ اور چاروں طرف رنگارنگ کی ترکاریاں رکھی تھیں لیکن گندنا نہ تھا، پانچ روٹیاں بھی تھیں۔ ایک پر زیتون دوسری پر شہید تیسری پر گھی چوتھی پر پنیر اور پانچویں پر گوشت کے ٹکڑے رکھے تھے۔ شمعون نے عرض کیا یا روح اللہ کیا یہ دنیوی کھانا ہے یا اخروی۔ فرمایا تمہارے سامنے جو کھانا ہے وہ دنیوی کھانے کی نوع کا ہے نہ آخرت کے کھانے کی قسم کا (بلکہ اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے اس کو تیار کیا ہے) تم نے مانگا تھا اب اس کو کھاؤ، اللہ تمہاری مدد کرے گا اور اپنے فضل سے تم کو مزید عطا فرمائے گا۔ حواریوں نے عرض کیا یا روح اللہ آپ ہی سب سے پہلے کھانا شروع کیجئے۔ فرمایا میں اس کو کھانے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ جس نے اس کی درخواست کی تھی وہی کھائے۔ یہ سن کر حواریوں کو کھانے سے ڈر لگا (اس لئے کھانے پر ہاتھ نہیں ڈالا) حضرت عیسیٰؑ نے کھانے کے لئے فاقہ زدہ فقیروں، بیماروں، کوڑھ اور برص والوں اور لنگڑے لُنجے اپاہجوں کو بلوایا اور فرمایا اللہ کا بھیجا ہوا رزق کھاؤ یہ تمہارے لئے مبارک ہے اور دوسروں کے لئے مصیبت۔ چنانچہ سب نے کھایا ایک ہزار تین سو نادار، بیمار، اپاہج اور دکھی مردوں اور عورتوں نے شکم سیر ہو کر کھایا۔ لیکن مچھلی اترنے کے وقت جیسی تھی۔ ویسی ہی رہی اس کے بعد خوان اٹھ گیا اور لوگوں کی نظروں کے سامنے اوپر چڑھتا چلا گیا آخر نگاہ سے غائب ہو گیا۔ جس بیمار اور اپاہج نے اس میں سے کھایا وہ تندرست ہو گیا اور جس فقیر نے کھایا غنی ہو گیا۔ یہ دیکھ کر نہ کھانے والوں کو پشیمانی ہوئی۔ خوان اترنے کا یہ سلسلہ چالیس روز تک چاشت کے وقت قائم رہا۔ مالدار، نادار، بڑے چھوٹے، مرد عورت سب ہی خوان کے نزول کے وقت جمع ہو جاتے تو خوان ان سب کی نظروں کے سامنے رکھا ہوتا اور لوگ کھاتے جب سب کھا کر لوٹ جاتے تو خوان سب کی نظروں کے سامنے اٹھ جاتا اور چڑھتا جاتا آخر نظروں سے چھپ جاتا (یہ بھی کہا جاتا ہے کہ) ثمود کی اونٹنی کی طرح خوان ایک دن بیچ آتا، ایک دن ناغہ ایک دن آمد۔ پھر اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کے پاس وحی بھیجی کہ میں اپنا خوان اور رزق صرف فقراء کے لئے مقرر کرتا ہوں مالداروں کے لئے (اس میں) کچھ نہیں ہے یہ حکم مالداروں کو بہت کھلا کہ خود بھی شک میں پڑ گئے اور دوسروں کے دلوں میں بھی شک پیدا کرنے لگے اور کہنے لگے دیکھو تو کیا یہ خوان واقعی آسمان سے اترتا ہے (اگر ایسا ہے تو اس میں ناداروں اور مالداروں کی تفریق کیوں ہے) اللہ نے عیسیٰؑ کے پاس وحی بھیجی اور فرمایا میں نے شرط لگا دی تھی کہ خوان نازل ہونے کے بعد جو کفر کرے گا میں اس کو ایسا عذاب دوں گا کہ سارے جہان میں کسی کو نہ دوں گا (اب انہوں نے کفر کیا ہے اس لئے عذاب کے مستحق ہو گئے)۔

حضرت عیسیٰؑ نے عرض کیا اگر تو ان کو عذاب دے گا تو یہ تیرے بندے ہیں (تجھے عذاب دینے کا حق ہے) اور اگر معاف کر دے تو یقیناً بلاشبہ تو ہی غالب اور دانا ہے (مغفرت کر سکتا ہے اور مغفرت کی مصلحت سے بھی واقف ہے) الغرض ان میں سے ۳۳۳ آدمیوں کی صورتیں مسخ کر دی گئیں۔ رات کو بیویوں کے ساتھ (بھلے چنگے) سوئے اور صبح کو سوروں کی شکل میں اٹھے اور راستوں اور کوڑا گھروں میں مارے مارے پھرنے اور کوڑے کے اندر گندگی کھانے لگے، لوگوں نے یہ حالت دیکھی تو گھبرا کر حضرت عیسیٰؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور روئے۔ سوروں نے حضرت عیسیٰؑ کو دیکھا تو آپ کے ارد گرد گھومنے اور رونے لگے۔ حضرت عیسیٰؑ ان کے نام لے کر پکارتے تھے اور وہ سروں سے اشارہ کرتے اور روتے تھے، بات نہیں کر سکتے تھے اس حالت میں تین روز زندہ رہے پھر سب مر گئے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ خلاص بن عمرو نے حضرت عمار بن یاسر کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خوان

اترا تو اس میں گوشت اور روٹی تھی اور بنی اسرائیل سے کہہ دیا گیا تھا کہ یہ مائدہ تمہارے لئے قائم رہے گا۔ جب تک تم اس میں خیانت نہ کرو گے اور چھپا کر نہ رکھو گے لیکن وہ دن بھی نہیں گزرا کہ انہوں نے خیانت کی اور (کچھ جنس) چھپا کر رکھ لی۔ آخر بندروں اور سوروں جیسی شکل ان کی کر دی گئی۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے فرمایا تھا تیس روزے رکھو پھر جو کچھ چاہو اللہ سے مانگو وہ تم کو عنایت فرمائے گا۔ حسب الحکم لوگوں نے روزے رکھے اور روزوں سے فراغت کے بعد عرض کیا اگر ہم کسی کا کام کرتے ہیں اور کام پورا کر دیتے ہیں تو وہ ہم کو کھانا دیتا ہے (اب اللہ کے لئے ہم نے روزے رکھے ہیں اور اللہ سے کھانا مانگتے ہیں) چنانچہ انہوں نے خوان اترنے کی درخواست کی (۔ دعا قبول ہوئی) ملائکہ ایک خوان اٹھائے ہوئے آئے خوان پر سات روٹیاں اور سات مچھلیاں تھیں لوگوں کے سامنے لا کر اس کو رکھ دیا۔ اول سے آخر تک سب لوگوں نے اس کو کھایا (اور جس طرح کھانا شروع کرنے کے وقت وہ تھا ویسا ہی آخر آدمی کے کھانے کے بعد رہا)۔

کعب احبار نے کہا مائدہ سرنگوں اترا تھا آسمان و زمین کے درمیان ملائکہ اس کو اڑا کر لا رہے تھے، گوشت کے علاوہ اس میں ہر چیز تھی۔ قتادہ نے کہا اس میں جنت کے پھل تھے۔ عطیہ عوفی نے کہا آسمان سے اتر کر ایک مچھلی آئی تھی جس میں ہر چیز کا مزہ تھا۔ کلبی نے کہا اس میں چاول کی روٹی تھی۔ سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ خوان میں سوائے گوشت اور روٹی کے ہر چیز تھی۔ وہب بن منبہ نے کہا اللہ نے جو کی چند چھوٹی روٹیاں اور مچھلیاں اتاری تھیں، کچھ لوگ کھا کر جاتے اور دوسرے آ کر کھاتے تھے یہاں تک کہ سب کھا چکے اور کھانا پھر بھی بچ رہا۔ کلبی اور مقاتل نے کہا اللہ نے روٹیاں مچھلیاں اور قلیے اتارے تھے۔ لوگوں کی تعداد ہزار سے اوپر تھی۔ سب نے کھایا اور لوٹ کر اپنی اپنی بستیوں میں جا کر جب اس کا تذکرہ کیا تو جو لوگ نہیں آئے تھے وہ ہنس دیئے اور کہنے لگے تمہاری نظر بندی کر دی گئی تھی۔ اللہ کو جس کی بھلائی مقصود تھی وہ تو ایمان پر قائم رہا اور جس کی خرابی اللہ کو منظور تھی وہ کفر کی طرف لوٹ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کو سوروں کی شکل پر کر دیا۔ مسخ شدہ لوگوں میں کوئی بچہ یا عورت نہ تھی (سب مرد تھے) تین روز تک اسی حالت میں رہ کر سب مر گئے۔ نہ کچھ کھایا نہ پیا نہ ان کی نسل ہوئی۔ ہر مسخ شدہ شخص کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ قتادہ کا قول ہے کہ جہاں کہیں بنی اسرائیل ہوتے تھے خوان وہیں صبح شام من و سلویٰ کی طرح اترتا تھا۔ نزول مائدہ کے متعلق اکثر علماء کے یہ مختلف اقوال تھے جو ذکر کر دیئے گئے۔ مجاہد اور حسن نزول مائدہ کی نفی کے قائل تھے ان کا خیال تھا کہ جب ان کو تنبیہ کی گئی کہ نزول مائدہ کے بعد اگر کفر کرو گے تو سنگین ترین عذاب میں مبتلا کر دیئے جاؤ گے، تو بنی اسرائیل کو اندیشہ ہو گیا کہ کہیں کوئی کفر کرنے لگے (اور عذاب سب پر پڑے) اس لئے انہوں نے معافی طلب کی اور عرض کیا ہم مائدہ کے طلب گار نہیں۔ واپسی درخواست کے بعد مائدہ نازل نہیں ہوا۔ رہ گیا لفظ اِنِّیْ مُنَزِّلُھَا (جو نازل ہونے پر دلالت کر رہا ہے) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تنبیہ کے بعد بھی اگر تم نزول مائدہ کے طلب گار ہو گے تو اللہ ضرور نازل فرما دے گا۔ صحیح قول وہی ہے جو اکثر علماء کا مختار ہے کہ مائدہ نازل ہوا کیونکہ اللہ نے پہلے سے خبر دیدی تھی کہ میں ضرور نازل کروں گا اور اللہ کی اطلاع غلط نہیں ہو سکتی۔ پھر نزول مائدہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی احادیث، صحابہ کے آثار اور تابعین کے اقوال بکثرت آئے ہیں جن کو (معنوی طور پر) متواتر کہہ سکتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ (اور جب اللہ نے فرمایا) یا فرمائے گا۔ سدی نے کہا جب اللہ نے عیسیٰ کو آسمان کی طرف اٹھا لیا اس وقت یہ بات فرمائی تھی کیونکہ قَالَ ماضی کا صیغہ ہے اور لفظ اذ کی وضع بھی ماضی ہی کے لئے ہے (اس قول پر اول ترجمہ صحیح ہو گا) باقی اہل تفسیر کا قول ہے کہ اللہ یہ بات قیامت کے دن فرمائے گا (اس تشریح پر دوسرا ترجمہ صحیح ہو گا۔ جمہور کا ترجمہ یہی ہے) اس کلام کی غرض کافروں کو تنبیہ و سرزنش کرنا ہے۔ دیکھو اللہ نے فرمایا یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ دوسری آیت میں آیا ہے هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ ان دونوں آیتوں میں روز قیامت مراد ہے۔ رہا اذ کا ماضی کے لئے وضع ہونا اور صیغہ ماضی کا ذکر ہونا تو اگر مستقبل میں آنے والا واقعہ یقینی ہو تو اس کے لئے ماضی کا صیغہ استعمال کر لیا جاتا ہے گویا آئندہ اس واقعہ کا

ہونا اتنا یقینی ہے کہ وہ ہو چکا اسی کی طرح (مستقبل کے لئے ماضی کا استعمال) آیت وَلَوْ تَرٰی اِذْ فَزِعُوْا میں استعمال کیا گیا ہے۔

یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ (اے عیسیٰؑ بن مریم کیا تو نے ہی لوگوں سے کہا تھا) اس آیت میں خطاب حضرت عیسیٰؑ کو ہے لیکن سرزنش کافروں کو ہے۔ مسند الیہ (اَنْتَ) مسند (قُلْتَ) پر مقدم لانے کی غرض ہے فعل کی نسبت کو عیسیٰؑ کی طرف محکم بنانا (کیونکہ اس طرز کلام میں نسبت کی تکرار ہو جاتی ہے ایک تو قُلْتَ کے اندر خود ہی اَنْتَ فاعل موجود ہے پھر قُلْتَ کا ربط اَنْتَ سے دوبارہ ہے) بات یہ تھی کہ قول شرک کی نسبت عیسیٰؑ کی طرف بہت ہی بعید تھی اس لئے قوت کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔

اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ (کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنالو)۔

مریم کی جگہ اُمِّیَ کا لفظ اس امر پر سرزنش کر رہا ہے کہ تو پیدا شدہ ہے اور مریمؑ تیری والدہ ہے پھر الوہیت کے دعوے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ اِلٰہ کو تو توالد اور تماثل سے پاک ہونا چاہئے۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (اللہ کے علاوہ) یہ اِلٰهَیْنِ کی صفت ہے۔ یعنی اللہ کے علاوہ دو معبود۔ یا اِتَّخِذُوْا کے فاعل یا مفعول سے حال ہے۔ لفظ دُوْنَ مغایرت پر دلالت کرتا ہے اس لفظ سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ دوسروں کی عبادت کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا عبادت نہ کرنے کی طرح ہے۔ جو شخص اللہ کی عبادت کے ساتھ عیسیٰؑ اور مریمؑ کی بھی عبادت کرتا ہے وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتا۔ دُوْنَ کا معنی کم بھی ہو سکتا ہے یعنی مجھے اور میری ماں کو معبود بناؤ مگر اللہ کی معبودیت سے کم درجہ کا۔ اس مطلب کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی عیسیٰؑ اور مریمؑ کو مستقل معبود تو جانتے نہیں ہیں بلکہ ان کی پرستش کو عبادت الٰہی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

ابو روق نے کہا عیسیٰؑ یہ کلام سن کر لرز جائیں گے ان کا جوڑ جوڑ کانپ جائے گا اور ہر بن مو سے خون پھوٹ نکلے گا پھر

قَالَ سُبْحٰنَكَ (عرض کریں گے تو پاک ہے) یعنی میں تیری پاکی کا اعتراف کرتا ہوں ہر طرح کے شرک سے یا میں تیرے پاک ہونے کا اقرار کرتا ہوں کہ تو حقیقت واقعہ جاننے کے لئے سوال اور جواب کا ضرورت مند ہو (حقیقت سے تو خود ہی واقف ہے تجھے مجھ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں)۔

مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ (میرے لئے سزاوار نہ تھا کہ جس چیز کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا وہ بات کہتا)۔

اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ (اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو تجھے اس کا علم ضرور ہوتا) یعنی مجھے عذر پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو تجھے علم ہوتا اور تو واقف ہے کہ میں نے یہ بات نہیں کہی۔

تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ (جو میرے نفس میں ہے اس کو تو جانتا ہے اور جو تیری ذات میں ہے اس کو میں نہیں جانتا یعنی میرے دل میں جو مخفی خیالات ہیں ان سے تو واقف ہے اور تیری پوشیدہ معلومات سے میں ناواقف ہوں۔ فِیْ نَفْسِكَ میں نفس سے ذات مراد ہے پہلے لفظ نفس کی مناسبت کی وجہ سے دوسری جگہ بھی لفظ نفس ہی استعمال کیا۔

اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ (بلاشبہ تو ڈھکی چھپی باتوں سے بخوبی واقف ہے)۔ غُیُوْب بکسر غین یا بضم غین ہے، یہ اختلاف قرأت اوپر گزر چکا ہے۔ اَنْتَ سے ان کے اسم (یعنی ك) کی تاکید ہو رہی ہے اس جملہ سے مذکورہ بالا دونوں جملوں کی تاکید ہو رہی ہے لفظاً بھی اور معنیً بھی۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖ (میں نے ان سے نہیں کہی مگر وہی بات جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا)۔ مَا اَمَرْتُ کے بجائے مَا قُلْتُ کہنے میں یہ نکتہ ہے کہ حکم دینا (در حقیقت) رب کا کام ہے اور حضرت عیسیٰؑ ربوبیت کی آمیزش اور شائبہ سے بھی اپنے کو الگ رکھنا چاہتے تھے۔

حضرت عیسیٰؑ نے پہلے نفی شرک کی تمہید قائم کی اس کے بعد آئندہ فقرہ میں پیام توحید اور نفی شرک کی صراحت کر دی

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ (کہ اس اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب) یعنی کسی کو (عبادت میں) اللہ کا شریک نہ بناؤ کیونکہ وہی میرا بھی خالق ہے جو تمہارا خالق ہے (اور میں تمہارا خالق نہیں)۔

یہ فقرہ بِہٖ کی ضمیر کا عطف بیان یا بدل ہے۔ بدل میں یہ ضروری نہیں کہ مبدل منہ کو بالکل ساقط کر دینا جائز ہو اس لئے موصول کا بقاء بغیر ضمیر کے لازم نہیں آتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پورا فقرہ مفعول ہو اور فعل محذوف ہو یا مبتدا محذوف ہو اور یہ فقرہ خبر ہو، لیکن مَا اَمَرْتَنِیْ سے اس کو بدل قرار دینا جائز نہیں کیونکہ ان مصدری ہے اور مصدر قول کا مقولہ نہیں ہو سکتا۔

ان کو مفسرہ قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ امر کا فاعل اَللّٰہُ ہے (اور اللہ اَعْبُدُوْا اللّٰہَ رَبِّیْ نہیں فرما سکتا وہ خود رب ہے اس کا رب کوئی اور نہیں) پھر قول کی تفسیر ان سے ہو بھی نہیں سکتی ہاں اگر قول کو بمعنی امر قرار دیا جائے تو ممکن ہے۔ گویا کلام کا مفہوم اس طرح ہو گا۔ میں نے ان کو حکم نہیں دیا مگر وہی جو تو نے مجھے حکم دیا تھا۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے اپنی طرف سے اپنے امر کی تفسیر کر دی کہ میں نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ اللہ کی عباد کرو۔

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (اور میں ان کا نگراں (اور ان کے احوال کا مشاہدہ کرتا رہا) ان کے کفر و ایمان کی دیکھ بھال کرتا رہا، حق کی طرف بلاتا رہا اور باطل قول و عقیدہ سے روکتا رہا۔

مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ (جب تک میں ان کے اندر رہا)۔

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ (پھر جب تو نے مجھے لے لیا)۔ اور اپنی طرف اٹھا لیا۔ توفی کا معنی ہے کسی چیز کو پورا پورا لے لینا۔ موت بھی توفی کی ایک قسم ہے۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا اللہ ہی پورا پورا قبضہ میں لے لیتا ہے جانوں کو ان کے مرنے کے وقت اور کچھ جانوں کو ان کے سونے کے وقت (یعنی توفی کا استعمال صرف موت کے لئے ہی نہیں ہوتا بلکہ موت وفات کی ایک قسم ہے ورنہ سونے کے وقت ارواح کو اللہ جو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اس پر بھی آیت مذکورہ میں لفظ توفی کا اطلاق آیا ہے)۔

كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ (تو ہی ان کا نگراں رہا) یعنی ان کے اعمال و اقوال کا محافظ و نگراں تھا پس جس کو تو نے بچانا چاہا اس کو دلائل، انبیاء اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ سے ہدایت عطا فرما دی اور توفیق دے دی۔

وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۱۱۷ (اور تو ہر چیز سے پورا باخبر ہے) میرے اور ان کے اقوال و اعمال تیرے سامنے ہیں۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ (اگر تو ان کو عذاب دے (تو بیجا نہیں) وہ تیرے بندے ہیں)۔ مالک حقیقی جیسا چاہے اپنی ملک میں تصرف کر سکتا ہے، اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا پھر انہوں نے تو تیرے علاوہ دوسروں کی پوجا کی باوجود یہ کہ تو نے ان کو پیدا کیا اور دوسروں کے گن گائے حالانکہ تو نے ان کو پرورش کیا اور نعمت عطا فرمائی۔ (اس صورت میں تو سزا دینا خلاف عدل ہو ہی نہیں سکتا)[۱]

---

[۱] ابن مردویہ کی روایت ہے کہ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ قربان، رات آپ نے نماز کے اندر قیام کی حالت میں قرآن کی ایک آیت (بار بار) اتنی پڑھی کہ اگر ہم میں سے کوئی ایسا کرتا تو ہم اس پر غصہ کرتے۔ فرمایا میں نے اپنی امت کے لئے دعا کی تھی۔ راوی نے پوچھا پھر کیا جواب ملا۔ فرمایا مجھے ایسا جواب ملا کہ اگر اس کی اطلاع لوگوں کو ہو جائے تو بہت لوگ نماز چھوڑ دیں۔ راوی نے عرض کیا، کیا میں اس کی بشارت لوگوں کو نہ دیدوں۔ فرمایا کیوں نہیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر یہ پیام آپ لوگوں کو بھیج دیں گے تو عبادت کو چھوڑ کر اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے آواز دے کر راوی کو واپس بلا لیا اور یہ آیت اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ تلاوت فرمائی۔ اسی کو (نماز میں بار بار) تلاوت فرما رہے تھے۔ مسلم اور نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۱۸﴾ (اور اگر تو ان کو معاف کردے گا تو بے شک تو ہی غالب ور حکمت والا ہے)۔ یعنی تو ہی غالب قوت والا اور عذاب و ثواب پر قادر ہے۔ تیری طرف سے معافی کسی کمزوری کی بناء پر نہیں ہوگی کہ اس کو عیب قرار دیا جاسکے۔ حاصل مطلب یہ کہ اگر تو عذاب دے تو یہ انصاف ہوگا اور معاف کردے تو تیری مہربانی ہوگی۔

ایک شبہ

عذاب اور مغفرت ہر ایک کو ان شرطیہ کے ساتھ ذکر کرنا بتا رہا ہے کہ دونوں کا امکان ہے حالانکہ مشرک کی مغفرت نہ ہونے کی صراحت آیت میں آچکی ہے۔

ازالہ

مشرک کی مغفرت اگرچہ فی نفسہ ممکن ہے لیکن اللہ نے چونکہ عدم مغفرت کی صراحت کردی ہے اس لئے ناممکن ہوگئی گویا عدم امکان اللہ کے قول کی وجہ سے ہوگیا مگر اس سے مغفرت کا فی الحال استحالہ تو ثابت نہیں ہوتا۔ نہ اس میں کافروں کے لئے مغفرت کی دعا ہے۔ اسی لئے العزیز الحکیم فرمایا الغفور الرحیم نہیں فرمایا بلکہ تمام امور کو اللہ کے سپرد کرنا اور ہر چیز کو اللہ کے ارادہ اور حکمت سے وابستہ قرار دینا مقصود ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت اِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ وَاِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ہے گویا آپ نے اَلۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ کے ساتھ تُعَذِّبۡ پڑھا ہے، تَغۡفِرۡ نہیں پڑھا۔ اسی لئے بعض علماء نے کہا کہ آیت میں (بر قرأت مشہورہ معنی کے لحاظ سے تقدیم و تاخیر ہے) یعنی تغفر سے عبادک کا اور تعذب سے العزیز الحکیم کا معنوی ربط ہے مطلب اس طرح ہے کہ تو غالب و حکیم ہے اس لئے تو عذاب دے سکتا ہے اور وہ تیرے بندے ہیں اس لئے ان کو معاف کرسکتا ہے۔

لیکن ہم بتا چکے ہیں کہ مشہور قرت ہی (معنوی لحاظ سے) زیادہ مناسب ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابراہیم کی یہ دعا جو اللہ نے نقل فرمائی ہے تلاوت فرمائی رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضۡلَلۡنَ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنۡ تَبِعَنِىۡ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡ وَمَنۡ عَصَانِىۡ فَاِنَّكَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ اور حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول جو اللہ نے نقل فرمایا ہے تلاوت فرمایا اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ۔ پھر دعا کی الٰہی میری امت کو (کو بخش دے) میری امت کو بخش دے اور رونے لگے اللہ نے فرمایا جبرئیلؑ محمد ﷺ سے جاکر دریافت کر اگرچہ تیرا رب بخوبی واقف ہے کہ رونے کی کیا وجہ ہے، جبرئیلؑ نے آکر رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے وہ دعا بتادی جو عرض کی تھی۔ اللہ نے حکم دیا جبرئیلؑ محمد ﷺ کے پاس جاکر کہہ دے کہ ہم تیری امت کے سلسلہ میں تجھے خوش کردیں گے، ناراض نہیں کریں گے۔

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوۡمُ يَنۡفَعُ الصّٰدِقِيۡنَ صِدۡقُهُمۡ (اللہ فرمائے گا یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی فائدہ رساں ہوگی)۔ یَوۡمُ یا منصوب ہے خواہ اس کو قَالَ کا مفعول فیہ قرار دیا جائے یعنی عیسیٰؑ کا یہ کلام قیامت کے دن ہوگا، خواہ ھٰذا کو مبتدا اور اس کی خبر کو محذوف قرار دیا جائے یعنی عیسیٰؑ نے جو کچھ کہا وہ حق ہے اللہ یہ بات قیامت کے دن فرمائے گا اس صورت میں حضرت عیسیٰؑ کے قول کی تصدیق اور امت عیسیٰؑ کے لئے مزید سرزنش ہوگی۔ خواہ یوں کہا جائے کہ ھٰذا مبتدا ہے اور یَوۡمُ حقیقت میں خبر مرفوع تھا مگر چونکہ اس کی اضافت مبنی کی طرف ہے اس لئے فتح پر مبنی ہوگیا۔ اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ یَوۡمُ کی اضافت تو صیغہ مضارع کی طرف ہے اور مضارع معرب ہے۔ مگر حقیقت میں یہ شبہ غلط ہے کیونکہ

یَوْمَ کی اضافت پورے جملہ کی طرف ہے اور جملہ مبنی ہوتا ہے۔ جمہور نے یَوْمُ کو خبر ہونے کی بنیاد پر مرفوع بصورت مضموم پڑھا ہے یعنی بغیر تنوین کے۔

حضرت عیسیٰؑ کے قول سے بظاہر یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ کافروں کے لئے حضرت دعاء مغفرت کررہے ہیں اس خیال کو دور کرنے کے لئے فرمادیا کہ آج سچوں کی سچائی فائدہ رساں ہوگی کاذب کافروں کے لئے کوئی فائدہ نہیں ان کی مغفرت نہ ہوگی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ عیسیٰؑ کے قول سے بظاہر جو خوف مترشح ہورہا ہے اس کو دور کرنے کے لئے فرمایا ہو کہ آج سچوں کو ان کی سچائی فائدہ پہنچائے گی (اور تم سچے ہو تم کو کوئی خوف نہ کرنا چاہئے) مطلب یہ کہ دنیا میں جو لوگ (اعتقاد اور قول و عمل کے لحاظ سے) سچے تھے آخرت میں ان کی سچائی مفید ہوگی اور جو دنیا میں جھوٹے تھے وہ آخرت میں سچ بولیں اور لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ کہیں اور شیطان اقرار کرے کہ اِنَّ اللّٰہَ وَعَدَکُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّکُمْ الخ یا آخرت میں بھی جھوٹ بولیں اور کہیں وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَاکُنَّا مُشْرِکِیْنَ بہرحال کوئی بات مفید نہ ہوگی ان کے منہ پر مہر کردی جائے گی اور ہاتھ پاؤں شہادت دیں گے جس سے ان کی رسوائی ہوگی۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک صَادِقِیْنَ سے مراد انبیاءؑ ہیں۔ کلبی نے کہا مومنوں کو ان کا ایمان فائدہ پہنچائے گا (یعنی صَادِقِیْنَ سے مراد مؤمن ہیں) عطاء کے نزدیک یَوْمُ یَنْفَعُ سے اسی دنیا کا دن مراد ہے کیونکہ آخرت تو دارالجزاء ہے دارالعمل نہیں ہے۔

لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ (ان کی سچائی ان کو جنتیں دلوائے گی جن کے (درختوں اور محلات کے) نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان جنتوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے)۔ یہ نفع اور ثواب کا بیان ہے۔

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ (اللہ ان سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے خوش) کیونکہ محبت دونوں جانب سے ہوگی۔ صوفیہ نے یہی تشریح کی ہے لیکن عام اہل تفسیر نے توضیح مطلب اس طرح کی ہے کہ اللہ ان کی مخلصانہ کوشش کو پسند فرمائے گا یہ اللہ کی رضامندی ہوگی اور اللہ کی طرف سے عطاکئے ہوئے کامل ثواب سے اہل جنت خوش ہوں گے یہ ان کی رضامندی ہوگی یعنی ایک طرف سے سعی مشکور ہوگی اور دوسری طرف سے جزاء موفور۔

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۱۹﴾ (یہی بڑے درجہ کی کامیابی ہے)۔ کیونکہ یہ کامیابی لازوال ہے اور دنیوی کامیابی فنا پذیر ہے۔ اس سے آگے آیات میں اللہ نے اپنی ذات کی عظمت کا اظہار اور عیسائیوں کے عقیدہ کا ابطال فرمایا ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِیْهِنَّ ؕ (اللہ ہی کی ہے حکومت آسمانوں کی اور زمینوں اور ان چیزوں کی جو ان کے اندر ہیں)۔ مَا کا لفظ بے عقل مخلوق کے لئے مستعمل ہے اور مَنْ کا لفظ باعقل کے لئے اور استعمال میں باعقل کو بے عقل پر تغلیب دے دی جاتی ہے۔ لیکن مَافِیْهِنَّ میں بے عقل کے ذیل میں باعقل کو داخل کردیا گیا ہے اور وہ لفظ استعمال کیا گیا ہے جو بے عقل کے لئے مخصوص ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ممکنات باعقل ہیں وہ بھی ذاتی امکان، علمی قصور اور نقصان ارادہ کے اعتبار سے بے عقلوں کے ہم جنس ہیں بلکہ ممکن کی تمام صفات کاملہ کا وجود عدم کی طرح ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ یعنی تم سب ذاتی اعتبار سے معدوم ہو (یعنی معدوم الاصل ہو اگرچہ موجود بالاعتبار ہو) اسی مضمون پر تنبیہ کرنے کے لئے بجائے مَنْ کے لفظ مَا ذکر کیا۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مَا کا اطلاق تمام اجناس پر ہوتا ہے (باعقل ہوں یا بے عقل) اور یہاں عموم مخلوق ہی مراد ہے۔

وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۲۰﴾ (اور وہ سب کچھ کرسکتا ہے)۔ نہ دینا، دینا، موجود کرنا، معدوم کرنا سب کا اس کو اختیار ہے۔ ۱۶ ع ۵ ۶

سورۂ مائدہ کی تفسیر ۶ ذیقعدہ ۱۱۹۸ھ کو ختم ہوئی اور اس کا ترجمہ یکم ربیع الاول ۱۳۸۳ھ کو پایہ تکمیل کو پہنچا فَالشُّکْرُ لَهٗ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ

سورۃ الانعام مکی ہے

اس میں ایک سو پینتالیس یا ایک سو چھیالیس آیات اور ۲۰ رکوع ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (ہر طرح کی ستائش ہے اللہ کے لئے) یہ لفظ کے اعتبار سے جملہ خبریہ ہے کہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ لیکن اس سے بندوں کو تعلیم دینا مقصود ہے کہ وہ اللہ کی حمد کریں اور درپردہ اس بات کی بھی تلقین ہے کہ اللہ کو بندوں کی ستائش کی ضرورت نہیں کوئی اس کی تعریف کرے یا نہ کرے بہر حال اس کے لئے واقع میں حمد و ستائش ہے۔

الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (جس نے آسمانوں کو اور زمین کو اندازہ کے مطابق بنایا) اور بغیر سابق مثال کے پیدا کیا۔ اللہ کے وصف خالقیت کا ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے محمود ہونے کے لئے کسی مزید استدلال کی ضرورت نہیں۔ آسمان و زمین کی تخلیق خود ثبوت حمد کے لئے کافی ہے۔ مخلوقات میں سے آسمان و زمین کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ اس لئے کیا کہ تمام مخلوقات میں سب سے بڑے یہی نظر آرہے ہیں، انہی کے اندر لوگوں کے لئے ہزاروں درس عبرت ہیں اور انہی سے بظاہر لوگوں کے مفاد وابستہ ہیں۔ پھر شب و روز کا حدوث و زوال ہر شخص دیکھ رہا ہے (اور کسی چیز کا حدوث بغیر محدث کے نہیں ہو سکتا) اسی لئے بعض نادان آسمانوں کو قدیم بالزمان کہتے ہیں۔ سمٰوٰت کا ذکر بصیغہ جمع اور اَرْض بصیغہ مفرد ذکر کرنے سے اس امر پر تنبیہ ہے کہ آسمانوں کی ماہیتیں اور اشکال باہم مختلف ہیں اور زمین (باوجود یہ کہ اس کے طبقات متعدد ہیں) پھر بھی ایک ہی ماہیت اور ایک ہی شکل رکھتی ہے۔

کعب احبار کا قول ہے کہ توریت کی سب سے پہلی یہی آیت ہے اور سب سے آخری آیت قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا الخ ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے آغاز تخلیق کا ذکر حمد سے کیا اور فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اور انسانوں کے خاتمہ کا ذکر بھی حمد کے ساتھ کیا اور فرمایا وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ (اور پیدا کیا تاریکیوں کو اور نور کو)۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ جَعَلَ کا معنی ہے خَلَقَ۔ بیضاوی نے لکھا ہے دونوں میں فرق ہے، خَلَقَ کا معنی ہے اندازہ کرنا اور جَعَلَ کے معنی کے اندر تضمین کا مفہوم ہے یعنی ایک چیز دوسری چیز کے ضمن میں کر دینا خواہ اس طرح کہ ایک چیز دوسری چیز سے موجود کر دی جائے یا اس طور پر کہ ایک شئے کو بدل کر دوسری چیز بنا دیا جائے (جیسے جَعَلَ الْخَاتَمَ مِنْ فِضَّةٍ انگوٹھی چاندی سے بنادی۔ اور جَعَلَ النُّوْرَ ظُلْمَةً روشنی کو تاریکی میں تبدیل کر دیا) خلاصہ یہ کہ جَعَلَ کے مفہوم کے اندر دو چیزوں کا اعتبار ضروری ہے اسی لئے نور و ظلمت کو عدم سے خارج کر کے وجود میں لانے کے لئے لفظ جَعَلَ ذکر کیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ نور و ظلمت بجائے خود کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے گویا اس سے فرقۂ ثنویہ کے عقیدہ کی تردید ہو جائے گی (جو کہتے ہیں کہ نور سراسر خیر ہے اور ظلمت سراسر شر۔ یعنی خیر کی طاقت کا نام نور ہے اور شر کی طاقت کا نام ظلمت اور یہ دونوں طاقتیں بجائے خود مستقل اور قائم بذاتہ ہیں)۔

میں کہتا ہوں کہ ظلمت باوجود یہ کہ عدمی چیز ہے اور عدم (محض) سے جَعَلَ کا تعلق نہیں ہو سکتا لیکن اس آیت میں ظُلُمٰات کو بھی مجعول قرار دیا ہے کیونکہ ظلمت (معدوم محض نہیں ہے بلکہ اس) کا انتزاع ایسے محل سے ہوتا ہے جو مخلوق

ہے ظلمت و نور بجائے خود قائم بذاتہ نہیں ہیں اور چونکہ وہ اجسام جو حامل ظلمت اور تاریک ہیں بکثرت ہیں اس لئے ظلمات کو بصیغۂ جمع ذکر کیا اور اجسام نورانیہ کم ہیں اس لئے صرف نور بصیغہ واحد ذکر فرمایا گویا نور کی نسبت ظلمت سے ایسی ہے جیسے واحد کی نسبت متعدد سے۔

حسن بصریؒ کے نزدیک ظلمات سے مراد کفر اور نور سے مراد ایمان ہے۔ اس قول پر ظلمات کو بصیغۂ جمع اور نور کو بصیغۂ مفرد لانے کی وجہ یہ ہے کہ کفر کے طریقے بکثرت ہیں اور ایمان کا صرف ایک راستہ ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے پھر اس لکیر کے دائیں بائیں مختلف لکیریں کھینچیں اور فرمایا ان راستوں میں سے ہر راستہ پر شیطان موجود ہے جو لوگوں کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے آیت اِنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ تلاوت فرمائی۔ رواہ احمد والنسائی والدارمی۔

ظلمت کا وجود چونکہ نور سے پہلے ہوتا ہے (عدم وجود سے مقدم ہے) اس لئے ظلمات کا ذکر نور سے پہلے کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا پھر ان پر اپنے نور کا ایک حصہ ڈالا پس جس پر نور کا کوئی حصہ پڑ گیا وہ ہدایت یاب ہو گیا جس پر نہ پڑا وہ گمراہ ہو گیا اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اللہ کے علم کے مطابق لکھ کر قلم خشک ہو گیا۔ رواہ احمد والترمذی۔

ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱﴾ (پھر جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ (عبادت و تعظیم اور عطاء و انعام کی نسبت میں) دوسروں کو اپنے رب کے برابر قرار دیتے ہیں)۔

اس جملہ کا عطف یا تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ پر ہے اس وقت يَعْدِلُوْنَ کا مطلب یہ ہو گا کہ باوجودیکہ سارے جہاں کو پیدا اللہ نے کیا اور بندوں پر یہ اسی کا انعام ہے لیکن کافر اس کی نعمت کا انکار کرتے ہیں (دوسروں کو اس انعام دہی میں شریک سمجھتے ہیں) یا خَلَقَ پر عطف ہے یعنی اللہ نے تو تمام جہان پیدا کیا جس کی تخلیق پر سوائے اللہ کے کسی کو قدرت نہیں پھر کافر ایسی مخلوق کو اس کے برابر قرار دیتے ہیں جس کو تخلیق کائنات پر قدرت نہیں۔

لفظ ثُمَّ (اس جگہ تراخی کے لئے نہیں ہے بلکہ) تعجب کے اظہار کے لئے کہ اس وضاحت کے بعد پھر کافروں کا شرک نہایت عجیب اور بعید (از عقل) ہے۔

بِرَبِّهِمْ کا تعلق كَفَرُوْا سے ہے اور يَعْدِلُوْنَ کا صلہ محذوف ہے یعنی اللہ کا انکار کرتے اور اس سے عدول کرتے ہیں (اس وقت يَعْدِلُوْنَ کا ترجمہ ہو گا لوٹتے ہیں یعنی اللہ سے لوٹتے ہیں) یا بِرَبِّهِمْ کا تعلق يَعْدِلُوْنَ سے ہے یعنی بتوں کو اللہ کے برابر قرار دیتے ہیں۔ نضر بن شمیل نے اس صورت میں بھی يَعْدِلُوْنَ کو عدول سے مشتق قرار دیا ہے اور انحراف و اعراض کے معنی بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ بِرَبِّهِمْ میں با، بمعنی عن (سے) ہے یعنی اپنے رب سے انحراف کرتے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ (اللہ وہی ہے جس نے تم کو (یعنی تمہارے باپ آدم کو ابتدا میں) گارے سے بنایا)۔ یا كُمْ سے پہلے اب کا لفظ محذوف ہے۔ تمہارے باپ آدم کو گارے سے بنایا (اس صورت میں مجاز فی الحذف ہو گا)۔

سدی نے کہا کہ اللہ نے جبرئیلؑ کو زمین پر کچھ مٹی لانے کے لئے بھیجا۔ زمین نے جبرئیلؑ سے کہا میں اللہ کی پناہ چاہتی ہوں اس بات سے کہ تو میرا کچھ حصہ کم کر دے (یعنی میرے بدن کا کچھ حصہ مجھ سے جدا کر لے) جبرئیلؑ نے یہ سن کر کچھ نہیں لیا اور لوٹ کر عرض کیا اے مالک زمین نے مجھ سے تیری پناہ مانگی (تھی اس لئے میں خالی لوٹ آیا) پھر اللہ نے میکائیل کو بھیجا زمین نے ان سے بھی اللہ کی پناہ مانگی، میکائیل بھی لوٹ گئے آخر اللہ نے ملک الموت کو بھیجا، زمین نے ان سے بھی اللہ کی پناہ مانگی۔ ملک الموت نے کہا میں اللہ کی نافرمانی کرنے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ غرض ملک الموت نے (کل) روئے زمین سے مٹی (تھوڑی تھوڑی) لی۔ سرخ، سیاہ، سفید ہر طرح کی مٹی مخلوط کی۔ اسی وجہ سے آدمیوں کے رنگ جدا جدا ہوئے پھر اس مٹی کو میٹھے نمکین اور تلخ پانی سے گوندھا اسی وجہ سے انسانوں کے اخلاق مختلف ہو گئے، پھر اللہ نے فرمایا جبرئیل اور میکائیل نے زمین پر

رحم کیا ایسا نہیں کیا اللہ جو مخلوق میں اسی مٹی سے بناؤں گا اس کی روحیں تیرے ہی ہاتھ میں دوں گا۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ اللہ نے آدم کی تخلیق خاک سے اس طرح کی کہ خاک کا گارا بنایا پھر (کچھ مدت) اسے چھوڑے رکھا یہاں تک کہ گارا سڑ کر لیسدار کیچڑ بن گیا پھر اس کا پتلا بنایا اور پتلے کی صورت بنائی پھر اتنی مدت اسے چھوڑے رکھا کہ وہ ٹھیکرے کی طرح (خشک ہو کر) کھن کھن بولنے لگا پھر اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی۔ کذا قال البغوی۔

حضرت ابوموسیٰؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے کہ اللہ نے تمام زمین سے ایک مٹھی (مٹی) لے کر آدمؑ کی تخلیق کی اسی لئے زمین کے مطابق آدمی سرخ، سفید، سیاہ اور مخلوط رنگ کے اور نرم خو، درشت مزاج، بدخصائل اور پاکیزہ اخلاق والے ہو گئے۔ رواہ احمد والترمذی وابوداؤد۔

حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت ہے کہ اللہ نے آدم کو جابیہ کی مٹی سے بنایا اور جنت کے پانی سے اس کو گوندھا (معلوم نہیں جابیہ سے کیا مراد ہے ممکن ہے نشیبی گڑھے مراد ہوں جہاں پانی جمع ہو جاتا ہے اور دلدل بن جاتی ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ دلدل اور سڑی ہوئی لیسدار مٹی سے جنت کے پانی سے گوندھ کر آدم کا پتلا بنایا) رواہ الحکیم وابن عدی بسند حسن۔

ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ؕ (پھر ایک وقت معین کیا)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب جسمانی ساخت کی تکمیل ہو جاتی ہے تو فرشتہ اس کی میعاد زندگی لکھتا ہے۔ لفظ ثم اور جملہ فعلیہ اسی پر دلالت کر رہا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کا مادۂ تخلیق ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک بصورت نطفہ جمع رکھا جاتا ہے، پھر اتنی ہی مدت پھٹکی کی صورت میں رہتا ہے، پھر اتنی ہی مدت بوٹی کی شکل میں رہتا ہے، پھر اللہ اس کے پاس چار باتوں کا حکم دے کر فرشتہ کو بھیجتا ہے، فرشتہ اس کے (اچھے برے) عمل، میعاد زندگی، رزق اور بدبخت نیک بخت ہونا لکھتا ہے، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ (ساری عمر) جنت والوں کے سے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور جنت کے درمیان صرف آدھے گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ کتاب کا لکھا آگے آتا ہے اور وہ دوزخیوں جیسا عمل کرتے ہیں اور دوزخ میں چلے جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ (ساری عمر) دوزخیوں کے سے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ (اللہ کی) تحریر سامنے آتی ہے اور وہ جنت والوں جیسے عمل کرتے ہیں اور جنت میں چلے جاتے ہیں۔ متفق علیہ۔

وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ (اور دوسرا معین وقت خاص اللہ ہی کے پاس ہے) یعنی میعاد مقرر و معین اللہ کے علم قدیم میں موجود ہے جس میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا، اللہ کے علاوہ اور کسی کو اس میں دخل نہیں ہے۔ جملہ اسمیہ دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے چونکہ اللہ کے علم کے اندر معیاد کا مقرر ہونا ناقابل تغیر ہے اس لئے جملہ اسمیہ استعمال کیا۔ اَجَلٌ کی تنوین عظمت کا اظہار کر رہی ہے اسی لئے اس جملہ کو بغیر عطف کے ذکر کیا اور چونکہ اَجَلٌ کی صفت مُسَمًّى مذکور ہے اس لئے خبر (عِنْدَهٗ) کو مقدم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

حسن قتادہ اور ضحاک نے کہا پہلی اَجَلٌ سے مراد ہے پوری مدت زندگی پیدائش سے موت تک اور دوسری اَجَلٌ سے مراد ہے موت سے حشر تک پوری برزخی مدت۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول روایت میں آیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہر شخص کی دو اجلیں ہیں۔ ایک پیدائش سے موت تک، دوسری موت سے حشر تک۔ اگر آدمی نیک، پرہیزگار اور کنبہ پرور ہوتا ہے تو برزخی اجل کا کچھ حصہ لے کر میعاد عمر میں بڑھا دیا جاتا ہے اور اگر بدکار رشتہ کو منقطع کرنے والا ہوتا ہے تو مدت زندگی کا کچھ حصہ لے کر اجل برزخی میں بڑھا دیا جاتا ہے۔

مجاہدؒ اور سعید بن جبیرؒ نے کہا اول اجل دنیا (کی زندگی) کی مدت ہے اور دوسری اجل آخرت کی مدت۔ عطیہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا میں اجل سے مراد نیند ہے جس میں اللہ روح کو قبض کر لیتا ہے اور بیداری کی حالت میں واپس کر دیتا ہے اور اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ سے مراد ہے اجل موت (یعنی مدت زندگی کا خاتمہ)۔

ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝ (پھر بھی تم شک میں پڑے ہو)۔ تمترون۔ مِرْيَةٌ سے ماخوذ ہے مِرْيَةٌ کا معنی ہے شک یا مُرَاءٌ سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے جھگڑا کرنا۔ یعنی اللہ کی قضاو قدر میں یا مرنے کے بعد جی اٹھنے میں تم شک یا جھگڑا کرتے ہو۔ ثم کا لفظ اظہار تعجب کے لئے ہے یعنی تعجب ہے کہ تم شک اور جھگڑا کرتے ہو باوجود یہ کہ یہ بات واضح ہو چکی کہ تمہارے تمام اصول کا خالق اور مدت مقررہ تک زندہ رکھنے والا اللہ ہی ہے۔ پس جس طرح اس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا اسی طرح دوبارہ بھی زندہ کر کے اٹھا سکتا ہے اس کے حکم اور علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھ شخص ہیں جن پر میں نے اور اللہ نے اور ہر مستجاب الدعوات پیغمبر نے لعنت کی ہے (۱) اللہ کی کتاب میں (لفظی یا معنوی) زیادتی کرنے والا (۲) تقدیر خداوندی کی تکذیب کرنے والا (۳) زبردستی تسلط جمانے والا تاکہ جس کو اللہ نے ذلیل قرار دیا ہے اس کو عزت دار بنائے اور جس کو اللہ نے عزت دار بنایا ہے اس کی ذلت کرے (۴) اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھنے والا (۵) اللہ کی حلال قرار دی ہوئی چیز کو حرام بنانے والا (۶) اور میرے طریقہ کو ترک کرنے والا۔ رواہ البیہقی فی المدخل ورزین فی کتابہ۔

میں کہتا ہوں اللہ کی کتاب میں زیادتی کرنے والے رافضی ہیں جو قرآن کے تیس پاروں میں دس پاروں کی زیادتی کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ عثمانؓ نے قرآن کے دس پارے ساقط کردیئے تھے۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ سورۂ احزاب، سورۂ بقرہ کے برابر تھی۔ اور رسول اللہ ﷺ کی اولاد کے قتل کو حلال سمجھنے والے خارجی ہیں اور تقدیر خداوندی کی تکذیب کرنے والے معتزلہ ہیں۔ انہی کی طرف آیت میں اشارہ ہے۔ اور اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال سمجھنے والا فرقہ مرجۂ ہے جو انسان کو محض مجبور قرار دیتا ہے اور زبردستی تسلط جمانے والے ظالم بادشاہ ہیں اور سنت رسول اللہ ﷺ کو ترک کرنے والے تمام بدعتی اور فاسق ہیں۔

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ (اور وہی ہے معبود برحق آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی)۔ ھو ضمیر لفظ اللّٰہ کی طرف راجع ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور لفظ اللّٰہ (جو اس جگہ مذکور ہے) ھُوَ کی خبر ہے یا بدل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ کی طرح ہو، ضمیر شان ہو اور اللّٰہ مبتدا ہو اور فِي السَّمٰوٰتِ خبر ہو) اگر لفظ اللہ کو صیغۂ مشتق کہا جائے تو اس کو ترجمہ ہوگا معبود برحق اور فِي السَّمٰوٰتِ کا اس سے تعلق ہوگا یعنی اللہ آسمانوں میں زمین میں معبود برحق ہے۔ اور اللہ کو علم کہا جائے تو بتاویل مشتق قرار دے کر یوں ترجمہ کیا جائے گا کہ اللہ ہی آسمانوں میں اور زمین میں اللہ ہے یعنی اس نام سے معروف ہے اور اسی نام سے اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

یا فِي السَّمٰوٰتِ ظرف مستقر ہے اور محذوف کے متعلق ہے اور مجاز اً خبر ہے یعنی اللہ آسمانوں میں اور زمین میں موجود ہے۔ اس پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا آسمان و زمین اللہ کے مکان اور محل ہیں۔ لیکن جب اس کو مجاز پر محمول کیا جائے تو کوئی شبہ نہیں رہے گا۔ کیونکہ (آسمان زمین اور) ساری کائنات اللہ کی صفات کا مظہر ہیں (پس موجود ہونے سے مراد ہوگا ظاہر ہونا پر تو انداز ہونا)۔

بیضاوی نے یہ تاویل کی ہے کہ اللہ کو آسمان و زمین کا چونکہ کامل علم ہے اس لئے مجازاً کہا جا سکتا ہے کہ اللہ ان میں موجود ہے

يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ (وہ تمہارے پوشیدہ اور ظاہر احوال کو جانتا ہے) یعنی جو باتیں تم دلوں میں پوشیدہ رکھتے ہو ان کو بھی جانتا ہے اور جو ظاہر کرتے ہو ان سے بھی واقف ہے۔ یہ دوسری خبر ہے یا پہلی ہی خبر ہے اور فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ، يَعْلَمُ سے متعلق ہے۔ کیونکہ آسمانوں اور زمین میں اللہ کے معلومات واقع ہیں۔

يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝ (اور جو کچھ تم عمل کرتے ہو ان کو بھی جانتا ہے)۔ یعنی اعضاء جسم سے تم جو نیکی بدی کرتے ہو اس کو اللہ جانتا ہے اس کا بدلہ (اچھا برا) تم کو دے گا۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دل اور اعضاء کے اعمال چھپ کر یا ظاہر طور پر تم کرتے ہو ان کو بھی اللہ جانتا ہے اور جو کام ابھی نہیں کئے آئندہ کرو گے اللہ ان سے بھی واقف ہے۔ ماضی حال اور

مستقبل کو جاننا اللہ کے معلومات کی خصوصیت ہے)۔
وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ۝ (اور ان کے پاس کوئی بھی نشانی ان کے رب کی نشانیوں میں سے نہیں آتی مگر وہ اس سے روگردانی کیا ہی کرتے ہیں)۔ مِنْ آيَةٍ میں مِنْ تعمیم کے لئے ہے اور زائد ہے۔ آیات رب سے مراد معجزات ہیں جیسے چاند کا پھٹنا، کنکریوں کا بولنا وغیرہ اور عطاء کے نزدیک قرآن کی آیات مراد ہیں اور مِنْ آيَاتِ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔
فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ (سوانہوں نے حق کو بھی جھوٹا قرار دیا جب حق ان کے پاس آگیا)
حق سے مراد ہے قرآن یا رسول اللہ کی ذات مبارک۔ فقد میں فاء تفریع کے لئے یعنی جب انہوں نے تمام معجزات کا انکار کر دیا تو قرآن کا بھی انکار کر دیا یہ بھی ایک معجزہ ہی ہے۔ یا فاء سببی ہے، یعنی جب انہوں نے قرآن کی تکذیب کی جو لفظاً اور معنی ہر زمانہ میں واضح ترین معجزہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی جن کا وجود بجائے خود معجزہ ہے، ایک شخص جو انہیں میں پیدا ہوا اور اس نے نہ کسی سے کچھ پڑھا نہ لکھا پھر ایسے شخص سے علم کے چشمے اور حکمت کے دریا بہہ نکلے جس کی تائید سابق آسمانی کتابوں سے ہو رہی ہے اور اس کی نبوت کا اقرار بڑے بڑے یہودی اور عیسائی علماء و مشائخ کر چکے ہیں لیکن انہوں نے اس کی نبوت کا بھی اقرار نہیں کیا تو پھر دوسرے متفرق معجزات سے روگردانی کیوں نہیں کریں گے۔
فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ (سو آئندہ ان کو اس چیز کی خبریں مل جائیں گی جس کا یہ مذاق اڑاتے تھے)۔ یعنی قیامت کے دن یا اسلام کے ظہور و عروج کے زمانہ میں۔ مطلب یہ کہ اپنے عمل کی برائی اس وقت ان پر ظاہر ہو جائے گی۔ جب قیامت کے دن یا دنیا میں ہی ان پر عذاب آئے گا۔
أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ (کیا (دوران سفر میں شام کے راستہ میں) انہوں نے نہیں دیکھا کہ کتنی کثرت سے جماعتوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں)۔ كَمْ خبریہ ہے بمعنی کثیر اور مِنْ قَبْلِهِمْ میں مِنْ زائد ہے۔ قرن ہم عصر جماعت، اس کی جمع قرون ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي یعنی تمام جماعتوں میں بہتر وہ لوگ ہیں جو میرے ہم عصر ہیں۔ یا قَرْن کے معنی ہیں زمانہ کا ایک حصہ چالیس سال کا یا دس سال کا یا بیس سال کا یا تیس یا پچاس یا ساٹھ ستر یا اسی یا سو یا ایک سو بیس برس کا، یہ مختلف اقوال آئے ہیں۔ صحیح ترین قول یہ ہے کہ قرن صدی کو کہتے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن بشر مازنی سے فرمایا تھا تم ایک قرن جیو گے۔ چنانچہ ان کی عمر سو برس ہوئی۔ (ذکرہ البغوی) نہایۃ الجزری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیر کر فرمایا تو ایک قرن جیتا رہے۔ چنانچہ اس کی عمر سو برس کی ہوئی۔ اگر قرن کا معنی آیت میں زمانہ کا لیا جائے تو (زمانہ کو ہلاک کرنے سے) مراد اہل زمانہ کو ہلاک کرنا ہوگا۔
مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ (جن کو زمین پر ہم نے اتنی قوت دی تھی) یعنی ان کو جماؤ دیا تھا اور طاقت، سامان اور تعداد عطا کی تھی۔
مَا لَمْ نُمَكِّن لَّكُمْ (کہ تم کو اتنی قوت نہیں دی) مَا لَمْ نُمَكِّنْ میں مَا یا مَكَّنَّا کا مفعول دوئم ہے کیونکہ مَكَّنَّا کے اندر اَعْطَيْنَا کا معنی ہے یا مصدری ہے شَيْئًا کے معنی میں۔
حضرت ابن عباسؓ نے (اس طرح تفسیری مطلب) بیان کیا کہ ہم نے ان کی عمر میں اتنی ڈھیل دی کہ اتنی ڈھیل تمہاری عمروں میں نہیں دی جیسے قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود وغیرہ۔ آیت میں (لَكُمْ) خطاب ہے لیکن اس سے اوپر (قَبْلِهِمْ، يَأْتِيهِمْ أَلَمْ يَرَوْا وغیرہ) غائب کی ضمیریں ہیں اور یہ غیوبت سے خطاب کی جانب انتقال ہے (جو مستحسن ہے) علماء بصرہ نے کہا اور پر اہل مکہ کے متعلق غائب کی ضمیر استعمال کی اور فرمایا أَلَمْ يَرَوْا لیکن اہل مکہ میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی بھی شامل تھے (جو حاضر تھے) اس لئے خطاب کی طرف انتقال کیا۔
وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِم مِّدْرَارًا (اور ہم نے ان پر خوب بارشیں برسائیں)۔ السَّمَاء سے مراد ہے

بارش، مِدْرَارًا بروزن مِفْعَالٌ۔ مادہ دَرٌّ ہے دَرٌّ کا معنی دودھ۔ دودھ عرب کے لئے بہت بڑھیا چیز ہے اس لئے بڑے فائدے اور کثیر بھلائی کو در کہا جاتا ہے۔ (گویا مِدْرَارًا کا ترجمہ ہوا بہت مفید۔ ضرورت کے وقت بہت کار آمد) حضرت ابن عباسؓ نے اس کا ترجمہ کیا۔ پیہم مسلسل۔

وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ (اور ہم نے ان کے نیچے سے نہریں جاری کیں) یعنی ان کے مکانوں کے نیچے ہم نے نہریں جاری کردی تھیں اس لئے پھلدار درختوں اور بہتی نہروں کے اندر وہ بڑے مزے اور عیش سے رہتے تھے۔

فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ (پھر ان کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے ان کو تباہ کر دیا) یعنی جب ہدایت کرنے کے لئے ان کے پاس انبیاء پہنچے اور انہوں نے انبیاء کو جھوٹا قرار دیا تو ہم نے ان کو تباہ کر دیا اس وقت ان کے پاس انبیاء پہنچے اور انہوں نے انبیاء کو جھوٹا قرار دیا تو ہم نے ان کو تباہ کر دیا اس وقت ان کی دنیوی طاقت اور خوش عیشی کچھ کام نہ آئی پس یہ کافر جب محمد ﷺ اور قرآن کا انکار کرتے ہیں تو دنیوی ساز و سامان ان کو تباہی سے کس طرح بچا سکتا ہے۔

وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۶ (اور ان کے بعد ہم نے دوسری قومیں پیدا کیں) اور تباہ شدہ لوگوں کی جگہ ان کو قائم کیا پس جس طرح گزشتہ زمانہ میں پیغمبروں کی تکذیب کرنے والوں کو تباہ کر کے دوسری قوموں کو ان کا جانشین بنایا اسی طرح اے اہل مکہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم کو بھی ہم تباہ کر دیں گے (اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئیں گے)۔

کلبی اور مقاتل کا بیان ہے کہ نضر بن حارث، عبداللہ بن ابی امیہ اور نوفل بن خویلد نے کہا محمد ﷺ ہم ہرگز تم پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک اللہ کی طرف سے (ہماری نظروں کے سامنے) تم ایک کتاب نہ لاؤ جس کے ساتھ چار فرشتے ہوں اور وہ شہادت دیں کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے آئی ہے) اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ (اور کسی کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر ہم تم پر نازل کر دیں جس کو اپنے ہاتھوں سے یہ لوگ چھو رہے ہوں)۔

لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷ (تب بھی کافر محض ضد اور عناد سے) کہیں گے کہ یہ تو بس کھلا ہوا جادو ہے۔ اپنے ہاتھ سے چھونے کے بعد فریب دہی اور فریب خوردگی کی گنجائش نہیں رہتی کیونکہ جن چیزوں کو ہاتھ سے چھو لیا جائے ان کو جادو کی کار فرمائی نہیں کہہ سکتے اور اس کو نظر بندی کہہ کر ساقط الاعتبار قرار دینا ممکن نہیں مگر کافر اس کو بھی جادو ہی کہیں گے اور ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ کے علم ازلی میں پہلے سے موجود ہے کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ (انہوں نے کہا کہ محمد پر فرشتہ نازل کیوں نہیں کیا گیا) یعنی فرشتے کو کیوں نہیں اتار اگیا جو اس کی نبوت کی شہادت دے اور ہم کو بتائے کہ یہ پیغمبر ہے۔ اس آیت کا مضمون وہی ہے جو آیت لو لا انزل الیہ ملک فیکون معہ نذیرا کا ہے۔

وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝۸ (اور اگر ہم (اس کے ساتھ) فرشتہ کو (شاہد بنا کر) اتار دیں تو کام ہی تمام کر دیا جائے گا اس کے بعد ان کو مہلت نہیں دی جائے گی) کام تمام کر دینے سے مراد ہے درخواست نزول کرنے والوں کو تباہ کر دینا کیونکہ ماضی میں اللہ کا طریقہ یہی رہا ہے کہ طلب معجزات کرنے والوں کو ظہور معجزات کے بعد ہلاک کر دیا گیا۔ مجاہد نے کہا کام تمام ہونے سے مراد ہے قیامت بپا ہو جانا۔ ضحاک نے کہا اگر فرشتہ اصلی شکل میں ان کے سامنے آجاتا ہیبت کے مارے سب مر جاتے۔

لفظ ثم (تراخی کے لئے یہاں نہیں ہے بلکہ) فرق مرتبہ کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ کام کا فیصلہ ہو چکنا اور مہلت نہ پانا

دونوں میں بڑا فرق ہے نفس عذاب سے عذاب کا ناگہاں آجانا زیادہ سخت ہوتا ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا (اور اگر ہم اس (شاہد) کو فرشتہ بناتے یا رسول کو فرشتہ بناتے یعنی اگر فرشتہ کو رسول کا ہمراہی (اور شاہد) بناتے یا یہ مطلب کہ کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔ کافروں کی درخواست دونوں طرح کی تھی۔ کبھی تو وہ کہتے لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا اور کبھی کہتے لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً (اس لئے آیت مذکورہ کا دونوں طرح ترجمہ اور مطلب صحیح ہے۔

لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا (تو ہم اس کو مرد بناتے) یعنی مرد کی شکل دیکر بھیجتے۔ جیسے حضرت جبرئیل حضرت دحیہ کلبیؓ کی شکل میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے آتے تھے۔ بات یہ ہے کہ فرشتوں کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنا عام بشری قوت سے باہر ہے البتہ بعض مخصوص انبیاء نے قوت قدسیہ کا حامل ہونے کی وجہ سے ملائکہ کو اصلی صورت میں کبھی دیکھا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ پیغمبر خالق و مخلوق کے درمیان ایک برزخی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس میں طرفین سے مناسبت ہوتی ہے خالق کے ساتھ ارتباط رکھنے کی وجہ سے وہ ان تمام فیوض کو قبول کرتا ہے جو عالم بالا سے جاری ہوتے ہیں اور مخلوق کے ساتھ مناسبت رکھنے کی وجہ سے وہ باری تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ فیوض سے مخلوق کو سرفراز کرتا ہے۔ اگر طرفین کے ساتھ مناسبت نہ ہو تو فیضان روحانی کو حاصل کرنا اور مخلوق کو اس سے بہرہ اندوز کرنا ممکن نہیں۔ انبیاء ہوں یا ملائکہ دونوں کا باطنی لگاؤ خالق سے ہوتا ہے ان کا مبداء تعین ذات باری کا کوئی مخصوص وصف ہوتا ہے باقی مخلوق کا مبداء تعین کوئی صفت نہیں بلکہ صفت کا پرتو اور عکس ہوتا ہے [1] اس لئے ضروری ہے کہ رسول کا مخلوق سے شکلی (نوعی اور مادی) مناسبت بھی ہو (پس اگر ملائکہ کو انسانوں کے پاس پیام پہنچانے کے لئے بھیجا جاتا تو کم سے کم ان رسولوں کا آدمی کی شکل پر ہونا ضروری تھا اور ایسی حالت میں ان کی شناخت ناممکن تھی، معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ واقع میں وہ ملائکہ انسانی نسل کی پیداوار ہیں اور انسانوں سے نوعی اشتراک رکھتے ہیں یا ملائکہ بشکل بشری ہیں اور انسانوں کے بھیس میں آئے ہوئے ہیں)۔

پیغمبر فرشتوں کو انسانی شکل میں بھیجنا اس لئے بھی ضروری ہو تا کہ انسان ایمان بالغیب کا مکلف ہے۔ اس ماموریت کا تقاضا ہے کہ فرشتوں کو (پیغمبر بنا کر بھیجنے کے باوجود) مشتبہ اور پردہ کے اندر رکھا جائے (تا کہ غیبی حقیقت غائب ہی رہے) اسی لئے آگے فرمایا ہے۔

وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۹ (اور ہمارے اس فعل سے ان کے لئے وہی اشکال پیدا ہوتا جو اشکال اب کر رہے ہیں) یعنی فرشتوں کی حالت کو ہم اشتباہ میں ہی رکھتے، لوگوں کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ یہ فرشتے ہیں بلکہ وہ یہی کہتے کہ یہ بھی دوسروں کی طرح انسان ہیں جس طرح اب انبیاء کے کھلے معجزات دیکھنے کے بعد بھی رسالت و نبوت میں اشتباہی کیفیت انہوں نے خود اپنے اوپر طاری کر رکھی ہے۔ کافر حضور اقدس ﷺ سے استہزاء کرتے تھے جس سے آپ کو دکھ پہنچتا تھا۔ آئندہ آیت آپ کی تسلی کے لئے نازل ہوئی۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ (اور آپ سے پہلے پیغمبروں سے بھی استہزاء کیا گیا ہے)۔ جس طرح آپ سے استہزاء کیا جاتا ہے اس لئے آپ اس کی پروانہ کریں۔

---

[1] نبوت اور ملکیت کو ایک آئینہ کہا جا سکتا ہے جس کا رخ پورے مقابلہ کے ساتھ نہیں بلکہ کچھ ترچھے طور پر آفتاب الوہیت کی طرف ہوتا ہے اور بغیر کسی وساطت کے آفتاب الوہیت کی کوئی شعاع جلالی یا جمالی اس آئینہ پر پڑتی ہے، مبداء تعین ہونے کا یہی معنی ہے۔ پھر آئینہ کا رخ چونکہ ترچھا ہوتا ہے اس لئے آئینہ نبوت ورسالت پر پڑنے والی کوئی شعاع براہ راست وہ شعاع کسی آڑ میں ہونے کی وجہ سے نہیں پہنچ سکتی گویا آفتاب الوہیت کی شعاع براہ راست آئینہ پر پڑتی ہے اور آئینہ کو روشن کر دیتی ہے، پھر آئینہ سے الٹ کر دالان کمرہ یا کسی اور مسقّف جگہ پر پہنچتی ہے اور آئینہ نبوت پر پڑنے والی شعاع کے عکس سے وہ اندرونی جگہ بھی چمکنے لگتی ہے یہی معنی ہیں اس قول کے کہ باقی مخلوق کا مبداء تعین صفت کا سایہ ہے۔

ع ۱/۷ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٠﴾ (پھر اسی (عذاب) نے ان مذاق بنانے والوں کو گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے)۔ سوان استہزاء کرنے والوں کو بھی وہی عذاب گھیر لے گا جس سے یہ استہزاء کرتے ہیں۔ ضحاک نے حَاقَ کا ترجمہ کیا ہے "گھیر لیا"۔ قاموس میں بھی یہی ہے۔ لیکن ربیع بن انس اور عطاء نے علی الترتیب اس کا ترجمہ کیا ہے نَزَلَ اور حَلَّ یعنی نازل ہوا اور اترا۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ اے محمد ﷺ (آپ کہہ دیجئے کہ زمین کی سیر کرو)۔ خواہ جسمانی سفر کے ذریعہ سے ہو یا عقل ودانش اور عبرت اندوز سوچ بچار کی سیر ہو۔

ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١١﴾ (پھر (پیغمبروں کو) جھوٹا قرار دینے والوں کے انجام کی کیفیت دیکھو)۔ یعنی دیکھو کہ ان کا انجام کار کیا ہوا اور کفر وتکذیب کے نتیجہ میں ان کی کیسی تباہی وناکامی ہوئی۔

......ایک شبہ......

دوسری آیت ہے قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ اور اس آیت میں ہے ثُمَّ انْظُرُوْا، فاء صرف تعقیب کے لئے آتی ہے (یعنی فاء کے بعد جو مضمون ہوتا ہے وہ فاء سے پہلے والے مضمون کے بعد بغیر کسی توقف کے واقع ہوتا ہے) اور ثم تراخی کے لئے آتا ہے (یعنی ثُمَّ کے بعد والا مضمون پہلے والے مضمون سے کچھ مدت اور وقفہ کے بعد واقع ہوتا ہے، اب سوال یہ ہے) کہ سیر ارض کے بعد فوراً انجام نظر کے سامنے آنا ضروری ہے یا کچھ مدت کے بعد۔ دونوں مضمونوں میں مطابقت کس طرح ممکن ہے۔

......ازالہ......

سیر (کوئی لحاتی اور آنی چیز نہیں بلکہ اس) کے لئے ممتد وقت اور مسافت کی ضرورت ہے ابتداء سیر اور انتہاء سیر کے درمیان کافی وقت ہوتا ہے اہل تکذیب کا کچھ انجام بد تو ابتدائی سیر کے بعد ہی نظر کے سامنے آسکتا ہے اور ان کے ویران شہروں اور تباہ شدہ بستیوں کا پورا عبرت آفریں معائنہ انتہاء سیر کے بعد ہوتا ہے۔ اول صورت کے لحاظ سے فاء کا استعمال کیا اور دوسری صورت کے لحاظ سے ثم کو ذکر کیا۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ اس آیت اور آیت سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا میں فرق یہ ہے کہ فَانْظُرُوْا والی آیت میں تو سیر کا حکم صرف نظر کے لئے دیا گیا ہے اور اس آیت میں ایسا نہیں ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تجارت وغیرہ کے لئے سفر کرنا مباح ہے اور تباہ شدہ لوگوں کے آثار دیکھنا واجب ہے (یعنی تجارت وغیرہ کے لئے جاؤ تو لازم ہے کہ نافرمانوں کی ویران بستیاں اور ان کا انجام بد دیکھو) صاحب مدارک نے بھی یہی لکھا ہے بلکہ اتنا زائد لکھا ہے کہ اس آیت میں (سیر کا حکم بطور اباحت کے ہے اور ہلاک شدہ لوگوں کے آثار دیکھنے کا حکم وجوبی ہے اور دونوں حکموں کے درمیان) ثُمَّ ذکر کیا ہے کیونکہ اباحت وایجاب میں کامل بعد ہے (اور ثُمَّ اس بُعد پر دلالت کر رہا ہے)۔

میں کہتا ہوں ان دونوں بزرگوں کے قول کا سنگ بنیاد یہ ہے کہ فاء کو سببیہ مانا گیا ہے اور سببیت کا تقاضا یہ ہے کہ سیر واقع میں نظر کا سبب ہے (یعنی سیر کے بعد نظر حاصل ہوتی ہی ہے) خواہ نظر مقصود اصلی ہو یا نہ ہو۔ اب دونوں آیتوں کا مقصد یہ نکلا کہ دونوں چیزیں مطلوب ہیں مطلق سیر اور تباہ شدہ لوگوں کے انجام کا معائنہ۔ مگر اس آیت میں چونکہ ثُمَّ ہے اس لئے سیر کا سبب نظر ہونا معلوم نہیں ہوتا اور دوسری آیت میں فاء ہے اس لئے سیر کا سبب نظر ہونا ضروری ہے اور دونوں آیتوں کا سیاق چاہتا ہے کہ امر کا اصل مقصد تو نظر انجام ہے اور سیر چونکہ نظر کا ذریعہ ہے اس لئے اس کا بھی حکم دے دیا گیا ہے اور چونکہ بالذات مقصود اور وسیلۂ مطلوب میں بہت زیادہ بعد ہے (مقصد اور ذریعۂ مقصد دو الگ الگ چیزیں ہیں) اس لئے لفظ ثُمَّ استعمال

کیا گیا۔ اب دونوں آیتوں میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے اس امر کی ضرورت نہیں رہتی کہ فَانْظُرُوْا والی آیت میں آغاز سیر اور ثُمَّ انْظُرُوْا والی آیت میں انتہاء سیر مراد لی جائے۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اے محمد ﷺ (آپ پوچھیے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ کس کا (بنایا ہوا قائم کیا ہوا) ہے ما کا لفظ عام ہے اصحاب عقل (جن وانس وملائک) اور بے عقل (باقی ساری کائنات) سب کو شامل ہے۔

قُلْ لِّلّٰهِ ؕ چونکہ اس کا جواب اختلافی نہیں ہو سکتا اور کوئی یہ جواب نہیں دے سکتا کہ یہ کائنات اللہ کے سوا کسی اور کی ہے اسلئے آپ ہی (کہہ دیجئے کہ سب کچھ اللہ کا ہے)۔

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ اس نے اپنے اوپر رحمت کا ذمہ لے رکھا ہے۔ یعنی اس نے رحمت کرنے کا ذمہ لے رکھا اور محکم ترین وعدہ کرلیا ہے، جس کی خلاف ورزی ناممکن ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ نے مخلوق کو پیدا کرنے کا فیصلہ کرلیا تو ایک تحریر لکھ کر اپنے پاس عرش کے اوپر رکھ چھوڑی جس میں لکھا ہے یقیناً میری رحمت میرے غضب پر غالب ہوگئی۔ دوسری روایت میں ہے میری رحمت میرے غضب سے آگے بڑھ گئی، رواہ البغوی من حدیث ابوہریرہؓ۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی سو رحمتیں ہیں جن میں سے ایک اس نے نیچے اتار کر جن وبشر اور چوپایوں اور کیڑوں مکوڑوں کو تقسیم کی ہے، اسی کی وجہ سے وہ باہم محبت ورحمت کرتے ہیں، وحشی جانور اسی کے سبب اپنے بچوں سے پیار کرتے ہیں۔ ننانوے رحمتیں اس نے اپنے لئے رکھ چھوڑی ہیں جن سے قیامت کے دن اپنے بندوں کو سرفراز فرمائے گا، رواہ مسلم۔

میں کہتا ہوں غالباً سو کی تعین عددی نہیں بلکہ بطور تمثیل اظہار کثرت مراد ہے کیونکہ بندوں کے پاس جو کچھ ہے (رحمت ہو یا کچھ اور سب) فنا ہونے والا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ لازوال ہے۔ ممکنات کی تمام صفات محدود ہیں اور اللہ کی صفات لامتناہی۔ رحمت کا جو حصہ اللہ نے اتارا اور بندوں کے دلوں میں ڈالا ہے وہ اللہ کی رحمت کا ایک ادنیٰ پرتو ہے۔

حضرت عمر بن خطابؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کچھ جنگلی قیدی حاضر کئے گئے ان میں ایک عورت بھی تھی جس کے پستان دودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ جب قیدیوں میں ایک بچہ پر اس کی نظر پڑی تو دوڑ کر عورت نے بچہ کو پکڑ کر سینے سے چمٹالیا اور اس کو دودھ پلایا۔ حضور ﷺ نے فرمایا دیکھو کیا یہ عورت اپنے بچہ کو آگ میں پھینک سکتی ہے۔ ہم نے عرض کیا نہیں وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ فرمایا جس قدر یہ عورت اپنے بچہ پر مہربان ہے اس سے زیادہ اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

اللہ کی دنیوی رحمت دنیوی نعمتوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے (جیسے جسمانی صحت وحسن، مال ودولت کی کثرت، اولاد کی فراوانی، عیش وراحت، حکومت وعزت، اس میں مسلم وکافر سب شریک ہیں) اور رحمت اخروی سے نعمت آخرت وابستہ ہے جیسے پیغمبروں کی بعثت آسمانی کتابوں کا نزول (باطنی وظاہری، انفسی وآفاقی) دلائل توحید کا قیام اور موت اور مرنے کے بعد دوبارہ زندگی جس کے نتیجہ میں جنت اور اللہ کا دیدار حاصل ہوگا۔ یہ سب آخرت سے تعلق رکھنے والی رحمت ہے (جو مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے) اور یہی اصل مقصود ہے۔ احادیث مندرجہ بالا اسی پر دلالت کر رہی ہیں اور آئندہ آیت بھی یہی بتا رہی ہے۔

لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (اللہ تم کو (یعنی تمہارے اجزاء کو) قیامت کے دن ضرور جمع کر کے اٹھائے گا)۔ اس جگہ اِلٰی بمعنی فِی ہے۔

یا یہ مطلب ہے کہ اللہ قبروں کے اندر تم سب کو قیامت تک جمع رکھے گا (یہ تو آیت کا اصل مطلب ہے جو صراحۃً معلوم ہو رہا ہے لیکن) اس سے ذیلی طور پر یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تم کو اٹھائے گا اور تم قبروں سے الگ الگ

نکالے جاؤ گے تاکہ اپنی اپنی زندگی کا کیا دھرا دیکھ سکو اور پھر اس کا بدلہ تم کو دیا جائے۔

اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اصل مقصد آخرت کی رحمت ہے۔ چونکہ کافر بڑی قوت کے ساتھ پر زور طور پر دوسری زندگی اور قیامت کے دن اٹھائے جانے کے منکر تھے اس لئے سب سے پہلے تکذیب کرنے والوں کے انجام بد کا معائنہ کرنے کا حکم دیا، پھر ہمہ گیر قدرت کا اظہار لِمَنْ مَّافِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کہہ کر فرمایا، پھر کَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ سے دوبارہ جی اٹھنے کی حکمت بیان فرمائی، پھر لَيَجْمَعَنَّكُمْ میں لام تاکید کے ساتھ بعث وحشر کی صراحت کی، پھر آئندہ آیت میں وجود قیامت کو ناقابل شک قرار دیا اور فرمایا۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ (اس میں کوئی شک نہیں)۔ یعنی جسم کے منتشر اجزاء کا دوبارہ جمع کیا جانا یا روز قیامت کا آنا ناقابل شک ہے۔

اور چونکہ اَلرَّحْمَةَ کا لفظ عام تھا جس سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید اللہ کی اخروی نعمت سے کفار بھی بہرہ اندوز ہو سکیں گے اور یہ شبہ تھا غلط اس لئے آئندہ آیت میں کافروں کی آخرت میں محرومی ظاہر کی اور یہ بھی بتادیا کہ یہ محرومی خود کافروں کی آوردہ ہوگی اور فرمایا۔

اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ (جن لوگوں نے اپنے کو ضائع کر دیا ہے وہ ایمان نہیں لائیں گے)۔

یعنی شرک کرنے کی وجہ سے جنہوں نے اپنے کو ضائع کر دیا وہ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ انہوں نے اصل پونجی ہی کھودی، فطرت سلیم اور صحیح دانش ضائع کر دی اور اللہ کی رحمت کا جو حصہ ان کو مل رہا تھا اس کو فوت کر دیا اور اس کے عوض عذاب خرید لیا۔

فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کی فاء بتا رہی ہے کہ اللہ کے علم میں جو کافروں کا خسران ہے (یعنی اللہ پہلے سے جانتا ہے کہ یہ لوگ خاسر رہیں گے) وہی ان کے ایمان نہ لانے کا سبب ہے۔

اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا سے پہلے واؤ عاطفہ کا ذکر ہونا چاہئے تھا تاکہ لَا رَيْبَ فِيْهِ پر عطف ہو جاتا مگر لَا رَيْبَ فِيْهِ کہنے کے بعد ایک سوال کیا جاسکتا تھا کہ روز قیامت ناقابل شک ہے تو کافروں کو اس میں شک کیوں ہے۔ اس کا جواب دینے کے لئے فرمایا کہ در حقیقت ان کا خسران عدم ایمان کا سبب ہے (چونکہ ان کو خاسر رہنا ضروری ہے اس لئے روز قیامت پر ان کا ایمان نہیں) یہ بھی ممکن ہے کہ اَلَّذِيْنَ کو فعل ذم محذوف کا مفعول قرار دیا جائے (اور یہ جملہ فعلیہ ہو جائے)۔

حضرت ابو امامہؓ کی روایت کردہ حدیث بھی اس امر پر دلالت کر رہی ہے کہ اللہ کی رحمت عام ہے اور کافروں کی محرومی کا سبب ان کا خسران ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک جنت میں جائے گا۔ سوائے اس شخص کے جو اللہ سے ایسا بھاگے جیسے وحشی اونٹ اپنے گھر والوں سے بھاگتا ہے۔ (رواہ الطبرانی والحاکم بسند صحیح)۔

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ (اور اسی کا ہے وہ سب کچھ جو رات اور دن (کے دور) میں رہتا ہے)۔

سَكَنَ، سُكْنٰى سے مشتق ہے اس کے بعد ظرف مکان آتا ہے، جس سے پہلے فی ہوتا ہے (جیسے فِي الْبَيْتِ، فِي الْمَسْجِدِ وغیرہ) لیکن اس جگہ زمان (اللیل و النہار) کا ذکر بطور اتساع کیا (گویا زمان کو مکان کا قائم مقام قرار دیا اور یہ ظاہر کیا کہ مکان کی طرح زمان بھی قابل سکونت چیز ہے) دوسری آیت میں سَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ آیا ہے (اور فی کے بعد مکان کا ذکر ہے) یہاں ما سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن پر روز و شب کا دور ہوتا ہے۔ یا لفظ سَكَنَ، سُكُوْنٌ سے ماخوذ ہے، مراد یہ ہے کہ اللہ ہی کا ہے جو دن رات کے چکر میں ساکن رہتا یا حرکت کرتا ہے۔ متحرک کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ متحرک کی ضد یعنی ساکن کا ذکر کر دیا (ایک ضد کے ذکر پر اکتفا کر لیا جاتا ہے مگر مراد دونوں ہوتے ہیں) جیسے سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ یعنی کرتے جو تم کو گرمی سردی سے محفوظ رکھتے ہیں۔

وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۳﴾ (اور وہی سننے والا ہے (مشرکوں کے اقوال کو) اور جاننے والا ہے) ان کے احوال کو) اس آیت میں مشرکوں کو وعید ہے (کہ تمہارا کوئی قول و فعل ہم سے مخفی نہیں ہم ضرور سزا دیں گے۔

قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا (آپ کہہ دیں کہ اللہ کے علاوہ کیا کسی دوسرے کو میں مددگار معبود قرار دوں)۔ یہ استفہام انکاری ہے۔ یعنی اللہ کے سوا دوسروں کو کارساز بنانے کا انکار ہے محض ولی بنانے کا انکار نہیں ہے۔ اس لئے ہمزہ کے بعد اَتَّخِذُ سے پہلے مفعول کو ذکر کیا ہے۔

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ اللہ تو ایسا ہے کہ (آسمانوں اور زمینوں کا خالق و موجد ہے) فاطِر کی اضافت معنویہ ہے (یعنی آسمان و زمین فاطِر کا مفعول ہے) مطلب یہ ہے کہ اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے۔

وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (اور وہی کھانے کو دیتا ہے اس کو کوئی کھانا نہیں دیتا) طعام سے مراد ہے رزق (کھانا کپڑا اور تمام چیزیں) کھانے کا ضرورت مند انسان زیادہ ہوتا ہے اس لئے طعام کا ذکر کیا۔ کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو باپ دادا کا دین اختیار کرنے کی ترغیب دی تو آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلْ إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ أَوَّلَ مَنْ أَسْلَمَ (آپ کہہ دیں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے اسلام قبول کروں)۔ رسول اللہ ﷺ تمام امت سے پہلے اسلام پر مامور ہوئے تھے۔

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۴﴾ (اور (یہ بھی کہا گیا ہے کہ) تم مشرکوں میں سے ہرگز نہ ہونا) (قِيلَ محذوف ہے اور لَا تَكُونَنَّ اس کا مقولہ ہے۔ یا اس کا عطف قُلْ پر ہے۔ ہم نے اول شق کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۱۵﴾ (آپ کہہ دیجئے مجھے بڑے دن (یعنی روز قیامت کے عذاب) کا خوف ہے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں گا)۔ یعنی اس کے سوا کسی اور کی عبادت کروں گا تو قیامت کے دن وہ مجھے عذاب دے گا۔

پرزور طرز کلام کے ساتھ کافروں کے خیال کا استیصال کر دیا اور در پردہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ کفر و نافرمانی کی وجہ سے تم لوگ عذاب کے مستحق ہو تم کو ضرور عذاب ہوگا۔ عَذَابَ يَوْمٍ، أَخَافُ کا مفعول ہے اور أَخَافُ، إِنْ عَصَيْتُ کی جزا نہیں ہے یعنی إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَّبَنِي چونکہ جملہ جزاء محذوف پر دلالت کر رہا ہے اس لئے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ (جس شخص سے اس روز عذاب ہٹا دیا جائے گا تو یہ اس پر اللہ کی رحمت ہی ہوگی) کہ محض اپنی مہربانی سے اس کو عذاب سے بچالے گا، ورنہ عذاب سے محفوظ رہنے والے کا اللہ پر کوئی واجب الاداء حق نہیں ہوگا۔ یَوْمَئِذٍ فتح پر مبنی ہے۔ عاصم اور یعقوب کی قرأت میں يَصْرِفْ ہے اس کا فاعل اللہ ہے اور عذاب مفعول محذوف ہے۔ مشہور قرأت يُصْرَفْ ہے جس کا نائب فاعل عذاب ہے۔

وَذَلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴿۱۶﴾ (اور یہی کھلی کامیابی ہے)۔ قاموس میں ہے کہ فَوْز کا معنی ہے نجات، کامیابی، ہلاکت، ہلاکت تو بہرحال مراد نہیں ہے سیاق کلام کے خلاف ہے اور نجات بھی مراد نہیں ہے کیونکہ عذاب کا ہٹنا خود ہی نجات ہے (تو یہ معنی ہو جائے گا کہ نجات نجات ہے اور یہ مطلب غیر مفید ہے) لامحالہ کامیابی مراد ہے۔ اس تقریر سے واضح ہو رہا ہے کہ عذاب دور ہونے کے لئے جنت میں داخل ہونا لازم ہے (درمیان میں کوئی اور درجہ نہیں کہ عذاب بھی دور کر دیا جائے اور پھر جنت میں بھی داخلہ نہ ہو) اس سے معتزلہ کے قول کی غلطی ظاہر ہو رہی ہے جو عذاب اور جنت کے درمیان تیسرے درجہ کے قائل ہیں۔

وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ اور اگر تجھ کو اللہ کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کا دور کرنے والا سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں۔ ضُرّ بمعنی شدت جیسے مفلسی، بیماری، عذاب۔ فَلَا كَاشِفَ سے یہ مراد ہے کہ

اس کو دور کرنے پر کوئی قادر نہ ہو گا (یعنی اللہ کی بھیجی ہوئی تکلیف کو سوائے اس کے کوئی دوسرا دور نہیں کر سکتا) ورنہ خدا کی کمزوری لازم آئے گی اور کمزوری، الوہیت اور واجب الوجود ہونے کے منافی ہے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٧﴾ (اور اگر تجھ کو اللہ کوئی نفع پہنچائے تو وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے)۔ خیر، بھلائی خواہ عافیت ہو صحت ہو دولت ہو یا کچھ اور یعنی اللہ کے قابو میں سب کچھ ہے۔ پس خیر کو قائم و باقی رکھنا اور زائل و دور کرنا بھی اسی کی قدرت میں ہے کوئی اور خدا کی عطا کی ہوئی خیر کو زائل نہیں کر سکتا۔

بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ کسریٰ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک خچر بطور ہدیہ بھیجا تھا آپ بالوں کی رسی کی لگام دے کر اس پر سوار ہوئے اور مجھے اپنے پیچھے بیٹھا لیا پھر مجھے لے کر روانہ ہو گئے کچھ دیر چلنے کے بعد میری طرف کو رخ موڑ کر فرمایا لڑکے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں حاضر ہوں، فرمایا اللہ (کے احکام) کی نگہداشت کر اللہ تیری حفاظت رکھے گا، اللہ (کے اوامر و نواہی) کی نگہداشت کر تو اس کو اپنے سامنے پائے گا، تو عیش و آرام کے وقت اللہ کو پہنچان، دکھ اور سختی کے وقت خدا تجھ سے انجان نہ ہو گا، کچھ مانگے تو اللہ سے مانگ اگر مدد طلب کرے تو اللہ سے طلب کر جو کچھ ہونے والا ہے قلم اس پر چل چکا ہے۔ فیصلہ خداوندی کے خلاف اگر ساری مخلوق تجھے فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے تو فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور اللہ کی تحریر کے خلاف اگر تجھے ضرر پہنچانا چاہے گی تو ضرر نہیں پہنچا سکے گی۔ اگر تجھ سے ہو سکے تو یقین کے ساتھ (مصائب پر) صابر رہ کر عمل کر اگر، عمل نہ کر سکتا ہو تو صبر کر، ناگوار امور پر صبر رکھنے میں بڑی بھتری ہے۔ یہ بھی جان رکھ کر صبر کے ساتھ مدد ہوتی ہے اور سختی کے ساتھ کشائش اور دشواری کے ساتھ آسانی۔ احمد اور ترمذی نے یہ حدیث نقل کی ہے ترمذی نے اس کو حسن صحیح کہا ہے لیکن ترمذی کی روایت میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ اگر تجھ سے ہو سکے تو یقین کے ساتھ صابر رہ کر عمل کر الخ (یعنی ترمذی کی روایت مختصر ہے۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ (اور وہی غالب ہے)۔ قہر اس غلبہ کو کہتے ہیں جس میں مغلوب کا عاجز ہونا بھی سمجھ میں آتا ہو اور قدرت کا معنی ہے قادر کے ارادہ کے خلاف ارادہ کرنے والے کو اس کے مقصد سے روک دینا۔ قدرت کے مفہوم سے قہر کے معنی میں کچھ بیشی ہے (کیونکہ قدرت کے مفہوم سے مقدور کا عجز ظاہر نہیں ہوتا اور قہر کے مفہوم میں مقہور کا عجز لازم ہے

فَوْقَ عِبَادِهٖ (وہی اپنے بندوں سے بالا ہے)۔ یہ دوسری خبر ہے (اول خبر اَلْقَاہِرُ ہے) لفظ فَوْقَ سے قاہر اور برتر ہونے کی تصویر کشی ہو رہی ہے۔

وَهُوَ الْحَكِيْمُ (اور وہی حکمت والا ہے)۔ اپنے حکم کی حکمت سے واقف ہے۔

الْخَبِيْرُ ﴿١٨﴾ (ہر چیز سے) باخبر ہے کوئی شئے اس سے مخفی نہیں۔

کلبی نے بیان کیا ہے کہ کچھ مکہ والے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، کیا کوئی شخص ایسا ہے جو تمہارے رسول ہونے کی شہادت دیتا ہو، ہمیں تو کوئی ایسا آدمی ملا نہیں جو تمہاری تصدیق کرتا ہو۔ ہم نے یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی تمہارے متعلق دریافت کیا سب نے جواب دیا کہ ان کے ہاں تمہارا کوئی ذکر نہیں ہے (یعنی ان کی کتابوں میں تمہارا کوئی تذکرہ نہیں آیا) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ط (آپ کہئے کہ سب سے بڑھ کر چیز گواہی دینے کے لئے کون ہے)۔ ہر موجود کو شئی کہتے ہیں۔ پوری تشریح سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ یہاں شئے سے مراد ہے شاہد (گواہ) اکبر سے مراد ہے عظمت والا۔ مطلب یہ کہ اللہ کی شہادت سے بڑی کس شاہد کی شہادت ہے۔ اب اگر وہ جواب دیں تو خیر ورنہ

قُلِ اللّٰهُ ۙ (آپ (خود ہی) کہہ دیں کہ سب سے بڑا شاہد اللہ ہے)۔ اللہ مبتدا ہے اور قرینہ کی وجہ سے خبر کو حذف کر دیا گیا ہے

شَهِيْدٌ ۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ (وہی میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے) شَہِیْدٌ خبر ہے، ھُوَ مبتدا محذوف

ہے۔ یا اللہ مبتدا ہے اور شہید خبر اور پورا جملہ قُل کا مفعول۔ کیونکہ اللہ جب گواہ ہے تو وہی سب سے بڑا شاہد ہوگا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ شَیْئٍ سے مراد مشہود ہو یعنی جس چیز کی گواہی دی جائے اور شہادت سے مراد ہو گواہی دیا جانا (یعنی مشہودیت۔ مصدر مبنی للمجہول) آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ میری رسالت یا عدم رسالت سے بڑھ کر کس مسئلہ کی گواہی ہو سکتی ہے اور میری رسالت کا شاہد اللہ ہے اور جس چیز کا گواہ اللہ ہو اس سے بڑھ کر مشہود کون ہو سکتا ہے، پس میری رسالت سب سے بڑھ کر مشہود ہے۔ اس تفسیر پر کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ اللہ کی شہادت وہ معجزات ہیں جو رسول اللہ کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے اللہ نے عطا فرمائے اور چونکہ تمام معجزات سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے اس لئے فرمایا۔

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ اور قرآن خود معجزہ ہے جو اللہ کی گزشتہ کتابوں کے مطابق مبدء اور معاد کے احوال بیان کرتا ہے۔

لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْ بَلَغَ (تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تم کو اور ان تمام لوگوں کو جن کو قرآن پہنچ جائے ڈراؤں)۔ یعنی اگر تم ایمان نہ لاؤ تو اس قرآن کے ذریعہ سے اللہ کے عذاب سے ڈراؤں۔ کُمْ کا خطاب اہل مکہ کو ہے اور مَنْ بَلَغَ کا عطف کُمْ پر ہے اور اس سے مراد وہ سب جن وانس ہیں جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے یا آئندہ قیامت تک آنے والے ہیں (پیغمبر کا فرض ہے فرماں برداروں کو خوشخبری دینا اور نافرمانوں کو عذاب سے ڈرانا لیکن) یہاں صرف ڈرانے کا ذکر کیا (بشارت کا ذکر نہیں کیا) کیونکہ حال ومقال کا قرینہ بشارت پر دلالت نہیں کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ انذار کی اہمیت (تبلیغ کے موقع پر) زیادہ ہے (اگر انذار مفید نہ ہوگا تو بشارت بدرجہ اولیٰ غیر مفید ہوگی کیونکہ) حصول منفعت سے دفع مضرت کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری جانب سے (لوگوں تک) پہنچا دو خواہ ایک ہی آیت ہو اور بنی اسرائیل کے (بیان کردہ اقوال) بیان کر دیا کرو اس میں کوئی (تم پر) تنگی نہیں (بشرطیکہ احادیث کے خلاف نہ ہوں) اور جس نے قصداً مجھ پر دروغ بندی کی اس کو اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لینا چاہئے، متفق علیہ۔

اس حدیث میں بنی اسرائیل سے مراد وہ بنی اسرائیل ہیں جو سچے دل سے مسلمان ہوگئے تھے، ورنہ جھوٹے کافروں کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے میری جانب سے کوئی حدیث یہ جانتے ہوئے بیان کی کہ وہ جھوٹ ہے (میرا کلام نہیں ہے) تو وہ بھی جھوٹوں میں سے ہے (رواہ مسلم)۔

حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ اس بندے کو سرسبز کرے جو میری بات سن کر یاد رکھے اور سمجھے اور پھر (دوسروں تک) پہنچا دے۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کسی سمجھ کی بات ایسے لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں جو پہنچانے والے سے زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں۔ تین باتوں میں مسلمان کا دل کھوٹ (یا بخل) نہیں کرتا۔ خلوص کے ساتھ اللہ کے لئے عمل کرنا، مسلمانوں کی خیر خواہی کرنا اور اہل اسلام کی جماعت کے ساتھ وابستہ رہنا۔ کوئی شبہ نہیں کہ ان کی دعوت پیچھے والوں کو محیط ہوگی۔ رواہ الشافعی والبیہقی فی المدخل۔ احمد، ترمذی، ابوداؤد ابن ماجہ اور دارمی نے یہ حدیث حضرت زید بن ثابت کی روایت سے بیان کی ہے مگر ترمذی اور ابوداؤد کی روایت میں تین باتوں کا ذکر نہیں ہے۔ محمد بن کعب قرظی کا قول ہے جس کو قرآن پہنچ گیا، اس نے گویا رسول اللہ ﷺ کی زیارت کر لی اور آپ سے قرآن سن لیا۔

اَئِنَّکُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی (اے اہل مکہ) کیا تم اس بات کے قائل ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے معبود بھی ہیں) (جو اللہ کے ساتھ اس کے خصوصی صفات میں شریک ہیں) یہ استفہام اظہار تعجب اور تقریری مع الانکار کے لئے ہے یعنی تعجب ہے اور بعید از عقل ہے کہ تم شرک کے قائل ہو باوجودیکہ تمام عقلی ونقلی دلائل

توحید کو ثابت کر رہے ہیں۔ یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ اہل مکہ نے توحید پر شہادت طلب کی تھی۔ اس صورت میں آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ اللہ توحید کا شاہد ہے اور توحید کی شہادت یہ ہے کہ اس نے دلائل قائم کیں اور قرآن نازل فرمایا جو سراسر معجزہ ہے اور اللہ کی یہ شہادت سب سے بڑی شہادت ہے، اب تعجب ہے کہ تم شرک کے قائل ہو۔ میں کہتا ہوں شاید انہوں توحید ورسالت دونوں کی شہادت طلب کی ہو، مگر کلبی نے شان نزول کے بیان میں صرف شہادت رسالت کی طلب کا تذکرہ کیا کیونکہ شہادت رسالت کے لئے شہادت توحید لازم ہے اور شہادت توحید کے لئے شہادت رسالت لازم نہیں۔

قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ۚ　(آپ کہہ دیجئے کہ (جس بات کے تم قائل ہو) میں اس کی شہادت نہیں دیتا)۔

قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ　(آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی معبود یکتا ہے)۔ یعنی معبودیت، وجوب وجود، خلاقیت، رزاقیت اور تمام صفات کمالیہ میں اکیلا ہے، اس کی کسی خصوصیت میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ ہر طرح کی (جسمانی یا حقیقی) ترکیب و تعدد، جسمانیت، مکان اور ترکیب و تعدد کے دوسرے لوازم سے پاک ہے۔ ہماری اس تشریح کے بعد یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کا اللہ کے لئے ثبوت افادیت سے خالی ہے اللہ تو خود ہی جزئی حقیقی ہے اور جزئی حقیقی میں کثرت کا احتمال ہوتا ہی نہیں ہے پھر اس کو اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کہنے سے کیا فائدہ۔ اس شبہ کا ازالہ ہماری تشریح سے ہو گیا کہ اِلٰہ بمعنی معبود ہے (اور احتمال ہو سکتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا بھی معبود ہو اس لئے واحد کہہ کر اس احتمال کو دور کر دیا۔ پس اللہ جزئی حقیقی ہے اس کی ذات و شخصیت میں کوئی اس کا شریک نہیں، نہ اس کے خصوصی اوصاف میں کسی کی شرکت ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِنَّمَا (کلمہ حصر نہ ہو بلکہ اس) میں مَا موصولہ ہو اور هُوَ ضمیر اسی ما موصول کی طرف راجع ہو اور هو اله پورا جملہ صلہ ہو اور وَّاحِدٌ ما موصولہ کی خبر ہو۔ مطلب اس طرح ہوگا کہ وہ جو معبود ہے وہ واحد ہے کیونکہ وہ واجب الوجود اور حامل صفات کمالیہ ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس شرک کے تم قائل ہو میں اس کا قائل نہیں بلکہ میں توحید کی شہادت دیتا ہوں۔

وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹﴾　(اور میں تمہارے شرک سے قطعاً بیزار ہوں) (مِمَّا میں اگر مَا موصولہ ہو تو) مَا سے مراد ہوں گے بت یعنی جن بتوں کو استحقاق معبودیت میں تم اللہ کا شریک قرار دیتے ہو۔ میں ان سے بیزار ہوں یا (اگر مَا کو مصدریہ قرار دیا جائے تو) مَا تُشْرِكُوْنَ سے مراد ہوگا شرک یعنی میں تمہارے شرک کرنے سے بیزار ہوں۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ　(جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے)۔ یعنی توریت وانجیل۔

يَعْرِفُوْنَهٗ　(وہ محمد ﷺ کو پہچانتے ہیں) کہ اللہ کے رسول ہیں کیونکہ رسول کا جو حلیہ اور اوصاف و اخلاق ان کی کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں وہ بعینہٖ محمد ﷺ کے ہیں۔

كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ　(جس طرح (دوسرے بچوں میں سے) اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں)۔

اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾　جن لوگوں نے (رسول اللہ ﷺ کے صفات مندرجہ توریت وانجیل چھپانے کی وجہ سے) اپنے کو ضائع کر لیا ہے (یعنی اللہ نے اپنے علم قدیم میں ان کی نامرادی کا اندازہ کرا لیا ہے) وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ یعنی دلوں سے یقین کرنے کے باوجود محض عناد، ظلم اور غرور وانانیت کی وجہ سے محمد ﷺ کی نبوت کو نہیں مانیں گے۔

مکہ والوں نے کہا تھا کہ تمہاری نبوت کا کون شاہد ہے، ہم نے تو یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی پوچھا تھا انہوں نے جواب دیا کہ تمہارا ذکر ان کی کتابوں میں نہیں ہے۔ اس قول کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے محمد ﷺ کی رسالت کی تکذیب کی۔ انہوں نے اپنے کو ضائع کر دیا کہ بصورت ایمان جو مقامات و مراتب ان کے لئے جنت کے اندر مقرر تھے ان کو کھو دیا اور دوزخ کے ٹھکانوں کو پسند کر لیا۔ ابن ماجہ اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے دو مقام ہیں ایک جنت میں ایک دوزخ میں، پس جو شخص مر کر دوزخ میں چلا جاتا

وقف لازم　ع ۲　۸

ہے، اس کے جنت والے مکان کے وارث اہل جنت ہو جاتے ہیں۔ یہی مطلب ہے آیت اُولٰئِکَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الخ کا۔ بغوی نے لکھا ہے قیامت کا دن ہو گا تو اللہ مؤمنوں کو دوزخیوں کے جنت والے مکان اور دوزخیوں کو مومنوں کے دوزخ والے مکان دے دے گا۔ اور یہی نامرادی ہے۔ میں کہتا ہوں رفتار کلام اس طرح ہونا چاہئے تھی کہ جو لوگ ایمان نہیں لائیں گے وہ اپنے کو ضائع کریں گے مگر کلام میں قوت پیدا کرنے کے لئے طرز بیان کو الٹ دیا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (اور جس نے اللہ پر دروغ بانی کی اس سے زیادہ بے انصاف کون ہو گا)۔ یعنی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور باوجود یہ کہ اس کے پاس اللہ نے وحی نہیں بھیجی مگر وہ وحی کا مدعی بن بیٹھا۔

اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ (یا اللہ کی آیات کی اس نے تکذیب کی)۔ یعنی قرآن میں اللہ نے جو آیات نازل فرمائی ہیں اور معجزات جو توحید پر دلالت کرتے ہیں اور رسول کی صداقت ان سے ثابت ہوتی ہے ان کو نہیں مانا۔ استفہام انکاری ہے یعنی ایسے شخص سے بڑھ کر کوئی ناانصاف نہیں (ظَالِمْ کا ترجمہ بے جا حرکت کرنے والا بھی ہے اس لئے اَظْلَمُ کا ترجمہ سب سے بڑا بے جا حرکت کرنے والا بھی ہو سکتا ہے، مترجم)۔

اس تشریح کی بناء پر آیت میں رسول اللہ ﷺ کے جھوٹ سے پاک ہونے اور کافروں کے ظالم ترین ہونے پر تنبیہ ہو گی)۔

لیکن آیت کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کافروں سے بڑھ کر کون بے انصاف ہو گا جو اللہ پر دروغ بندی کرتے ہیں اور اللہ کی شان میں ایسی باتیں کہتے ہیں جو اس کے لئے نازیبا ہیں کوئی اس کا ساجھی قرار دیتا ہے اور کوئی اس کو باپ کہتا ہے اور کوئی پتھروں کو بارگاہ خداوندی میں اپنا سفارشی قرار دیتا ہے یا اللہ کی آیات کو جھوٹ جانتا ہے۔ اس صورت میں بجائے اَوْ کے وَ عاطفہ ہونا چاہئے تھا کیونکہ مکہ والے ان تمام افکار و اقوال شنیعہ کا مجموعہ تھے لیکن اَوْ لانے سے اس امر پر تنبیہ ہو جائے گی کہ ان دونوں اقوال میں سے ہر ایک کامل طور پر اَظْلَمُ بنانے کے لئے کافی ہے۔ پھر ان کے اندر تو دونوں چیزیں ہیں، افتراء بندی بھی اور تکذیب آیات بھی، اس لئے ان کا اَظْلَمُ ہونا تو بدرجہ اولیٰ یقینی ہے۔

اَوْ ذکر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ افتراء بندی اور تکذیب آیات دو جرم ایسے ہیں جو باہم ضد ہیں اور دونوں کو یکجا جمع نہ ہونا چاہئے مگر ان کافروں کی حماقت اس درجہ تک پہنچ چکی ہے کہ دونوں (متضاد) خرابیاں ان کے اندر موجود ہیں۔

اللہ پر افتراء بندی اور اس امر کا دعویٰ کرنا کہ اللہ نے فلاں کام کو حلال اور فلاں کام کو حرام بنایا ہے اور اس کی بیوی بھی ہے اور اولاد بھی اور وہ بتوں کی شفاعت قبول کرے گا۔ اس قسم کی خرافات کا تقاضا ہے کہ وہ رسالت کے قائل ہیں اور ان باتوں کو رسالت کے ذریعہ سے آیا ہوا مانتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ آیات و معجزات کی تکذیب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آدمی کو کس طرح پیغمبر بنایا جا سکتا ہے، پیغمبر تو فرشتہ ہونا چاہئے اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ کسی انسان کی رسالت کے قائل نہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے لئے خلاف ہیں مگر احمق کافر دونوں کے قائل ہیں۔

اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾ (ظالم قطعاً فلاح یاب نہیں ہوں گے) اور جو سب سے بڑا ظالم ہو اس کا تو ٹھکانا ہی کیا۔ اِنَّهٗ میں ضمیر شان ہے [1]

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا (اور جس روز ہم ان سب کو جمع کریں گے)۔ یعنی کافروں کو اور ان کے معبودوں کو (بتوں وغیرہ کو) یَوْمَ مفعول فیہ ہے اس کا فعل محذوف ہے یعنی یاد کرو اس دن کو جب ایسا ایسا ہو گا۔

یا یوں کہا جائے کہ کوئی معین فعل ذکر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ روز قیامت کے تمام خطرات اور شدائد و مصائب کی طرف ذہن کا انتقال ہو جائے (اور ہر قسم کی ہیبت ناکیاں نظر کے سامنے آجائیں اگر کوئی معین فعل ذکر کیا جاتا تو صرف اسی فعل کا تصور ہوتا اور دوسرے شدائد کی طرف ذہن کا انتقال نہ ہوتا) گویا یوں فرمایا کہ جس روز ہم سب کو جمع کریں گے اس روز سب پر

[1] شعر: وائے بر قومے کہ بت را سجدہ بے حجت کنند — بارسل گویند اِنْ اَتُوْنَا بِسُلْطَانٍ مُّبِيْن

ایسی دہشت طاری ہو جائے گی کہ ناقابل بیان ہے، الفاظ کی حدود کے اندر نہیں آسکتی۔ سورج قریب آجائے گا، پسینہ کی لگام لگ جائے گی۔ یعنی منہ تک لوگ پسینہ میں غرق ہوں گے، پسینہ بہہ کر ستر ہاتھ زمین میں گھس جائے گا وغیرہ وغیرہ جیسا کہ صحیح احادیث میں آیا ہے۔

ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا (پھر (سرزنش کرنے کے لئے) ہم مشرکوں سے کہیں گے)۔ نَقُوْلُ کا عطف نَحْشُرُ پر ہے۔ ثُمَّ کا لفظ بتارہا ہے کہ حشر کے بعد مدت تک لوگ سوال کے منتظر رہیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا جب تم کو اللہ پچاس ہزار برس تک جمع کر رکھے گا جیسے تیردان کے اندر تیر اکٹھے کئے جاتے ہیں۔ (اس مدت میں) تمہاری طرف نظر بھی نہیں کرے گا۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور بیہقی نے بھی حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا قیامت کے دن تاریکی میں ہزار برس تک تم کو روک رکھا جائے گا کہ بات بھی نہ کرسکو گے۔ رواہ البیہقی عن ابن عمرؓ۔

اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾ (تمہارے وہ شرکاء جن کے معبود ہونے کا تم دعویٰ کرتے تھے کہاں گئے)۔ شُرَكَآء سے مراد ہیں وہ معبود جن کو مشرک اللہ کے ساتھ عبادت میں شریک قرار دیتے تھے۔ تَزْعُمُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ تم استحقاق معبودیت میں شریک قرار دیتے تھے یا ان کو بارگاہ خداوندی میں اپنا سفارشی سمجھتے تھے۔

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ (پھر ان کے شرک کا انجام اور کچھ نہ ہوگا)۔ لفظ ثُمَّ بتارہا ہے کہ مدت تک تامل کرنے کے بعد وہ جواب دیں گے۔ فتنہ سے مراد کفر یہ ہے یعنی انجام کفر یہ ہوگا کہ طویل تامل و ندامت کے بعد وہ کہیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ اور قتادہؒ نے فتنہ کا ترجمہ عذر کیا ہے اور ان کا عذر ان کے لئے فتنہ ہوگا کیونکہ وہ معذرت کو رہائی اور بچاؤ کا ذریعہ سمجھ رہے ہوں گے حالانکہ اس جواب سے ان کی رہائی نہ ہو سکے گی۔ فَتَنْتُ الذَّهَبَ میں نے سونے کو میل کچیل سے الگ کر دیا یہ عربی کا محاورہ ہے۔ یا فِتْنَةُ سے مراد ہے جواب۔ جواب چونکہ جھوٹا ہوگا اس لئے اس کو فتنہ فرمایا۔ بعض علماء نے فتنہ کا ترجمہ تجربہ کیا ہے چونکہ سوال ان کے اندرونی خیال کو ظاہر کرانے کا ایک تجربہ ہوگا اس لئے جواب کو تجربہ فرمایا۔ زجاج نے کہا یہ لفظ اس جگہ ایک لطیف معنی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ بعض محبّ محبوب پر شیفتہ فریفتہ ہوتے ہیں۔ لیکن جب اس شیفتگی اور عشق میں ان پر مصائب آتے ہیں تو وہ محبوب سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ان سے کہا جاتا ہے تمہارا عشق بس یہ ہوا (کہ دکھ پڑا تو عشق کو بھول گئے) قیامت کے دن بتوں کی محبت سے بھی کافر اسی طرح بیزار ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں بتوں کی محبت ہی کیا اسلاف کی تقلید سے بھی اظہار نفرت کریں گے۔

اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ (سوائے اس کے کہ وہ کہیں گے اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے ہم تو مشرک نہیں تھے)۔

ایک آیت میں آیا ہے وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا (اللہ سے وہ کوئی بات نہیں چھپائیں گے) اور اس آیت میں ہے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ دونوں آیات کا مضمون باہم مخالف ہے۔ حسب روایت بخاری حضرت ابن عباسؓ نے (اس تضاد کو دور کرنے کے لئے) فرمایا قیامت کے دن جب کفار دیکھیں گے کہ اللہ مسلمانوں کے گناہ تو معاف فرما رہا ہے اور شرک کو معاف نہیں فرماتا تو وہ مشرک ہونے سے انکار کر دیں گے اور کہیں گے واللہ ہم مشرک نہیں تھے۔ اس وقت اللہ ان کے منہ پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے اعمال کی شہادت دیں گے۔ ایسی حالت میں ان کو تمنا ہوگی کاش ہم زمین کا پیوند ہو جاتے، خاک کے ساتھ خاک بن جاتے۔ اس وقت وہ اللہ سے کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے (حضرت ابن عباسؓ کی توضیح کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائی حالت میں وہ شرک کا انکار کریں گے اور جب دست و پا کی شہادت کے بعد حقیقت کھل جائے گی تو پھر کوئی بات چھپا نہ سکیں گے)۔

اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (اے مخاطب) ذرا دیکھ توانہوں نے اپنے اوپر کیسا جھوٹ بولا)۔ كَذَبُوْا کی ضمیر فاعل سے کَیْفَ حال ہے۔ چونکہ استفہام صدارت کو چاہتا ہے اس لئے کَیْفَ کو پہلے ذکر کیا۔

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ (اور جو کچھ دروغ بندیاں کرتے تھے وہ ان سے غائب ہو گئیں) دروغ بندی سے مراد ہے بعض احکام کو خود حرام حلال بنانا اور اللہ کی طرف ان کی حرمت وحلت کی نسبت کرنا اور بتوں کو اپنا سفارشی قرار دینا۔

کلبیؒ نے بیان کیا ایک بار ابوسفیان بن حرب، ابو جہل بن ہشام، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، امیہ بن خلف، ابی بن خلف اور حارث بن عامر جمع ہو کر رسول اللہ ﷺ سے قرآن سننے لگے۔ ساتھیوں نے نضر سے کہا ابو قتیلہ محمد کیا کہہ رہا ہے نضر نے کہا مجھے تو معلوم نہیں کیا کہہ رہا ہے زبان ہلا رہا ہے اور پرانے لوگوں کی کچھ داستانیں اسی طرح کہہ رہا ہے جس طرح گزشتہ اقوام کے قصے میں تم سے بیان کرتا ہوں۔ نضر اقوام پارینہ کے قصے اور افسانے بہت زیادہ بیان کیا کرتا تھا۔ ابوسفیان بولا میرے خیال میں تو بعض باتیں سچ کہتا ہے۔ ابو جہل بولا ہرگز نہیں، تم ایسا اقرار نہ کرو۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ابو جہل نے کہا اس سے تو ہمارے لئے موت آسان ہے۔ اس لئے اللہ نے آیات ذیل نازل فرمائیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ (اور ان میں سے بعض لوگ اپ کی طرف کان لگاتے ہیں)۔ یعنی جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو کان لگا کر سنتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ (اور ہم نے ان کے دلوں پر اس کو سمجھنے سے حجاب ڈال رکھے ہیں۔ اَکِنَّۃً، کنان کی جمع ہے اور کنان کا معنی ہے پردہ یعنی ان کے دلوں پر حجاب ڈال دیئے ہیں تاکہ قرآن کو نہ سمجھیں۔

وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا (اور ان کے کانوں میں ڈاٹ دے رکھی ہے وقر کا معنی گرانی گوش اور ٹھوس پن۔

وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا اور اگر وہ تمام دلائل کو دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہ لائیں)۔ دلائل سے مراد ہیں معجزات۔ اللہ نے ان کی آنکھوں پر پردے اور دلوں پر حجاب ڈال دیئے ہیں، انہی حجابات کی وجہ سے وہ رسول اللہ ﷺ سے دشمنی اور تقلید اسلاف پر کمربستہ ہو گئے ہیں نتیجہ یہ کہ نہ اچھے کو اچھا جانتے ہیں نہ برے کو برا۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ (یہاں تک کہ یہ لوگ جب آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ سے (خواہ مخواہ) جھگڑتے ہیں)۔

يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾ (یہ کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن تو سوائے پہلوں کی بے سند داستانوں کے اور کچھ بھی نہیں ہے)۔ حَتّٰی عاطفہ ہے، جو جملہ پر داخل ہوتا ہے اور لَا يُؤْمِنُوْنَ پر اس کا عطف ہے اور اِذَا ظرفیہ ہے جس کے اندر شرط کا معنی ہے اور شرط کی يُجَادِلُوْنَكَ ہے اور یقول يُجَادِلُوْنَكَ کی تفسیر ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ جَآءُوْا کے فاعل سے يُجَادِلُوْنَكَ حال ہے اور شرط کی جزاء يَقُوْلُ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی بے ایمانی اور تکذیب حق جھگڑے کی حد تک پہنچ چکی ہے اور یہ نوبت آگئی ہے کہ قرآن کو پہلوں کی خرافات کہنے لگے اور صرف جھگڑے کیلئے آنے لگے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حَتّٰی حرف جر ہو اور اِذَا محل جر میں لَا يُؤْمِنُوْنَ سے متعلق۔ کیونکہ جمہور اہل نحو کے خلاف سیبویہ کے نزدیک اذا کا شرطیہ ہونا درست ہے اس صورت میں يُجَادِلُوْنَكَ حال ہوگا اور يَقُوْلُ اس کی تشریح وہ آپ سے جھگڑتے ہیں یعنی کافر کہتے ہیں۔

قاموس میں ہے سَطَر کا معنی ہے ایک لائن، قطار، درختوں کی ہو یا تحریر کی یا کتاب کی یا کسی اور چیز کی، اس کی جمع سُطُوْر اَسْطُر اور اَسْطَار ہے اور جمع الجمع اَسَاطِيْر ہے اور اَسَاطِيْرُ الْاَحَادِيْث وہ باتیں ہیں جو بے تکی ہوں ان کے اندر ایک نظم نہ ہو۔ بیضاوی نے اَسَاطِيْر کا ترجمہ اَبَاطِيْل کیا ہے (بیہودہ بے حقیقت باتیں) میں کہتا ہوں اَسَاطِيْر کے حقیقی

معنی کے لئے باطل اور خرافات ہونا لازم ہے۔ اسلاف کے متعلق قصوں کی کتابوں میں بیشتر خرافات ہی درج ہیں، واقعات سابقہ کی صحیح اطلاع نہیں، نہ نقل میں احتیاط سے کام لیا گیا ہے اور روایات کے اختلاف کی وجہ سے قصوں کا ایک نظم بھی نہیں ہے۔ لیکن لفظ اَسَاطِیر کا استعمال باطل جھوٹی اور بیہودہ باتوں کے لئے اتنا کثیر ہو گیا کہ گویا اَسَاطِیر کا حقیقی معنی ہی اَبَاطِیل کا ذیعہ ہو گیا۔

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْـَٔوْنَ عَنْهُ (اور یہ لوگ قرآن سے دوسرں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی دور رہتے ہیں)۔ یہ ترجمہ محمد بن حنفیہ اور قتادہ کے قول کے مطابق کیا گیا ہے۔ دونوں بزرگوں کے نزدیک اس آیت کا نزول مکہ کے ان کافروں کے حق میں ہوا تھا، جو رسول اللہ ﷺ کے اتباع اور قران سے دوسروں کو روکتے تھے اور خود بھی دور دور رہتے تھے۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ کے قول پر آیت کا نزول ابو طالبؓ کے حق میں ہوا، جو مشرکوں کو رسول اللہ ﷺ کو تکلیف دینے سے روکتے تھے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ جو دین و قرآن لے کر آئے تھے اس کو نہیں مانتے تھے خود اس سے دور رہتے تھے۔ (کذا اخرج الحاکم وغیرہ) اس صورت میں جمع کی ضمیر ابو طالبؓ اور ان کے رفقاء کی طرف راجع ہو گی۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن ابی ہلال کی روایت سے بیان کیا ہے کہ آیت کا نزول رسول اللہ ﷺ کے چچیروں کے حق میں ہوا جن کی تعداد دس تھی۔ علی الاعلان تو وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھی تھے لیکن اندرونی طور پر رسول اللہ ﷺ کے سخت مخالف تھے، رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینے سے لوگوں کو تو روکتے تھے لیکن اتباع رسول ﷺ سے خود دور رہتے تھے۔ بغوی نے لکھا ہے مشرکوں کے کچھ مڈ ابو طالب کے پاس جمع ہوئے اور درخواست کی کہ محمد ﷺ کو ہمارے سپرد کر دیجئے اور اس کے عوض ہمارے کسی حسین ترین جوان کو لے لیجئے۔ ابو طالبؓ نے جواب دیا تم نے یہ انصاف کی بات نہیں کہی میں تو اپنا بچہ تم کو دے دوں کہ تم اس کو قتل کر دو اور تمہارے بچہ کی میں پرورش کروں۔

روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو طالبؓ کو اسلام کی دعوت دی ابو طالبؓ نے کہا اگر قریش کے عار دلانے کا مجھے اندیشہ نہ ہوتا تو میں (مسلمان ہو کر) تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا۔ پھر بھی جب تک زندہ ہوں دشمنوں کو تمہاری طرف سے دفع کرتا رہوں گا۔ ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کی دعوت کے سلسلے میں یہ شعر کہے ہیں۔

میرے قبر میں دفن ہونے تک یہ لوگ اپنے جتھوں کے ساتھ بھی آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ آپ علی الاعلان اپنا کام کریں آپ کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی اور اپنے کام سے آپ خوش اور خنک چشم رہیں آپ نے مجھے دعوت دی ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ میرے خیر خواہ، سچے اور امین ہیں اور ایسا دین پیش کر رہے ہیں جو سب لوگوں کے مذاہب سے اچھا ہے مگر مجھے ملامت کا اندیشہ ہے اگر لوگوں کے ملامت کرنے اور عار دلانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو آپ مجھے علی الاعلان بسہولت قبول کرنے والا پاتے۔

وَإِنْ يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿۲۶﴾ (اور وہ محض اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں اور (اس بات کو) نہیں سمجھتے)۔ کہ اس فعل سے خود انہی کو نقصان پہنچے گا رسول اللہ ﷺ کا کچھ ضرر نہ ہو گا۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ (اور اگر آپ (کافروں کی) وہ حالت دیکھیں جب ان کو دوزخ پر روکا جائے گا تو عجیب دہشت ناک حالت دیکھیں گے) یعنی جب دوزخ کے معاینہ یا اس میں داخل کرنے کے لئے کافروں کو روکا جائے گا تو وہ منظر عجیب ہولناک ہو گا۔

فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۷﴾ (اور وہ کہیں گے کاش ہم کو (دنیا کی طرف جو دار العمل ہے) لوٹا دیا جائے (اس صورت) میں ہم اپنے رب کی آیات کی تکذیب نہ کریں گے اور مومنوں میں سے ہو جائیں گے)۔

بَلْ بَدَا لَهُمْ مَا كَانُوا يُخْفُونَ مِنْ قَبْلُ (بلکہ (وجہ یہ ہے کہ) جس چیز کو پہلے چھپایا کرتے تھے وہ ان

کے سامنے آگئی (ہو گی)۔
تمنا سے سمجھا جاتا تھا کہ عذاب دیکھنے کے وقت کافروں کے دلوں میں ایمان کا پختہ ارادہ پیدا ہو جائے گا لفظ بَلْ سے اس کی نفی فرمادی اور بطور اعتراض فرمایا کہ یہ بات نہیں بلکہ (پچھلا کیادھرا اور سینوں میں چھپایا ہوا) ان کے سامنے آگیا ہو گا اس سے تنگ آکر ایسا کلمہ زبان سے نکال دیں گے۔ مِنْ قَبْلُ سے مراد ہے دنیا میں۔ اور مَا كَانُوْا يُخْفُوْنَ سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ کے وہ خصوصی اوصاف جو اہل کتاب جانتے تھے اور ان صفات کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو اس قدر یقین کے ساتھ پہچانتے تھے جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے تھے مگر حضور ﷺ کے اوصاف کو چھپاتے تھے۔ یا مِنْ قَبْلُ سے مراد ہے آخرت کا گزرا ہوا وقت جس میں کافر اپنے مشرک ہونے کو چھپائیں گے اور کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ۔ نضر بن شمیل نے کہا بَدَا لَهُمْ کا معنی ہے بَدَا عَنْهُمْ یعنی وہ بات جس کو وہ چھپاتے تھے خود ان سے ظاہر ہو جائے گی۔ مبرد نے مَا كَانُوْا يُخْفُوْنَ کو مبتدا شرطی اور بَدَا لَهُمْ کو خبر جزائی قرار دیا ہے۔

وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (اور (عذاب جہنم کے معائنہ کے بعد بالفرض) اگر (دوبارہ) ان کو بھیج دیا جائے تب بھی وہی (کفر و معصیت) دوبارہ کریں گے جس سے ان کو منع کیا گیا ہے)۔ کیونکہ اللہ کے اسم وصفی مُضِلٌّ (گمراہ کرنے والا) کا پر تو ان کافروں کا مبدء تعین ہے اب اگر کافروں کو ایمان کی حقانیت اور کفر کے بطلان کا کتنا ہی یقین ہو مگر (اپنے مبد تعین کے خلاف نہیں جاسکتے اور) ایمان نہیں لاسکتے، جیسے یہودی رسول اللہ ﷺ کو اپنی اولاد کی طرح بلاشبہ پہچاننے کے باوجود نہیں مانتے تھے اور آپ سے بغض رکھتے تھے اور محض مجرمانہ عناد کی وجہ سے یقین قلبی رکھنے کے باوجود آپ کا انکار کرتے تھے۔

وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾ (اور بلاشک و شبہ وہ جھوٹے ہوں گے) یعنی تکذیب نہ کرنے اور ایمان لانے کا جو وعدہ کریں گے وہ جھوٹا ہو گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ جھوٹ بولنے کے وہ عادی ہیں (اس وقت بھی حسب عادت جھوٹ بولیں گے)۔

طبرانی نے الاوسط میں لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا میں نے سنا، رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے (کافروں کو دوزخ میں بھیجنے کے) تین عذر قیامت کے دن اللہ آدم کے سامنے بیان فرمائے گا۔ ارشاد فرمائے گا۔ آدم میں کافروں کو رحمت سے دور کر چکا ہوں اور اس کا وعدہ کر چکا ہوں اور جھوٹ بولنے اور وعدہ خلافی کرنے سے مجھے نفرت ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج تیری تمام اولاد پر میں رحمت کر دیتا (کسی کو دوزخ میں نہ بھیجتا) مگر میری یہ بات پوری ہو کر رہے گی کہ اگر میرے پیغمبروں کی تکذیب کی گئی اور میری نافرمانی کی گئی تو جہنم کو جنات اور انسانوں سے سب سے بھر دوں گا۔ اے آدم میں کسی کو دوزخ میں داخل نہیں کروں گا نہ کسی کو عذاب دوں گا سوائے ان لوگوں کے جن کے متعلق مجھے اپنے علم سے معلوم ہے کہ اگر ان کو دنیا میں دوبارہ بھیج دیا گیا تب بھی یہ اسی شر کی طرف رجوع کریں گے جو ان کے اندر ہے شر سے نہیں لوٹیں گے۔ اے آدم میں اپنے اور تیری اولاد کے درمیان تجھے ہی فیصلہ کن (پنچ) بناتا ہوں، اعمال کی وزن کشی کے وقت میزان کے پاس جاکر تو خود کھڑا ہو جا جس کا خیر کا پلڑا شر کے پلڑے سے ذرہ برابر بھی جھکتا ہوا ہو اس کے لئے جنت ہے (میں نے یہ باتیں تجھ سے اس لئے کہی ہیں) تاکہ تجھے معلوم ہو جائے کہ میں صرف ظالم کو دوزخ میں داخل کروں گا۔

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۲۹﴾ (اور وہ کہتے ہیں کہ (جینا اور کہیں نہیں) یہی فی الحال کا جینا ہے اور ہم زندہ نہ کئے جائیں گے) هِيَ ضمیر حَيَات کی طرف راجع ہے۔ دُنْيَا، اَدْنٰى کا مونث ہے اس کا مادہ دُنُوّ ہے اور دُنُوّ کا معنی ہے قرب۔ قَالُوْا کا عطف لَعَادُوْا پر ہے یعنی اگر بالفرض ان کو دنیا میں لوٹا کر بھیج دیا جائے تو ممنوعات کا ارتکاب کریں گے اور یہ بات کہیں گے۔ یا لَكٰذِبُوْنَ پر عطف ہے یعنی یہ کاذب ہیں اور انہوں نے دنیا میں یہ بات کہی تھی۔ یا نُهُوْا پر عطف ہے یعنی اگر دنیا میں لوٹا دیا جائے تو دوبارہ انہی امور کا ارتکاب کریں گے جن کی ممانعت کر دی گئی اور اسی بات کی طرف لوٹیں گے۔ یا نیا جملہ ہے (واو استینافیہ ہے) اور دنیا میں کافروں کا جو قول ہے اللہ نے اس کا ذکر کیا ہے

یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ بس یہی دنیوی زندگی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری زندگی نہ ہوگی (ہم نے ترجمہ اسی مطلب کے مطابق کیا ہے)۔

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْؕ (اور اگر (اے محمد ﷺ) آپ دیکھیں اس حالات کو جب ان کو ان کے مالک کے سامنے (سوال اور سرزنش کے لئے) روکا جائے گا) تو آپ کے سامنے عجیب منظر آئے گا۔ رب کے سامنے کھڑے کئے جانے سے مراد مجازی معنی ہے یعنی سوال اور سرزنش کے لئے روکا جائے گا۔ عَلٰى رَبِّهِمْ کا معنی فیصلہ رب اور جزاء رب بھی کہا گیا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس وقت کامل طور پر وہ خدا کو پہچان لیں گے۔

قَالَ (وہ (یعنی اللہ) کہے گا) یا باجازت الٰہی دوزخ کے کارندے کہیں گے گویا ایک محذوف سوال کا یہ جواب ہے، کلام مذکور سن کر کوئی شخص پوچھ سکتا تھا کہ مذکورۂ بالا کلام کا ان کو جواب کیا ملے گا تو جواب دیا گیا اللہ فرمائے گا۔

اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّؕ (کیا یہ (یعنی قبروں سے زندہ ہو کر اٹھنا اور اس کے ثواب و عذاب، حساب و کتاب) حق نہیں ہیں) کیا اب بھی اس میں کچھ شبہ ہے۔ یہ سوال محض سرزنش کرنے اور تکذیب پر عار دلانے کیلئے ہوگا (طلب فہم اور دریافت خیر کے لئے نہ ہوگا)۔

قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَاؕ (وہ کہیں گے بے شک و شبہ (حق ہے) اپنے مالک کی قسم)۔ چونکہ واقعات بالکل سامنے ہوں گے اور شرک و تکذیب سے وہ برأت ظاہر کرنا چاہیں گے اس لئے اپنے اقرار کو قسم سے مؤکد کرینگے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ گفتگو قیامت کے ایک موقف پر ہوگی اور قیامت کے مختلف موقف ہوں گے کسی موقف پر کافر انکار کرینگے اور کسی پر اقرار۔

قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝۳۰ ع (اللہ یا فرشتہ کہے گا) تو اپنے گزشتہ کفر کے (سبب یا کفر کے) عوض اب عذاب کا مزہ چکھو)۔ بما میں با سببیہ ہے یا عوض کے لئے۔ ع ۹

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِؕ (بے شک خسارے میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی پیشی کو جھوٹ مانا۔ لِقَاءُ اللّٰهِ سے مراد ہے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جانا کیونکہ دوسری زندگی یہ دیدار الٰہی تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافر نامراد رہیں گے کیونکہ وہ قیامت اور جنت و دوزخ کا انکار کرتے ہیں جس کی وجہ سے لازوال راحت سے محروم ہونا اور دوامی دردناک عذاب میں مبتلا ہونا یقینی ہے۔

معتزلہ بھی چونکہ اللہ کے دیدار اور مغفرت و شفاعت کے منکر ہیں اس لئے ان کو دیدار و مغفرت اور شفاعت سے محرومی ہوگی اس لئے وہ بھی نامراد رہیں گی۔ اللہ نے فرمایا ہے (حدیث قدسی ہے) میرے متعلق میرا بندہ جیسا گمان رکھتا ہے میں اسی کے گمان کے پاس (یعنی اس کے مطابق) ہوں گا۔ متفق علیہ۔

طبرانی اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ واثلہ کی روایت سے ابراہیم صائغ کا قول نقل کیا ہے ابراہیم نے کہا دیدار الٰہی کے عوض اگر مجھے آدھی جنت مل جائے تو مجھے پسند نہیں پھر ابراہیم نے آیات ذیل تلاوت کیں كَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ پھر فرمایا (هٰذَا سے اشارہ دیدار کی طرف ہے) بِهٖ اَيْ بِالرُّؤْيَةِ۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ (یہاں تک کہ جب وہ مقرر گھڑی ان پر آپہنچے گی)۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ حَتّٰی کا تعلق كَذَّبُوْا سے ہے (یعنی جن لوگوں نے آخری گھڑی تک تکذیب کی وہ نامراد رہے) خَسِرُوْا سے نہیں ہے کیونکہ کافروں کے نامراد رہنے کی تو کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس پر شبہ کیا جاسکتا ہے کہ تکذیب تو موت پر ختم ہو جاتی ہے قیامت تک قائم نہیں رہتی (اور ساعت سے مراد ہے قیامت) اس شبہ کو دور کرنے کے لئے ہم کہتے ہیں کہ ساعت سے مراد موت کی گھڑی ہے کیونکہ مرنے والے کی موت اس کی قیامت ہے جو مرا اس کی قیامت بپا ہوگئی۔

صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت، سے آیا ہے کہ کچھ دیہاتی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ساعت کے متعلق دریافت کیا کرتے تھے (کہ ساعت موعودہ یا قیامت کب ہوگی) آپ ان کی جماعت کے سب سے کم عمر شخص کی طرف دیکھ کر فرماتے تھے اگر یہ زندہ رہا تو اس کا بڑھاپا آنے سے پہلے تم پر تمہاری قیامت آپہنچے گی۔ اور (بالفرض) اگر آیت میں اَلسَّاعَۃ سے مراد قیامت ہی ہو تب بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ موت قیامت کا پیش خیمہ ہے، موت آجانا گویا قیامت آجانا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ مرنے کے بعد چونکہ قیامت بہت جلد آجائے گی اس لئے موت کے وقت کو قیامت قرار دیا۔

اگر اَلسَّاعَۃ سے موت مراد ہو تو حَتّٰی کا تعلق خَسِرُوْا سے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ خُسْرَان کا معنی ہے اصل پونجی کا ضائع ہو جانا اور مرنے کے وقت کافروں کا اصل سرمایہ یعنی زندگی ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد تو ناداری کا زمانہ آجاتا ہے۔

بَغْتَۃً (اچانک) یہ حال ہے یا مفعول مطلق کیونکہ اچانک آنا بھی آنے ہی کی ایک نوع ہے (اس لئے مفعول مطلق بیان نوع کے لئے ہوگا)۔

قَالُوْا یٰحَسْرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطْنَا فِیْھَا (تو کہیں گے ہائے افسوس ہم سے اس (کے بارہ) میں بڑی کوتاہی ہوئی)

فیہا کی ضمیر حیات دنیا کی طرف راجع ہے اور کمی کرنے سے مراد ہے نیک کام میں کمی کرنا۔ چونکہ مرجع معلوم تھا اس لئے بغیر سابق ذکر کے حیات دنیا کی طرف ضمیر راجع کر دی گئی۔ یا اَلسَّاعَۃ کی طرف ضمیر راجع ہے یعنی ہم نے قیامت کے بارہ میں بڑی کمی کی اس پر ایمان نہ لائے۔

وَھُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَھُمْ عَلٰی ظُھُوْرِھِمْ (اور (قبروں سے نکلتے وقت) وہ اپنی بداعمالی کے بوجھ اپنی کمر پر لادے ہوں گے)۔ ابن ابی حاتم نے عمرو بن قیس ملائی کا بیان نقل کیا ہے کہ مومن جب قبر سے برآمد ہوگا تو اس کا نیک عمل حسین ترین شکل اور پاکیزہ ترین خوشبو کے ساتھ اس کے سامنے آئے گا اور کہے گا کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں مومن کہے گا نہیں، بس اتنا جانتا ہوں کہ اللہ نے تیری صورت حسین اور تیری خوشبو پاکیزہ بنائی ہے۔ نیک عمل کہے گا میں دنیا میں بھی ایسا ہی تھا میں آپ کا نیک عمل ہوں، میں مدت دراز تک دنیا میں تیرے اوپر سوار رہا آج تو مجھ پر سوار ہو جا۔ پھر (راوی نے) یہ آیت تلاوت کی یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا اور کافر کا عمل مکروہ ترین شکل اور بدترین بو کے ساتھ اس کے سامنے آئے گا اور کہے گا کیا تو مجھے نہیں پہچانتا۔ کافر جواب دے گا نہیں، مگر اتنی بات جانتا ہوں کہ اللہ نے تیری شکل بہت مکروہ اور تیری بو بہت گندی بنائی ہے۔ عمل کہے گا میں دنیا میں بھی ایسا ہی تھا میں تیرا برا عمل ہوں دنیا میں مدت دراز تک تو مجھ پر سوار رہا آج میں تجھ پر سوار ہوں گا۔ پھر (راوی نے) یہ آیت تلاوت کی وَھُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَھُمْ عَلٰی ظُھُوْرِھِمْ۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ (خطبہ دینے) کھڑے ہوئے اور مال غنیمت میں چوری کرنے کو بڑا جرم بتایا پھر (مویشی اور سونے چاندی کی زکوٰۃ نہ دینے والوں کو ڈرانے کے لئے) فرمایا خوب سن لو میں ایسی حالت میں (تم کو) نہ پاؤں کہ تم میں سے بعض لوگ بلبلاتے اونٹ کو اپنی گردن پر اٹھائے میرے سامنے آئیں اور کہیں یا رسول اللہ ﷺ دہائی ہے اور میں جواب دوں آج اللہ کے سامنے میرا کچھ قابو نہیں، میں تجھے (دنیا میں) پیام پہنچا چکا۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جس کے اندر حضور ﷺ نے ہنہناتے گھوڑے اور منمناتی بکری اور سونے چاندی کے گردن پر سوار ہونے کا بھی ذکر فرمایا تھا، متفق علیہ۔

ابو یعلی اور بزار نے بھی اسی طرح کی حدیث حضرت عمر بن خطابؓ کی روایت سے نقل کی ہے۔

طبرانی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے مرفوع حدیث بیان کی ہے کہ جس نے اپنی ضرورت سے زائد کوئی مکان بنایا (یعنی جائیداد بنائی) قیامت کے دن اس کو مجبور کیا جائے گا کہ اس مکان کو اپنے کندھے پر اٹھائے۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت ہے جس نے بالشت بھر زمین بغیر حق کے لی قیامت کے دن اللہ اس کو ساتھ زمینوں کا طوق پہنائے گا۔

اس مبحث کی احادیث طبرانی نے حضرت حکم بن حارث اور حضرت انسؓ کی روایت سے بھی بیان کی ہیں اور طبرانی نیز امام احمد نے حضرت یعلیٰ بن مرہ اور حضرت ابو مالکؓ اشعری کی روایت سے اس باب کی احادیث نقل کی ہیں۔

اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾ (خوب سن لو کہ برا ہوگا وہ بوجھ جس کو وہ اٹھائے ہوں گے)۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ (اور دنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں ہے، صرف کھیل اور بہلاوا ہے) لَعِبٌ غیر مفید کام جس کا کوئی صحیح مقصد نہ ہو۔ لَهْوٌ مفید کام سے روکنے والا امر۔ یعنی جن اعمال کی غرض صرف دنیوی عیش پسندی اور لذت اندوزی ہو اور رضاء مولیٰ کی طلب نہ ہو ان سے کوئی خاص قابل اعتبار نفع حاصل نہیں ہو سکتا جو دنیوی فائدہ ہوگا وہ عارضی اور زوال پذیر اور لازوال زندگی کے فوائد کے حصول سے روکنے والا ہوگا۔

وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ (اور پچھلا گھر یقیناً پرہیز گاروں کے لئے بہترین ہوگا)۔

ابن عامر کی قرأت میں وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ بھی آیا ہے۔ اس صورت میں اَلْاٰخِرَةِ کا موصوف اَلسَّاعَة محذوف ہوگا۔ جیسے صَلٰوةُ الْوُسْطٰی اور مَسْجِدُ الْجَامِع میں (الساعة اور الوقت محذوف ہے) پرہیز گاروں سے مراد ہیں شرک اور گناہوں سے بچنے والا۔ دار آخرت لازوال ہے، اس کی لذتیں اور فوائد کدورت سے پاک ہیں، اس لئے دنیوی فوائد و لذائد سے بہتر ہیں۔ دار آخرت کی بھلائی صرف اہل تقویٰ کے لئے مخصوص ہے، مشرکوں کے لئے تو آخرت دنیا سے بہت ہی زیادہ بری ہے۔ چونکہ آیت میں متقین کے اعمال کو اعمال دنیا کے مقابل بیان کیا ہے اور اعمال دنیا کو لہو و لعب فرمایا ہے اس لئے اشارہ معلوم ہوا کہ جو اہل تقویٰ کا عمل نہ ہو وہ لہو و لعب ہے۔

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾ (کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے) کہ کون سے اعمال بہتر ہیں دنیا کے یا آخرت کے۔ بہتر وہی عمل ہوگا جس کا فائدہ زیادہ خالص اور لازوال ہو اور جس کا فائدہ عارضی، کدورت آمیز اور کمزور ہو وہ عمل بہتر نہیں ہو سکتا۔

ترمذی اور حاکم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے لکھا ہے کہ ابو جہل نے رسول اللہ ﷺ سے کہا ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ جو چیز آپ نے پیش کی ہے اس کی تکذیب کرتے ہیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ (ہم کو خوب معلوم ہے کہ آپ کو ان کے اقوال مغموم کرتے ہیں سو یہ آپ کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں)۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ (اس جگہ) لفظ قَدْ فعل کی زیادتی اور کثرت کو ظاہر کرنے کے لئے آیا ہے جیسے وَلٰكِنَّهٗ قَدْ يُهْلِكُ الْمَالَ نَائِلُهٗ میں آیا ہے اور اِنَّهٗ میں ضمیر شان ہے (جس کو مرجع کی ضرورت نہیں ہوتی) سدی کا بیان ہے کہ اخنس بن شریق نے ابو جہل بن ہشام سے ملاقات کی اور کہا ابو الحکم محمد بن عبد اللہ کے متعلق مجھے بتاؤ وہ سچے ہیں یا جھوٹے۔ اس وقت یہاں میرے سوا آپ کی بات سننے والا اور کوئی نہیں ہے۔ ابو جہل نے کہا خدا کی قسم محمد بلاشبہ سچے ہیں لیکن جب قصی کی اولاد کے پاس جھنڈا، حاجیوں کو پانی پلانا، کعبہ کی تولیت، پنچائیت اور نبوت (ہر امتیاز) پہنچ گیا تو باقی قریشیوں کے لئے کیا بچا (میں اس لئے محمد کی نبوت کی مخالفت کرتا ہوں) اس پر آیت فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ نازل ہوئی۔ ناجیہ بن کعب کا بیان ہے کہ ابو جہل نے رسول اللہ ﷺ سے کہا ہم آپ ﷺ پر (جھوٹے ہونے کا) شبہ نہیں کرتے اور نہ آپ کو جھوٹا کہتے ہیں بلکہ جو چیز آپ نے پیش کی اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

بجائے ضمیر غائب کے اَلظّٰلِمِيْنَ کا لفظ صراحت کے ساتھ ذکر کرنا دلالت کر رہا ہے۔ کہ انکار کرنے کی وجہ سے وہ لوگ ظالم ہو گئے تھے یا یوں کہا جائے کہ حق کوشی چونکہ ان کی عادت تھی اس لئے انہوں نے انکار کر دیا تھا اور چونکہ جحود (انکار) کے اندر تکذیب کا مفہوم داخل ہے (اور تکذیب کے بعد ب آتی ہے) اس لئے آیات سے پہلے ب کو ذکر کیا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی تکذیب حقیقت میں خدا کی تکذیب ہے کیونکہ آپ کی تکذیب وہ نبوت کے اعتبار سے کرتے ہیں (ویسے وہ

دوسری باتوں میں آپ کو جھوٹا نہیں جانتے) اور حقیقت میں یہ نبوت دے کر بھیجنے والے کی تکذیب ہے۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ (اور آپ سے پہلے بہت پیغمبروں کو (نبوت کے دعوے میں) جھوٹا کہا گیا) یعنی جس طرح آپ کی قوم نے آپ کی تکذیب کی اسی طرح سابق پیغمبروں کی قوموں نے ان کی تکذیب کی اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی گئی ہے (کہ آپ قوم کی مخالفت سے تنگدل نہ ہوں پیغمبروں کی مخالفت قدیم دستور ہے کوئی نئی بات نہیں)۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ کا لفظ بتا رہا ہے کہ لَا یُكَذِّبُوْنَكَ کا حقیقی مفہوم مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ رسول ﷺ کی تکذیب حقیقت میں خدا کی تکذیب ہے (تو یہ حقیقت میں خدا کی تکذیب ہوئی) رسول اللہ ﷺ نے (اسی لئے) ارشاد فرمایا تھا جس نے مجھے ایذا دی ہے، اس نے حقیقت میں اللہ کو ایذا دی۔

فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ (سو انہوں نے اپنی تکذیب اور دکھ رسیدہ ہونے پر صبر کیا آخر ہماری مدد ان کو پہنچ گئی)۔ صبر کا نتیجہ نصرت نکلا پس جس طرح انہوں نے صبر کیا آپ بھی صبر کریں آخر کار آپ کو بھی اللہ کی طرف سے نصرت پہنچ جائے گی۔

وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ (اور اللہ کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں)۔

كَلِمٰتُ اللّٰهِ سے مراد ہیں نصرت انبیاء کے خداوندی وعدے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ- دوسری آیت ہے اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا۔ تیسری آیت میں آیا ہے وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (اپنے پیغمبر بندوں کے لئے ہمارا وعدہ پہلے ہی ہو چکا ہے کہ انہیں کی مدد کی جائے گی ہم ہی اپنے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں۔ ہمارا لشکر ہی غلبہ پانے والا ہے) یا كَلِمٰتُ اللّٰهِ سے مراد ہے اللہ کا تکوینی فیصلہ اور قضاء مقدر۔ یعنی اضطراب سے کوئی فائدہ نہیں۔ صبر رکھنا لازم ہے۔ جب وقت آجائے گا تو اللہ کی طرف سے نصرت آجائے گی پھر اس کو کوئی پلٹ نہیں سکتا۔

وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾ (اور آپ کے پاس پیغمبروں کے بعض قصے پہنچ چکے ہیں) اخفش نحوی کے نزدیک مِن زائد ہے۔ سیبویہ کلام مثبت میں مِنْ کی زیادتی جائز نہیں قرار دیتا اس لئے سیبویہ کے نزدیک اس جگہ مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی پیغمبروں کی بعض خبریں آپ کے پاس پہنچ چکی ہیں جو آپ کی تسلی کے لئے کافی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو قوم کے مسلمان ہونے کی رغبت حرص کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ ایمان سے ان کی روگردانی آپ کو بہت کھلتی تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ جب وہ آپ سے کوئی معجزہ طلب کرتے تو آپ تہ دل سے خواستگار ہوتے کہ اللہ یہ معجزہ آپ کے ہاتھ سے نمودار کر دے تاکہ لوگ ایمان لے آئیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ (اور اگر آپ کو ان کا اعراض کرنا گراں گزرتا ہے تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان پر پہنچنے کی کوئی سیڑھی تلاش کر لیں) روگردانی سے مراد ہے نبوت و قرآن پر ایمان لانے سے روگردانی کرنا نَفَقًا کا معنی ہے سرنگ۔ فی الارض اس کی صفت ہے یعنی اگر تم زمین کے اندر گھسنے کیلئے کوئی سرنگ بنا سکتے ہو اور سرنگ کے ذریعہ سے زمین کے اندر گھس کر ان کے لئے کوئی معجزہ نمودار کر سکتے ہو۔ سُلَّمًا زینہ چڑھنے کا راستہ۔ فِي السَّمَآءِ سے مراد ہے آسمان کی چھت یعنی اگر تم آسمان کی طرف چڑھنے کا کوئی زینہ بنا سکتے ہو کہ اس پر چڑھ کر آسمان پر پہنچ جاؤ اور

فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ (وہاں سے لا کر کوئی معجزہ ان کے سامنے ظاہر کر دو تو ایسا کرو)۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ آپ خود کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکتے اس لئے خواہ مخواہ اپنے کو بے چین نہ کرو خواہ ان کا اعتراض تم کو کتنا ہی کھلے تم صبر رکھو۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ (اور اگر اللہ ان سب کو ہدایت کرنا چاہتا)۔

لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى (تو سب کو ہدایت پر متفق کر دیتا)۔ کیونکہ بندوں کے ارادہ کا خالق بھی خدا ہے۔ بندوں کی مشیت اللہ کی مشیت کی تابع ہے مگر اللہ ہی اپنی مصلحت کے پیش نظر ان کی ہدایت نہیں چاہتا اور اس کی مصلحت سے کوئی دوسرا واقف نہیں تم ان کو ہدایت یافتہ بنانے کا قابو نہیں رکھتے اس لئے صبر کرو، بے چین نہ ہو۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾ (اور نادانوں میں سے نہ بنو)۔ غیر مفید کام کے لئے ایسے مقام پر مضطرب ہونا جہاں صبر مفید ہو، نادانوں کی خصوصیت ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ آپ ان نادانوں میں نہ ہوں جو اتنا بھی نہیں جانتے کہ لوگوں کا ہدایت یاب ہونا اللہ کی مشیت پر موقوف ہے کسی اور کی مشیت کو اس میں دخل نہیں ہے۔ النصف

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ (آپ کی دعوت کو تو) وہی لوگ قبول کریں گے جو (حق و قبول کے کانوں سے) سنتے ہیں) یعنی سنی ہوئی بات کی حقانیت کا علم جن کے دلوں کے اندر اللہ نے پیدا کر دیا ہو۔ سننے سے مراد ہے سن کر جاننا کیونکہ سننے کے بعد علم کی تخلیق اللہ کا دستور ہے۔ وقف غفران

وَالْمَوْتٰى (اور مردے) یعنی کافر (کیا سنیں گے، کافروں کے دلوں پر اللہ نے قفل ڈال دیا ہے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور آنکھوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اسی لئے وہ حق کو حق اور باطل کو باطل نہیں جانتے گویا مردے ہیں۔

يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ (ان کو (تو بس قیامت کے دن) اللہ اٹھائے گا (تو اٹھیں گے)۔

ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾ (پھر اللہ ہی کی طرف سب کو لوٹایا جائے گا)۔ وہی ان کو کفر کی سزا دے گا اس سے پہلے نہ وہ حق بات سنیں گے نہ تصویر حق دیکھیں گے۔ یا اَلْمَوْتٰى سے عام مردے مراد ہیں کافر ہوں یا مؤمن سب کو اللہ زندہ کر کے اٹھائے گا اور سب کی واپسی اللہ ہی کی طرف ہو گی وہی سزا جزا دے گا۔ جیسے اعمال ہوں گے ویسا بدلہ ملے گا۔ وقف منزل عند البعض

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اور (قریش کے سرداروں نے) کہا کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نازل نہیں کیا گیا) یعنی ہمارا مطلوبہ معجزہ یا موجودہ معجزات کے علاوہ کوئی اور غیر معمولی معجزہ۔ نازل شدہ معجزات کو تو وہ محض عناد کی وجہ سے درخور اعتناء نہیں سمجھتے تھے۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً (آپ کہہ دیجئے کہ اللہ (ہر) معجزہ اتارنے پر قادر ہے۔ آیۃ سے مراد یا تو مطلوبہ معجزہ ہے یا ایسا معجزہ جس کو ماننے پر وہ مجبور ہو جائیں جیسے پہاڑ کو جڑ سے اکھاڑ کر سروں پر معلق کر دینا۔ یا ایسا معجزہ جس کے بعد انکار کرنے والوں کی ہلاکت ضروری ہو جائے۔

وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾ (لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے) کہ اللہ ہر نشانی اتارنے پر قادر ہے یا مطلوبہ معجزہ اتار کر انکار کرنے والوں کو بیخ و بن سے برباد کر دینے پر قادر ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ (اور نہیں ہے زمین پر کوئی چلنے والا جاندار)

وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دونوں پنکھوں سے ہوا میں اڑتا ہو)۔ ہر پرندہ دو بازوؤں سے ہی اڑتا ہے لیکن رفتار کی تیزی کے لئے بھی مجازاً کبھی اڑنے کا لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے، اس خیال کو دور کرنے کے لئے طائر کے بعد يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ فرمایا يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ کہنے سے محض معنوی تاکید مقصود ہے۔

اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ (مگر سب تمہاری طرح گروہ گروہ ہیں) یعنی پیدا ہونے میں، مرنے میں، پھر جی اٹھنے میں، غذا کی ضرورت اور رزق کی طلب میں، عافیت و مصیبت کے توارد میں (غرض تمام حیوانی لوازم و خصوصیات میں) تمہاری طرح ہیں تم کو محض معرفت الٰہی کی وجہ سے ان پر برتری حاصل ہے، ورنہ اور کوئی وجہ فضیلت نہیں۔

مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ (ہم نے کتاب کے اندر کسی قسم کی کمی نہیں چھوڑی)۔ مِنْ شَیْءٍ میں مِنْ زائد ہے اور شَیْءٍ مفعول بہ نہیں ہے مفعول مطلق ہے۔ کیونکہ فرط کے بعد مفعول بہ بغیر ب کے نہیں آتا، اَلْكِتٰبُ سے مراد ہے لوح محفوظ یعنی اللہ کا علم ہمہ گیر ہے ظاہر ہو یا پوشیدہ کوئی چیز علم خدا سے باہر نہیں اور کوئی حیوان و غیرِ حیوان ایسا نہیں

کہ اس کا اندراج لوح محفوظ میں نہ ہو۔ یا اَلْکِتَاب سے مراد ہے قرآن مجید اور مِنْ شَیْءٍ سے مراد ہیں دینی امور یعنی قرآن میں تمام دینی امور تفصیل یا اجمال کے ساتھ موجود ہیں)۔

ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ (پھر ان سب کو ان کے مالک کے پاس جمع کیا جائے گا) ھُمْ کی ضمیر مجموعہ کی طرف راجع ہے یعنی اُمَمٌ اور کُمْ دونوں کا مجموعہ ضمیر کا مرجع ہے اسی لئے یُحْشَرُوْنَ جمع مذکر غائب کا صیغہ استعمال کیا۔ حضرت ابن عباسؓ اور ضحاک نے فرمایا ان کی موت ہی ان کا حشر ہے (یعنی حشر سے مراد موت ہے مطلب یہ کہ ان سب پر موت آتی ہے اور یہ سب اللہ کی طرف چلے جاتے ہیں)۔

لیکن ابن ابی حاتم اور ابن جریر اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن تمام مخلوق اٹھائی جائے گی، چوپائے کیڑے مکوڑے اور پرندے سب ہی کا حشر ہوگا اور اللہ کا انصاف اس حد تک پہنچ جائے گا کہ اللہ سینگوں والی سے منڈی کا بدلہ دلاوئے گا۔ پھر فرمائے گا خاک ہو جاؤ (اداء حقوق کے بعد سب جاندار خاک ہو جائیں گے) اس وقت کافر کہے گا، کاش میں بھی خاک ہو جاتا (کہ دوامی عذاب سے نجات ہو جاتی) بغوی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اہل حقوق کو ان کے حقوق دلوائے جائیں گے یہاں تک کہ سینگوں والی بکری سے منڈی بکری کا بدلہ دلوایا جائے گا۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلا مقدمہ جس کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جائے گا دو بکریوں کا ہوگا۔ ایک سینگوں والی ہوگی دوسری منڈی۔ اسی طرح کی ایک حدیث حضرت ابوذرؓ کی روایت سے احمد اور بزار اور طبرانی نے بھی نقل کی ہے۔ اور حاکم نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔

تخلیق کائنات اور آثار قدرت جو اللہ کی عظمت اور اس کے علم و قدرت کی ہمہ گیری کے نشان ہیں اور ان سے حشر و جزا پر استدلال کیا جاتا ہے جب ان کا ذکر ہو چکا تو آگے فرماتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ (اور جو لوگ ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں وہ بہرے ہیں (واضح نشانات حق کی آواز نہیں سنتے) گونگے ہیں (کلمۂ حق ان کی زبانوں پر نہیں آتا)۔

فِی الظُّلُمٰتِ (تاریکیوں میں) اندھے ہوئے ہیں یعنی کفر، جہالت، عناد اور اسلاف پرستی کے اندھیروں میں پڑے ہوئے ہیں۔

آیات قدرت سے کسی کا ہدایت یاب ہونا یا نہ ہونا اللہ کی مشیت پر موقوف ہے وہی جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے آگے فرمایا۔

مَنْ یَّشَاِ اللّٰهُ یُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ یَّشَاْ یَجْعَلْهُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۳۹﴾ (اللہ جس کی گمراہی چاہتا ہے اس کو گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو ہدایت یاب کرنا چاہتا ہے اس کو سیدھے راستہ پر کر دیتا ہے) اور یہ راستہ اس کو حق تک پہنچا دیتا ہے۔

قُلْ (اے محمد ﷺ ان مشرکوں سے) آپ کہہ دیں۔

اَرَءَیْتَكُمْ (بھلا بتاؤ تو) ہمزۂ استفہام اظہار تعجب کے لئے ہے اور کاف حرف خطاب ہے اس سے رَاَیْتَ کے فاعل کی تاکید ہو رہی ہے۔ کاف کا اعرابی محل کچھ نہیں ہے (یعنی یہ نہ فاعل ہے نہ مفعول) بلکہ رَاَیْتَ کے دونوں مفعول محذوف ہیں جن پر آنے والا کلام دلالت کر رہا ہے یعنی کیا تم نے دیکھا کہ جب تم اپنے معبودوں کو پکارتے ہو تو کیا تم کو وہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔

فراء نے کہا عرب اَرَاَیْتَکَ بولتے ہیں لیکن (اس استفہام سے) ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ہم کو بتاؤ۔

علامہ تفتازانی نے کہا کہ رَاَیْتَ میں رُؤْیَتْ علمی یا رؤیت چشمی کا سوال ہے مگر اس سے مقصود ہے طلب خبر کیونکہ آنکھوں سے دیکھنا علم کا ذریعہ ہے اور علم خبر دینے کا سبب ہے سبب کو مسبب کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ (اگر (دنیا میں گزشتہ اقوام کی طرح) تم پر اللہ کا عذاب آجائے)۔
اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ (یا قیامت (اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ) تم پر آجائے)۔
اَغَیْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ (تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے)۔ استفہام انکاری ہے جس سے مخاطبوں کو قائل کرنا مقصود ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۴۰﴾ (اگر تم سچے ہو) کہ یہ بت، دیوتا اور معبود ہیں تو کیا ان کو مصیبت دور کرنے کے لئے پکارو گے (نہیں)۔

بَلْ اِیَّاهُ تَدْعُوْنَ (بلکہ تم اسی کو پکارو گے)۔ تقدیم مفعول حصر کے لئے ہے۔

فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ (سو وہی اگر چاہے گا تو اس مصیبت کو دور کردے گا جس کے دور کرنے کے لئے تم اس کو پکارو گے)۔ یعنی دنیا میں مصیبت دور کردے گا اگر چاہے گا آخرت کا عذاب نہیں دور کرے گا۔

وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾ (اور (ایسے وقت میں) ان (دیوتاؤں) کو بھول جاؤ گے جن کو شریک قرار دیتے ہو،) بھول جانے سے مراد ہے چھوڑ دینا (بات یہ ہے کہ فطری طور پر) انسان کے دماغ میں یہ امر پیوست ہے کہ مصیبت کو دور کرنے پر قدرت صرف اللہ کو حاصل ہے (اس لئے مشرک بھی اٹل مصیبت کے وقت اللہ ہی کو پکارنے پر مجبور ہیں)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ (اور ہم نے آپ سے پہلے والی امتوں کے پاس بھی پیغمبر بھیجے (اور جب انہوں نے سرتابی کی) تو تنگ دستی اور بیماری میں (مبتلا کر کے) ان کی پکڑ کی تاکہ وہ گڑگڑا کر (گناہوں سے) توبہ کرلیں۔ مِنْ قَبْلِكَ میں مِنْ زائد ہے۔ بَاْسَآء سختی اور ناداری۔ ضَرَّآء بیماری اور دوسرے جسمانی دکھ تضرع عاجزی سے سوال کرنا۔

فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا (سو جب ان کو ہماری طرف سے سزا پہنچی انہوں نے عاجزی (کے ساتھ توبہ) کیوں نہیں کی)۔ مراد یہ کہ انہوں نے سزا دیکھنے کے بعد بھی توبہ نہیں کی۔ کلمۂ نفی کی جگہ لَوْلَا کا استعمال اس طرف اشارہ کر رہا ہے کہ تَضَرُّع کے ترک کا ان کے پاس کوئی عذر نہ تھا بلکہ تَضَرُّع کے دواعی موجود ہونے کے باوجود انہوں نے توبہ نہیں کی۔

وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ (لیکن ان کے دل سخت پڑ گئے تھے)۔
وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ (اور شیطان ان کے اعمال کو ان کی نظر میں پسندیدہ بنا کر دکھاتا رہا)۔ یعنی مصائب میں مبتلا ہونے سے بھی ان کو تنبیہ نہ ہوئی اور انہوں نے اپنے اعمال کو ہی پسندیدہ نظر سے دیکھا۔ یہ توبہ سے روکنے والے سبب کا بیان ہے اور اس بات کا اظہار ہے کہ دل کی سختی اور شیطانی اغوا نے ان کو توبہ سے روک دیا تھا، شیطان کے اغواء سے وہ اپنے اعمال پر ہی ریجھے رہے۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ (سو جب انہوں نے ان چیزوں کو چھوڑے رکھا جن کی ان کو نصیحت کی گئی) اور اختیار نہ کیا ان احکام کو جو ان کو دیئے گئے تھے اور تنگ دستی و بیماری میں مبتلا ہو کر بھی بیدار نہ ہوئے اور توبہ نہ کی۔

فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ (تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے) یعنی ڈھیل دینے کے لئے ان کو ہر طرح کی نعمتیں عطاء کردیں۔ حضرت عقبہ بن عامر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی بندہ گناہوں پر جما ہوا ہو اور دنیا میں ہر دل پسند چیز اس کو ملتی رہے تو (سمجھ لو کہ) یہ محض ڈھیل ہے۔ پھر حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ۔

حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا (یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو ان کو ملی تھیں وہ اترا گئے)۔
اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً (تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا)۔

فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ (سو وہ یکدم (حیرت زدہ ہو کر رہ گئے) ہر بھلائی سے ناامید ہو گئے)۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ (پھر ظالم لوگوں کی جڑ کٹ گئی) قاموس میں دَابِر کا معنی ہے تابع، ہر چیز کا آخری حصہ، جڑ۔ مطلب یہ ہے کہ سب کو ہلاک کر دیا گیا ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا۔ توالد کا سلسلہ ہی کاٹ دیا گیا۔ نسل منقطع ہو گئی۔ پس قطع دابر قطع اصول کی صورت میں ہو گیا یا قطع فروع کی شکل میں۔

بجائے دَابِرُهُمْ کہنے کے دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ الخ سے اس طرف اشارہ ہے کہ ان کی بربادی کی علت ان کا ظلم تھا (اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا ان کا خود ظلم موجب بربادی ہوا)۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾ (اور اللہ ہی کے لئے ہر ستائش ہے جو سارے جہان کا مالک ہے)۔ ظالموں کو ہلاک کرنا بھی قابل حمد و ستائش فعل ہے، مومنوں کو ظالموں کے شر سے نجات ملتی ہے، غلط افکار اور فاسد اعمال سے زمین پاک ہوتی ہے۔ عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ نزول عذاب کا موجب ہوتے ہیں پس ظالموں کی تباہی سے اہل زمین عمومی تباہی سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس جگہ وصف ربوبیت کا خصوصی ذکر اس لئے کیا کہ ظالموں کو تباہ کر دینا ہمہ گیر ربوبیت کا تقاضا ہے (متعدی بیمار کی ہلاکت تعدیۂ مرض کی بندش و بیخ کنی کا سبب ہوتی ہے) اس جملہ میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ جو اللہ کی حمد نہ کرے اور اللہ اس کو ہلاک کر دے تو ایسے شخص کی ہلاکت پر اللہ کی حمد کرنا واجب ہے۔ اس سے آگے اپنی قدرت کی ہمہ گیری اور توحید کو بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے۔

قُلْ (اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیجئے)۔

اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ

(اے مشرکو) بتاؤ تو اگر اللہ تمہاری شنوائی اور بینائی بالکل لے لے (تم کو اندھا بہرا کر دے) اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے (ایسی غفلت مسلط کر دے کہ تمہاری عقلیں ناکارہ ہو جائیں) تو اللہ کے سوا کون ایسا معبود ہے جو یہ چیزیں تم کو پھر دے دے) یعنی اللہ کے سوا کوئی تم کو یہ چیزیں نہیں دے سکتا۔ استفہام تقریری ہے مطلب یہ کہ تم خود جانتے ہو کہ اگر اللہ تمہاری شنوائی، بینائی اور دانائی لے لے تو اور کوئی معبود بھی واپس نہیں دے سکتا۔

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ (اے محمد ﷺ) آپ دیکھئے تو ہم کس طرح دلائل کو مختلف پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں پھر بھی یہ اعراض کرتے ہیں)۔ قاموس میں صَرْفِ آیات کا معنی ہے آیات کو کھول کر بیان کرنا بغوی نے یہی لکھا ہے یعنی ہم توحید کے دلائل کس طرح کھول کھول کر بیان کر رہے ہیں۔ بیضاوی نے نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ کی تشریح اس طرح کی ہے ہم بار بار دلائل بیان کرتے ہیں، کبھی عقلی دلائل پیش کرتے ہیں کبھی ترغیب اور تخویف سے کام لیتے ہیں، کبھی گزشتہ اقوام کے احوال بیان کر کے عبرت اندوز ہونے کی نصیحت اور تنبیہ کرتے ہیں۔

ثُمَّ هُمْ میں ثُمَّ (تراخی کے لئے نہیں ہے بلکہ) اظہار دوری کے لئے ہے یعنی کھلے دلائل کے بیان اور ظہور آیات کے بعد ان کا اعراض کرنا بہت بعید ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

(اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ (مشرکو) بتلاؤ اگر اللہ کا عذاب تم پر آپڑے خواہ بے خبری میں یا خبرداری میں تو کیا بجز ظالم لوگوں کے اور بھی کوئی ہلاک کیا جائے گا)۔

بَغْتَةً سے مراد ہے اچانک بغیر کسی نشانی اور علامت کے۔ اور جَهْرَةً کا معنی ہے علی الاعلان جس کی نشانیاں پہلے سے نمودار ہو چکی ہوں۔ حضرت ابن عباسؓ اور حسنؒ نے فرمایا بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً کا معنی ہے رات میں یا دن میں۔ هَلْ يُهْلَكُ میں استفہام انکاری ہے یعنی سوائے ظالموں کے اور کوئی ہلاک نہ ہوگا۔ چونکہ اس جگہ استفہام بمعنی نفی ہے اسی لئے آگے استثناء کیا گیا۔ اَلظّٰلِمُوْنَ سے مراد ہیں کافر جو کفر کی وجہ سے خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (اور ہم پیغمبروں کو صرف اس لئے بھیجا کرتے ہیں کہ وہ (اہل ایمان کو جنت کی) بشارت دیں اور (کافروں کو دوزخ سے) ڈرائیں)۔ یعنی کافروں کے مطلوبہ معجزات کو پیش کرنا اور جس کو اللہ ہدایت یاب نہ بنانا چاہے اس کو ہدایت یاب بنانا ان کی قدرت میں نہیں ہوتا، نہ پیغمبر ان صفات کے حامل ہوتے ہیں جن سے متصف ہونا کافروں کے نزدیک ضروری ہے (مثلاً فرشتہ ہونا، کھانے پینے کا ضرورت مند نہ ہونا، کوئی عجیب مَافَوْقَ الْفِطْرَت ہستی ہونا وغیرہ وغیرہ)۔

فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾ (پس جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے درستی کرلی (یعنی پیغمبروں کی پیش کردہ تعلیم کو سچا مان لیا اور جنت کی امید اور دوزخ کے خوف سے اپنے اعمال کی اصلاح کرلی) تو پھر نہ ان کو (عذاب کا) ڈر ہوگا نہ (ثواب کے فوت ہونے کا) غم)۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا (اور جن لوگوں نے ہماری (بشارت آفریں خوف آگیں) آیات کو جھوٹا قرار دیا)۔

يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾ (تو (ایمان واطاعت کے دائرہ سے) خارج ہونے کی وجہ سے ان کو عذاب لگے گا)۔ چھونا اور لگنا تو زندگی کی علامت ہے گویا عذاب بھی ایک زندہ چیز ہوگا جو کافروں سے جس طرح چاہے گا آلگے گا۔ مَا كَانُوْا میں مَا مصدری ہے۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ (آپ کہہ دیجئے میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں) یعنی جن چیزوں پر اللہ کو خصوصی قدرت حاصل ہے وہ میرے قبضہ میں ہیں یا اس کے رزق کے خزانے میرے پاس ہیں۔

وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں غیب جانتا ہوں) یعنی وہ (گزشتہ اور آئندہ چیزیں جن کی وحی سے مجھے اطلاع نہیں دی گئی ان کو جاننے کا میں دعویٰ نہیں کرتا۔ لَا زائد ہے اس کا عطف عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ پر ہے۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ (اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں) کہ میرا کھانا پینا اور نکاح کرنا میرے دعویٰ کے خلاف ہو، مطلب یہ کہ میں تم سے کوئی ایسی بات نہیں کہتا جس کا عقلاً انکار ضروری ہو اور جو طلب دلائل کا محتاج ہو۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (میں تو (تعلیم و تبلیغ میں) بس اسی کا اتباع کرتا ہوں جس کی وحی میرے پاس آتی ہے)۔ یعنی میں صرف نبوت کا دعویٰ کرتا ہوں اور انہی امور کے درپے ہوں جن کے درپے دوسرے انبیاء تھے اور اس میں کوئی عقلی استحالہ نہیں۔ یہ بات عقلاً درست ہے گزشتہ انبیاء کی خبریں اس سلسلہ میں متواتر پہنچ چکی ہے۔ مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ کے دعوئے نبوت کو بعید از عقل سمجھا تھا اور حضور ﷺ کے دعوے کے ناممکن ہونے کا ان کو یقین تھا۔ اس آیت مین ان کے خیال کی تردید فرمادی۔

بغویؒ نے اس آیت کی تشریح میں کہا ہے کہ مشرکوں نے جب (اندھا دھند) معجزات کی طلب کی تو ان آیات کا نزول ہوا۔ مطلب یہ ہے آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اللہ کے خزانے میرے قبضہ میں ہیں یہاں تک کہ میں کوہ صفا کو سونے کا بنادوں اور جو کچھ تم چاہتے ہو وہ تم کو دیدوں، نہ میں غیب دانی کا مدعی ہوں کہ گزشتہ، آئندہ کی باتیں بغیر اللہ کی وحی کے تم کو بتادوں، نہ خود فرشتہ ہونے کا میرا دعویٰ ہے کہ مجھے کھانے پینے اور نکاح کرنے کی ضرورت نہ ہو، میں تو بس اسی پر چلتا ہوں جو وحی سے میرے پاس آجاتا ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ (آپ کہئے کہ کیا اندھے اور انکھیارے برابر ہوسکتے ہیں) اندھا (کافر) حق وباطل میں امتیاز نہیں کرتا ناممکن الانکار چیز کا انکار کردیتا ہے اور ناممکن التصدیق بات کی تصدیق کرتا ہے اور انکھیارا (یعنی سچا موٴمن) حق وباطل کی تمیز رکھتا ہے، مدعیٔ نبوت کے معجزات و آیات کی تصدیق کرتا ہے اور جو لوگ اللہ

کے سوا دوسروں کو معبود بناتے اور بتوں کو دربار خداوندی میں اپنا سفارشی مانتے اور فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے اور سائبہ کو بغیر کسی دلیل کے حرام کہتے ہیں ان کی اس خرافات کی یہ انکھیار آدمی تکذیب کرتا ہے (اور ان سب بیہودہ باتوں کو غلط کہتا ہے)

اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾ (تو کیا تم غور نہیں کرتے) کہ حق و باطل میں تمیز کرنے اور واجب التصدیق و واجب التکذیب امور میں فرق کرنے کا راستہ تم کو مل جائے۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْٓا اِلٰی رَبِّهِمْ (اور اس سے ایسے لوگوں کو ڈراؤ جو اس بات سے اندیشہ رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس جمع کئے جائیں گے)۔

چونکہ اَلَّذِیْنَ کے بعد یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْٓا آیا ہے (جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ انہی لوگوں کو خوف دلانے کا حکم ہے جن کو اندیشۂ حشر بصورت یقین یا بطور تردد لگا ہوا ہے) اس لئے بیضاوی نے لکھا ہے کہ اَلَّذِیْنَ سے مراد یا تو وہ مؤمن ہیں جن سے عمل میں کچھ کوتاہی ہو رہی ہو یا وہ لوگ مراد ہیں جن کو حشر کا اقرار ہو، خواہ وہ مؤمن ہوں یا کافر کتابی یا حشر ہونے نہ ہونے میں تردد رکھنے والے ہوں۔ غرض وہ لوگ مراد نہیں ہیں جن کو حشر کے نہ ہونے کا یقین ہو کیونکہ اس آخری گروہ کو ڈرانا بے سود ہے اور باقی اشخاص کو ڈرانا سود مند ہو سکتا ہے۔

بیضاویؒ کی یہ تشریح غلط ہے اِنذار کا حکم عمومی ہے اللہ نے اپنے پیغمبر کو یہ کہنے کا حکم دے دیا ہے کہ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ۔ عمل میں کوتاہی کرنے والے مؤمنوں کی انذار کے لئے کوئی خصوصیت نہیں۔ عمل کی انتہائی کوشش کرنے والے مؤمنوں کے لئے بھی انذار مفید ہے تاکہ انذار کے بعد وہ اجتہاد اور کوشش میں غفلت نہ کریں۔ دیکھو دور رسالت میں سب ہی سعیٔ عمل میں منہمک تھے کوئی بھی کوتاہی کرنے والا نہ تھا۔ لہٰذا اَلَّذِیْنَ سے مراد سب لوگ ہیں۔ بندہ عاجز کو اپنے خالق قوی سے ڈرنا ہی چاہئے یا یوں کہا جائے کہ آیت میں حشر سے ڈرنے والوں کا خصوصیت سے ذکر اس وجہ سے کیا کہ ڈرانے کا فائدہ انہی کو پہنچ سکتا ہے (جیسے هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ میں اہل تقویٰ کا خصوصی ذکر اس لئے ہے کہ وہی ہدایت قرآنی سے فائدہ اٹھانے والے ہیں اگرچہ قرآن کی ہدایت عمومی ہے)۔

لَیْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ (کہ ان کے لئے اللہ کے سوا نہ کوئی مددگار ہوگا نہ سفارشی)۔

یعنی حشر کی اس حالت سے ڈرتے ہیں کہ اللہ کے سوا نہ کوئی ان کا حامی ہوگا نہ سفارشی۔ اس صورت میں پورا جملہ یحشروا کی ضمیر سے حال ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس جملہ کا مضمون بِهٖ کی ضمیر سے بدل ہو۔ اس وقت مطلب اس طرح ہوگا کہ قرآن کے ذریعہ سے حشر کا اندیشہ کرنے والوں کو اس طرح ڈراؤ کہ اللہ کے سوا ان کا نہ کوئی حامی ہوگا نہ سفارشی، لہٰذا اس کے سوا نہ کسی کی عبادت کریں نہ کسی اور کو مدد کے لئے پکاریں۔ اس آیت میں بظاہر شفاعت کی نفی ہے لیکن دوسری آیت میں باذن خداوندی شفاعت ہونے کا ثبوت موجود ہے (اسی طرح مؤمنوں کے لئے مؤمنوں کا حامی ہونا بھی مذکور ہے) اس لئے مثبتین شفاعت (یعنی اہل سنت) کی طرف سے کہا جائے گا کہ اللہ کے اذن کے بعد شفاعت ہونا بھی حقیقت میں اللہ ہی کی حمایت ہے (اور آیت میں نفی ولایت و شفاعت سے بلا اذن الٰہی ولایت و شفاعت کی نفی مراد ہے) پس اولیاء کی طرف سے ولایت و شفاعت جو اذن خداوندی کے بعد ہوگی اس کی نفی آیت میں نہیں ہے۔

لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾ (اس امید پر کہ وہ ڈر جائیں) حضرت مفسر نے لَعَلَّ کا ترجمہ تاکہ کیا ہے۔ امام احمد طبرانی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن مسعودؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ قریش کے کچھ سردار رسول اللہ ﷺ کی طرف سے گزرے، اس وقت حضرت خبابؓ، حضرت صہیبؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت عمارؓ حضور ﷺ کی خدمت میں موجود تھے۔ سرداران قریش کہنے لگے محمد ﷺ تم نے انہی کا انتخاب کیا ہے کیا اللہ نے ہم لوگوں میں سے انہی کو اپنی نعمت سے سرفراز کیا ہے اگر تم ان کو اپنے پاس سے نکال دو گے تو ہم آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اس پر وَاَنْذِرْ بِهِ سے سَبِیْلُ الْمُجْرِمِیْنَ تک آیات کا

نزول ہوا۔

ابن حبان اور حاکم نے حضرت سعد بن وقاصؓ کا بیان نقل کیا۔ حضرت سعدؓ نے فرمایا یہ آیت چھ آدمیوں کے حق میں نازل ہوئی، میں اور عبداللہ بن مسعودؓ اور چار دوسرے لوگ۔ کفار قریش نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا ان لوگوں کو نکال دو تو ہم آپ کے پیرو ہو جائیں گے، ہم کو ان کی طرح تمہارا پیرو ہونے میں شرم آتی ہے (یعنی ہم ان لوگوں کے ساتھ آپ کے پاس نہیں بیٹھ سکتے) حضور ﷺ کے دل میں بھی اس بات کا کچھ خیال آیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مسلم کی روایت بالفاظ ذیل ہے ہم چھ آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے، میں، ابن مسعودؓ اور قبیلہ ہذیل کا ایک شخص اور بلال اور دو آدمی اور جن کے نام میں بھول گیا۔ ہم کو حضورؐ کی صحبت میں دیکھ کر مشرکوں نے کہا ان کو اپنے پاس سے ہٹا دو تا کہ ہمارے وقار میں فرق نہ آئے حضور ﷺ کے دل میں بھی اس سے کچھ خیال آیا اور آپ نے کچھ سوچا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ اور جو لوگ صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں ان کو اپنے پاس سے نہ نکالو۔ پکارنے سے مراد ہے عبادت اور ذکر کرنا۔ کریم کی عبادت اور یاد سے اس کے انعام کا فیضان مزید ہوتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک پکارنے سے مراد ہے دعاء کرنا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، صبح و شام پکارنے سے مراد ہے فجر اور عصر کی نماز۔

ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی بھی نسبت کی گئی ہے کہ پانچوں نمازیں مراد ہیں کیونکہ کچھ غریب مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اس پر کچھ بڑے لوگوں نے کہا کہ جب ہم نماز میں شریک ہوں تو ان لوگوں کو آپ پیچھے کر دیا کریں یہ ہمارے پیچھے ہو کر نماز پڑھیں اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

يُرِيدُونَ وَجْهَهُ (جو خاص اس کی رضامندی چاہتے ہیں)۔

یعنی خلوص دل سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ تمام کاموں کا مدار اخلاص پر ہے اور جب خلوص کے ساتھ وہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو ایسے عبادت گزاروں کی عزت کی جائے، نکالا نہ جائے[1]

مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ (ان کا حساب ذرا بھی آپ کے متعلق نہیں اور نہ آپ کا حساب کچھ ان کے متعلق ہے)۔ مِنْ شَیْءٍ، مَا کا اسم ہے اور عَلَیْکَ خبر اور مِنْ حِسَابِکَ، عَلَیْکَ کی ضمیر سے حال ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اپنی مجلس سے نکالنا اور ہم نشینی ترک کرنا اس وقت جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے اگر ہم نشینی سے دونوں میں سے کسی کا ضرر ہوتا ہو۔ اگر آپس میں کسی کا نقصان نہ ہوتا ہو تو مجالست ترک کرنا واجب نہیں اور ان لوگوں کی ہم نشینی سے تو نہ آپ کا کوئی ضرر ہے نہ ان کا، بلکہ دونوں کا فائدہ ہے۔ آپ کی صحبت میں بیٹھ کر یہ نیکیاں کریں گے اور امت کی نیکیوں کا ثواب پیغمبر کو ملنا یقینی ہے اور ان کو اپنی صحبت میں بٹھا کر آپ راہ راست بتاتے اور ہدایت کرتے رہیں گے اس سے ان کو فائدہ پہنچے گا۔ اس مطلب پر یہ پورا جملہ منفیہ اَلَّذِیْنَ سے حال ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حِسَابِهِمْ اور عَلَيْهِمْ کی ضمیر مشرکوں کی طرف راجع ہو۔ اس وقت مطلب اس طرح ہوگا مشرکوں کے اعمال کا آپ سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا نہ آپ کے اعمال کی ان سے حساب فہمی، پھر ان کے مسلمان ہونے کے لالچ میں موجود مسلمانوں کو اپنے پاس سے نکالنا درست نہیں اور زیبا نہیں۔

---

[1] علم البلاغۃ کا مسلمہ ضابطہ ہے جس کی صراحت امام عبدالقاہر نے اپنی کتابوں میں کی ہے اور صاحب مطول نے بھی اس کو نقل کیا ہے کہ اگر کسی حکم کو کسی وصف پر مرتب کیا جائے تو وہ وصف اس حکم کی علت ہوتا ہے جیسے اپنے سچے دوست زید سے اچھا سلوک کرو۔ اچھا سلوک کرنے کی علت سچا دوست ہونا ہے۔ اسی ضابطہ کی طرف حضرت مفسر نے اشارہ کیا ہے کہ اخراج کی ممانعت جن لوگوں سے متعلق کی گئی ہے ان کا خصوصی وصف بھی ذکر کر دیا ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ عبادت کرتے ہیں پس اخلاص کے ساتھ عبادت کرنا ممانعت اخراج کی علت ہوئی خلوص کے ساتھ عبادت کرنے کا تقاضا عزت ہے نہ کہ اخراج۔ ۱۲

فَتَطْرُدَهُمْ (کہ مسلمانوں کو آپ اپنے پاس سے نکالیں) یہ نفی کا جواب ہے اسی لئے منصوب ہے۔
فَتَكُونَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ (اور ظالموں میں سے ہو جائیں) (یہ ترجمہ اس وقت ہو گا جب فَتَكُوْنَ کا عطف تَطْرُدَ پر قرار دیا جائے اور اگر یہ نہی کا جواب ہے (جیسا کہ حضرت مفسر نے صراحت کی ہے تو ترجمہ اس طرح ہو گا ان کو اپنے پاس سے نہ نکالو ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے)۔
وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ (اور اسی طور پر ہم نے ایک کو دوسرے کے ذریعہ سے آزمائش میں ڈال رکھا ہے) كَذٰلِكَ میں کاف اسی طرح زائد ہے جس طرح لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ میں۔ ذٰلِكَ سے اشارہ سرداران قریش کی گمراہی کی جانب ہے اور فَتَنَّا کا مفعول مطلق ہے۔ بَعْضَهُمْ سے مراد ہیں کفار قریش اور بِبَعْضٍ سے مراد ہیں فقراء اہل اسلام جن کی موجودگی اور حاضر باشی سرداران قریش کے اسلام نہ لانے کا سبب بنی۔ بِبَعْضٍ اصل میں بِبَعْضِهِمْ تھا (یعنی تنوین مضاف الیہ کے قائم مقام ہے)۔
علامہ تفتازانی نے لکھا ہے کہ اس جگہ كَذٰلِكَ فَتَنَّا (اور اسی طرح دوسرے مقامات پر لفظ كَذٰلِكَ) اگرچہ تشبیہی ہے لیکن تشبیہ مراد نہیں، یا یوں کہا جائے کہ آیت کا معنی اس طرح ہے کہ وہ گمراہی جس میں ہم نے قریش کے سرداروں کو مبتلا کیا ویسی ہی تھی جیسے گزشتہ امتوں میں سے ہم نے بعض کو بعض کی گمراہی کا سبب بنا دیا تھا مثلاً قوم نوح نے کہا تھا مَا نَرٰكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ اور حضرت نوحؑ نے ان کے جواب میں فرمایا تھا مَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اس تفسیر پر بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ سے گزشتہ اقوام مراد ہیں اور سرداران قریش کی گمراہی کو گزشتہ اقوام کی گمراہی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جو مطالبہ سرداران قریش نے کیا تھا وہی مطالبہ گزشتہ انبیاء کی بعض امتوں نے کیا تھا اور جس سبب سے سرداران قریش گمراہ ہوئے اسی سبب سے بعض اقوام پارینہ کے سردار گمراہ ہوئے)۔
بیضاویؒ نے آیت کی جو تشریح کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ذٰلِكَ سے اشارہ دنیوی آزمائش کی طرف ہے اور فَتَنَّا سے مراد ہے دینی ابتلاء یعنی جیسے ہم نے دنیوی معاملات میں لوگوں کو مختلف کر کے آزمائش کی ہے کسی کو فقیر بنایا اور کسی کو امیر اسی آزمائش کی طرح ہم نے دینی امور میں بھی لوگوں کو امتحان میں ڈالا ہے اور بعض کو بعض کی آزمائش کا سبب بنایا ہے، چنانچہ کمزوروں کی سابق الایمان بنا کر سرداروں پر ان کو برتری عطا کی (اور یہ ہی عمل سرداروں کی گمراہی کا سبب بن گیا۔
لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا (تاکہ یہ لوگ کہا کریں کہ کیا یہی لوگ ہیں کہ ہم سب میں سے اللہ تعالیٰ نے ان پر زیادہ فضل کیا ہے)۔ يَقُوْلُوْا کا فاعل اَغْنِيَاء ہے اور هٰؤُلَاءِ سے اشارہ فقراء مسلمین کی جانب ہے۔ انعام سے مراد ہے ہدایت اور توفیق ایمان۔ اَهٰؤُلَاءِ میں استفہام انکاری ہے یعنی اغنیاء نے اس امر کا انکار کیا کہ فقراء کو قبول حق کی توفیق مل جائے اور وہ خیر کی جانب اغنیاء سے آگے بڑھ جائیں۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ اگر اسلام حق ہوتا تو ہم اس کی طرف فقراء سے پیش قدمی کرتے اور وہ ہم سے آگے نہ بڑھ سکتے۔
اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ (کیا اللہ شکر گزاروں سے بخوبی واقف نہیں ہے) یعنی جن لوگوں کے اندر شکر گزار ہونے کی استعداد ہے جس کی وجہ سے اللہ ان کو شکر گزاری کی توفیق عطا فرما دیتا ہے اور جن لوگوں کے اندر ایمان اور شکر گزاری کی صلاحیت نہیں ہے جس کی وجہ سے اللہ ان کو توفیق ایمان نہیں دیتا کیا ان دونوں گروہوں سے اللہ واقف نہیں ہے۔
یہ آیت (اس تفسیر کی روشنی میں) دلالت کر رہی ہے کہ (خیر و شر کی) استعداد وجود سے پہلے ہوتی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اسی لئے فرمایا تھا کہ تعینات اہل ایمان کے مبادی اللہ کے اسم هادی کا پرتو ہیں اور تعینات کفار کے مبادی اللہ کے اسم مُضِلّ کا پرتو (یعنی توفیق ایمان ہو یا ضلالت آفرینی دونوں اللہ کی صفات کے پرتو ہیں۔ جس پر اللہ کے اسم هادی کا پرتو پڑ گیا وہ ہدایت یافتہ ہو گا اور جس پر اللہ کے اسم مضل کا پرتو پڑ گیا وہ گمراہ ہو گیا) پس جس چیز سے اور جس غرض کے لئے جس کو پیدا

کیا گیا ہے اس سے تجاوز ناممکن ہے۔

آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ رذیل فقیر اس قابل ہیں کہ ہم کو تو صحبت رسول حاصل نہ ہو اور صرف ان کو صحبت رسول ﷺ کی نعمت دے کر اللہ سر بلند کرے (ایسا نہیں ہو سکتا) اس خیال کو رد کرنے کے لئے اللہ نے فرمایا کیا اللہ شکر گزاروں کو نہیں جانتا پس جو شکر گزار ہیں وہی رسول اللہ ﷺ کی ہم نشینی کے مستحق ہیں۔ اغنیاء شکر گزار نہیں ہیں اس لئے ان کو صحبت رسول ﷺ کا استحقاق بھی نہیں ہے۔

بغوی کا بیان ہے کہ حضرت سلمانؓ اور حضرت خباب بن الارتؓ نے فرمایا اس آیت کا نزول ہمارے سلسلہ میں ہوا۔ اقرع بن حابس تمیمی، عیینہ بن حصن فزاری اور بعض دوسرے لوگ جو مؤلفۃ القلوب (مسلمانوں) میں سے تھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت حضور ﷺ کے پاس بلال، صہیب، عمار، خباب اور کچھ اور کمزور مسلمان بیٹھے ہوئے تھے، آنے والوں نے ان بے چاروں (غریبوں) کو دیکھ کر تحقیر کی نظر سے دیکھا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ صدر مقام پر تشریف فرما ہوں اور ان لوگوں کو اور ان کے لباس کی بدبو کو اپنے پاس سے ہٹا دیں تو ہم آپ کے پاس بیٹھیں گے اور آپ سے کچھ حاصل کریں گے۔ ان غریب مسلمانوں کے اونی چوغے تھے جن سے پسینہ کی وجہ سے بدبو پھیل رہی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں اہل ایمان کو اپنے پاس سے نہیں نکال سکتا۔ کہنے لگے اچھا تو ہمارے لئے الگ جگہ مقرر کر دیجئے کہ (آنے والے) عرب ہماری بڑائی کو پہچان لیں کیونکہ آپ کے پاس عربوں کے وفد آتے رہتے ہیں ہمیں ان کے سامنے ان غلاموں کے ساتھ بیٹھتے شرم آتی ہے۔ ہم جب آپ کے پاس آیا کریں تو آپ ان کو اٹھوا دیا کریں اور جب ہم فارغ ہو کر چلے جائیں تو آپ کو اختیار ہے آپ پھر ان کو اپنے پاس بٹھا لیا کریں۔ حضور ﷺ نے کاغذ طلب فرمایا اور حضرت علیؓ کو بلوایا۔ راوی کا بیان ہے ہم ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے ہی تھے (اور تحریر لکھنے نہ پائے تھے) کہ جبرئیل آیت وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ .... بِالشّٰكِرِيْنَ تک لے کر نازل ہوئے۔ حضور ﷺ نے فوراً دست مبارک سے کاغذ پھینک دیا اور ہم کو طلب فرمایا ہم خدمت میں پہنچے تو آپ پڑھ رہے تھے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ چنانچہ ہم حضور ﷺ کے پاس برابر بیٹھتے رہے۔ جب حضور ﷺ اٹھنے کا ارادہ کرتے تو خود اٹھ جاتے اور ہم کو بیٹھے چھوڑ جاتے، اس پر اللہ نے نازل فرمایا وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ۔ اس کے بعد (بڑے بڑے سرداروں کے آنے پر بھی) حضور ﷺ ہمارے پاس بیٹھے رہتے اور ہم اتنے قریب بیٹھتے کہ ہمارے زانو حضور ﷺ کے زانو سے چھونے لگتے۔ پھر جب حضور ﷺ کے اٹھنے کا وقت آ جاتا تو ہم خود اٹھ جاتے اور حضور ﷺ نے ہم سے فرمایا تھا اللہ کا شکر ہے کہ مرنے سے پہلے اس نے مجھے حکم دے دیا کہ میں اپنی امت کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھا رہوں۔ تمہارے ہی ساتھ میرا مرنا جینا ہے۔ کلبی نے کہا اقرع اور عیینہ وغیرہ نے عرض کیا تھا۔ آپ ایک دن ہمارے لئے اور ایک دن ان کے لئے مقرر فرما دیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کہنے لگے اچھا تو مجلس ایک ہی رکھئے مگر ہماری طرف کو منہ اور ان کی طرف کو پشت رکھئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

بغوی نے جو واقعہ حضرت خبابؓ اور حضرت سلمانؓ کی روایت سے نقل کیا ہے وہی واقعہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم وغیرہ نے (صرف) حضرت خبابؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اس میں اتنا زائد ہے کہ پھر اللہ نے اقرع اور اس کے ساتھی کا تذکرہ فرمایا اور ارشاد فرمایا وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ الخ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے یہ روایت غریب ہے کیونکہ یہ آیت تو مکی ہے اور اقرع و عیینہ ہجرت سے بہت مدت کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔

بغوی نے اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا، میں مہاجروں کی ایک جماعت میں بیٹھا ہوا تھا برہنگی کی وجہ سے بعض لوگ بعض کی آڑ پکڑے ہوئے تھے اور ایک قاری پڑھ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے اور آکر کھڑے ہو گئے۔ حضور ﷺ کو کھڑا دیکھ کر قاری چپ ہو گیا آپ نے سلام کیا اور فرمایا تم کیا کر رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا یا

رسول اللہ ایک قاری قرآن مجید پڑھ رہا تھا ہم اللہ کا کلام سن رہے تھے۔ فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری امت میں بعض لوگ ایسے بنا دیئے جن کے ساتھ مجھے اپنے آپ کو جمائے رکھنے کا حکم دیا اس کے بعد اظہار مساوات کے لئے آپ ہمارے وسط میں بیٹھ گئے، پھر ہاتھ سے اشارہ فرمایا تو لوگوں نے گردا گرد حلقہ بنا لیا اور سب کے چہرے سامنے آگئے (کوئی آڑ میں نہیں رہا) میرا خیال ہے کہ میرے علاوہ حضور ﷺ نے کسی کو نہیں پہچانا ارشاد فرمایا اے نادار مہاجروں کے گروہ قیامت کے دن تم کو نور کامل حاصل ہونے کی بشارت ہو، مالداروں سے آدھے دن پیشتر غریب لوگ جنت میں جائیں گے اور اس آدھے دن کی مقدار پانسو برس ہوگی۔

ابن جریر نے حضرت عکرمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، مطعم بن عدی اور حارث بن نوفل، عبد مناف کے کچھ کافر سرداروں کی معیت میں ابو طالب کے پاس گئے اور کہا اگر آپ کا بھتیجا ان غلاموں کو اپنے پاس سے نکال دے تو اس کی عظمت ہمارے دلوں میں بڑھ جائے گی اور ہماری نظر میں وہ زیادہ قابل اطاعت ہو جائے گا اور ہمارے لئے اس کا اتباع کرنا زیادہ مناسب ہو جائے گا۔ ابو طالب نے اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کی۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے بھی مشورہ دیا کہ ایسا کر دیکھئے ہم بھی تو دیکھیں قریش کا اس سے مقصد کیا ہے اس پر اللہ نے آیت وَاَنْذِرْبِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ ...... اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشَّاكِرِيْنَ تک نازل فرمائی۔ جن لوگوں کو رسول اللہ کے پاس سے قریش نے ہٹوانا چاہا تھا وہ بلال، عمار بن یاسر، ابو حذیفہ کا آزاد کردہ سالم، اسید کا آزاد کردہ صبیح، عبد اللہ بن مسعود، مقداد بن عبد اللہ، وقد بن عبد اللہ حنظلی اور انہی کی طرح کے اور لوگ تھے۔ اس آیت کے نزول کے بعد حضرت عمرؓ خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور اپنے سابق مشورہ کے عذر خواہ ہوئے اس وقت آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ (اور جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ ان سے کہیں تم پر سلامتی ہو)۔

حضرت عکرمہؓ کا قول ہے اس آیت کا نزول ان لوگوں کے حق میں ہوا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو غریب مسلمانوں کے اخراج سے منع کیا تھا چنانچہ رسول اللہ ﷺ جب ان حضرات کو دیکھتے تھے تو سلام کا آغاز خود ہی کرتے تھے۔ عطاء کا بیان ہے اس آیت کا نزول مندرجہ ذیل حضرات کے حق میں ہوا۔ ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، بلالؓ، سالمؓ، ابو عبیدہؓ، مصعبؓ بن عمیر، حمزہؓ، جعفرؓ، عثمان بن مظعونؓ، عمار بن یاسرؓ، ارقم بن ارقمؓ، ابو سلمہ بن عبد الاسدؓ۔

فریابی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ماہان کی روایت نقل کی ہے کہ کچھ لوگ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ہم بڑے بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ حضور اقدسؐ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر آیت ذیل وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ الخ نازل ہوئی۔

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (تمہارے رب نے اپنی ذات پر تمہارے لئے رحمت لازم کر لی ہے)۔

اس آیت میں اللہ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ ان لوگوں سے سلام کرنے میں خود پیش قدمی کیا کریں یا ان کو اللہ کی طرف سے سلام پہنچا دیں (یعنی فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ کے دونوں مطلب ہو سکتے ہیں) اور فقط سلامتی ہی کی بشارت نہیں بلکہ اس کے بعد یہ بات بھی ان کو پہنچا دیں کہ اللہ نے اپنی مہربانی سے اپنے وعدہ کے مطابق ان پر رحمت فرمانے کو واجب و لازم قرار دے لیا ہے

اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾

(کہ تم میں سے اگر کوئی شخص نادانی سے برا کام کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور (اپنے آپ کو) درست کر لے تو اللہ کی یہ شان ہے کہ وہ بڑا غفور رحیم ہے) ضرور معاف کر دے گا۔

اِنَّهٗ میں ضمیر شان ہے (جس کو مرجع کی ضرورت نہیں) اور پورا جملہ اَلرَّحْمَةَ سے بدل ہے، یا ب محذوف ہے بِجَهَالَةٍ

عَمِلَ سے حال ہے اور مفعول محذوف ہے یعنی بداعمالی کے ضرر رساں تباہی آفریں نتیجہ کو نہ جاننے کی حالت میں جس نے کوئی برا کام کیا۔ یا بِجَہَالَۃٍ کا معنی ہے مُتَجَاهِلاً یعنی جس کسی نے کوئی برا کام جاہلانہ طور پر کر لیا۔ مطلب یہ ہے کہ خواہشات نفس کے غلبہ کی وجہ سے اس کا طور طریقہ جاہلانہ ہو گیا اور پھر جاہلانہ طور پر اس نے کوئی برا عمل کر لیا اور کرنے کے بعد اس کو پشیمانی ہو گئی اور آئندہ نہ کرنے کا اس نے پختہ ارادہ کر لیا اور اپنے اعمال کو درست کر لیا تو اس کے لئے اللہ غفور رحیم ہے۔ آیت دلالت کر رہی ہے کہ توبہ مغفرت گناہ کا سبب ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ (اور اسی طرح ہم آیات کو الگ الگ کر کے بیان کرتے رہتے ہیں)۔

یعنی جس طرح ہم نے اس سورت میں آیات کی تفصیل کی، اسی طرح ہم قرآن کی آیات الگ الگ کھول کر بیان کرتے ہیں یا آیات سے مراد ہیں دلائل حق جو منکرین حق کے سامنے بیان کی جاتی ہیں۔

وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾ (تاکہ راہ مستقیم معلوم ہو جائے) اور مجرموں کی راہ نمایاں ہو جائے اس کا عطف محذوف جملہ پر ہے پورا کلام اس طرح تھا ہم آیات بیان کرتے ہیں تاکہ راہ مستقیم واضح ہو جائے اور مجرموں کا راستہ کھل کر سامنے آجائے۔ ع ۶ ۱۲

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ (آپ کہہ دیجئے مجھے ممانعت کر دی گئی ہے) یعنی مجھے عقلی دلائل و براہین اور قرآنی آیات و احکام کے ذریعہ سے باز داشت کر دی گئی ہے، پھیر دیا گیا ہے۔

اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (کہ ان کی پرستش کروں جن کو اللہ کے علاوہ تم معبود قرار دیتے) اور ان کی عبادت کرتے اور ان کو الٰہ کہتے ہو۔

قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ (آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا)۔ اس جملہ میں کافروں کی امید کو پرزور طریقہ سے قطع کر دیا گیا اور اس بات کو واضح کر دیا گیا کہ جن خیالات پر تم چل رہے ہو ان کے لئے نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی ثبوت، محض خواہش نفس کی پیروی ہے اس میں ترک اتباع کی علت کا بھی اظہار فرما دیا اور طلب گاران حق کو تنبیہ بھی کر دی کہ دلیل و برہان واجب الاتباع ہے اور (بے ثبوت) تقلید ناجائز۔

قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا (کیونکہ اس حالت میں تو میں بے راہ ہو جاؤں گا)۔ یعنی اگر میں تمہاری خواہشات پر چلا تو گمراہ ہو جاؤں گا۔

وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾ (اور ہدایت یافتہ گروہ میں سے نہ ہوں گا)۔ اس میں در پردہ تنبیہ ہے کہ تم ہدایت یافتہ گروہ میں شامل نہیں ہو۔

قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ (آپ کہہ دیجئے کہ میرے پاس تو ایک دلیل ہے میرے رب کی طرف سے)۔

مِنْ بَيِّنَةٍ کی مِنْ رَّبِّيْ صفت ہے یعنی وہ دلیل جو میرے رب کی طرف سے مجھے ملی۔ یا مِنْ رَّبِّيْ، بَيِّنَةٍ کا صلہ ہے یعنی اپنے رب کی معرفت اور اس بات کا علم کہ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔

سابق آیت میں اس (خواہش نفس) کا اظہار تھا جس کا اتباع ناجائز ہے اس آیت میں اس شئی کا بیان ہے جس کا اتباع لازم ہے یعنی دلیل و بصیرت۔

وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ (اور تم اس کی تکذیب کرتے ہو)۔ بِہٖ کی ضمیر بَيِّنَة کی طرف راجع ہے کیونکہ بَيِّنَة کا لفظ اگرچہ مونث ہے لیکن معنوی اعتبار سے یہ مذکر ہے یعنی برہان۔ یا رب کی طرف راجع ہے یعنی تم میرے رب کی تکذیب کرتے ہو دوسروں کو (عبادت میں) اس کا شریک بناتے ہو۔

مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ (جس چیز کے جلد آنے کی تم درخواست کر رہے ہو وہ میرے پاس نہیں)۔

مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ سے مراد عذاب ہے، کیونکہ کافر کہتے تھے اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً

مِنَ السَّمَاءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ یا قیامت مراد ہے اللہ نے فرمایا ہے یَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا۔
اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عذاب میں تعجیل یا تاخیر اور قیامت کو لانے کے متعلق (حکم بس اللہ کے ہی اختیار میں ہے)۔
يَقُصُّ الْحَقَّ (اللہ واقعی بات بتا دیتا ہے)۔ يَقُصُّ کا معنی ہے وہ بیان کرتا ہے، فرماتا ہے، تفصیل کرتا ہے۔
لیکن اگر اس لفظ کو قصّ اثرہ (اس کے نشان قدم پر چلا) سے ماخوذ قرار دیا جائے تو ترجمہ یہ ہوگا وہ حق کے ساتھ ہے حق کے پیچھے ہے۔
وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾ (وہی سب سے اچھا حاکم اور (حکم کو) ظاہر کرنے والا ہے)۔
قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ (اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ بالفرض۔ اگر میری قدرت میں وہ عذاب اور قیامت کو لانا۔ جس کی تم جلدی مچا رہے ہو ہوتا)۔
لَقُضِيَ الْاَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ (تو میرا اور تمہارا باہمی قصہ فیصل ہو چکا ہوتا)۔
یعنی عذاب آ چکتا اور تم ہلاک ہو چکتے اور میرا تمہارا جھگڑا ہی مٹ جاتا، یا یہ مطلب ہے کہ آج ہی قیامت بپا ہو جاتی، حق و باطل کا فیصلہ ہو جاتا اور میرے تمہارے درمیانی جھگڑے کا فیصلہ جو قیامت میں ہونے والا ہے وہ آج ہی طے ہو جاتا۔ اللہ نے فرمایا ہے ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ اس آیت میں باہمی جھگڑا چکانے کا مبہم طور پر ذکر کر دیا گیا لیکن تعین کے ساتھ یہ نہیں بتایا کہ عذاب میں مبتلا کون فریق ہوگا اس کی توضیح کے لئے آگے فرمایا۔
وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ (اور اللہ ظالموں (بے جا حرکات کرنے والے ناحق کوشوں یعنی کافروں) کو خوب جانتا ہے) پس انہی کو اپنی حکمت کے زیر اقتضاء تباہ کرے گا۔
وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ (اور غیب کے خزانے (یا کنجیاں) اللہ ہی کے قبضہ میں ہیں)۔ عِنْدَهٗ کی تقدیم مفید حصر ہے (یعنی اسی کے قبضہ میں ہیں کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں ہیں) مَفَاتِحُ جمع ہے اس کا واحد مَفْتَحٌ (بفتح میم) ہے جس کا معنی ہے خزانہ۔ یا مِفْتَحٌ (بکسر میم) واحد ہے جس کا معنی ہے بند چیز کو کھولنے کا آلہ یعنی کنجی۔ مِفْتَاحُ الْغَيْبِ سے مراد ہے علم خداوندی، جو ہر معلوم چیز تک پہنچنے (اور اس کی حقیقت کو پانے) کا ذریعہ ہے اور قبضہ میں ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس کا علم ہر غیبی چیز کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے گویا وہ غیبی چیز اس کے پاس موجود ہے۔
غیب وہ چیز ہے جو ابھی تک عالم وجود میں نہیں آئی جیسے قیامت کے احوال، بارش ہونا نہ ہونا اور کب ہونا، آدمی کا کل کو کیا کام کرنا، کس جگہ (اور کب) مرنا۔ یہ سب امور اسی قسم کی غیب میں داخل ہیں۔ غیب وہ چیز بھی ہے جو موجود تو ہو گئی مگر اللہ نے کسی کو اس سے واقف نہیں بنایا جیسے شکم مادر میں کیا ہے (نر یا مادہ) آیت میں دونوں طرح کا غیب مراد ہے۔
بغویؒ نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مفاتح الغیب پانچ چیزیں ہیں جن کو سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا کہ رحم مادر کے اندر کیا ہے، سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا، سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا کہ بارش کب ہوگی، کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس سر زمین میں مرے گا اور سوائے اللہ کے کوئی واقف نہیں کہ قیامت کب بپا ہوگی۔ امام احمد —— اور بخاری کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے حضرت جبرئیل کے سوال کے سلسلہ میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا یہ ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا یعنی قیامت (پانچ غیبی امور میں سے ہے) اس کے بعد حضور ﷺ نے تلاوت فرمائی اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ الخ۔
میں کہتا ہوں کہ خزائن غیب انہی پانچ چیزوں میں محدود نہیں ہیں بلکہ جو چیز اب تک موجود نہیں ہوئی یا موجود ہو گئی۔ مگر اللہ نے اس کا اظہار کسی پر نہیں کیا وہ خزائن غیب میں داخل ہے۔ ضحاک نے کہا مَفَاتِحُ الْغَيْبِ زمین کے خزانے ہیں اور نزول عذاب کا علم ہے۔ عطاء نے کہا مَفَاتِحُ الْغَيْبِ وہ ثواب و عذاب ہے جو تم سے پوشیدہ ہے۔ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ کے متعلق

بعض اقوال دوسرے بھی آئے ہیں جیسے زندگی کی مدت کب ختم ہوگی، آدمی سعید ہے یا شقی، آدمی کا خاتمہ کس حالت پر ہوگا (وغیرہ) ہم نے جو تصریح کردی اس کی بناء پر ان تمام اقوال میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (ان کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا) اوپر مفاتح الغیب کو اللہ کے لئے محدود کیا گیا تھا مگر ابہاماً، اس آیت میں اس حصر کی صراحت کردی گئی۔ ھَا کی ضمیر مغیبات کی طرف راجع ہے یعنی اللہ کے سوا ان غیبی امور کا علم کسی کو نہیں۔ وہی ان کے اوقات اور دیر میں یا جلدی آنے سے واقف ہے اور اس کی حکمت سے بھی وہی واقف ہے۔ ہاں اگر اللہ خود ہی کسی کو ان چیز کا کچھ علم عطا فرمادے تو دوسرا جان سکتا ہے۔ آیت دلالت کررہی ہے کہ اللہ تمام چیزوں کو ان کے وجود سے پہلے ہی جانتا ہے۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (اور جو کچھ خشکی اور سمندر میں ہے اللہ اس سے واقف ہے) یعنی خشکی میں نباتات اور حیوانات وغیرہ اور سمندر میں حیوانات اور موتی مونگا وغیرہ جو کچھ ہے سب سے اللہ ہی واقف ہے۔

آیت بالا میں مغیبات کا ذکر تھا۔ اس آیت میں موجود محسوسات کا بیان ہے مطلب یہ ہے کہ دونوں قسم کی مخلوق اللہ کے علمی احاطہ کے اندر ہے۔

وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا (اور نہیں گرتی کوئی پتی مگر اللہ اس کو جانتا ہے)۔

مَا نفی کے لئے ہے اور مِنْ استغراق کے لئے۔ اس آیت میں پر زور طور پر بیان فرمایا کہ ہر ہر جزئی کو اللہ کا علم محیط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ درختوں کی تمام پتیوں کی پوری تعداد اور نیچے گرنے سے پہلے اور بعد کے تمام احوال و کیفیات کو اللہ جانتا ہے۔

وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾ (اور کوئی حصہ زمین کی اندھیریوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر و خشک چیز گرتی ہے مگر یہ سب کتاب مبین میں ہیں)۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا رَطْبٍ (سے مراد ہے) پانی اور یَابِسٍ (سے مراد ہے) صحراء۔ عطاء نے کہا نامی اور جامد مراد ہے۔ بعض کے نزدیک زندہ اور مردہ مراد ہے۔ وَلَا حَبَّةٍ اور وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ کا عطف وَرَقَةٍ پر ہے اور یہ سب نفی علم کے تحت مندرج ہیں۔ گویا یوں مطلب ہوا کہ ہر پتی، کو ہر دانہ کو اور ہر تر و خشک کو اللہ جانتا ہے۔ اس صورت میں کِتَابٍ مُّبِيْنٍ سے مراد ہوگا اللہ کا علم اور اِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِيْنٍ۔ استثناء اول سے بدل کل ہوگا۔ اور اگر کتاب مبین سے لوح محفوظ مراد ہوگی تو اِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِيْنٍ بدل بعض ہو جائے گا۔ یا یوں کہا جائے کہ حبۃ کا عطف وَرَقَةٍ پر اور اِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِيْنٍ کا عطف اِلَّا يَعْلَمُهَا پر ہے فعل ایک ہی ہے اور دو معمولوں کا دو معمولوں پر عطف ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ (اور وہ ہی ہے جو رات میں تمہاری روحوں کو (ایک گونہ) قبض کرلیتا ہے، جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس کو جانتا ہے، پھر دن میں تم کو جگا اٹھاتا ہے)۔ تَوَفِّیْ کا اصل (لغوی) معنی ہے کسی چیز کو پورے طور سے قبض کرلینا یا تَوَفِّیْ سے بطور استعارہ موت مراد ہوتی ہے۔ یہاں مراد نیند ہے کیونکہ نیند بھی ایک قسم کی وفات (موت) ہے۔ جرح ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء سے کوئی کام کرنا۔ آیت میں کام کرنے کا وقت دن کو اور سونے کا وقت رات کو قرار دیا کیونکہ عموماً دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے، اس سے تخصیص لازم نہیں آتی کہ آدمی رات کو کام نہ کرسکے اور دن کو نہ سو سکے۔ پوری آیات میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل کلام یوں ہے هُوَ الَّذِیْ يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ بِالنَّهَارِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ چونکہ اعضاء سے کام کرنے کی اہمیت زائد تھی اس لئے بیدار کرکے اٹھانے سے پہلے اس کا ذکر کیا۔

لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى (تاکہ میعاد معین تمام کردی جائے)، یعنی موت آنے کی میعاد معین، شکم مادر میں جب بچہ ہوتا ہے اسی وقت میعاد موت مقرر کردی جاتی ہے بلکہ ازل میں ہی اس کی تعیین کردی گئی ہے۔

ثُمَّ اِلَيْهِ (پھر اس کی طرف یعنی اس کے فیصلہ کی طرف)

مَرْجِعُكُمْ (تم سب کی (مرنے کے بعد) واپسی ہے)۔ ۷ع

ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٠﴾ (پھر (قیامت کے دن حساب کے وقت) تم کو ان اعمال پر آگاہ کرے گا جو تم کرتے تھے) اور ان اعمال کا بدلہ دے گا۔ سابق آیت میں علم کی ہمہ گیری پر تنبیہ کی گئی تھی اور اس آیت میں کمال قدرت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ نیند موت کی بہن ہے سونے کے بعد اٹھانے سے دوبارہ جی اٹھنے کی دلیل کی جانب اشارہ ہے۔ ۱۳

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے)۔ فوقیت سے مراد ہے غلبہ اور برتری۔ قاہر اس غالب کو کہتے ہیں جس کا مقابلہ ممکن نہ ہو۔

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿٦١﴾

(اور وہی تم پر نگرانی کرنے والے بھیجتا ہے یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آپہنچتی ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور (اپنے فرض کی ادائیگی میں) وہ کوتاہی نہیں کرتے)۔ حَفَظَة سے مراد ہیں نامہائے اعمال میں اعمال کا اندراج کرنے والے اور لکھنے والے تاکہ قیامت کے دن ان اعمال ناموں کو کھولا جائے اور نافرمان و فرماں بردار کا سب کے سامنے ظہور ہو جائے۔

حتی سے ارسال حَفَظَة کے غرض ظاہر کی گئی ہے یا غلبہ کا نتیجہ۔ ابن ابی حاتم اور ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رُسُلُنَا سے مراد ہیں ملک الموت کے مددگار فرشتے۔ ابوالشیخ نے نخعی کی روایت سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ سیوطی نے وہب بن منبہ کا قول نقل کیا ہے کہ جو فرشتے انسان کے قریب رہتے ہیں وہی اس کی اجل کو بھی لکھتے ہیں اور جب موت کا وقت آجاتا ہے تو وہی روح کو لیکر ملک الموت کے سپرد کر دیتے ہیں (گویا اعمال نامے لکھنے والے ملک الموت کے ماتحت ہوتے ہیں) گویا ملک الموت اس تحصیل دار کی طرح ہے کہ اس کے ماتحت زکوٰۃ کی رقم وصول کر کے اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔

ابن حبان اور ابوالشیخ کا بیان ہے کہ ربیع بن انسؓ سے دریافت کیا گیا کیا ملک الموت تنہا تمام روحوں کو قبض کرتا ہے؟ ربیع نے کہا روحوں کا ذمہ دار تو تنہا ملک الموت ہے مگر اس کے مددگار اور کارندے ہیں اور سب کا سردار ملک الموت ہے اور فرشتۂ موت کا ایک قدم مشرق سے مغرب تک کا ہوتا ہے۔ دریافت کیا گیا مومنوں کی روحیں کہاں رہتی ہیں۔ ربیع نے جواب دیا سدرۃ المنتہی کے پاس۔ قرطبی نے کہا ان تینوں آیات میں کوئی تعارض نہیں ہے ایک آیت ہے تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا دوسری آیت میں يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ تیسری آیت ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ۔ اول آیت میں قابض ارواح رسل کو قرار دیا ہے اور دوسری آیت میں ملک الموت کو اور تیسری آیت میں قبض ارواح کی نسبت خود اللہ نے اپنی طرف کی ہے۔ کیونکہ قبض روح کرنے والے اور جان کھینچنے والے تو فرشتے ہیں جو ملک الموت کے مددگار ہیں اور روحوں پر قبضہ رکھنے والا ملک الموت ہے جان کھینچنے کا کام مددگار کرتے ہیں اور قبضہ ملک الموت کا ہوتا ہے اور حقیقی فاعل اللہ ہی ہے حقیقۃً قبض ارواح اسی کا کام ہے کیونکہ بندوں کے تمام افعال اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔

یہ بھی قرطبی کا بیان ہے حدیث میں آیا ہے کہ مرنے والے پر چار فرشتے اترتے ہیں ایک دائیں پاؤں سے، دوسرا بائیں پاؤں سے، تیسرا دائیں ہاتھ سے اور چوتھا بائیں ہاتھ سے جان کھینچتا ہے۔ ذکرہ ابوحامد۔

کلبی کا بیان ہے کہ ملک الموت روح کو قبض کر کے رحمت یا عذاب کے فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ جوبیر نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ملک الموت کا تسلط زمین کی تمام چیزوں پر اسی طرح ہے جس طرح اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیز پر ہے تمام جانوں کو وہ خود ہی قبض کرتا ہے مگر اس کے ساتھ رحمت اور عذاب کے فرشتے ہوتے ہیں پاک روح کو قبض کرنے کے بعد رحمت کے فرشتوں کو دے دیتا ہے اور ناپاک روح کو عذاب کے فرشتوں کے سپرد کر دیتا

ہے۔ ابن ابی الدنیا اور ابوالشیخ نے ابن المثنی حمصی کی روایت سے بھی ایسا ہی بیان کیا ہے۔ اس کی تائید حضرت براء بن عازب کی روایت کردہ اس طویل حدیث سے ہوتی ہے جس کو احمد، ابوداؤد، حاکم، ابن ابی شیبہ اور بیہقی وغیرہ نے صحیح اسنادوں کے ساتھ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن بندہ کا تعلق جب دنیا سے منقطع ہونے لگتا ہے اور آخرت سامنے سے آرہی ہوتی ہے تو سورج جیسے گورے چہروں والے ملائکہ اس کے پاس اتر کر آتے ہیں، جنت کا کفن اور خوشبو ان کے ساتھ ہوتی ہے آکر درازی نگاہ کے فاصلہ پر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر مرنے والے کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے اے پاکیزہ روح اللہ کی مغفرت اور رضامندی کی طرف نکل کر چل، روح فوراً اس طرح بہتی نکل آتی ہے جس طرح مشک کے اندر سے پانی کا قطرہ نکل آتا ہے۔ موت کا فرشتہ اس کو لے کر فوراً (مندرجہ بالا) ملائکہ کے سپرد کر دیتا ہے۔ پل بھر بھی اپنے ہاتھ میں نہیں روکتا ملائکہ اسی (بہشتی) کفن اور خوشبو میں روح کو لپیٹ دیتے ہیں (الحدیث)۔ اسی حدیث میں کافر کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا کہ سیاہ رو ملائکہ ٹاٹ لئے درازی نظر کے فاصلہ پر آکر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور روح کو قبض کر کے فوراً (عذاب کے سیاہ رو) فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے پل بھر بھی اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتا۔

ابن ابی حاتم نے زہیر بن محمد کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ ملک الموت تو ایک ہے اور مشرق مغرب اور ان دونوں کے درمیان دو لشکر لڑتے ہیں گرتے ہیں اور ہلاک ہوتے ہیں (ایک وقت میں ملک الموت کہاں کہاں جاتا اور کس کس کی جان قبض کرتا ہے) فرمایا ملک الموت کے لئے دنیا اس طرح گھیر دی گئی ہے جس طرح ایک طشت تمہارے سامنے ہوتا ہے دنیا کی کوئی چیز ملک الموت سے چھوٹ نہیں سکتی۔ ابن ابی الدنیا اور ابوالشیخ نے اشعث بن اسلم کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ملک الموت سے جس کا نام عزرائیل ہے اور جس کی دو آنکھیں آگے چہرہ میں اور دو آنکھیں پیچھے گدی میں ہیں دریافت کیا کہ جب ایک شخص مشرق میں دوسرا مغرب میں ہو اور وباء کسی زمین پھیلی ہوئی ہو (یا) دو لشکر باہم لڑیں تو آپ کیا کرتے ہیں۔ عزرائیل نے کہا میں روحوں کو باذن اللہ پکارتا ہوں اور تمام روحیں میری اس چٹکی میں آجاتی ہیں۔ اشعث بن اسلم نے کہا ملک الموت کے سامنے زمین ہموار شکل میں طشت کی طرح کر دی گئی ہے جس جگہ سے چاہتے ہیں وہ روح کو پکڑ لیتے ہیں۔

یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے سوال کے جواب میں ملک الموت نے کہا کہ اللہ نے دنیا کو میرا تابع بنادیا ہے جس طرح تمہارے سامنے طشت رکھا ہو اور تم اس میں سے جس کنارہ سے چاہو (پھل یا کھانا وغیرہ) لے سکتے ہو اسی طرح دنیا میرے لئے ہے۔

ابوالشیخ اور ابونعیم نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے اور الزہد میں بھی مجاہد کا یہ بیان آیا ہے کہ ملک الموت کے لئے زمین ایک طشت کی طرح کر دی گئی ہے وہ جہاں سے چاہتا ہے روحوں کو لے لیتا ہے اللہ نے اس کے کچھ مددگار بنادیئے ہیں جو روحوں کو قبض کرتے ہیں پھر ان سے ملک الموت وہ روحیں لے لیتا ہے۔

میں کہتا ہوں احادیث اور آثار صحابہ کی روشنی میں مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ جس طرح محسوسات میں سورج کا تعلق (ایک وقت میں) ہر چیز سے برابر ہے اسی طرح ملک الموت کے لئے تمام زمین اور اطراف زمین ہے۔ (ایک ہی وقت اس کا تعلق ہر گوشہ زمین سے ہے) ایک کام میں مشغولیت اس کو (اسی وقت میں) دوسرے کام میں مشغول ہونے سے نہیں روکتی (اگر ایک وقت میں مشرق کے کسی گوشہ میں وہ کسی روح کو قبض کرنے میں مشغول ہو تو اسی وقت اسی آن مغرب، جنوب، شمال اور حصۂ زمین میں دوسری روحوں کو قبض کر لیتا ہے) اللہ نے بعض اولیاء کو بھی یہ قوت عطا فرمائی ہے کہ ایک آن میں وہ مختلف مقامات میں اپنے اختیار کردہ اجسام میں نمودار ہو سکتے ہیں۔ اللہ نے ملک الموت کے کچھ مددگار بھی بنادیئے ہیں جو ملک الموت کے اعضاء کی طرح ہیں اور روحیں قبض کرتے ہیں۔ ہر مرنے والے کے پاس خواہ مومن ہو یا کافر فرشتوں کی ایک جماعت جنت یا

دوزخ کا کفن لئے آتی ہے اور اس کی روح کو ملک الموت سے لے کر آسمان کی طرف چڑھ جاتی ہے۔ پس اس آیت میں رُسُلْ سے مراد یا ملک الموت کے مددگار ہیں یا دہ ملائکہ مراد ہیں جو ملک الموت سے روحیں لے کر آسمان کی طرف چڑھ جاتے ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ رُسُلْ اگرچہ جمع کا صیغہ ہے مگر مراد تنہا ملک الموت ہے۔

ادائیگی فرض میں کوتاہی نہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ سستی اور تاخیر نہیں کرتے ملائکہ میں بغیر اذن الٰہی کے روحوں کو قبض کرنے کی قدرت نہیں ہے۔ طبرانی اور ابن مندہ اور ابو نعیم نے حضرت حارث بن خزرج کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار ملک الموت کو ایک انصاری کے سر کے قریب دیکھا اور فرمایا اے ملک الموت میرے صحابی سے نرمی کرنا یہ مومن ہے ملک الموت نے جواب دیا آپ ﷺ دل کو خوش اور آنکھوں کو ٹھنڈی رکھئے اور سمجھ لیجئے کہ میں ہر مومن سے نرمی کرتا ہوں۔ محمد ﷺ آپ کو جان لینا چاہئے کہ میں جب کسی آدمی کی روح قبض کرتا ہوں اور اس کے گھر والوں میں سے کوئی چیختا چلاتا ہے تو میں میت کی روح لئے اس کے گھر میں کھڑا ہو کر کہتا ہوں اے چیخنے والے خدا کی قسم ہم نے اس پر ظلم نہیں کیا اور نہ اس کی اجل سے پہلے اس کو مارا، نہ اس کی قضا طلب کرنے میں عجلت کی، اس کو قبض کرنے میں ہماری کوئی خطا نہیں (یہ اللہ کا کیا ہوا ہے) اب اگر تم اللہ کے کئے ہوئے کام پر رضامند رہو گے تو اجر پاؤ گے، ناراض ہو گئے تو گناہ گار ہو گے اور گناہ کا بار اٹھاؤ گے، ہم تو تمہارے پاس لوٹ لوٹ کے بار بار آتے ہی رہیں گے تم کو خوف اور احتیاط رکھنی چاہئے کوئی ڈیرے خیمہ میں رہنے والا ہو یا مستقل مکانوں کا باشندہ اہل شعر (بالوں والا) اہل مدر (مٹی کے ڈھیلوں والا) اول سے مراد خانہ بدوش بدوی جو کہیں مستقل طور پر نہیں رہتے اور دوسرے سے مراد وہ لوگ جو کہیں بستی نگری میں مکان بنا کر رہتے ہیں۔ عرب میں خیمے ڈیرے اونی بنائے جاتے تھے اس لئے اہل شعر سے مراد اہل خیام ہو گئے) نیک ہو یا بد میدانی علاقہ کا باشندہ ہو یا پہاڑ کا سب کو شب و روز میں تلاش میں رکھتا ہوں، یہاں تک کہ وہ خود اپنے کو اتنا نہیں پہچانتے جتنا میں ان کے چھوٹے بڑے کو پہچانتا ہوں۔ خدا کی قسم میں اگر ایک مچھر کی جان بھی خود قبض کرنا چاہوں تو بغیر اللہ کے اذن کے نہیں کر سکتا وہی جان کو قبض کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ابن ابی الدنیا اور ابو الشیخ نے بھی حسن کی روایت سے اسی طرح بیان کیا ہے۔

جعفر بن محمد نے فرمایا مجھے اطلاع ملی ہے کہ ملک الموت نماز کے اوقات پر (مسجدوں میں) لوگوں کی تلاش رکھتا ہے پھر مرنے کے وقت آ کر دیکھتا ہے اگر مرنے والا پانچوں نمازوں کی پابندی رکھنے والوں میں سے ہوتا ہے تو ملک الموت اس کے قریب آ کر شیطانوں کو بھگا دیتا ہے اور مرنے والے کو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تلقین کرتا ہے۔

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ (پھر سب اپنے مالک حقیقی کے پاس لائے جائیں گے)۔

مَوْلٰى، مالک۔ لفظ ثم دلالت کر رہا ہے کہ اللہ کی طرف لوٹائے جانے سے مراد ہے، قیامت کے دن حساب کے لئے پیشی ہونا۔ یا یہ مراد ہے کہ مرنے کے بعد رحمت یا عذاب کے فرشتے ان کو اوپر چڑھا کر لے جاتے ہیں۔ ایک طویل حدیث میں جس کے راوی حضرت براء بن عازب ہیں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کو یعنی مومن کی روح کو فرشتے اوپر چڑھا کر لے جاتے ہیں اور فرشتوں کی جس جماعت کی طرف سے گزرتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں یہ پاکیزہ روح کونسی ہے، لے جانے والے فرشتے اس کا دنیوی سب سے اچھا نام لے کر کہتے ہیں یہ فلاں بن فلاں ہے یہاں تک کہ آسمان دنیا تک اس کو لے کر پہنچتے ہیں اور (دروازہ) کھلوانا چاہتے ہیں تو کھول دیا جاتا ہے اور ہر آسمان کے مقرب فرشتے اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں اور متصل آسمان تک پہنچا دیتے ہیں اسی طرح ساتویں آسمان تک اس کو پہنچا دیا جاتا ہے یہاں اللہ فرماتا ہے میرے بندہ کا اعمالنامہ علیین میں درج کر لو اور اس کو زمین کی طرف لوٹا دو۔ الخ

کافر کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا (ملائکہ) اس کو چڑھا کر لے جاتے ہیں اور ملائکہ کے جس گروہ کی طرف سے اس کو لے کر گزرتے ہیں تو وہ دریافت کرتے ہیں یہ گندی روح کون ہے لے جانے والے فرشتے اس کے دنیوی ناموں میں سے بدترین نام لے کر کہتے ہیں یہ فلاں بن فلاں ہے، یہاں تک کہ اس کو آسمان دنیا تک لے جاتے ہیں اور (آسمان کا

دروازہ) کھلوانا چاہتے ہیں مگر وہ نہیں کھولا جاتا، پھر حضور ﷺ نے پڑھا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَاءِ الخ اللہ فرماتا ہے سب سے نچلی زمین کے اندر سجین میں اس کا اعمالنامہ درج کرلو نتیجہ میں اس کی روح کو دور پھینک دیا جاتا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ۔

اَلَا لَهُ الْحُكْمُ (خوب سن لو کہ حکم بس اللہ ہی کا ہوگا یعنی کسی اور کا نہیں)۔

وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾ (اور وہ بہت تیزی سے حساب لے لے گا) (ایک وقت میں) ایک کا حساب اس کو دوسرے (کے) حساب سے مانع نہیں ہو سکتا۔ حدیث میں آیا ہے۔ دنیا کے آدھے دن (کے برابر وقت) میں اللہ ساری مخلوق کا حساب لے لے گا۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (آپ پوچھئے تم کو بحر و بر کی تاریکیوں سے کون بچاتا ہے) چونکہ تاریکی اور مصیبت دونوں ہولناک ہوتی ہیں اس لئے بطور استعارہ آیت میں تاریکیوں سے مراد ہیں مصائب و مقامات ہلاکت۔ لوگ جب تری خشکی کا سفر کرتے اور دوران سفر میں راستہ سے بھٹک جاتے، طوفانی موجیں اور بادل کی کڑک ہر طرف سے گھیر لیتی، تو اس وقت خلوص کیساتھ وہ اللہ کو پکارتے تھے کیونکہ اتنا وہ بھی جانتے کہ پتھروں کے بت نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر۔

تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (کہ تم اس سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعا کرتے ہو)۔

تَضَرُّع زاری کرنا اور خوب گڑگڑا کر مانگنا۔ تَضَرُّعًا اور خُفْيَةً دونوں مصدر ہیں لیکن معنی اسم فاعل کے ہیں۔ چپکے چپکے دعا اور ذکر کرنا سنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نہ کسی بہرے کو پکارتے ہو نہ غائب کو (یعنی اللہ نہ بہرا ہے نہ غائب کہ اس کو زور سے پکارا جائے بلکہ ہر وقت حاضر ہے اور پست ترین آواز کو بھی سنتا ہے) آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم عاجزی اور خلوص کے ساتھ دعا کرتے ہو (یعنی چپکے چپکے دعا کرنے سے مراد ہے خلوص کے ساتھ دعا کرنا) کیونکہ چپکے چپکے دعا کرنے میں ریاکاری کا شائبہ نہیں ہوتا محض خلوص ٹپکتا ہے۔

لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ (اور کہتے ہو) کہ اگر اس (شدت اور ظلمت) سے اس نے ہمیں بچالیا)۔ هٰذه سے ظلمت و شدت کی طرف اشارہ ہے۔ لَئِنْ اَنْجٰنَا سے پہلے یا لفظ قَوْل محذوف ہے (یعنی کہتے ہو) یا یہ تَدْعُوْنَهٗ کا بیان ہے (دعا کرتے ہو کہ اگر اس نے ہمیں بچالیا)۔ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾

تو ہم شکر گزاروں میں سے ہوں گے۔ شکر کی حقیقت ہے منعم کی نعمت کا اقرار کرنا اور نعمت کا حق ادا کرنا یعنی منعم کی رضا مندی میں اس کو صرف کرنا۔

قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾ (آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی تم کو اس تاریکی اور ہر غم سے بچاتا ہے پھر بھی تم شرک کرنے لگتے ہو)۔ یعنی شرک کی طرف لوٹ جاتے ہو وعدہ پورا نہیں کرتے۔ جانتے ہو کہ مصیبت سے اللہ ہی تم کو بچاتا ہے اور بت کسی کام نہیں آتے پھر بھی بتوں کو (عبادت میں) اللہ کا شریک بناتے ہو۔ بجائے لَاتَشْكُرُوْنَ کے تُشْرِكُوْنَ فرمایا اس میں پوری سرزنش ہے اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ جس نے اللہ کی عبادت میں دوسروں کو شریک کیا اس نے قطعاً اللہ کی عبادت ہی نہیں کی ثُمَّ اَنْتُمْ میں ثُمَّ تراخی کے لئے نہیں ہے بلکہ انعام و شرک میں انتہائی بعد ظاہر کرنے کے لئے ہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ

(آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی اس بات پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تمہارے اوپر سے کوئی عذاب تم پر بھیج رہے)۔ جیسے قوم نوح، قوم عاد اور قوم لوط اور اصحاب الفیل کے ساتھ کیا ہے۔

اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ (یا تمہارے پاؤں تلے سے) کوئی عذاب بھیج دے) جیسے قوم نوح کے ساتھ کیا کہ زمین کے اندر سے چشمے جاری کر کے پانی کے طوفان سے سب کو ڈبو دیا یا فرعون کو غرق کر دیا یا قارون کو زمین میں دھنسا دیا۔ حضرت ابن عباسؓ و مجاہدؒ کا قول ہے کہ عذاب فوق سے ظالم بادشاہ اور تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ سے بدکردار غلام مراد ہیں۔ ضحاک نے کہا فوق و تحت سے بڑے چھوٹے مراد ہیں۔ بعض علماء نے کہا فَوْقِكُمْ سے بارش کو اور تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ سے روئید گی کو روک لینا مراد ہے۔

اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (یا کہ تم کو گروہ گروہ کر کے سب کو بھڑا دے اور ایک کو دوسرے کی جنگ کا مزہ چکھادے)۔

يَلْبِسَ کا معنی ہے يَخْلِطُ۔ شِيَعًا کا معنی ہے مختلف گروہ جن کے خیالات و خواہشات الگ الگ ہوں۔ بَاْسٌ کا معنی عذاب اور جنگ کے شدائد۔ قاموس۔

مراد یہ ہے کہ تم میں سے بعض بعض کو قتل کرنے لگیں۔ حضرت جابرؓ بن عبد اللہ کی روایت ہے کہ جب آیت مذکورہ کا پہلا حصہ (یعنی) قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے کہا اَعُوْذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيْمِ جب (اس سے آگے دوسرا حصہ) اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ نازل ہوا تو آپ نے فرمایا یہ (پہلے عذاب سے) آسان اور سہل ہے۔ رواہ البخاری وغیرہ۔

فائدہ :- آیت (کے آخری حصہ) کی تعبیر ہجرت سے ۳۵ سال کے بعد نظروں کے سامنے آگئی، جب جنگ جمل و صفین میں مسلمان باہم کشت و خون میں مبتلا ہو گئے۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا بیان ہے ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب مسجد بنی معاویہؓ کی طرف سے گذرے۔ آپ ﷺ نے مسجد میں داخل ہو کر دو رکعت نماز ادا کی اور ہم نے بھی نماز پڑھی پھر آپ ﷺ نے دیر تک دعا کی، دعا کے بعد فرمایا میں نے اپنے رب سے تین باتوں کا سوال کیا تھا۔ میں نے اس سے درخواست کی تھی کہ میری امت کو (عمومی) غرق (کے عذاب) سے ہلاک نہ کرے (جیسا کہ حضرت نوح کی امت کے ساتھ کیا) اللہ نے میری یہ دعا قبول کر لی۔ میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ میری امت کو (عمومی) قحط سے ہلاک نہ کرے اس نے میری یہ دعا بھی قبول فرمائی۔ میں نے سوال کیا کہ میری امت کو باہم جنگ کے عذاب میں مبتلا نہ کرے اللہ نے میری یہ دعا نہ مانی۔ رواہ البغوی۔

عبد اللہؓ بن عبد الرحمٰن انصاری کا بیان ہے کہ حضرت عبد اللہؓ بن عمرؓ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مسجد میں تین دعائیں کیں اللہ نے دو دعائیں تو قبول فرمالیں اور ایک دعا رد فرمادی۔ حضور ﷺ نے اللہ سے دعا کی کہ میری امت پر کسی غیر دشمن کو مسلط نہ فرمائے کہ وہ سب پر چیرہ دستی کرے، اللہ نے یہ دعا قبول فرمالی۔ حضور ﷺ نے دعا کی کہ سب امت کو (عمومی پیہم) قحط سالیوں سے ہلاک نہ کرے، اللہ نے یہ دعاء بھی قبول فرمالی۔ حضور ﷺ نے دعا کی کہ امت کو باہم خانہ جنگی میں مبتلا نہ کرے، اللہ نے یہ دعا قبول نہیں فرمائی۔ رواہ البخاری۔

ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم کا بیان نقل کیا ہے کہ جب آیت قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ الخ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے بعد لوٹ کر کافر نہ ہو جانا کہ باہم ایک دوسرے کی گردن تلوار سے مارنے لگو۔ صحابہؓ نے عرض کیا ہم شہادت دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں (کیا اس شہادت کے باوجود ہم ایسا کر سکتے ہیں) ایک شخص بولا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا یعنی ہم سب مسلمان ہیں پھر ایک دوسرے کی گردن ماریں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝ (آپ دیکھئے تو ہم کس طرح دلائل مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں، شاید وہ سمجھ جائیں) یعنی وعد و وعید کے مختلف پہلوؤں سے دلائل بیان کرتے ہیں۔

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ (اور آپ کی قوم (یعنی کفار قریش اس) عذاب یا قرآن کی تکذیب کرتی ہے)۔
وَهُوَ الْحَقُّ (حالانکہ وہ یقینی ہے) یعنی واقعی حقیقت ہے یا سچ ہے۔
قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۶۶﴾ (آپ کہہ دیجئے کہ میں (اللہ کی طرف سے) تم پر تعینات نہیں کیا گیا ہوں یعنی اس کا ذمہ دار نہیں بنایا گیا ہوں کہ تم پر اسلام کو چمٹا دوں یا اگر تم انکار کردو تو سزا دے دوں۔
لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ (ہر خبر کے وقوع کا ایک وقت ہے) یعنی قرآن نے جو کافروں کے عذاب میں مبتلا ہونے کی خبریں دی ہیں، ان میں سے ہر خبر کا وقوع مقرر ہے جس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔
وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾ (اور جلد ہی تم کو معلوم ہو جائے گا) جب کہ دنیا میں یا آخرت میں اس خبر کا ظہور ہو جائے گا۔
وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ (اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیات میں عیب جوئی کر رہے ہوں تو ان سے کنارہ کش ہو جاؤ) یعنی ان کے پاس سے اٹھ جاؤ ان کے ساتھ نہ بیٹھو۔ اس آیت کی غرض کفار کے دین اور ان کی ہم نشینی سے الگ رکھنا ہے، ترک جہاد مقصود نہیں ہے کہ اس کو (آیت قتال سے) منسوخ قرار دینا پڑے (یعنی اگر اعراض اور تعلق نہ رکھنے کا مفہوم یہ مانا جائے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، ان سے کچھ تعرض نہ کرو تو لامحالہ ترک قتال کا حکم اس سے مستفاد ہو گا اور پھر آیت قتال سے اس کو منسوخ ماننا پڑے گا)۔
حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ (اس وقت تک کہ وہ (آیات میں عیب جوئی کو چھوڑ کر) کسی اور بات میں لگ جائیں)۔ غَیْرِہٖ کی ضمیر معنی آیات کی طرف راجع ہے جو (مفرد مذکر ہے اور حقیقت میں) قرآن ہے۔ قریش اپنی مجالس میں بیٹھ کر آیات قرآنی کی تکذیب کرتے ان میں نکتہ چینی کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ (ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کی ممانعت اس آیت میں کی گئی۔
وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۸﴾ اور اگر (یہ حکم ممانعت) شیطان تم کو بھلا دے تو یاد آنے کے بعد پھر ایسے ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو) بجائے ضمیر غائب کے اَلظّٰلِمِیْنَ کا لفظ صراحت کے ساتھ لانا بتا رہا ہے کہ یہ لوگ بڑی بیجا حرکت کرتے ہیں کہ بجائے تصدیق کے تکذیب اور استہزاء کرتے ہیں۔

بغویؒ نے لکھا ہے روایت میں آیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب آیت مذکورہ نازل ہوئی تو مسلمانوں نے کہا ہم کعبہ میں کس طرح بیٹھیں اور کیونکر طواف کریں، مشرک تو وہاں ہمیشہ ہی آیات میں عیب جوئی کرتے رہتے ہیں۔ دوسری روایت میں آیا کہ مسلمانوں نے کہا اگر ہم ان کو یوں ہی چھوڑ دیں اور عیب جوئی سے منع نہ کریں تو ہم کو گناہ کا اندیشہ ہے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔
وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى (اور جو لوگ احتیاط رکھتے ہیں (یعنی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ) ان پر ان (مشرکوں) کی باز پرس کا کوئی اثر نہیں پہنچے گا ہاں ان (مسلمانوں) کے ذمہ نصیحت کر دینا ہے) مِنْ حِسَابِہِمْ میں مِنْ تبعیض کے لئے ہے اور ضمیر کفار کی طرف راجع ہے۔ مِنْ شَیْءٍ میں مِنْ زائد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافروں سے ان کے گناہوں کا جو محاسبہ و مواخذہ ہو گا اس کا کوئی حصہ مسلمانوں کو نہیں چمٹ جائے گا۔ وَلٰکِنْ ذِکْرٰی کا یہ مطلب ہے کہ اگر مسلمانوں میں طاقت و استطاعت ہو تو بقدر استطاعت خَوْض فِی الْاٰیَات اور دوسری برائیوں سے منع کرنے کی ذمہ داری مسلمانوں کی ہے۔
لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۶۹﴾ (شاید وہ بھی احتیاط کرنے لگیں)۔ یعنی مسلمانوں کے نصیحت کرنے سے شاید کافر نصیحت پذیر ہو جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لَعَلَّہُمْ کی ضمیر اَلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ کی طرف راجع ہو۔ اس وقت مطلب اس طرح ہو گا تا کہ مسلمان تقویٰ پر جمے رہیں۔
وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا (اور ایسے لوگوں سے بالکل کنارہ کش رہو جنہوں

نے اپنے دین کو کھیل کود بنا رکھا ہے)۔

یعنی ایسا مذہب اختیار کیا ہے جو نہ دنیا میں ان کے لئے سود مند ہے نہ آخرت میں نفع بخش جیسے بت پرستی اور بحیرہ وسائبہ کو حرام بنا رکھنا یا یہ مطلب ہے کہ جس دین کو قبول کرنے کا ان کو حکم دیا گیا ہے اس کو ہنسی کھیل سمجھ رکھا ہے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ نے ہر قوم کا ایک تہوار کا دن بنا دیا تھا پس ہر قوم نے سوائے مسلمانوں کے اپنے تہوار کو لہو و لعب بنا لیا مگر مسلمانوں نے اپنے تہوار کو عبادت کا دن قائم رکھا جیسے عید اور جمعہ کی نماز، تکبیرات، قربانی، صدقہ، فطر خطبہ نصیحت وغیرہ۔ ذَرِ الَّذِیْنَ کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اقوال و افعال کی پرواہ نہ کرو۔ یہ کیا کہتے ہیں، کیا کرتے ہیں، سب سے کنارہ کش رہو۔ یا ذَرْ سے مراد ہے دھمکی دینا اور ڈرانا جیسے دوسری آیت میں آیا ہے ذَرْنِیْ وَ مَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا۔

بعض علماء کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ ان سے تعرض نہ کرو، ان کے معاملہ میں دخل دینے سے باز رہو۔ اس صورت میں آیت قتال سے اس آیت کا حکم منسوخ قرار دیا جائے گا۔

وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (اور دنیوی زندگی نے ان کو فریب دے رکھا ہے) یہاں تک کہ وہ حشر ونشر کے منکر ہو گئے۔

وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ

(اور اس قرآن کے ذریعہ سے نصیحت کرتے رہو تاکہ کوئی شخص اپنے کردار کے سبب اس طرح نہ پھنس جائے کہ کوئی غیر اللہ نہ اس کا مددگار ہو، نہ سفارشی) تُبْسَلَ سے پہلے لا محذوف ہے یعنی لِئَلَّا تُبْسَلَ (تاکہ پھنس نہ جائے) بَسْلٌ کا معنی ہے بند کر رکھنا روک رکھنا۔ قاموس۔ ولی مددگار جو قوت سے عذاب کو دفع کر سکے شفیع سفارشی جو سفارش کر کے عذاب سے بچالے۔

وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۚ (اور (یہ کیفیت ہو کہ) اگر دنیا بھر کا بھی معاوضہ دے ڈالے تب بھی اس سے قبول نہ ہو) چونکہ اس آیت میں عدل مصدری معنی میں ہے اس لئے لَا يُؤْخَذْ کی ضمیر اس کی طرف راجع نہیں ہو سکتی، ہاں آیت لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ میں چونکہ عدل بمعنی اسم مفعول ہے اس لئے لَا يُؤْخَذُ کی نسبت اس کی طرف صحیح ہے۔ عدل کا معنی ہے فدیہ، معاوضہ۔ عدل اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ مفدی (جس کا معاوضہ دیا جائے) کے برابر ہوتا ہے۔ كُلَّ عَدْلٍ مفعول مطلق ہے (یعنی عدل بمعنی معدول نہیں ہے)۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝ ع ۱۴

(یہ ایسے ہی ہیں کہ اپنے کردار کے سبب پھنس گئے۔ ان کے لئے نہایت تیز پانی پینے کو ہوگا اور دردناک عذاب ہوگا اپنے کفر کے سبب اُولٰئِکَ سے اشارہ ان ہی لوگوں کی طرف ہے جنہوں نے دین کو لہو و لعب بنا رکھا ہے اُبْسِلُوْا یعنی حبس کر دیئے گئے اور ان کو عذاب کے سپرد کر دیا گیا۔ حَمِیْم انتہائی گرم پانی۔ عَذَابٌ اَلِیْمٌ آگ وغیرہ کا عذاب۔ بِمَا كَانُوْا میں با سببیہ ہے۔ یہ از سر نو جملہ ہے یا اُولٰئِکَ کی دوسری خبر ہے۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ

(آپ کہہ دیجئے کیا ہم اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی پوجا کریں جو ہم کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکتیں (اگر ہم ان کی پوجا کریں) اور نقصان نہیں پہنچا سکتیں (اگر ہم ان کی پوجا نہ کریں اور ان کو نہ مانیں) اور اپنی ایڑیوں کے بل (شرک کی طرف کو) لوٹ جائیں (جس پر ہم پہلے تھے) بعد اس کے کہ اللہ نے ہم کو (وحی کے ذریعہ سے) ہدایت کر دی (اور شرک سے بچا لیا اور اسلام کی نعمت عطا فرما دی)

كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۗ

(جیسے کوئی شخص ہو کہ اس کو شیطان نے کہیں بیابان میں بے راہ کر دیا ہو اور وہ بھٹکتا پھرتا ہو اس کے کچھ ساتھی ٹھیک راستہ کی طرف اس کو بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آجا)۔ اِسْتَهْوَتْ (واحد مؤنث) باب استفعال۔ مجرد هَوٰی یَهْوِیْ هویٰ کا معنی ہے "گیا"۔ اِسْتَهْوَتْهُ اس کو لے جانا چاہا ہو لے گئے ہوں۔ کَالَّذِیْ میں کاف محل نصب میں ہے خواہ اس کو مفعول مطلق قرار دیا جائے یا نُرَدُّ کی ضمیر سے حال۔ اول صورت میں ترجمہ ہو گا کہ کیا ہم شرک کی طرف لوٹ جائیں اس طرح جیسے وہ شخص لوٹ جاتا ہے جس کو شیطانوں نے بے راہ کر دیا ہو، دوسری صورت میں ترجمہ ہو گا کیا ہم شرک کی طرف لوٹ جائیں اس شخص سے مشابہت رکھتے ہوئے جس کو الخ۔

شیاطین سے مراد ہیں سرکش جنات۔ اَلْاَرْض سے مراد بیابان یعنی راستہ سے بہکا کر مقامات ہلاکت کی طرف لے گئے ہوں۔ حَیْرَانَ، اِسْتَهْوَتْهُ کی مفعولی ضمیر سے حال ہے یعنی اس حال میں کہ وہ بھٹکتا ہوا متحیر پھر رہا ہو، اس کی سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کہاں جائے اور کیا کرے۔ اَلْهُدٰی مصدر ہے بمعنی اسم مفعول یعنی سیدھا راستہ اِئْتِنَا، یَدْعُوْنَهٗ کی تشریح ہے۔ یَدْعُوْنَ کے اندر قول کے معنی ہیں یعنی اس کے ساتھی اس سے کہہ رہے ہوں کہ ہمارے پاس آجا اور وہ قبول نہ کرے ان کے پاس نہ آئے۔

جو شخص راہ اسلام سے بھٹک گیا ہو اور مسلمان ان کو اسلام کی طرف بلا رہے ہوں مگر وہ دعوت کی طرف توجہ نہ کرے۔ اللہ نے اس شخص کی تشبیہ اس آدمی سے دی جس کو جنگل میں شیطانوں نے بے راہ کر دیا ہو، ساتھی اس کو راستہ کی طرف بلا رہے ہوں مگر وہ نہ آتا ہو۔

اَنَدْعُوْا میں استفہام انکاری ہے یعنی ہم اب ایسا نہیں کریں گے اور پورا تشبیہی جملہ نُرَدُّ کی ضمیر سے حال ہے۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی (آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی ہدایت (یعنی اسلام) ہی حقیقت میں ہدایت ہے) اس کے سوا ہر طریقہ گمراہی ہے۔

وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۱﴾ وَاَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ (اور ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم پروردگار عالم کے پورے مطیع ہو جائیں اور یہ (بھی حکم ہوا ہے) کہ نماز کی پابندی کرو اور اس سے ڈرو)۔ لِنُسْلِمَ میں لام زائد ہے یا ب کے معنی میں اور اَنْ مقدر ہے اس لئے فعل بمعنی مصدر ہے یا لام تعلیلیہ ہے اور اُمِرْنَا کا مفعول محذوف ہے۔ مطلب اس طرح ہو گا ہم کو اتباع رسول کا حکم دیا گیا تا کہ ہم رب العالمین کے مطیع ہو جائیں۔ اللہ تک پہنچنا اور اس کا مطیع ہونا اتباع رسول ﷺ پر موقوف ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ (اور وہی ہے جس کے پاس تم سب جمع کئے جاؤ گے)۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (اور وہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو باقاعدہ پیدا کیا) بِالْحَقِّ کا معنی ہے حکمت کے ساتھ۔ یا حق بمعنی محق ہے یعنی بر حق واقعی یا باء بمعنی لام ہے یعنی اظہار حق کے لئے پیدا کیا۔

وَیَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ (اور جس روز وہ (کسی چیز کو) فرمائے گا ہو جا وہ فوراً ہو جائے گی) یعنی جب (مردہ) مخلوق سے فرمائے گا اٹھ کھڑے ہو فوراً سب اٹھ کھڑے ہوں گے۔

قَوْلُهُ الْحَقُّ (اس کا کہنا با اثر ہے) اَلْحَقُّ سے مراد ہے سچا۔

وَلَهُ الْمُلْكُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ (اور ساری خالص حکومت اسی کی ہو گی جس روز صور میں پھونک ماری جائے گی) دوسری آیت میں بھی یہی مضمون آیا ہے فرمایا ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ صور نر سنگھا جس کو پھونکا جائے گا اور اعرابی نے جب صور کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ نے یہی فرمایا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت سے ابن مبارک نے الزہد میں اور بیہقی نے البعث میں اس کو بیان کیا ہے نسائی نے بھی اس کو

نقل کیا ہے اور ابن حبان نے نقل کرنے کے بعد اس کو صحیح اور ابو داؤد نے حسن کہا ہے۔

ابو الشیخ ابن حبان نے کتاب العظمۃ میں وہب بن منبہ کی روایت سے لکھا ہے کہ اللہ نے صور کو بلور کی طرح جھلکتے ہوئے سفید موتی سے بنایا، پھر عرش سے فرمایا، صور کو پکڑ لے فوراً صور عرش سے لٹک گیا پھر اللہ نے فرمایا ہو جا، فوراً اسرافیل پیدا ہو گئے اللہ نے اسرافیل کو صور لے لینے کا حکم دیا اسرافیل نے صور کو پکڑ لیا، صور میں ہر پیدا شدہ روح اور موجود کردہ جان کی گنتی کے برابر سوراخ ہیں۔ دو روحیں ایک سوراخ سے نہیں نکلیں گی۔ صور کے وسط میں اتنا بڑا دہانہ ہے جیسے آسمان زمین کا گول چکر، اسرافیل اس دہانہ پر اپنا منہ رکھے ہوئے ہے۔ پھر اللہ نے اسرافیل سے فرمایا میں نے صور پھونکنے اور چیخ مارنے کی ڈیوٹی تیری مقرر کر دی ہے چنانچہ اسرافیل نے عرش کے اگلے حصے میں داخل ہو کر دلیاں پاؤں عرش کے نیچے داخل کر کے بایاں قدم آگے بڑھا رکھا ہے اور پیدائش کے بعد سے کبھی پلک نہیں ماری حکم کا انتظار کر رہا ہے۔ احمد اور طبرانی نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت زید بنؓ ارقم کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے کیسے چین ہو صور والا تو سینگ منہ میں دبائے پیشانی جھکائے اور کان لگائے تیار ہے کہ کب اس کو حکم ملے۔ یہ سن کر صحابہ سخت متاثر ہوئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہو حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ اسی طرح احمد نے اور مستدرک میں حاکم نے اور البعث میں بیہقی نے اور الاوسط میں طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بھی نقل کیا ہے اس روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہو حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ترمذی اور حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بھی حدیث اس طرح نقل کی ہے اور ابو نعیم نے حضرت جابر کی روایت سے بھی یہی لکھا ہے۔

بزاز اور حاکم نے حضرت ابو سعیدؓ خدری کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر صبح کو (یعنی روزانہ) دو فرشتے جن کی ڈیوٹی صور پر ہے منتظر ہیں کہ کب ان کو حکم ہو اور وہ صور میں پھونک ماریں۔ ابن ماجہ اور بزاز کی یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا دونوں صور والوں کے ہاتھوں میں دو سینگ ہیں دونوں تک رہے ہیں کہ کب ان کو (صور پھونکنے) کا حکم ملتا ہے۔ حاکم نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں (صور) پھونکنے والے دوسرے آسمان میں ہیں ایک کا سر مشرق میں اور پاؤں مغرب میں اور دوسرے کا سر مغرب میں اور پاؤں مشرق میں ہے۔ دونوں منتظر ہیں کہ کب ان کو صور پھونکنے کا حکم ہو اور وہ پھونکیں۔ ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صور پھونکنے والے دو فرشتے ہیں جن کے پاس دو نرسنگھے ہیں۔

طبرانی نے حسن سند کے ساتھ کعب احبار کی روایت سے ایک حدیث اس طرح نقل کی ہے صور کا فرشتہ ایک زانو ٹیکے دوسرا کھڑا کئے صور منہ میں دبائے پشت جھکائے تیار ہے اس کو حکم دیا گیا ہے کہ جونہی اسرافیل کو وہ دونوں بازو سمیٹے دیکھے فوراً صور میں پھونک مار دے۔ یہی حدیث حضرت عائشہؓ کی روایت سے بھی آئی ہے، اس روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے (یعنی حضرت عائشہؓ کی روایت مرفوع ہے) شیخ ابن حجرؒ نے کہا یہ حدیث دلالت کر رہی ہے کہ صور پھونکنے والا اسرافیل کے علاوہ کوئی اور ہے اس لئے (متضاد روایات میں توافق پیدا کرنے کے لئے) کہا جائے گا کہ صاحب صور جب اسرافیل کو دونوں بازو سمیٹے دیکھے گا تو پہلا صور پھونکے گا پھر مردوں کو قبروں سے اٹھانے کے لئے دوبارہ اسرافیل صور پھونکے گا۔

ابو الشیخ ابن حبان نے کتاب العظمۃ میں ابو بکر ہذلی کا قول نقل کیا ہے کہ فرشتہ صور جس کے متعلق صور کی ڈیوٹی ہے اس کا ایک قدم زمین میں ہے اور وہ ایک زانو ٹیکے آنکھیں اسرافیل کی طرف اٹھائے تک رہا ہے۔ جب سے اللہ نے اس کو پیدا کیا کبھی اس نے پلک نہیں ماری انتظار میں ہے کہ کب اس کو اشارہ ہو اور وہ صور پھونکے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ (وہ جاننے والا پوشیدہ چیزوں کا ظاہر چیزوں کا)۔ غیب سے مراد غیر موجود (یعنی جو ابھی معدوم ہے) اور شہادت سے مراد موجود (یعنی جو پیدا ہو چکا ہے) کیونکہ ہر موجود اللہ کے سامنے ہے اس سے آسمان و

زمین کا کوئی ذرہ چھپا ہوا نہیں۔

وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ (وہ ہی حکمت والا اور خبر رکھنے والا ہے) یعنی موجود و معدوم کرنے کی حکمت سے واقف ہے اور حساب، سزا جزا اور مخلوق کے تمام احوال سے باخبر ہے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ (اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا)۔ آزر عجمی نام ہے۔ علمیت اور عجمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے (اس پر کسرہ اور تنوین نہیں آتا) بعض نے اس کو عربی لفظ کہا ہے اور ازر بمعنی قوت یا وزر بمعنی ثقل سے مشتق قرار دیا ہے اس وقت اس کے عدم انصراف کی وجہ یہ ہے کہ اس میں علمیت اور وزن فعل ہے۔

صحیح تحقیق یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیمؑ کا چچا تھا عرب چچا کو بھی باپ کہہ لیتے ہیں (اس لئے اس جگہ باپ کہا گیا) جیسے اس آیت میں آیا ہے نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَإِلَهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَهًا وَاحِدًا آزر کا اصل نام ناخور تھا۔ ناخور پہلے اپنے آباؤ اجداد کے دین توحید پر تھا لیکن نمرود کا وزیر ہونے کے بعد دین توحید چھوڑ کر دنیوی لالچ میں کافر ہو گیا۔ امام رازی نے بھی صراحت کی ہے کہ آزر ابراہیمؑ کا چچا تھا باپ نہ تھا۔ امام رازی سے پہلے بھی سلف کی ایک جماعت کا یہی قول تھا۔ زرقانی نے شرح المواہب میں لکھا ہے کہ آزر کے عم ابراہیمؑ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ شہاب ہیثمی نے صراحت کی ہے کہ توریت وانجیل والوں نے نیز تمام اہل تاریخ نے اس کو ابراہیم کا چچا مانا ہے۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ ہم کو سندوں کے ساتھ یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت ابن عباس، مجاہد، ابن جریر اور سدی قائل تھے کہ آزر ابراہیمؑ کا باپ نہ تھا۔ ابراہیمؑ کے باپ کا نام تو مارخ تھا۔ سیوطی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن المنذر کی تفسیر میں مجھے ایک اثر (قول صحابی) ملا ہے کہ آزر ابراہیمؑ کا چچا تھا۔

قاموس میں ہے آزر ابراہیمؑ کا چچا تھا، باپ تارخ یا تارح تھا یا دونوں نام ایک ہی شخص کے تھے۔ آزر کے باپ نہ ہونے کی تائید اس تشریح سے ہوتی ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ کی تفسیر کے ذیل میں ہم نے کی ہے کہ صحیح روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُونِ بَنِي آدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا حَتَّى كُنْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِي كُنْتُ مِنْهُ۔ رواہ البخاری۔

(اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام آباؤ اجداد موحد گذرے ہیں کوئی مشرک نہیں ہوا اور آزر مشرک تھا اس لئے حضرت ابراہیمؑ کا چچا ہو سکتا ہے باپ نہیں ہو سکتا) سیوطی نے حضرت آدمؑ تک رسول ﷺ کے آباؤ اجداد کو مسلم ثابت کرنے کے لئے چند رسائل لکھے ہیں۔ محمد بن اسحٰق، ضحاک اور کلبی کا بیان ہے کہ آزر ابراہیمؑ کے باپ کا نام تھا اسی کا نام تارخ بھی تھا جیسے اسرائیل و یعقوب دونوں ایک ہی شخص کے نام تھے۔ مقاتل ابن حبان نے ابراہیمؑ کے باپ کا لقب آزر اور نام تارخ قرار دیا ہے۔

بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیمؑ کی ملاقات اپنے باپ آزر سے ہو گی۔ آزر کا چہرہ غبار آلود اور دخان آگیں ہو گا (جو دوزخی ہونے کی علامت ہو گی) حضرت ابراہیمؑ فرمائیں گے کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ میری نافرمانی نہ کر۔ حضرت ابراہیمؑ کا باپ جواب دے گا آج میں تیرے حکم کے خلاف نہیں کروں گا۔ حضرت ابراہیمؑ دعا کریں گے اے میرے مالک تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جس روز لوگوں کو اٹھایا جائے گا اس روز تو مجھے رسوا نہ کرے گا مگر میرے باپ کی یہ حالت ہے اس سے زیادہ رسوائی اور کیا ہو گی۔ اللہ فرمائے گا میں نے کافروں کے لئے جنت حرام کر دی ہے۔ پھر حکم ہو گا ابراہیمؑ اپنے قدموں کے نیچے دیکھو ابراہیمؑ حکم کی تعمیل کریں گے تو ایک بزبجو گوبر اور کیچڑ میں لتھڑا ہوا دکھائی دے گا، پھر اس کی ٹانگیں پکڑ کر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا واللہ اعلم (اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آزر حضرت ابراہیمؑ کا باپ تھا) سلیمان تیمی نے کہا آزر کے معنی ہے ٹیڑھا یہ ایک برا کلمہ ہے۔ بعض نے کہا فارسی میں اس کا معنی ہے پیر فرتوت۔ اس قول پر یہ لفظ فارسی قرار پائے گا اور چونکہ اس کے دوسرے ہم وزن (اسماء) غیر منصرف ہیں ان کی مشابہت وزنی کی وجہ سے اس کو بھی غیر منصرف پڑھا گیا۔ اول قول (یعنی علم ہونا) زیادہ صحیح ہے۔ سعید بن مسیب اور مجاہد نے کہا آزر بت کا نام تھا

چونکہ یہ شخص اس بت کا پرستار تھا اس لئے اس کو آزر کہا جانے لگا یا یوں کہا جائے کہ آزر اصل میں عبد آزر تھا لفظ عبد کو حذف کر دیا گیا اگر آزر کو بت کا نام مانا جائے گا تو آزر کو نصب دینے والا ایک فعل مضمر ماننا ہوگا جس کی تفسیر آئندہ فعل مذکور کر رہا ہے۔

اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً (یعنی کیا تو آزر کی پوجا کرتا ہے) کیا اس کو معبود بناتا ہے اور چونکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ابراہیمؑ کا باپ صرف آزر کی پوجا پر بس نہیں کرتا تھا بلکہ دوسرے بتوں کو بھی معبود بناتا تھا اس لئے تَتَّخِذُ کے بعد اَصْنَامًا اٰلِهَةً فرما دیا۔

اِنِّیْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ (میں تجھ کو اور تیری قوم کو (یعنی تیرے ہم مذہب لوگوں کو) دیکھتا ہوں)۔

فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۷۴﴾ (کھلی ہوئی گمراہی میں)۔

وَكَذٰلِكَ (اور اسی طرح) یعنی جس طرح اہل زمانہ کے خلاف ہم نے ابراہیمؑ کو حق دکھا دیا تھا اسی طرح۔

نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ہم ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین میں اپنی حکومت کا مشاہدہ کراتے تھے) نری میں گذشتہ حال کی حکایت کی گئی ہے (اس لئے حال کا صیغہ استعمال کیا) قاموس میں ہے ملکوت بروزن رہبوت و ترقوت غلبہ اور اقتدار یہ لفظ ملک سے مشتق ہے واؤ اور تاء مبالغہ کی ہے، اس لئے ملک سے زیادہ مَلَكُوْت کے معنی میں عظمت ہے (بڑی حکومت بڑا اقتدار) صحاح جوہری میں ہے کہ ملکوت صرف اللہ کی حکومت کو کہا جاتا ہے (کیونکہ اسی کی حکومت سب سے بڑی حکومت ہے) ملکوت کی اضافت اَلسَّمٰوٰت کی طرف اضافت الی المفعول ہے یعنی آسمان و زمین پر اللہ کا غلبہ و اقتدار۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا مَلَكُوْتُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے مراد ہیں آسمان و زمین میں (اللہ کی قدرت و حکومت کی) نشانیاں۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ کو ایک پتھر پر کھڑا کیا گیا اور وہاں پردے اٹھا دیئے گئے تمام آسمان و زمین یہاں تک کہ عرش بریں اور اسفل السافلین سب ہی کا مشاہدہ کرا دیا گیا، انتہا یہ کہ آپؑ نے بہشت کے اندر اپنی جگہ بھی دیکھ لی۔ یہی مطلب ہے آیت وَاٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا کا یعنی ہم نے ابراہیمؑ کو ان کی بہشتی جگہ (دنیا میں ہی) دکھا دی۔

حضرت سلمانؓ کا بیان ہے اور بعض اہل روایت نے اس کی نسبت حضرت علیؓ کی طرف بھی کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب آسمان و زمین میں اللہ کی قدرت و حکومت دکھائی گئی تو دوران مشاہدہ میں آپ نے دیکھا کہ ایک مرد ایک فاحشہ عورت پر سوار ہے، آپ نے بددعا کی وہ فوراً ہلاک ہو گیا۔ پھر دوسرے شخص کو بھی اسی حالت میں دیکھا اور بددعا کی وہ بھی ہلاک ہو گیا۔ پھر تیسرے شخص کی بھی یہی حالت دیکھی اور جونہی بددعا کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ نے فرمایا ابراہیمؑ تو مقبول الدعوات ہے میرے بندوں کے لئے بددعا نہ کر، میرا تعلق اپنے (گناہ گار) بندوں سے تین طرح کا ہے یا تو وہ (گناہ کے بعد) توبہ کر لیتا ہے تو میں اس کی توبہ قبول کر لیتا ہوں یا اس کی نسل سے کوئی ایسا شخص پیدا کرتا ہوں جو میری عبادت کرتا ہے یا (اسی گناہ گار ہونے کی حالت میں) اس کو میرے پاس لایا جاتا ہے اور میں اپنی مشیت کے مطابق اس کو معاف کر دیتا ہوں یا سزا دیتا ہوں۔ گناہ گار بندوں سے میرے یہ ہی تین سلوک ہوتے ہیں۔ دوسری روایت میں آیا ہے اگر وہ منہ پھیرتا ہے تو اس کے پیچھے جہنم موجود ہے (جس میں اس کو داخل کر دیا جائے گا)۔

قتادہؒ نے کہا مَلَكُوْتُ السَّمٰوٰتِ چاند اور ستارے ہیں اور مَلَكُوْتُ الْاَرْضِ پہاڑ درخت اور سمندر۔

وَلِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ ﴿۷۵﴾ (اور تاکہ وہ (عینی) یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے) اس جملہ کا عطف فعل محذوف پر ہے یعنی دیکھنے کے بعد وہ استدلال کرے اور مشاہدہ کے بعد عینی یقین کرے جیسا کہ اس کو اس سے پہلے بصیرت کی روشنی میں اللہ کی طرف سے یقین عطا فرمایا گیا تھا (اب بصر کی روشنی سے دیکھ کر صاحب یقین ہو جائے)

یا یوں مطلب کہا جائے کہ ہم نے ایسا اس لئے کیا کہ ابراہیمؑ شہودی یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا (جب اسی پر رات (کی تاریکی) چھا گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا) یعنی زہرہ یا مشتری۔

قَالَ هٰذَا رَبِّيْ (تو کہا یہ میرا رب ہے) کافر بتوں اور ستاروں کی پوجا اور تعظیم کرتے تھے اور عقیدہ رکھتے تھے کہ تمام کام انہی کے ہاتھ میں ہیں حضرت ابراہیمؑ نے چاہا کہ اس گمراہی پر ان کو متنبہ کریں اور دلیل و برہان کے ساتھ راہ حق دکھائیں اس لئے هٰذَا رَبِّيْ فرمایا یعنی تمہارے خیال میں یہ میرا رب ہے یا هٰذَا سے پہلے ہمزہ استفہام محذوف ہے یعنی کیا یہ میرا رب ہے یا ازراہ فرض یہ جملہ فرمایا یعنی بفرض محال یہ میرا رب ہے۔ اول مخالفوں کا مفروضہ بیان کیا تاکہ آگے ان کے قول کی تردید کی جائے۔ بعض علماء کے نزدیک جملہ کا ظاہری معنی ہی مراد ہے کسی تاویل کی ضرورت نہیں کیونکہ اس بات کو کہنے کے وقت حضرت ابراہیمؑ طالب توحید اور خواست گار ہدایت تھے (ہدایت یافتہ اور پختہ کار نہ ہوئے تھے) استدلال کے موقع پر ایسا کلمہ زبان سے نکالنا کوئی جرم نہ تھا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس وقت بچہ تھے مکلف نہ ہوئے تھے اس لئے یہ کلمۂ کفر نہ تھا۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ وہ زمانہ آپ کے عنفوان یا آغاز بلوغ کا تھا۔ شرح خلاصۃ السیر میں مولانا ابو بکر نے لکھا ہے کہ چاند ستاروں سے استدلال کے وقت حضرت ابراہیمؑ پندرہ مہینے کے تھے لیکن (یہ تمام اقوال غلط ہیں) صحیح پہلا ہی قول ہے کہ (جملہ استفہامیہ یا فرضیہ ہے) کیونکہ ہر پیغمبر ہر وقت موحد ہوتا ہے، کبھی کسی وقت مشرک نہیں ہو سکتا ایسا شرکیہ قول اس شخص سے کیسے سرزد ہو سکتا ہے جس کو اللہ نے معصوم و طاہر بنایا تھا اور سن رشد سے پہلے ہی اس کو رشد یافتہ کر دیا تھا۔ قاضی عیاض کی شفاء میں ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ یعنی بچپن کے زمانہ میں ہی ہم نے ابراہیم کو ہدایت یافتہ بنا دیا تھا۔ مجاہد وغیرہ نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔ ابن عطاء نے کہا پیدا کرنے سے پہلے ہی ان کو چن لیا تھا۔ بعض روایات میں آیا ہے حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تو اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ نے آکر کہا اللہ کو دل سے پہچانو اور زبان سے اس کی یاد کرو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا یہ تو میں نے کر لیا۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں ایسا کروں گا (یعنی مضارع کا صیغہ نہیں بولا ماضی کا صیغہ فرمایا یہی وہ رشد تھا (جو اللہ نے پہلے سے ہی آپ کو عطا کر دیا تھا) اس آیت میں فَلَمَّا جَنَّ کا عطف قَالَ پر ہے اور ف تعقیبیہ ہے اور كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ الخ جملہ معترضہ ہے گویا اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ فرمانے کے بعد ہی آپ نے چاند و ستاروں کے غروب سے اللہ کی ربوبیت پر استدلال کیا تھا اور اگر اس کلام کو بطریق استدلال قرار دیا جائیگا تو فاء تفصیل کے لئے ہو گی اور یہ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ الخ کی تشریح و تفسیر ہو جائے گی اس صورت میں اس کلام کا وقت وہ ہو گا جب عقل و شعور کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد پہلی مرتبہ آپ نے ستارہ دیکھا جو کبھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس تفسیر کی بنیاد کے طور پر اہل روایت ایک قصہ بیان کرتے ہیں جس کی تفصیل یہ ہے کہ نمرود بن کنعان (عراق کا بادشاہ تھا اسی) نے سب سے پہلے اپنے لئے تاج بنوایا اور لوگوں کو اپنی پوجا کرنے کا حکم دیا اس کے دربار میں کچھ جوگی اور نجومی بھی تھے ان جوگیوں اور نجومیوں نے ایک بار نمرود سے کہا اس سال آپ کے ملک میں ایک لڑکا پیدا ہو گا جو اس ملک کے رہنے والوں کا مذہب تبدیل کر دے گا اور آپ کی جان اور حکومت اس کے ہاتھوں سے تباہ ہو جائے گی۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ سابق انبیاء کی کتابوں میں انہوں نے ایسا لکھا پایا تھا۔ سدی کا بیان ہے کہ نمرود نے ایک خواب دیکھا تھا کہ ایک ستارہ ایسا طلوع ہوا جس کی روشنی کے سامنے چاند سورج کی روشنی جاتی رہی۔ نمرود اس خواب سے گھبرا گیا جادوگروں اور جوگیوں کو طلب کر کے اس کی تعبیر پوچھی، تعبیر دینے والوں نے کہا اس سال آپ کی طرف ایک لڑکا پیدا ہو گا جو آپ کی اور آپ کے گھر والوں کی ہلاکت اور آپ کی سلطنت کے زوال کا باعث ہو گا۔ نمرود نے یہ سن کر حکم دے دیا کہ اس سال اس کے ملک میں جو لڑکا پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے اور آئندہ مرد عورتوں سے الگ رہیں اور ہر دس آدمیوں پر ایک نگران مقرر کر دیا جائے۔ ایام ماہواری کے زمانہ میں مردوں کو عورتوں سے اختلاط کی اجازت تھی کیونکہ حیض کی حالت میں وہ لوگ قربت صنفی نہیں کرتے تھے اور جب عورتیں پاک ہو جائیں تو مرد عورت کا اختلاط ممنوع ہو جاتا۔ ایک روز آزر جو اپنی بیوی کے پاس گیا اور اس کو پاکی کی حالت میں پایا تو قربت کر بیٹھا اور حضرت ابراہیمؑ کا حمل قرار پا گیا۔

محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ نمرود نے ہر حاملہ عورت کے پاس ایک نگراں مقرر کر رکھا تھا جو عورت کو اپنے پاس روکے رہتا تھا۔ البتہ حضرت ابراہیمؑ کی والدہ چونکہ کم سن تھیں اور ان کے پیٹ کے اندر حمل کی علامت نمایاں نہ تھی اس لئے ان پر کوئی نگراں مسلط نہ تھا۔ سدی نے ذکر کیا ہے کہ موعود بچہ کی پیدائش کے ڈر سے نمرود تمام مردوں کو لشکر گاہ میں لے کر چلا گیا تھا اور اس طرح مردوں کو عورتوں سے الگ کر دیا تھا کچھ مدت تک اسی حالت پر رہا، پھر شہر میں آنے کی اس کو کوئی ضرورت پڑی اور سوائے آزر کے اس کو کوئی اور شخص نظر نہ آیا جس کو شہر میں (اپنی جگہ) بھیجنے پر اس کو اطمینان ہوتا مجبوراً آدمی بھیج کر آزر کو بلوایا آزر آگیا تو نمرود نے اس سے کہا میرا ایک کام ہے اور میں وہ کام تیرے سپرد کرنا چاہتا ہوں اور چونکہ مجھے تیرے اوپر اعتماد ہے اس لئے اس کام کے لئے تجھے بھیج رہا ہوں مگر تجھے قسم دیتا ہوں کہ اپنی بیوی کے پاس نہ جانا آزر نے کہا مجھے بیوی کے پاس جانے سے اپنا مذہب زیادہ پیارا ہے۔ نمرود نے کام بتا کر آزر کو روانہ کر دیا آزر نے شہر میں جا کر کام سرانجام دیا پھر دل میں کہا اگر میں گھر جا کر گھر والوں کو دیکھتا چلوں تو کیا حرج ہے یہ سوچ کر گھر پہنچا اور ابراہیمؑ کی ماں کو دیکھ کر اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکا اور قربت کر بیٹھا نتیجہ میں وہ حاملہ ہو گئی اور ابراہیمؑ کا حمل قرار پا گیا۔

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے جب حضرت ابراہیمؑ کی ماں حاملہ ہو گئی تو کاہنوں نے نمرود سے کہا جس لڑکے کی ہم نے آپ کو اطلاع دی تھی اس کی ماں آج رات حاملہ ہو گئی۔ نمرود نے فوراً لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ جب ابراہیمؑ کی پیدائش کا وقت قریب آگیا اور ماں کو دردزہ ہونے لگا تو وہ بھاگ کر بستی سے باہر نکل گئی کہ کہیں کسی کو اطلاع ہو گئی تو بچہ کو قتل کر دیا جائے گا اور (جنگل میں پہنچ کر) حلفاء گھاس میں اس کا بچہ پیدا ہوا اس نے آکر اپنے شوہر کو اطلاع دے دی کہ میرے بچہ پیدا ہو گیا اور فلاں جگہ موجود ہے باپ نے وہاں جا کر بچہ کو لے کر ایک سرنگ کھود کر اس کے اندر بچہ کو چھپا دیا اور درندوں کے خوف سے سرنگ کا دروازہ پتھر سے بند کر کے چلا آیا ماں وہاں آتی جاتی اور دودھ پلاتی رہی۔

محمد ابن اسحاق کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی والدہ کو جب دردزہ ہوا تو وہ رات کو نکل کر قریب کے ایک غار میں چلی گئی غار کے اندر ابراہیمؑ پیدا ہوئے نوزائیدہ بچہ کا جو کام ہوتا ہے ماں وہ سب کام ٹھیک کر کے غار کا دروازہ بند کر کے گھر کو لوٹ آئی، پھر دیکھ بھال کرتی رہی جب وہاں جاتی تو ابراہیمؑ کو زندہ انگوٹھا چوستے پاتی۔ ابو روزق کا بیان ہے ایک روز حضرت ابراہیمؑ کی ماں نے کہا آج میں اس کی انگلیاں دیکھوں گی۔ چنانچہ انگلیاں دیکھیں تو آپ ایک انگلی سے پانی، دوسری سے شہد، تیسری سے دودھ، چوتھی سے چھوارہ اور پانچویں سے گھی چوس رہے تھے۔ محمد بن اسحٰق کا بیان ہے آزر نے ابراہیمؑ کی ماں سے پوچھا حمل کا کیا ہوا ماں نے کہا لڑکا پیدا ہوا تھا مگر مر گیا۔ آزر کو یقین آگیا اور خاموش ہو رہا۔ ابراہیمؑ کے لئے ایک دن ایک ماہ کی طرح اور ایک مہینہ سال کی طرح (نمو کے اعتبار سے) ہوتا تھا۔ غار کے اندر آپ صرف پندرہ مہینے رہے آخر ایک روز ماں سے کہا مجھے یہاں سے باہر نکال لو ماں عشاء کے وقت آپ کو باہر لائی آپ نے کائنات سماوی وارضی کو دیکھا اور غور کیا اور فرمایا جس نے مجھے پیدا کیا اور کھلایا پلایا وہی میرا پروردگار ہے، اس کے سوا میرا کوئی اور معبود نہیں۔ پھر آسمان پر غور سے دیکھا تو ایک ستارہ نظر آیا بولے یہ میرا رب ہے اس کے بعد اس کے پیچھے نظر لگائے دیکھتے رہے آخر وہ غائب ہو گیا آپ نے کہا غائب ہونے والوں کو میں نہیں چاہتا پھر چاند کو دمکتا دیکھ کر بولے یہ میرا رب ہے اس کے پیچھے بھی نگاہ لگائے رکھی آخر وہ بھی ڈوب گیا۔ پھر سورج نکلا اور مندرجہ بالا صورت ہوئی پھر اپنے باپ آزر کے پاس لوٹ کر آئے تو رخ درست ہو چکا تھا رب کو پہچان چکے تھے اور اپنی قوم کے مذہب سے بیزار ہو گئے تھے مگر قوم پر یہ بات ظاہر نہیں کی اور باپ سے آکر کہا میں آپ کا بیٹا ہوں ماں نے بھی بتا دیا کہ واقعی یہ تمہارا بیٹا ہے اور میں نے یہ کام کیا تھا آزر اس سے بہت خوش ہوا ایک روایت میں آیا ہے سرنگ کے اندر آپ دس سال رہے دوسری روایت میں سات سال اور تیسری میں سترہ سال رہنے کا ذکر آیا ہے۔

میں کہتا ہوں اگر اس قصہ کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی حضرت ابراہیمؑ کے ماں باپ کا کافر ہونا اس سے ثابت نہیں ہوتا ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس میں حضرت ابراہیم کے باپ کا نام آزر بتایا گیا ہے اور آزر کے کافر ہونے کی صراحت

قرآن مجید اور حدیث مبارک میں آچکی ہے۔ لیکن اس قصہ میں لفظ آزر کا آنا بعض راویان قصہ کا وہم ہے (اصل بیان میں صرف ابراہیمؑ کے باپ کا ذکر ہے آزر کا نہیں) بلکہ اصل قصہ بعض راویوں نے اس طرح بیان کیا کہ جب سرنگ کے اندر حضرت ابراہیمؑ جوان ہوگئے تو انہوں نے اپنی ماں سے پوچھا میرا پروردگار کون ہے۔ ماں نے کہا میں۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تیرا پالنے والا کون ہے۔ ماں نے کہا تیرا باپ۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا میرے باپ کا پالنے والا کون ہے۔ ماں نے کہا نمرود۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا نمرود کا رب کون ہے۔ ماں نے کہا خاموش ہوجا۔ حضرت ابراہیمؑ خاموش ہوگئے ماں نے واپس جا کر اپنے شوہر سے کہا دیکھو تو جس لڑکے کے متعلق ہم سے کہا جاتا تھا کہ وہ (اس) ملک والوں کے مذہب کو بگاڑ دے گا وہ آپ ہی کا بیٹا ہے پھر ابراہیم کا قول اس نے نقل کیا باپ فوراً ابراہیم کے پاس پہنچا آپ نے اس سے بھی پوچھا باپ مجھے پالنے والا کون ہے۔ باپ نے کہا تیری ماں۔ حضرت نے فرمایا میری ماں کو پالنے والا کون ہے۔ باپ نے کہا میں۔ آپ نے پوچھا آپ کو پالنے والا کون ہے۔ باپ نے کہا نمرود۔ ابراہیم نے فرمایا نمرود کا رب کون ہے۔ باپ نے ایک طمانچہ مارا اور کہا چپ۔ پھر جب رات چھا گئی تو حضرت ابراہیم نے سرنگ کے دروازہ کے پاس آکر پتھر کی جھری سے باہر کو دیکھا تو ایک ستارہ نظر آیا آپ نے کہا یہ میرا رب ہے ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والدین سے کہا مجھے یہاں سے نکالو والدین نے سرنگ سے باہر نکالا اور غروب آفتاب کے بعد ساتھ لے چلے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کچھ اونٹ گھوڑے اور بکریاں دیکھیں اور باپ سے پوچھا یہ کیا ہے باپ نے کہا اونٹ، گھوڑے اور بکریاں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا ان کو پالنے اور پیدا کرنے والا ضرور کوئی ہوگا۔ پھر (آسمان کی طرف) نظر کی تو مشتری یا زہرہ دکھائی دیا مہینہ کی آخری رات تھی چاند کا طلوع آخر رات میں ہونے والا تھا چاند سے پہلے آپ نے ستارہ دیکھا تھا۔ آیت فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا میں اسی کا بیان ہے۔ یہ بیان حضرت ابراہیمؑ کے والدین کے کافر ہونے پر ضرور دلالت کر رہا ہے مگر اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کفر کی حالت ہی میں ان کی موت ہوئی۔ پھر بیان مختلف مضطرب ضعیف بھی ہے اور صحیح سند سے ثابت نہیں اس کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر آپ کے والدین تک حضور ﷺ کے تمام آباؤ اجداد مؤمن تھے پاک لوگوں کی پشت سے پاک عورتوں کے رحم کی طرف اور پاک عورتوں کے رحم سے پاک مردوں کی پشت کی طرف آپ کا انتقال ہوتا رہا (یہاں تک کہ پاک ماں باپ کے بطن و صلب سے آپ ﷺ پیدا ہوئے) آیت وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ کو اسی معنی پر محمول کیا گیا ہے اور چچا کو باپ کہنا عمومی محاورہ ہے خصوصاً اس صورت میں جب چچا نے پرورش کی ہو اور یہ ممکن ہے کہ تارخ (حضرت ابراہیمؑ کا باپ) ابراہیمؑ کو ماں کے پیٹ یا شیرخوارگی کی حالت میں چھوڑ کر مر گیا ہو اور چچا آزر نے آپ کی پرورش کی ہو۔ واللہ اعلم

فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿۷۶﴾ (پھر جب ستارہ چھپ گیا تو ابراہیم نے کہا میں غائب ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا) یعنی جس کے احوال میں تغیر ہوتا ہے اس کی پوجا کرنے کو پسند نہیں کرتا کیونکہ تغیر احوال حادث ہونے کی نشانی ہے۔ جو قدیم ہو اس کے احوال حادث نہیں ہو سکتے اور حادث قابل عبادت نہیں۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ (پھر جب چاند (ابتداء طلوع کے وقت) چمکتا دیکھا تو اس نے کہا یہ میرا رب ہے)۔

حضرت ابراہیمؑ کے اندر قوت فکریہ کامل تھی اور ستارہ کے غروب سے (توحید پر) استدلال کامل ہو چکا تھا مزید دلیل کی ضرورت نہ تھی لیکن مشرکوں کو مزید شکست دینے کے لئے آپ نے اپنے استدلال کے دائرہ کو وسیع کیا اور چاند و سورج سے بھی استدلال کیا۔

فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿۷۷﴾ (پھر جب چاند بھی چھپ گیا تو ابراہیم نے کہا اگر میرا رب ہی مجھے سیدھی راہ نہ بتائے گا تو میں گمراہ لوگوں میں سے ہو جاؤں گا) اللہ کی طرف سے ہدایت ملنے کی نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے مذکورہ بالا الفاظ حضرت ابراہیمؑ نے کہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا اگر

اللہ کی طرف سے توفیق نہ ہوتی تو ہم نہ ہدایت یاب ہوتے، نہ صدقہ دیتے، نہ نماز پڑھتے۔ مذکورہ بالا قول میں حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کو راہ حق بتائی ہے اور تنبیہ کی ہے کہ چاند بھی قابل عبادت نہیں اس کے احوال بھی تغیر پذیر ہیں جو اس کو معبود قرار دے گا گمراہ ہو جائے گا طلوع اور غروب دونوں سے حالات کے تغیر کا پتہ لگتا ہے لیکن غروب زوال کی حالت ہے (اور طلوع عروج کی) اور زوال کی حالت سے ناقابل عبادت ہونے پر استدلال زیادہ واضح ہے۔ اس لئے حضرت نے غروب قمر سے استدلال کیا طلوع سے نہیں کیا۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ (پھر جب سورج کو دمکتا دیکھا تو اس نے کہا یہ میرا رب ہے یہ سب سے بڑا ہے) (یعنی تمام ستاروں سے بڑا ہے) شَمْسٌ عربی زبان میں مؤنث اور ھٰذَا (اسم اشارہ مذکر) ہے اشارہ سورج کی طرف ہے کیونکہ ھٰذَا کی خبر یعنی رب مذکر ہے (اور جو اسم اشارہ مشار الیہ اور خبر کے درمیان واقع ہوتا ہے اس میں مشار الیہ کی تذکیر تانیث قابل لحاظ نہیں ہوتی خبر کا مذکر مونث ہونا ملحوظ رہتا ہے) بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ھٰذَا سے اشارہ نکلنے والے (یعنی طالع) کی طرف ہے یا معنی کی طرف ہے یعنی چمک اور نور۔

میں کہتا ہوں کہ لفظ شَمْسٌ کی تانیث صرف سماعی ہے کیونکہ اس کی تصغیر شُمَيْسَةٌ آتی ہے (اور تصغیر میں اصلی حروف ظاہر کر دیئے جاتے ہیں) اور حضرت ابراہیم کی زبان عربی نہیں تھی ان کی زبان میں سورج مذکر تھا اپنی زبان کے اعتبار سے انہوں نے اشارہ بصیغہ مذکر ذکر کیا ہو گا اور اللہ نے انہی کے زبان کے استعمال کا لحاظ کر کے اشارہ کو عربی زبان میں ذکر کر دیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے ھٰذَا اَكْبَرُ استدلال کے اعتبار سے اور مشرکوں کے شبہ کو ظاہر کرنے کی غرض سے فرمایا (یعنی مشرکوں کو غیر اللہ کی ربوبیت کا شبہ سورج کو دیکھ کر زیادہ ہو سکتا ہے

فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ (پھر جب وہ ڈوب گیا تو ابراہیمؑ نے کہا اے میری قوم والو (تم جن چیزوں کو (معبود برحق کا عبادت میں) شریک بناتے ہو میں ان سب سے بیزار ہوں) ستارے اور چاند سورج اجرام علوی ہیں، بڑے بڑے ہیں، روشن ہیں، مگر الوہیت کے قابل نہیں۔ محل حوادث ہیں، خود حادث ہیں، ان کے احوال حادث ہیں پیدا کرنے والے کے محتاج ہیں اور ایسی ذات کے ضرورت مند ہیں جس نے ان کو یہ مخصوص احوال عطا فرمائے ہیں، ان کے مقابلہ میں بت اور دوسرے سفلی اجسام بہت حقیر ہیں اور ناقابل عبادت ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی لئے اجرام علویہ کے حالات کو دیکھ کر تمام علوی اور سفلی اجرام کی الوہیت سے بیزاری کا اظہار کر دیا جب علوی اجرام قابل الوہیت نہیں تو سفلی اجسام کیسے معبود ہو سکتے ہیں حضرت ابراہیم۔ نے پہلے استدلال کیا پھر قوم کو خطاب کر کے غیر اللہ کی الوہیت سے بیزاری کا اظہار کیا اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو مسئلہ توحید کی تحقیق پہلے ہو چکی تھی یہ کلام بول کر فقط مشرکوں کو لاجواب بنانا مقصود تھا۔

باطل معبودوں سے اظہار برأت کرنے کے بعد آئندہ کلام میں آپ نے قوم کو الٰہ حق کی ہستی کی طرف رہنمائی کی جس کے وجود پر تمام ممکنات دلالت کر رہے ہیں چنانچہ فرمایا۔

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (میں سب کو چھوڑ کر اپنا منہ اس کی طرف موڑتا ہوں جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور میں اس کے ساتھ کسی اور کو ساجھی قرار دینے والوں میں سے نہیں ہوں) یعنی آسمان اور اس کی ساری کائنات اور زمین اور اس کی تمام موجودات اپنے وجود میں ایسی واجب الوجود ہستی کی محتاج ہیں جو ان کو عدم سے وجود میں لانے والی ہے۔ میں نے اس کی طرف اپنا رخ پھیر لیا اور تمام مذاہب کو چھوڑ کر اسی کی اطاعت اختیار کر لی۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ (اور ابراہیمؑ سے اس کی قوم نے حجت کرنی شروع کر دی) یعنی توحید اور نفی شرک کے مسئلہ میں جھگڑنے لگے جب استدلال صحیح کے مقابلہ سے عاجز اور لاجواب ہو گئے تو جھگڑے پر اتر آئے، کہنے لگے

ہمارے معبودوں سے ڈر، کہیں تجھے کسی دکھ میں مبتلا کردیں اور نمرود سے بھی ڈر تارہ، کہیں تجھے قتل کردے یا جلادے۔

قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنِ (ابراہیمؑ نے کہا کیا (اللہ کی ہستی اور توحید پر قطعی استدلال کے بعد بھی خواہ مخواہ) تم اللہ کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑتے ہو حالانکہ اسی نے مجھے ہدایت کردی) یعنی باوجودیکہ میں کم عمر اور ان پڑھ ہوں مگر اس نے مجھے حق اور استدلال کا راستہ بتادیا۔

وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ (اور جس چیز کو تم اس کا شریک قرار دیتے ہو میں اس سے نہیں ڈرتا) یعنی ممکنات میں سے کوئی ہو خواہ علویات میں سے ہو جیسے چاند، سورج، ستارے یا عنصریات میں (آگ، پانی، ہوا، مٹی اور ان کے مرکبات) پھر ذی عقل عنصری مرکب ہو جیسے نمرود یا جماد ہو جیسے بت میں کسی سے نہیں ڈرتا، یہ سب میری طرح عاجز ہیں، بغیر اللہ کے خود نفع نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے بلکہ بعض مجھ سے بھی زیادہ عاجز ہیں (جیسے جمادات نباتات) روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جب سرنگ سے برآمد ہوئے اور مشرکوں کو ان سے کوئی امید نہ رہی اور آزر نے ان کو اپنالیا تو خود مورتیاں بنا کر بیچنے کے لئے ابراہیمؑ کو دیں۔ آپ مورتیاں لے کر بازار گئے اور آواز لگائی۔ مجھ سے کوئی ایسی چیز خریدتا ہے جو ضرر رساں ہے فائدہ بخش بالکل نہیں۔ نتیجہ میں کسی نے نہیں خریدا۔ شام کو آپ سب مورتیاں واپس لے آئے اور نہر پر لے جاکر ایک مورتی کو پکڑ کر اس کا منہ پانی کی طرف جھکا کر کافروں کا مذاق اڑانے کے لئے کہنے لگے پانی پی۔

اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّیْ شَيْـًٔا (مگر یہ کہ میرے رب کی مشیت ہو)۔ یعنی تمہارے معبود جن کو تم اللہ کا شریک قرار دیتے ہو مجھے کبھی کوئی دکھ نہیں پہنچا سکتے ہاں جس وقت میرا رب ہی دکھ پہنچانا چاہے (تو اس وقت کسی ذریعہ سے مجھے دکھ پہنچ سکتا ہے۔

وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا (میرے رب کا علم ہر چیز کو اپنے اندر سمائے ہوئے ہے) ہر چیز کو محیط ہے۔ یہ فقرہ گویا استثناء کی علت ہے یعنی یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ کے علم میں یہ بات ہو کہ اس کی مشیت اور عطاء اختیار کی وجہ سے بعض مخلوقات کی طرف سے مجھے دکھ پہنچ جائے جو درحقیقت رب کا بھیجا ہوا ہوگا۔

اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾ (کیا اب بھی تم نہیں سمجھتے) کہ ایک ہستی مکمل با اقتدار و قہار ہے (یعنی اللہ) اور کچھ مخلوق بالکل پورے طور پر عاجز جیسے بت اور کچھ ہستیاں اپنی ذات سے اعتبار کے تو عاجز و بے اختیار ہیں لیکن ان کو قدرت و اختیار دے سکتا ہے اور وہ (ظاہر مجازی) قادر ہوسکتی ہیں ان تینوں کے فرق کو کیا تم نہیں جانتے۔

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ (اور جن کو تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے، میں ان سے کس طرح ڈر سکتا ہوں) ان میں سے تو کوئی اللہ کی مشیت کے بغیر مجھے دکھ نہیں پہنچا سکتی۔

وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا (حالانکہ (جو بات حقیقت میں ڈرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ مختار کل، قادر مطلق، حقیقی فائدہ بخش، نفع رساں ہستی کا کسی کو ساجھی قرار دیا جائے مگر) تم اس بات کا خوف نہیں کرتے کہ اللہ کے ساتھ تم ایسی ہستیوں کو شریک بناتے ہو جن کو شریک قرار دینے کی اللہ نے تمہارے لئے کوئی دلیل نہیں اتاری (نہ عقلی نہ نقلی)۔

فَاَیُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ (پس (دنیا و آخرت کے عذاب و شدائد سے) محفوظ رہنے کا زیادہ مستحق دونوں فریقوں میں سے کون سا فریق ہے)۔ اہل توحید کا گروہ جس کا عقیدہ عقل و نقل کے تقاضوں کے موافق ہے یا اہل شرک کا گروہ جن کے پاس اپنے شرکیہ عقیدہ کی کوئی دلیل نہیں۔ اَیُّ الْفَرِيْقَيْنِ فرمایا اَيُّنَا (ہم میں سے کون) نہیں فرمایا کیونکہ ایّنا کہنے میں تزکیہ خودی کا شائبہ تھا پھر اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا تھا کہ استحقاق امن کی خصوصیت صرف میری ذات کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اہل توحید کا پورا گروہ اس کا مستحق ہے کوئی موحد ہو درپردہ اس میں مشرکوں کو توحید کی ترغیب بھی دی ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ (اگر تم جانتے ہو) کہ کس سے خوف کیا جانا چاہئے تو صرف اللہ سے ڈرو اس کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔ اِنْ کی جزا محذوف

ہے جس پر کلام سابق دلالت کر رہا ہے یا کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ بمعنی فعل نہیں بلکہ اسم فاعل کے معنی میں ہے اس صورت میں) یہ معنی ہوگا کہ اگر تم اہل بصیرت اور دانش مند ہو تو میرے سوال کا جواب انصاف کے ساتھ دو۔

۹ ع ۱۲ ۱۵

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾

(جو لوگ (اللہ پر) ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم آمیز یعنی شرک آلود نہیں کیا انہی کیلئے عذاب سے حفاظت ہے اور وہی حق یا جنت کا راستہ پانے والے ہیں) حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کا بیان ہے کہ جب یہ آیت اتری تو مسلمانوں پر بڑی شاق گذری انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم میں سے کون (باوجود مؤمن ہونے کے) اپنے نفس پر ظلم نہیں کرتا (پھر ہمارے محفوظ رہنے کی کیا شکل ہے) حضور ﷺ نے فرمایا ظلم (سے مراد) شرک ہے کیا تم نے لقمان کا وہ قول نہیں سنا جو انہوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (رواہ البخاری و مسلم)۔

حضرت ابراہیمؑ نے مشرکوں سے سوال کیا تھا کہ محفوظ رہنے کا مستحق کون ہے۔ مشرکوں کی طرف سے جب کوئی جواب نہیں ملا تو حضرت ابراہیمؑ نے خود فرما اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ اس صورت میں یہ ابراہیمؑ کا کلام ہوگا جو اللہ نے نقل فرمایا ہے یا یہ اللہ نے اپنی طرف سے فیصلہ فرمایا اور یہ براہ راست اللہ کا قول ہے۔ ابن ابی حاتم نے بکر بن سوادہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک دشمن نے مسلمانوں پر حملہ کر کے ایک مسلمان کو مار ڈالا پھر دوبارہ حملہ کر کے دوسرے مسلمان کو قتل کر دیا پھر تیسری مرتبہ حملہ کر کے ایک اور مسلمان کو قتل کر دیا پھر (مسلمان ہونے کے ارادہ سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور) عرض کیا اس حالت میں بھی مجھے اسلام سے فائدہ پہنچ سکتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا ہاں وہ شخص فوراً مسلمانوں میں شامل ہو گیا (یعنی مسلمان ہو گیا) پھر اپنے (گزشتہ) ساتھیوں پر حملہ کر کے ایک کو پھر دوسرے کو قتل کر دیا پھر تیسرے کو مارا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول اسی شخص کے حق میں ہوا۔

وَتِلْكَ (اور یہ تِلْكَ سے فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ سے مُهْتَدُوْنَ تک جس مضمون کو بیان کیا ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو ستارے اور چاند سورج کو رب قرار دیا اور ان کے زوال کو دیکھ کر ان کی ربوبیت سے گریز کیا، یہ حضرت ابراہیمؑ کا اپنے اطمینان کے لئے مقام تفکر نہ تھا۔ نفوس قدسیہ کو ان فکری استدلالات کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ قوم کو غلطی پر متنبہ کرنے کے لئے تھا۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ تِلْكَ سے اس دلیل کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کے مقابلہ میں پیش کی تھی جس کا ذکر سورہ بقرہ میں گذر چکا ہے مگر یہ قول بعید از قرینہ ہے اول تفسیر ہی صحیح ہے۔

حُجَّتُنَآ (ہماری (تعلیم کردہ) دلیل تھی) یہ اسم اشارہ کی خبر یا صفت یا بدل ہے۔

اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ (جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی تھی) عطا کرنے سے مراد ہے بتا دینا اور قوم سے مراد ہیں نمرود اور اس کے ہم مذہب۔ اگر حُجَّتُنَا کو خبر یا صفت قرار دیا جائے گا تو عَلٰى قَوْمِهٖ کا تعلق حُجَّتُنَا سے ہوگا اور اگر حُجَّتُنَا کو اسم اشارہ سے بدل کہا جائے گا تو عَلٰى قَوْمِهٖ کا تعلق فعل محذوف سے ہوگا۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ (ہم جس کو چاہتے ہیں کتنے ہی درجے اونچا کر دیتے ہیں) یعنی علم و حکمت کے درجات (دے کر) عالی مرتبہ کر دیتے ہیں درجت یا تمیز ہے یا مفعول مطلق۔

اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ (بے شک آپ کا رب (کسی کو اونچا نیچا کرنے میں) حکمت والا ہے)۔

عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾ جس کو اونچا کرتا ہے اس کی حالت اور قابلیت کو (خوب جانتا ہے)۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ (اور ہم نے ابراہیمؑ کو بخشا (ایک بیٹا) اسحاقؑ اور (ایک پوتا) یعقوبؑ)۔

كُلًّا هَدَيْنَا (اور (دونوں میں سے) ہر ایک کو ہدایت دی) یعنی کُلًّا کی تنوین مضاف الیہ کے عوض ہے۔

وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ (اور ابراہیمؑ سے پہلے نوح کو ہدایت عنایت کی) حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ کے

سلسلہ اجداد میں تھے اس لئے حضرت نوحؑ کے ہدایت یافتہ ہونے کو حضرت ابراہیمؑ کے لئے نعمت قرار دیا اس سے معلوم ہوا کہ والد کا شرف اولاد کی طرف، اولاد کا شرف والد کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں اس صورت میں ممکن نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے آباؤ اجداد میں سے کوئی کافر ہوا ہو آپ تو اللہ کے محبوب تھے (اور محبت کا تقاضا ہے کہ شرف کامل عطا کیا جائے)

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ (اور اس کی (یعنی نوحؑ یا ابراہیمؑ کی) نسل میں سے ہم نے ہدایت کی داؤد (بن الیشا) کو سلیمانؑ (بن داؤد) کو اور ایوبؑ (بن اموص بن رازخ بن روم بن عیص بن اسحاق بن ابراہیمؑ) کو اور یوسفؑ (بن یعقوبؑ بن اسحاقؑ) کو اور موسیٰؑ (بن عمران بن یصمر بن قاہت بن لاوی بن یعقوب) کو اور (موسیٰؑ کے بھائی) ہارونؑ کو (جو موسیٰؑ سے سال بھر بڑے تھے) مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ کی ضمیر ابراہیمؑ کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ کلام آپ ہی کے متعلق ہے۔ بعض کے نزدیک نوحؑ کی طرف راجع ہے۔ نوح کا لفظ قریب مذکور ہے اس کے علاوہ یونسؑ اور لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں سے نہیں تھے، حضرت نوحؑ کی نسل میں سے تھے یہی زیادہ ظاہر ہے کہ لیکن اگر ابراہیم کی طرف ضمیر راجع قرار دی جائے تو اس آیت اور اس کی بعد والی آیت میں جن انبیاء کے نام آئے ہیں صرف انہی کے ساتھ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ کی خصوصیت ہوگی اور جن انبیاء کا ذکر تیسری آیت میں آیا ہے ان کا عطف نُوْحًا پر ہوگا (وہ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ کے ذیل میں نہیں آئیں گے۔

وَكَذٰلِكَ (اور اسی طرح) یعنی جس طرح ہم نے ابراہیمؑ کو ان کے حسن کردار و رفتار کا بدلہ دیا اور ان کے درجات اونچے کئے اور اولاد کے مرتبہ بلند کئے اسی طرح

نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾ (ہم اہل احسان کو بدلہ دیتے ہیں) حضرت عمرؓ کی مرفوع روایت ہے کہ حضرت جبرئیلؑ کے سوال کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اپنے رب کی عبادت (اتنے استغراق کے ساتھ) کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ پاتے تو یقیناً وہ تم کو دیکھتا ہی ہے۔ متفق علیہ

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ (اور زکریاؑ (ابن آذن) کو اور یحییٰ (بن زکریاؑ) کو اور عیسیٰؑ (بن مریم بنت عمران) کو اور الیاس (بن متی بن فخاص بن عیزار بن ہارونؑ) کو) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا، ادریسؑ ہی الیاسؑ تھے دونوں نام ایک ہی شخص کے تھے جیسے یعقوب اور اسرائیل لیکن آیت کی رفتار اس کے خلاف ہے ادریسؑ نوحؑ کی نسل میں سے نہیں تھے بلکہ پدر نوحؑ کے دادا تھے۔ نوح کے باپ لامک، لامک کے باپ متوشلخ، متوشلخ کے باپ خنوخ اور خنوخ کے باپ حضرت ادریس تھے۔ اولاد آدمؑ میں آپ سب سے پہلے نبی تھے اور آپ نے قلمی تحریر ایجاد کی۔

كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾ (مذکورہ بالا اشخاص میں سے) ہر ایک نیکوکاروں میں سے تھا) یعنی یہ حضرات ان لوگوں میں سے تھے جو تمام کبائر و صغائر سے معصوم تھے کیونکہ جو شخص کسی امر ممنوع کا مرتکب یا مامور بہ کا تارک ہو وہ صالح نہ ہوگا فاسد ہوگا خواہ اس کے اعمال کتنے ہی کم ہوں (مگر ہوگا فاسد) غیر معصوم پر جو کبھی صالح کا اطلاق ہو جاتا ہے وہ حقیقی نہیں ہوتا اضافی ہوتا ہے (یعنی مرتکب کبائر کے مقابلہ میں ہم بعض صغائر کے مرتکب کو صالح کہہ سکتے ہیں اگرچہ وہ بالکل صالح نہیں ہوتا) ہاں گناہ کرنے کے بعد جو سچی توبہ کرے وہ صالح ہو جاتا ہے کیونکہ گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہو جاتا ہے لیکن جو کامل الصلاح ہو وہ معصوم ہوتا ہے۔

وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا (اور اسمٰعیلؑ (بن ابراہیمؑ) کو (جو رسول اللہ ﷺ کے جد اعلیٰ تھے) اور الیسع (بن اخطوب بن عجوز) کو اور یونس (بن متی) کو اور لوط (بن ہاران) کو) جو حضرت ابراہیم کے بھتیجے تھے یسع عجمی نام ہے اس پر الف لام داخل کر لیا گیا ہے جیسے یزید پر الف لام داخل کر کے اَلْيَزِيْد کہا جاتا ہے ایک شاعر کا قول ہے۔

(رَاَيْتُ الْوَلِيْدَ بْنَ الْيَزِيْدِ مُبَارَكًا شَدِيْدًا بِاَعْبَاءِ الْخَلَافَةِ كَاهِلُهٗ

میں نے ولید بن یزید کو بابرکت پایا اس کے کاندھے خلافت کا بار اٹھانے میں مضبوط ہیں۔
وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾ (اور ان میں سے ہر ایک کو ان کے زمانہ والوں پر ہم نے برتری عطا کی تھی) یہ آیت بتا رہی ہے کہ ان انبیاء کو ان کے تمام اہل زمانہ پر فضیلت حاصل تھی اہل زمانہ خواہ انسان ہوں یا جنات یا ملائکہ۔
وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾
(اور ان کے باپ دادا اور نسل اور بھائیوں میں سے بعض کو (ہم نے ہدایت کی یا بزرگی عطا کی اور ان کو) برگزیدہ بنایا اور سیدھا راستہ دکھایا) وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ کا عطف كُلًّا پر ہے یعنی ہم نے بزرگی عطا کی یا نُوْحًا پر عطف ہے یعنی ہم نے ہدایت کی اور مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی ان کی اصل نسل اور بھائیوں میں سے بعض کو برتری دی یا ہدایت کی کیونکہ سب کے سب نہ پیغمبر ہوئے نہ ہدایت یافتہ۔
ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ (یہی (دین توحید) اللہ کا بتایا ہوا ہے اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا اس کی ہدایت کرتا ہے)۔
وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ (اور اگر وہ (پیغمبر بھی بالفرض) شرک کرتے تو جو کچھ (اچھے اعمال) وہ کرتے تھے سب اکارت چلے جاتے) دوسروں کا تو ذکر ہی کیا ہے پیغمبروں کی جلالت و عظمت بھی شرک کے بعد کسی عمل کو بربادی سے نہیں روکتی۔
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ (یہ سب ایسے تھے کہ ہم نے ان کو کتاب دی) اَلْكِتَاب اسم جنس ہے یعنی نازل کردہ خدائی کتابیں۔ دینے سے مراد ہے اتارنا، یا نازل شدہ کتاب کی تبلیغ کا حکم دینا۔
وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ (اور حکمت و نبوت) حکم سے مراد یا حکومت ہے یعنی ہم نے ان کو حاکم بنایا تھا کہ لوگ ان کی اطاعت کریں یا حکمت و دانش مراد ہے یا تقاضاء حق کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرنا مراد ہے۔
فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ (اب اگر یہ (کفار مکہ) ان (تینوں چیزوں) کا انکار کردیں تو (کوئی نقصان ہمارا نہیں) ہم نے اس کے لئے ایسے بہت لوگ مقرر کردیئے ہیں جو اس کا انکار نہیں کرتے) یعنی انصار اور اہل مدینہ۔ اس کے لئے مقرر کرنے سے مراد یہ ہے ایمان لانا اور ان پر عمل کرنا۔ قوما سے مراد انصار۔ اور اہل مدینہ کی تخصیص حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ کے نزدیک ہے بظاہر آیت کا مصداق عام ہے تمام صحابہؓ اور صحابہؓ کے بعد آنے والے اہل فارس اور دوسرے ممالک کے مؤمنوں کو آیت شامل ہے۔ ابورجاء عطاردی نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا اگر زمین کے رہنے والے اس کا انکار کردیں تو ہم نے آسمان کے فرشتوں کو مقرر کردیا ہے وہ منکر نہیں ہیں۔
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ (یہ ایسے لوگ تھے جن کو اللہ نے ہدایت کی تھی) یعنی توحید، اصول دین اور مامورات و منہیات کی پابندی کی ہدایت کردی تھی۔

فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ (پس انہی کے طریقہ پر آپ چلیں) یعنی دوسروں کے طریقہ پر نہ چلیں اس میں مشرکوں پر تعریض ہے کہ وہ (پیغمبروں کے راستہ پر چلنے کی بجائے) اپنے گمراہ آباد اجداد کی پیروی کرتے ہیں۔ طریقہ انبیاء خصوصاً سید الانبیاء کا تو ذکر ہی کیا ہے آپ کے لئے تو تقلید جائز ہی نہیں۔
مطلب یہ ہے کہ دوسرے انبیاء کی طرح آپ بھی ہدایت کے راستہ پر چلیں اور اس شریعت الٰہی کا اتباع کریں جو تقاضاء عقل کے مطابق ہے۔ اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کا طریقہ حق تھا اور عقل نقل کے تقاضوں کے مطابق تھا۔
بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ هُدَاهُمْ سے مراد عقیدۂ توحید اور دین کے وہ اصول ہیں جو تمام انبیاء کی تعلیم میں مشترک ہیں فروعی مسائل مراد نہیں ہیں فروعی مسائل میں تو انبیاء میں تفریق ہے اور هُدَاهُمْ میں هُدٰی کی اضافت کل انبیاء کی طرف کی گئی ہے لہٰذا ایسا راستہ ہونا ضروری ہے جو سب کے درمیان مشترک ہو۔ فروعی مسائل میں سب انبیاء کی پیروی ممکن نہیں (کیونکہ فروعی احکام میں انبیاء میں اختلاف ہے) اب یہ کہنا غلط ہے کہ اس آیت میں گزشتہ انبیاء کی شریعتوں پر چلنے کا حکم

رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا ہے اور آپ گزشتہ شرائع کے مکلف تھے۔

میں کہتا ہوں تمام انبیاء امر خداوندی کے مکلّف تھے اگر سابق فروعی مسائل کو اللہ کی طرف سے منسوخ نہیں کیا گیا تو ان فروعی احکام کی تعمیل بھی سب کے لئے ضروری تھی اور اگر متلو یا غیر متلو وحی کے ذریعہ سے گزشتہ احکام جزئیہ کو منسوخ کر کے جدید احکام نازل کر دیئے گئے تو جدید احکام کی تعمیل لازم ہے۔ حاصل یہ ہے کہ تمام انبیاء گزشتہ فروعی احکام کے بھی پابند تھے بشرطیکہ جدید شریعت میں ان کو منسوخ نہ کر دیا گیا ہو۔ پس گزشتہ شریعتوں کے فروعی احکام کی تعمیل بھی ہم پر واجب ہے اگر ہماری شریعت میں اللہ نے ان کو منسوخ نہ کر دیا ہو اِقْتَدِهْ میں ھا سکتہ ہے (ضمیر نہیں ہے۔)

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ (آپ کہہ دیجئے میں اس (تبلیغ یا قرآن) کا کسی قسم کا معاوضہ تم سے نہیں مانگتا) جس طرح مجھ سے پہلے انبیاء اپنی امتوں سے اجر تبلیغ کے طلب گار نہ تھے۔ جن امور میں اقتداء انبیاء کا حکم دیا گیا تھا ان میں سے یہ اجر کا طلب گار نہ ہونا بھی ہے۔ یہ جملہ بتا رہا ہے کہ قرآن حدیث اور فقہ کی تعلیم کا معاوضہ (طلب کر کے) لینا جائز نہیں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾ (یہ (تبلیغ یا قرآن) تو جن وانس کے لئے محض ایک یادداشت اور نصیحت ہے) ع ۱۰

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیرؒ کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ ایک یہودی جس کا نام مالک بن الصیف تھا مناظرہ کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جھگڑے بازی کرنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا میں تجھے اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے موسیٰؑ پر توریت نازل فرمائی تھی کیا توریت میں یہ بات تم لکھی ہوئی پاتے ہو کہ موٹے عالم کو اللہ پسند نہیں فرماتا۔ مالک موٹا تھا، یہ سن کر غضبناک ہو گیا اور بولا خدا کی قسم اللہ نے کسی انسان پر کوئی حکم نہیں اتارا۔ اس کے ساتھیوں نے جو یہ بات سنی تو بولے ارے (ارے) کیا موسیٰؑ پر بھی اللہ نے کچھ نہیں اتارا۔ اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ (اور انہوں نے اللہ (کی ذات وصفات) کا ایسا اندازہ نہیں کیا جیسا کرنا چاہئے تھا)۔ حَقَّ قَدْرِهٖ مفعول مطلق ہے۔ بغویؒ نے لکھا ہے کہ اسی قول کی وجہ سے یہودیوں نے مالک کو اجتہاد کے عہدہ سے معزول کر کے اس کی جگہ ابن اشرف کو مقرر کر دیا۔ سدی کا بیان ہے کہ اس آیت کا نزول فخاص بن عازوراء کے حق میں ہوا اور فخاص نے ہی یہ بات کہی تھی۔ سورۂ نساء میں یہ حدیث گذر چکی ہے۔ ابن جریر نے بطریق ابو طلحہؒ حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہودیوں نے کہا محمد ﷺ کیا اللہ نے آپ پر کوئی کتاب نازل کی ہے حضور ﷺ نے فرمایا ہاں! بولے خدا کی قسم اللہ نے آسمان سے کوئی کتاب نہیں اتاری اس پر اللہ نے نازل فرمایا وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ یعنی اللہ نے بندوں پر جو نعمت و رحمت مبذول فرمائی ہے اس کو انہوں نے نہیں جانا اور اس لحاظ سے اللہ کو جیسا پہچاننا چاہئے ویسا نہیں پہچانا، جب کہ انہوں نے کہا کہ اللہ نے کسی آدمی پر کچھ نازل نہیں فرمایا یعنی پیغمبروں کی بعثت کا انکار کر دیا حالانکہ نبوت اللہ کی سب سے بڑی رحمت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں پر کی ہے۔

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ (اے محمد ﷺ) آپ کہئے کہ جو کتاب (توریت) موسیٰؑ لائے تھے وہ کس نے اتاری تھی جو (سراسر) نور اور لوگوں کے لئے ہدایت ہے جس کو تم نے متفرق اوراق میں رکھ چھوڑا ہے کہ ان میں سے بعض حصوں کو تو ظاہر کرتے ہو اور بہت حصے کو چھپائے رکھتے ہو) نوراً الکتاب یا کتاب کی ضمیر بِهٖ سے حال ہے۔ متفرق اوراق میں کرنے سے یہ مراد ہے کہ کاغذ کے مختلف ٹکڑوں پر لکھتے ہو اور ان کی جدا جدا کاپیاں بناتے ہو۔ بعض حصوں کو ظاہر کرنے کا یہ معنی ہے کہ جس حصہ کو اور توریت کی جن باتوں کو ظاہر کرنا چاہتے ہو ظاہر کرتے ہو۔ زیادہ باتوں کے چھپانے کا یہ مطلب ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تعریف اور آیت رجم وغیرہ کو چھپاتے ہو حالانکہ یہ چیزیں توریت میں موجود ہیں۔ اس فقرہ میں

یہودیوں کو سرزنش کی گئی ہے کہ تم نے توریت کے معاملہ میں اپنی خواہشات کا اتباع کیا (اللہ کی کتاب کو اپنی نفسانی خواہشات کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی)

وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ (اور تم کو بہت سی ایسی باتیں تعلیم کی گئیں جن کو نہ تم جانتے تھے نہ تمہارے باپ دادا)۔ اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ اس آیت میں مخاطب یہود ہیں، یعنی یہودیو! تم کو توریت کے ذریعہ سے جو علم عطا کیا گیا تھا اس سے زیادہ علم محمد ﷺ کی زبانی تم کو دیا گیا۔ یا یہ مطلب ہے کہ توریت کی عبارت میں جس چیز کا سمجھنا تمہارے اور تمہارے آباؤ اجداد کے لئے غیر واضح تھا اس کو رسول اللہ ﷺ کی زبانی کھول دیا گیا۔ دوسری آیت میں بھی اس طرح کا مفہوم ادا کیا گیا ہے فرمایا ہے اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔ جس نے (عُلِّمْتُمْ کا) یہ مطلب بیان کیا کہ یہودیوں کو رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے قرآن کا علم دیا گیا تھا مگر انہوں نے اس کو کھو دیا (قبول نہیں کیا) مجاہدؒ کے نزدیک اس آیت کے مخاطب مسلمان ہیں۔ مسلمان پہلے (یعنی اسلام سے پہلے) بے علم تھے اللہ نے ان کو رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد علم عطا فرمایا اور اسی نعمت کی اس آیت میں یاد دہانی کی۔

قُلِ اللّٰهُ (آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے) موسیٰؑ پر کتاب اتاری تھی اس جملہ کا تعلق قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ سے ہے۔ جب یہودی لاجواب ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ خود کہہ دیجئے کہ اللہ ہی نے توریت نازل کی تھی اس جملہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سابق سوال کا جواب متعین ہے جس کے خلاف ممکن نہیں۔

ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۱﴾ (پھر ان کو ان کے مشغلہ میں بے ہودگی کے ساتھ لگا رہنے دیجئے) فِيْ خَوْضِهِمْ کا تعلق ذَرْهُمْ سے ہے اور يَلْعَبُوْنَ ضمیر مفعول یعنی هُمْ سے یا خَوْضِهِمْ کی ضمیر سے حال ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فِيْ خَوْضِهِمْ کا تعلق يَلْعَبُوْنَ سے ہو، خَوْضٌ سے مراد ہیں یہودیوں کے باطل افکار۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (اور یہ بھی ایک (عظیم الشان) کتاب ہے جس کو ہم نے اتارا، بڑی برکت والی ہے، اپنے سے پہلی کتاب کو سچا بتانے والی ہے)۔

یعنی یہ قرآن کثیر المنافع ہے اس سے پہلے جو توریت (اللہ کی کتاب نازل ہو چکی) تھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ مبارک سے مراد کثیر الفوائد اور الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ سے مراد توریت ہے۔

وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا تاکہ تم اس سے نفع اٹھاؤ (اور مکہ والوں کو اور مکہ کے ہر سمت والوں کو ڈراؤ)۔ وَلِتُنْذِرَ کا عطف فعل محذوف پر ہے جس کے مفہوم کو لفظ مبارک بتا رہا ہے یعنی تاکہ تم اس سے نفع اٹھاؤ اور تمام انسانوں کو ڈراؤ۔ اُمَّ الْقُرٰى مکہ۔ مَنْ حَوْلَهَا سے مراد پورب پچھم اور جنوب وشمال۔ غرض سارے اطراف کے رہنے والے۔ اُمَّ الْقُرٰى سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی ام القریٰ کے رہنے والے۔ مکہ کو ام القریٰ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اسی جگہ سے ساری زمین پھیلائی گئی یا یہ وجہ ہے کہ دنیا کی تمام بستیوں کے باشندوں کا یہ قبلہ اور مقام حج ہے۔ اول وجہ تسمیہ کی بنیاد پر ام بمعنی اصل ہو گا (اور دوسری وجہ تسمیہ کی صورت میں ام کے معنی ماموم یعنی مقصود ہوگا)۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾ (اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس (پیغمبر یا قرآن) پر ایمان رکھتے ہیں اور وہی نماز کی پابندی کرتے ہیں) کیونکہ آخرت (کو یقینی چیز سمجھنے والا اور اس) پر ایمان رکھنے والا انجام سے ڈرتا رہتا ہے اور یہ ڈر ہی اس کو غور وفکر میں منہمک رکھتا ہے۔ نتیجہ میں وہ پیغمبر پر ایمان رکھتا ہے اور قرآن پر بھی اور تمام طاعتوں کی بھی پابندی کرتا ہے۔ تمام طاعات میں سے صرف نماز کی خصوصیت سے ذکر اس وجہ سے کیا کہ نماز دین کا ستون ہے۔ آیت میں درپردہ یہ بات بتاتا ہے کہ یہودی جو قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں رکھتے۔ حقیقت میں یہ نہ آخرت کو مانتے ہیں نہ حضرت موسیٰؑ کی لائی ہوئی کتاب کو ورنہ قرآن اور محمد ﷺ پر ان کا ایمان ضرور ہوتا کیونکہ قرآن توریت اور قیامت میں سے ہر ایک پر ایمان دوسرے پر ایمان رکھنے کو مستلزم ہے۔ تینوں میں باہم تلازم

ہے (ایک پر ایمان ہو دوسرے پر نہ ہو ایسا ہو نہیں سکتا)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا (اور اس شخص سے بڑھ کر بیجا حرکت کرنے والا کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت تراشی کرتا ہے) جیسے مالک بن الصیف جو کہتا تھا کہ اللہ نے کسی آدمی پر کچھ نازل نہیں کیا۔ یا جیسے عمرو بن لحی اور اس کے پیرو جو کہتے تھے کہ اللہ نے سائبہ اور حام کو حرام کر دیا ہے اور بعض قسم کے اونٹوں پر سوار ہونا اللہ کی طرف سے ناجائز کر دیا گیا ہے اور ان جانوروں کے پیٹ کے بچے اگر زندہ برآمد ہوں تو مردوں کے لئے حلال ہیں عورتوں کے لئے حرام اور اگر مردہ برآمد ہوں تو سب کے لئے حلال ہیں۔

اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْهِ شَیْءٌ (یا کہتا ہے کہ میرے پاس وحی آئی ہے حالانکہ اس کے پاس بالکل وحی نہیں آئی)۔

بغویؒ نے لکھا ہے کہ بر قول قتادہ اس آیت کا نزول مسیلمہ کذاب کے حق میں ہوا یہ شخص کاہن تھا اور کاہنوں کی طرح کچھ مسجع فقرے بولتا تھا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور کہتا تھا کہ میرے پاس وحی آتی ہے۔ ابن جریر نے عکرمہ کا بھی یہی بیان نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس نے دو قاصد بھیجے تھے حضور ﷺ نے قاصدوں سے دریافت کیا کیا تم مسیلمہ کو نبی مانتے ہو قاصدوں نے کہا جی ہاں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اگر قاصدوں کو قتل نہ کرنے کا دستور نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردن اڑا دیتا۔

بغویؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں سو رہا تھا سونے کی حالت میں مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گیں اور سونے کے دو کنگن میرے دونوں ہاتھوں میں ڈال دیئے گئے مجھے اس سے بڑی ناگواری اور رنج ہوا تو مجھے وحی کی گئی کہ ان دونوں پر پھونک مارو میں نے پھونک ماری کنگن فوراً غائب ہو گئے میں نے اس کی تعبیر دی کہ دونوں کنگنوں سے مراد دو کذاب ہیں ایک صنعاء (یمن) والا اور دوسرا یمامہ والا۔ صنعا والے سے حضور کی مراد اسود عنسی اور صاحب یمامہ سے مراد مسیلمہ کذاب تھا (ان دونوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا)۔

وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ط (اور وہ جو کہتا ہے کہ جیسا کلام اللہ نے نازل کیا ہے ایسا میں بھی لاتا ہوں)۔ بر قول بغوی اس آیت کا نزول عبداللہ بن ابی سرح کے حق میں ہوا ہے۔ عبداللہ مسلمان ہو گیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کا کاتب تھا لیکن (قرآن میں جس جگہ) حضور ﷺ سَمِیْعًا بَصِیْرًا لکھواتے وہ عَلِیْمًا حَکِیْمًا لکھتا اور جہاں عَلِیْمًا حَکِیْمًا لکھواتے وہاں وہ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا لکھتا تھا۔ جب آیت وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ نازل ہوئی اور حضور نے یہ آیت لکھوائی تو عبداللہ کو تخلیق انسانی کی یہ تفصیل بہت پسند آئی اور وہ فوراً بول اٹھا فَتَبٰرَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ۔ حضور ﷺ نے فرمایا (آگے) یہ بھی لکھ دو یہ اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ عبداللہ کے دل میں شک پیدا ہو گیا اگر محمد ﷺ (وحی کے دعوے میں) سچے ہیں تو جس طرح ان کے پاس وحی آئی ہے میرے پاس بھی آگئی (میں بھی نبی ہو گیا) اور اگر جھوٹے ہیں تو پھر جس طرح وہ کہتے ہیں۔ میں نے بھی کہہ دیا (نہ خدا کا کلام، ان کا نہ میرا) اس کے بعد وہ مرتد ہو گیا اور مشرکوں سے جاملا۔ ابن جریرؒ نے عکرمہ اور سدی کی روایت سے بھی آیت تَبٰرَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ کے سلسلہ میں یہی قصہ بیان کیا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جب رسول اللہ ﷺ مر الظہران میں فروکش تھے۔ عبداللہ دوبارہ اسلام لے آیا تھا۔ حافظ فتح الدین ابن سید الناس نے سیرت میں لکھا ہے کہ ابن ابی سرح نے حضرت عثمانؓ بن عفان کی سفارش کرائی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کی سفارش کو قبول فرمالیا اس کے بعد عبداللہؓ کا اسلامی کریکٹر اچھا رہا کسی نے اس کے اسلام پر کوئی خوردہ گیری نہیں کی آخر سجدہ کی حالت میں عبداللہ کا انتقال ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ نے آیت سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے متعلق فرمایا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے کلام کو ٹھٹول بناتے تھے اور لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ کا یہ جواب ہے۔

میں کہتا ہوں اس سے مراد نضر بن حارث ہے جو سورۂ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا کے مقابلہ میں (بطور استہزاء) وَالطَّاحِنَاتِ طَحْنًا وَّالْعَاجِنَاتِ عَجْنًا وَّالْخَابِزَاتِ خُبْزًا کہتا تھا (قسم ہے آٹا پیسنے اور گوندھنے اور روٹی پکانے والیوں کی)

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ (اور اگر آپ اس وقت دیکھیں جبکہ یہ ظالم لوگ موت کی سختیوں میں ہوں گے)۔ تَرٰى کا خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے اور اَلظّٰلِمِیْنَ مفعول محذوف ہے۔ اَلظّٰلِمُوْنَ میں الف لام یا عہدی ہے اور مراد ہیں یہودی اور نبوت کے جھوٹے دعویدار اور کلام اللہ سے استہزاء کرنے والے یا الف لام جنسی ہے ان سب کو بھی شامل ہے اور دوسرے ظالموں (کافروں) کو بھی۔ لو حرف شرط ہے تَرٰى اس کی شرط ہے اور جزاء محذوف ہے یعنی اگر آپ ظالموں کی حالت دیکھیں گے تو آپ کو ہیبت ناک منظر دکھائی دے گا۔ غَمَرَاتُ کا معنی ہے شدائد۔ یہ غَمْرَۃٌ کی جمع ہے قاموس میں ہے غَمْرَۃُ الشَّیْئِ کسی چیز کی شدت۔ وضعی معنی ہے ڈھانکنا غَمَرَتْهُ الْمَاءُ اس کو پانی نے ڈھانک لیا۔ اس کے بعد شدائد اور مصائب کے لئے اس لفظ کا استعمال کیا جانے لگا (کیونکہ شدائد بھی انسان کو محیط ہو جاتی ہیں اور ہر طرف سے چھا جاتی ہیں) صحاح میں ہے غَمْر کا اصل وضعی معنی ہے کسی چیز کے اثر کو زائل کر دینا آب کثیر کو غمر اسی مناسبت کی وجہ سے کہتے ہیں۔ صاحب صحاح کی تحقیق کے بموجب آیت میں موت کی جانب غَمَرَاتُ کی اضافت بیانیہ ہو گی شدت موت کو غَمْرَۃٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ موت زندگی کا اثر مٹا دیتی ہے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے (اور کہہ رہے ہوں گے کہ) اپنی جانیں نکالو)۔ یہ جملہ حالیہ ہے اور ضمیر کا مرجع محذوف ہے یعنی سختی کے ساتھ تقاضا کرنے والے قرض خواہ کی طرح جھڑک کر اور درشتی کے ساتھ روحوں کو قبض کرنے یا عذاب دینے کے لئے فرشتے ان سے کہیں گے کہ اپنی جانوں کو جسموں کے اندر سے نکالو یا عذاب سے بچاؤ۔

اَلْيَوْمَ (آج) مرنے کے وقت سے غیر متناہی مدت تک۔

تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ (تم کو عذاب ذلت کی سزا دی جائے گی) یعنی وہ عذاب دیا جائے گا جس میں ذلت اور شدت ہو گی۔

بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ (کیونکہ تم اللہ پر چھوٹی افتراء بندی کیا کرتے تھے)، اس کو صاحب اولاد کہتے تھے، مخلوق کو اس کا شریک قرار دیتے تھے، نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرتے تھے اور باوجود وحی نہ آنے کے کہتے تھے کہ ہمارے پاس وحی آئی ہے۔

وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ (اور تم اللہ کی آیات (یعنی قرآنی آیات یا دلائل توحید) سے تکبر کرتے تھے) نہ ان پر غور کرتے تھے، نہ ان کو مانتے تھے۔ ابن جریر وغیرہ نے عکرمہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ نضر بن حارث نے کہا تھا لات اور عزیٰ اللہ کے سامنے ہماری سفارش کریں گے اس پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى مرنے کے بعد اور قیامت کے دن حساب کتاب اور جزا و سزا کے لئے (تم اکیلے ہمارے ہمارے پاس آگئے) یعنی نہ مال، نہ اولاد، نہ دوست احباب اور مددگار اور نہ وہ دنیوی چیزیں جن کو تم نے اپنے لئے چھانٹ رکھا تھا۔ یا اکیلے آنے سے یہ مراد ہے کہ وہ بت جن کو اپنے خیال میں تم نے اپنا سفارشی سمجھ رکھا تھا وہ تمہارے ساتھ نہ ہوں گے۔ فُرَادٰى، فَرْدٌ کی جمع ہے آخری الف تانیث کا ہے۔

اس آیت میں اللہ نے ملائکہ کے اس قوت کی خبر دی ہے جو مرنے کے وقت یا قیامت کے دن فرشتے کافروں سے کہیں گے۔ کلام کی رفتار بتا رہی ہے کہ مرنے کے وقت فرشتے یہ کلام کریں گے کیونکہ اس کلام کا عطف اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ پر ہے۔

كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ایسے اکیلے آگئے (جیسے پہلی مرتبہ ہم نے تم کو (اکیلا) پیدا کیا تھا)۔ یہ فُرَادٰى سے بدل یا حال ہے یا فُرَادٰى کی ضمیر سے حال ہے۔ موخر الذکر صورت میں یہ مطلب ہو گا کہ جس طرح تم کو برہنہ اور

غیر مختون حالت میں پیدا کیا گیا تھا اسی حالت سے تم ہمارے پاس آ گئے۔

وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ (اور جو کچھ (مال، اولاد، خدام اور جاہ و حشم) ہم نے تم کو عطا کیا تھا وہ اپنے پیچھے چھوڑ آئے) اور ذرہ برابر ساتھ نہیں لائے۔ آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے پاس نامرادی کی حالت میں روز پیدائش کی طرح خالی ہاتھ آ گئے۔ اپنا اصل سرمایہ یعنی عمر برباد کر چکے اور ہمارا دیا ہوا سارا مال منال و دنیا میں چھوڑ چکے، کچھ بھی آخرت کے لئے نہیں بھیجا۔

وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ (اور ہم تو تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جن کی نسبت تمہارا دعویٰ تھا کہ وہ تمہارے معاملہ میں (اللہ کے) شریک ہیں) شریک ہونے سے مراد ہے ربوبیت اور استحقاق عبادت میں شریک ہونا یعنی بت۔

لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾ (واقعی تمہارے آپس میں تو قطع تعلق ہو گیا اور وہ تمہارا دعویٰ سب تم سے گیا گذرا ہو گیا) بَيْنَكُمْ کاف کے زبر کے ساتھ نافع حفص اور کسائی کی قرأت ہے۔ تَقَطَّعَ کا فاعل یا مضمر ہے جس پر کلام سابق دلالت کر رہا ہے یا بَيْنَ کا موصوف محذوف ہے اور وہی تَقَطَّعَ کا فاعل ہے یعنی تَقَطَّعَ مَابَيْنَكُمْ ٹوٹ گیا وہ تعلق جو تمہارے درمیان تھا وغیرہ وغیرہ۔ بَيْنَ مصدر متضاد المعنی ہے اس کا معنی توڑ بھی ہے۔ اور جوڑ بھی یہ اسم بھی ہے اور ظرف بھی دونوں طرح اس کا استعمال ہے۔ کذا فی القاموس۔ مَاكُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ سے مراد ہے بتوں کے شفیع ہونے کا گمان اور یوم آخرت نہ ہونے کا خیال۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ (بے شک اللہ پھاڑنے والا ہے دانہ کو اور گٹھلیوں کو)۔

حسن قتادہ اور سدی کے نزدیک اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ بالی کے اندر سے دانہ اور درخت کھجور کے اندر سے گٹھلی کو برآمد کرتا ہے۔ زجاج نے کہا خشک دانے اور خشک گٹھلی کو چیر کر سبز کونپل نکالنے والا ہے۔ مجاہد نے کہا اس سے وہ شگاف مراد ہے جو گیہوں کے دانے اور کھجور کی گٹھلی میں ہوتا ہے (یعنی یہ شگاف اللہ نے پیدا کیا ہے) ضحاک نے کہا خالق سے مراد ہے خالق۔ حَبّ کا واحد حَبَّةٌ ہے۔ اس کا اطلاق اس بیج پر ہوتا ہے جو کھانے کے کام میں آتا ہے جیسے گیہوں، جو، چنا، جوار، چاول وغیرہ یعنی ہر قسم کا غلہ، اور نَوٰی کا واحد نَوَاةٌ ہے اس کا اطلاق ان بیجوں پر ہوتا ہے جو کھانے کے کام میں نہیں آتے جیسے کھجور، آڑو، خوبانی، انار وغیرہ کی گٹھلیاں۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ (وہ زندہ کو بے جان سے نکالتا ہے) یعنی نامی حیوان اور سبزہ کو غیر نامی (نطفہ، دانے اور گٹھلی) سے پیدا کرتا ہے۔

یہ جملہ سابق جملہ کے بیان کے مقام پر آیا ہے اس لئے حرف عطف نہیں لایا گیا۔

وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ (اور وہی بیجان (یعنی غیر نامی) کو جاندار (یعنی نامی) سے نکالنے والا ہے) نطفہ، بیج، گٹھلی کو حیوان اور سبزہ سے پیدا کرتا ہے اس جملہ کا عطف فَالِقُ الْحَبِّ پر ہے اسی لئے مُخْرِجُ اسم فاعل کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ (یہ ہی)۔ زندہ اور مردہ کرنے والا تم سب کا اللہ ہے یعنی معبود ہونے کا مستحق ہے۔ جو خود عاجز ہو وہ مستحق عبادت نہیں ہوتا وہ تو ہر عمل سے اثر پذیر ہوتا ہے، مؤثر نہیں ہو سکتا۔

فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾ (پھر کہاں (اللہ سے دوسروں کی طرف) پھرے جا رہے ہو)۔

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ (وہی صبح کو نکالنے والا ہے) اِصْبَاحُ مصدر (باب افعال) اس کا معنی ہے "صبح میں داخل ہونا" یہاں مجازاً صبح مراد ہے حال بول کر محل مراد لیا جاتا ہے یعنی وہ ظلمت شب یا دن کی روشنی سے عمود صبح کو چیر کر نکالنے والا ہے یا ظلمت صبح سے عمود صبح کو برآمد کرنے والا ہے۔ ظلمت صبح سے مراد ہے وہ تاریکی جو صبح سے متصل ہوتی ہے۔

وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا (اور اسی نے رات کو آرام (پانے) کی چیز بنایا ہے)۔ انسان اور اکثر حیوان دن بھر کی معاشی

جد و جہد سے تھک کر رات کو گہری نیند سے سکون یاب ہوتا ہے یا یوں کہا جائے کہ ایک عارف دن بھر مخلوق کے ساتھ مشغول رہتا ہے جس سے اس کو وحشت ہوتی ہے رات کو تنہائی میں اپنے خالق سے انس گیر ہوتا ہے۔

وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا (اور سورج چاند کو اس نے حساب (اوقات) کی علامت بنایا ہے)۔ حُسْبَانٌ مصدر ہے اس کا ماضی حَسَبَ بفتح سین ہے (حساب کرنا) حِسْبَانٌ بکسر حاء بھی مصدر ہے اس کا ماضی حَسِبَ بکسر سین ہے (گمان کرنا) بعض علماء نے حسبان کو حساب کی جمع کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے چاند سورج کی رفتار کو حساب اوقات کی علامت بنایا ہے۔

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۹۶﴾ (یہ (حساب) غالب اور دانا ہستی کا ٹھہرایا ہوا ہے) یعنی وہ غالب ہے چاند سورج اس کے تابع فرمان ہیں۔ وہ علیم ہے چاند سورج کا نظام اور ان کے نافع ترین چکروں سے بخوبی واقف ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (وہی ایسا ہے جس نے ستاروں کو تمہارے لئے بنایا تاکہ ان کے ذریعہ سے تم راستہ معلوم کر سکو خشکی اور اندھیروں میں بھی اور سمندر کی تاریکیوں میں بھی ظُلُمٰتِ بَرّ و بَحْر میں اضافت ملابست کی وجہ سے ہے، مراد ہیں رات کی تاریکیاں جو خشکی اور سمندر میں ہوتی ہیں یا راستوں کی بھول بھلیاں مراد ہیں جن کو بطور استعارہ تاریکیاں کہا گیا ہے۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ (ہم نے کھول کر نشانیاں (یعنی خالق حکیم کی توحید کی دلیلیں) بیان کر دیں)۔

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾ (ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں) کیونکہ وہی اس بیان سے فائدہ اندوز ہوتے ہیں اگرچہ بیان ہر ایک کے لئے عام ہے عالم ہو یا جاہل۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (اور اللہ وہی ہے جس نے ایک شخص سے تمہاری ابتدائی تخلیق کی)۔ یعنی آدمؑ سے۔

فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ (پھر ایک جگہ زیادہ رہنے کی ہے اور ایک جگہ چندے رہنے کی) مُسْتَقَرٌّ اسم مفعول ہے یعنی تم میں سے بعض (زمین کے اوپر) ٹھہرائے گئے ہیں یا مصدر میمی یعنی تمہارے لئے (زمین پر) ٹھہراؤ ہے یا اسم ظرف ہے یعنی تمہارے لئے (زمین پر) ٹھہرنے کی جگہ ہے۔

مُسْتَوْدَعٌ بھی یا اسم مفعول ہے یا مصدر یا اسم ظرف، ترجمہ کا اختلاف حسب سابق ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا مُسْتَقَرٌّ رحم میں ہوتا ہے وقت پیدائش تک اور مستودع قبر میں ہوتا ہے وقت قیامت تک (یعنی مستقر سے مراد رحم مادر اور مستودع سے مراد قبر ہے) سعید بن جبیر نے کہا مستقر رحم میں اور مستودع باپ کی پشت میں ہوتا ہے حضرت ابیؓ کا قول اس کے برعکس روایت میں آیا ہے۔ مجاہد کا قول ہے مستقر زمین میں اور مستودع قبر میں ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ حسنؒ بصری کے نزدیک مستقر قبر میں اور مستودع دنیا میں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مستقر جنت اور دوزخ ہے اور مستودع باقی چیزیں خواہ پشت پدر ہو یا رحم مادر یا دنیا یا قبر۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾ (ہم نے سمجھنے والوں کے لئے (توحید کی) نشانیاں کھول کر بیان کر دیں)۔ ستارے نظروں کے سامنے تھے اس لئے وہاں لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ فرمایا لیکن بنی آدم کی ابتدائی تخلیق پھر ان کے استقرار و استیداع کا نظم سمجھنا دقیق نظر کا محتاج تھا اس لئے یہاں يَّفْقَهُوْنَ فرمایا۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (اور وہی ہے جس نے آسمان سے (ابر تک اور ابر سے زمین تک) پانی اتارا)

فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ (پھر ہم نے پانی سے (ہر قسم کے دانے اور گٹھلی کے اندر سے) ہر طرح کے نباتات کو باہر نکالا) سبحان اللہ ایک ہی قسم کے پانی سے ہر طرح کی سبزی کو سینچا جاتا ہے، مگر کھانے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

فَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهُ خَضِرًا (پھر اس (سبزے یا پانی) سے ہم نے سبز (شاخ) نکالی) یعنی تخم سے پھوٹ کر ایک سبزی نکلتی ہے پھر اس سبزی کی جڑ سے سبز شاخیں برآمد ہوتی ہیں، پھر۔

نُّخۡرِجُ مِنۡهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ (اس سبز شاخ سے ہم تہ بہ تہ چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں) یعنی بالیں دانوں سے بھری ہوئی پیدا ہوتی ہیں۔

وَمِنَ النَّخۡلِ مِنۡ طَلۡعِهَا قِنۡوَانٌ دَانِيَةٌ (اور کھجور کے درختوں (یعنی ان کے گیھوں میں) سے خوشے (نکلتے) ہیں جو (مارے بوجھ کے) نیچے کو لٹکے جاتے ہیں قِنۡوَانٌ کا واحد قِنۡوٌ ہے۔ قِنۡوٌ کا معنی ہے خوشہ، گچھا۔ دَانِيَةٌ سے مراد یا تو یہ ہے کہ توڑنے والے کے قریب ہوتے ہیں یا یہ مراد ہے کہ آپس میں ایک گچھا دوسرے سے قریب ہوتا ہے (دَانِيَةٌ کا صحیح ترجمہ وہ ہے جو مترجم نے آیت کے بعد ذکر کر دیا ہے۔

وَّجَنّٰتٍ مِّنۡ اَعۡنَابٍ (اور (ہم نے پانی سے پیدا کئے) انگوروں کے باغ) اس کا عطف نَبَاتَ كُلِّ شَيۡءٍ پر ہے۔

وَّالزَّيۡتُوۡنَ وَالرُّمَّانَ (اور زیتون و انار کے (درخت)) لفظ شَجَر، اَلزَّيۡتُوۡنَ اور اَلرُّمَّانَ سے پہلے محذوف ہے

مُشۡتَبِهًا وَّغَيۡرَ مُتَشَابِهٍ ؕ

(جو آپس میں ملتے جلتے بھی ہوتے ہیں اور ملتے جلتے نہیں بھی ہوتے) یہ اَلرُّمَّانَ سے حال ہے یعنی انار باہم ہم شکل بھی ہوتے ہیں اور ہم شکل نہیں بھی ہوتے ہیں یا مجموعہ سے حال ہے یعنی مذکورہ بالا مجموعہ میں سے شکل، مقدار، رنگ اور مزہ میں کوئی تو کسی سے ملتا جلتا ہوتا ہے اور کوئی ملتا جلتا نہیں ہوتا۔

اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَيَنۡعِهٖ ؕ (اے لوگو! (بصیرت کی نظر سے) دیکھو ہر ایک کے پھل کو جب وہ پھلتا ہے اور اس کے پختہ ہونے کو) ثَمَر اسم جنس ہے جیسے تَمۡر اور تَمۡرَة، کَلِم اور کَلِمَة یعنی بصیرت کی نظر سے دیکھو کہ جب پھل پیدا ہوتا ہے تو کیسا چھوٹا اور بے کار ہوتا ہے اور پھر پک کر کیسا بڑا اور لذیز ہو جاتا ہے۔ يَنۡع مصدر ہے، بعض کے نزدیک يَانِع کی جمع ہے جیسے تَجۡر تاجر کی جمع ہے۔

اِنَّ فِىۡ ذٰلِكُمۡ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ۝۹۹ (مذکورہ بالا چیزوں میں ایماندار لوگوں کے لئے (قادر حکیم اللہ کی توحید کی) بڑی نشانیاں ہیں) جس کا نہ کوئی حریف مخالف ہے نہ مثل مقابل اور یہ نشانیاں صرف ایمانداروں کے لئے اس لئے ہیں کہ وہ ہی ان سے توحید پر استدلال کرتے ہیں۔

وَجَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الۡجِنَّ (اور (باوجود دلائل توحید قائم ہونے کے کفار مکہ نے) جنات کو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے)۔ آیات توحید کا ذکر تقاضا کر رہا تھا کہ مشرکوں کو سرزنش کی جائے اس لئے مشرکوں کی مذمت کی۔ اَلۡجِنَّ سے مراد ہیں ملائکہ کیونکہ فرشتے نظروں سے مخفی ہیں اور مرتبہ ربوبیت سے قاصر ہیں۔ ملائکہ کو شریک بنانے کا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے ملائکہ کی پوجا کی اور ان کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا یا شیاطین مراد ہیں۔ شیاطین کے بہکانے سے مشرکوں نے بتوں کی پوجا کی اور شیطانوں کا کہا مانا یہ ہی شیاطین کو شریک خدا بنانے کا مطلب ہے۔ یا شیاطین کو شریک بنانے کا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے شیاطین کی پوجا کی کیونکہ شیاطین بھی بتوں کے اندر گھس جاتے تھے اور مشرک بتوں کی پوجا کرتے تھے تو یہ شیطانوں کی پوجا ہوئی یا شرک کا یہ مطلب ہے کہ وہ اللہ کو خیر کا اور شیطان کو شر کا خالق کہتے تھے۔

جَعَلُوۡا کا پہلا مفعول شُرَكَآء اور دوسرا مفعول اَلۡجِنَّ ہے اور لِلّٰهِ کا تعلق شُرَكَآء سے ہے یا اللہ اور شُرَكَآء دو مفعول ہیں اور اَلۡجِنَّ، شُرَكَآء سے بدل ہے۔

وَخَلَقَهُمۡ (حالانکہ اللہ ہی نے ان سب کو پیدا کیا) یعنی یہ جانتے ہوئے کہ اللہ نے جن، انس اور ہر چیز کو پیدا کیا اور جن کسی چیز کے خالق نہیں وہ اللہ کے ساتھ جن کو شریک بناتے ہیں۔

وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ (اور (مشرکوں نے) اپنے دلوں سے گھڑ لئے ہیں اللہ کے لئے بیٹے اور بیٹیاں)۔

یہودی حضرت عزیزؑ کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے اور عیسائی حضرت مسیحؑ کو ابن اللہ قرار دیتے تھے اور (بت پرست) مشرک فرشتوں کو ۱۲ ع ۲ ۱۸

خدا کی بیٹیاں مانتے تھے مگر بغیر کسی عقلی و نقلی دلیل کے بے ثبوت ایسی افترابندیاں کرتے تھے۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝۱۰۰ (وہ پاک اور برتر ہے ان باتوں سے جن کو یہ لوگ بیان کرتے ہیں)۔ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ ۭ (وہ آسمانوں کا اور زمین کا بغیر نمونہ کے موجد ہے)۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں صفت کی موصوف کی جانب اضافت ہے یعنی آسمان و زمین اس کی نادر تخلیق ہے، جس کی کوئی نظیر نہیں۔ بعض نے بَدِيْعُ کو بمعنی مُبْدِعٌ کہا ہے یعنی بغیر سابق مثال کے عدم سے وجود میں لانے والا۔

اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ (جب اس کی بیوی ہی نہیں تو اس کی اولاد کہاں سے (یا کیسے) ہو سکتی ہے)۔

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۰۱ (اور اس نے ہر چیز اندازہ کے ساتھ پیدا کی ہے اور وہ ہی ہر چیز کو خوب جانتا ہے)۔

آیت سے بوجوہ ذیل نفی ولدیت ثابت ہو رہی ہے (۱)..... آسمان و زمین اللہ کی بے مثال تخلیق ہے یہ اگرچہ دوسری مخلوق کے ساتھ جنسیت میں شریک ہیں جس کی وجہ سے والدیت کی صفت ان میں آسکتی ہے لیکن چونکہ یہ طویل البقاء ہیں۔ ایک طویل مدت سے ایک حالت پر قائم ہیں اس لئے والدیت سے بے نیاز ہیں (ان کو اولاد کی ضرورت نہیں اولاد کی ضرورت اس کو ہوتی ہے جو محدود مختصر مدت حیات رکھتا ہو پھر بھی ان کی مدت بقاء کسی وقت ختم ہو گی ان کی ہستی دوامی نہیں اور اللہ کی ہستی قدیم لازوال غیر فانی ہے ایسی حالت میں تو اس کا اولاد سے بے نیاز ہونا بالکل ہی ضروری ہے۔

۲..... اللہ تمام (چھوٹے) بڑے اجسام کا خالق ہے اور خالق اجسام خود جسم نہیں ہو سکتا اور والدیت جسم کی خصوصیت ہے۔

۳..... اولاد دو ہم جنس صنفوں کے ملاپ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے نر و مادہ (جو ہم جنس بھی ہوں) کی ضرورت ہے اور اللہ کا کوئی ہم جنس نہیں (اللہ کے سوا نہ کوئی قدیم ہے نہ واجب نہ غیر مخلوق)۔

۴..... بچہ باپ کا کفو اور مثل ہوتا ہے، لیکن اللہ کے علاوہ ہر چیز مخلوق ہے اس لئے کوئی بھی اس کا کفو نہیں۔

۵..... اللہ ہر چیز کا عالم ہے اور اللہ کے سوا کوئی بھی ہمہ گیر علم نہیں رکھتا، ہاں اگر اللہ ہی کسی کو علم محیط عطا فرما دے تو خیر (مگر اللہ نے کسی کو محیط کل علم نہیں عطا فرمایا)۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (یہ ہے اللہ تمہارا رب اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے) یہ سب پیہم خبریں ہیں یا بعض خبریں اور بعض بدل یا صفت۔

فَاعْبُدُوْهُ ۚ (لہٰذا اس کی عبادت کرو) فاء سببیہ ہے (یعنی سابق کلام عبادت کی علت ہے) مطلب یہ ہے کہ اوصاف مذکورہ کا حامل صرف اللہ ہے لہٰذا وہ ہی معبود ہونے کا مستحق ہے کسی اور کو استحقاق عبادت نہیں۔

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝۱۰۲ (اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے) یعنی ہر چیز کی نگرانی اور نظم کا ذمہ دار ہے۔ مطلب یہ کہ وہ تمہارے سب کاموں کا ذمہ دار اور تمہارے مال کا نگراں ہے۔ پس اپنے سارے کام اسی کے سپرد کرو اور عبادت کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ بناؤ وہ تمہارے کام بنا دے گا اور نیکیوں کی جزاء عطا فرمائے گا۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ (اس کو نگاہیں محیط نہیں ہو سکتیں) ابن ابی حاتم وغیرہ نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر جن و بشر اور شیاطین و ملائکہ سب آغاز آفرینش سے آخری لمحۂ حیات تک یک قطار ہو کر (اللہ کا معائنہ کریں تو) کبھی اللہ کا احاطہ نہ کر پائیں گے۔ فرقۂ معتزلہ نے اس آیت سے

استدلال کیا ہے کہ اللہ کا دیدار محال ہے۔ اہل سنت قائل ہیں کہ دنیا میں اللہ کا دیدار نہیں ہو سکتا۔ جنت کے اندر مؤمنوں کو نصیب ہوگا۔ آیت سے معتزلہ کا استدلال غلط ہے۔ (1) لَا تُدْرِکُ مضارع کا صیغہ ہے اور صیغہ مضارع کی حقیقی وضع حال کے لئے ہے استقبال کے لئے استعمال مجازی ہے یا حال و استقبال دونوں کے لئے بطور اشتراک مضارع کی وضع ہے اور آیت میں فی الحال نفی رویت تو بالاجماع مراد ہی ہے، دنیا میں اللہ کے دیدار کے جواز کا قائل کوئی نہیں۔ ایسی حالت میں استقبال میں بھی نفی رویت مراد ہونا غلط ہے ورنہ (بر صورت اول) حقیقت و مجاز دونوں کا ایک وقت میں مراد ہونا لازم آئے گا یا (بر صورت دوئم) عموم مشترک کا قائل ہونا پڑے گا جو ناجائز ہے (یعنی ایک وقت میں ایک لفظ مشترک کے دونوں معنی مراد لینا درست نہیں اس کو عموم مشترک کہتے ہیں۔

۲...... اَلْاَبْصَارُ جمع کا صیغہ ہے اس لئے جنس بصر تو مراد ہو ہی نہیں سکتی بلکہ مجموعہ افراد مراد ہوگا۔ اب اگر الف لام کو عہدی قرار دیا جائے گا تو وہ ابصار مراد ہوں گے جو دنیا میں موجود ہیں (اور معنی یہ ہوں گے کہ دنیا میں تمام بینائیاں اللہ کو نہیں دیکھ سکتیں) پس اس سے یہ کہاں نکلا کہ جنت میں مؤمنوں کی آنکھیں بھی نہ دیکھ سکیں گی اور اگر الف لام کو استغراقی کہا جائے تو آیت میں استغراق کی نفی کی گئی ہے (یعنی سب آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں) نفی رؤیت کا استغراق نہیں ہے (یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی یہاں تک کہ جنت میں کوئی **مومن بھی نہیں دیکھ سکتا**) ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ تلاوت فرمائی، پھر فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا موسیٰؑ مجھے جو زندہ دیکھے گا، مر جائے گا جو خشک (پتھر وغیرہ) دیکھے گا لڑھک جائے گا اور جو تر (درخت وغیرہ) دیکھے گا پھٹ جائے گا اور اس کے اجزاء پراگندہ ہو جائیں گے۔ مجھے صرف جنت والے دیکھیں گے، ان کی آنکھیں مردہ نہ ہوں گی اور ان کے بدن بوسیدہ نہ ہوں گے۔

۳...... آیت میں نفی ادراک کی صراحت ہے نفی رؤیت کا ذکر نہیں ادراک اور رویت میں فرق ہے۔ رؤیت کا معنی ہے "دیکھنا" اور ادراک کا معنی ہے "کسی چیز کی حقیقت پالینا" اور اس کو ہر طرف سے گھیر لینا یا کامل طور پر کسی چیز تک پہنچ جانا (یعنی پورے طور پر اس چیز کو پالینا) رؤیت اور ادراک میں تلازم نہیں ہے۔ دیکھو اللہ نے فرمایا فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓی اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ قَالَ کَلَّا جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تو موسیٰؑ کے ساتھیوں نے کہا اب یقیناً ہم تک یہ پہنچ جائیں گے (ہم پکڑے جائیں گے) موسیٰؑ نے کہا ہرگز نہیں (یہ تم کو نہیں پا سکتے) اس آیت میں طرفین سے رویت ہونے کا تو ثبوت ہے مگر ادراک کی پرزور نفی ہے۔

۴...... اچھا رؤیت اور ادراک کو اگر ہم معنی تسلیم بھی کر لیا جائے تو) آیت میں نفی رویت کی صراحت ہے (کوئی آنکھ اس کو نہیں دیکھتی) رؤیت محال ہونے کی صراحت نہیں (یعنی یہ مطلب نہیں کہ کوئی آنکھ اس کو دیکھ ہی نہیں سکتی)۔

وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (اور وہ تمام نگاہوں کو محیط ہے) یعنی اس کا علم محیط ہے۔

وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾ (اور وہی باریک ہے وباخبر ہے)۔ لطیف کا معنی صاحب قاموس نے لکھا ہے اپنے بندوں سے بھلائی کرنے والا، اپنی مہربانی سے مخلوق کو فائدہ پہنچانے والا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اپنے دوستوں پر مہربان۔ صاحب قاموس نے لطیف کا معنی پوشیدہ امور کا عالم بھی لکھا ہے۔ صحاح میں ہے کبھی لطیف ایسی چیز کو بھی کہتے ہیں جس کا ادراک حس سے نہ ہو سکے (یعنی محسوس نہ ہو) صاحب صحاح کی توضیح کے موافق آیت میں لف و نشر مرتب ہوگا، کلام اس طرح ہوگا اس کو نگاہیں نہیں پاتیں کیونکہ وہ غیر محسوس ہے وہ نگاہوں کو پالیتا ہے کیونکہ باخبر ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا (اب بلاشبہ تمہارے پاس حق بینی کے ذرائع پہنچ چکے ہیں سو جو شخص دیکھ لیگا اور جو شخص اندھا رہے گا وہ اپنا نقصان کرے گا) بَصَآئِرُ کھلی ہوئی دلیلیں

جن سے گمراہی وہدایت اور حق وباطل میں امتیاز کرنے والی بصیرت حاصل ہو جائے۔ بصیرت: نفس کی بینائی۔ بصر: جسمانی آنکھ کی بینائی۔ یعنی جو دلیل سے کام لے گا حق کو دیکھے گا اور اس پر ایمان لائے گا تو اس کا فائدہ خود اسی کو پہنچے گا اور جو حق کی طرف سے اندھا ہو جائے گا، دلائل سے روگرداں ہو کر گم گشتہ راہ بنجائے گا تو اس کا برا انجام اسی کو بھگتنا ہو گا۔

وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۱۰۴﴾ (آپ کہہ دیجئے کہ) میں تمہارا نگراں نہیں ہوں) یعنی میں تمہارے اعمال کا نگراں نہیں، نہ سزا جزا دینے والا ہوں میں تو صرف بشیر ونذیر ہوں۔ حفیظ تو اللہ ہے۔ جملہ مذکورہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے کہلوایا ہے گویا یوں فرمایا آپ کہہ دیجئے کہ دلائل واضحہ آگئیں، دلائل کی روشنی میں راہ حق دیکھنا نہ دیکھنا تمہارا کام ہے، نفع نقصان تمہارا ہے، میں تمہارے اعمال کی سزا جزا دینے والا نہیں، میرا کام تو صرف ڈرانا اور بشارت دینا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ (ہم اسی طرح آیات کی تفصیل کرتے ہیں یا کھول کر بیان کرتے ہیں) صَرْف کا لغوی معنی ہے کسی چیز کو ایک حال سے دوسرے حال کی جانب منتقل کرنا (تبدیل حالت، تغیر وغیرہ کا مفہوم صرف کے مفہوم کے قریب ہے) کسی معنی کی تفصیل بھی اسی طرح ہوتی ہے کہ ایک عبارت سے دوسری عبارت کی طرف اداء معنی کے لئے انتقال کیا جاتا ہے تاکہ مخاطب سمجھ لے۔ قاموس میں ہے صَرْفُ الْحَدِيْث کا معنی ہے بات میں کچھ بڑھانا اور اس کو خوبصورت بنا دینا۔ یہ لفظ صَرْف فِي الدَّرَاهِم کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کا معنی ہے بعض دراہم کی قیمت کا بعض دراہم سے زیادہ ہونا۔ صَرْفُ الْكَلَام کا معنی بھی صرف الحدیث کی طرح ہے لَهٗ عَلَيْهِ صَرْفٌ اس کی اسی پر بیشی ہے، برتری ہے۔ برتر چیز ممتاز ہوتی ہی ہے۔

وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ (تاکہ تبلیغ پورے طور پر ہو جائے اور اس لئے بھی کہ اس کے نتیجہ میں کفار کہہ دیں تم تو (کسی سے) سیکھ آئے ہو (جب ہی ایسی باتیں کہہ رہے ہو) وَلِيَقُوْلُوْا کا عطف محذوف پر ہے اور اس میں لام عاقبت ہے (یعنی تفصیل آیات کا لازمی نتیجہ یہ نکلے کہ کافر کہہ دیں تم یہ باتیں کسی سے پڑھ کر آئے ہو) دَرَسْتَ الْكُتُبَ تم نے کتاب کسی سے پڑھ لی (گویا درس کتاب کا معنی ہے کسی سے کتاب پڑھنا سیکھنا) حضرت ابن عباسؓ نے آیت کا توضیحی مطلب اس طرح بیان کیا ہے جب اہل مکہ کے سامنے تم قرآن پڑھو تو وہ کہیں کہ تم بسیار اور جبر سے یہ کلام سیکھ آئے ہو، یہ دونوں شخص رومی غلام تھے (اور شاید انجیل سے واقف تھے) اور پھر ہم کو پڑھ کر سناتے ہو اور دعوی یہ کرتے ہو کہ یہ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس آیا ہے۔

وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ (اور تاکہ جاننے والے لوگوں کے (فائدہ کے لئے) ہم اس قرآن کو کھول کر بیان کر دیں) قرآن کا نزول اگرچہ سارے جہان کے لئے ہے صرف اہل علم کے لئے خاص نہیں لیکن اس سے فائدہ اندوز صرف اہل علم ہوتے ہیں (اس لئے گویا قرآن کا نزول انہی کے لئے ہوا)۔

لِنُبَيِّنَهٗ میں ضمیر غائب قرآن کی طرف راجع ہے آیات کا لفظ سابق کلام میں آگیا ہے اور آیات سے مراد ہے قرآن، اس لئے قرآن کی طرف ضمیر راجع ہونا صحیح ہے۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ تصریف آیات کے تین مقصد ہیں۔

۱...... تکمیل تبلیغ۔ ۲...... (جو شخص اس کو کسی انسان کا سکھلایا ہوا کلام کہے اس کا بدنصیب ہو جانا۔ ۳...... جس کے سامنے حق واضح ہو جائے اور وہ مان لے تو اس کا سعادت مند ہو جانا۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ (آپ اسی کا اتباع کریں جو آپ کے رب کی طرف سے آپ کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا گیا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں) یعنی قرآن پر آپ عمل کریں۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یا تو رب سے حال مؤکد ہے یعنی الوہیت تنہا۔ یا مستقل علیحدہ جملہ ہے اتباع قرآن کے وجوبی حکم کی تاکید کے لئے اس کو ذکر کیا گیا ہے۔

وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ (اور مشرکوں کی طرف التفات نہ کریں یعنی مشرکوں سے جھگڑا نہ کرو، ان کی

بات نہ سنو، ان کے خیالات کی طرف توجہ نہ دو۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْاؕ (اور اگر اللہ (ان کو مؤمن بنانا) چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے)۔ مگر اللہ کی بات تو پوری ہونی ہے کہ میں جہنم کو جن وانس سے بھر دوں گا۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ کفر و ایمان ہر ایک اللہ کے ارادہ کے تحت ہوتا ہے اور اللہ کے ارادہ کا پورا ہونا ضروری ہے۔ فرقہ معتزلہ کی رائے اس کے خلاف ہے (ان کا قول ہے کہ اللہ کفر کا ارادہ نہیں کرتا، بندہ خود کفر کا ارادہ کرتا ہے)۔

وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًاۚ (اور ہم نے آپ کو ان کا نگراں نہیں بنایا) کہ آپ ان کے اعمال کی چوکیداری کریں اور ان کے جرم کا آپ سے مواخذہ ہو۔ عطاء نے اس طرح تشریح کی ہے ہم نے آپ کو ان کا نگہبان و محافظ نہیں بنایا کہ اللہ کے عذاب سے آپ ان کو بچالیں۔ آپ کو صرف معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾ (اور آپ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں) کہ ان کی کارسازی آپ کے ذمہ ہو۔ ابن عبدالرزاق نے بسلسلۂ معمر قتادہ کا بیان نقل کیا ہے کہ مسلمان کافروں کو گالیاں دیتے تھے، اس پر کافر بھی مسلمانوں کو گالیاں دیتے تھے، اس کی ممانعت میں آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍؕ (اور دشنام نہ دو ان کو جن کی خدا کو چھوڑ کر یہ لوگ عبادت کرتے ہیں کہ پھر یہ بھی براہ جہل حد سے آگے بڑھ کر اللہ کی شان میں گستاخی کریں گے)۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب آیت اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ نازل ہوئی تو مشرکوں نے کہا کہ محمد ﷺ یا تو ہمارے معبودوں کی ہجو کرنے سے تم باز آجاؤ، ورنہ ہم بھی تمہارے رب کی ہجو کریں گے، اس پر اللہ نے مسلمانوں کو بتوں کی ہجو کرنے سے منع فرمادیا۔

سدی کا بیان ہے کہ جب ابو طالب کے انتقال کا وقت آپہنچا تو قریش نے کہا چلو اس شخص سے چل کر کہیں کہ اپنے بھتیجا کو ہم سے روک دے کیونکہ ہم کو شرم آتی ہے کہ اس شخص کے مرنے کے بعد جب اس کے بھتیجا کو قتل کردیں تو لوگ کہنے لگیں کہ چچا اس کی حفاظت کرتا تھا چچا مر گیا تو لوگوں نے اس کو مار ڈالا۔ چنانچہ ابو سفیان، ابو جہل، نضر بن حارث، امیہ بن خلف، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، عمرو بن عاص اور اسود بن ابوالبختری جمع ہو کر ابو طالب کے پاس گئے اور کہا ابو طالب آپ ہمارے بزرگ اور سردار ہیں مگر محمد ﷺ نے ہم کو اور ہمارے معبودوں کو دکھ دے رکھا ہے، اگر آپ پسند کریں تو محمد ﷺ کو بلوا کر اس حرکت سے روکئے وہ ہمارے معبودوں کا ذکر نہ کرے، ہم اس کو اور اس کے معبود کو کچھ نہیں کہیں گے۔

ابو طالب نے رسول اللہ ﷺ کو بلوایا اور کہا تیری قوم والے چاہتے ہیں کہ تو ہم سے اور ہمارے معبودوں سے کچھ تعرض نہ کر ہم تجھے اور تیرے معبود کو کچھ نہ کہیں گے اور بات بھی یہ انصاف کی کہہ رہے ہیں لہٰذا (بھتیجے) تو یہ بات مان لے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں تمہاری یہ بات مان لوں تو کیا تم بھی میری ایک بات مان لو گے جس کو مان لینے کے بعد تم عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم بھی تمہارے زیر حکم آجائیں گے۔ ابو جہل نے کہا تیرے باپ کی قسم ایک بات نہیں ایسی ایسی دس باتیں ہم مان لیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے قائل ہو جاؤ۔ قریش نے انکار کر دیا اور چلے گئے۔ ابو طالب نے کہا بھتیجے اس کے علاوہ کوئی اور بات کہو (کہ یہ مان لیں) حضور ﷺ نے فرمایا چچا میں کوئی اور بات کہنے والا نہیں خواہ یہ لوگ سورج کو لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔ قریش نے کہا ہمارے معبودوں کو برا کہنے سے باز آجاؤ، ورنہ ہم تم کو اور جو تم کو حکم دیتا ہے اس کو دشنام دیں گے۔ اس پر اللہ نے نازل فرمایا وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی بتوں کی برائیوں کا ذکر نہ کرو۔

بغیر علم کا ترجمہ ہے براہ جہالت یعنی اللہ اور اللہ کی صفات ثبوتیہ وسلبیہ کا علم نہ رکھنے کی وجہ سے ظاہر آیت میں اگرچہ بتوں کی ہجاء کرنے کی ممانعت کی گئی ہے لیکن حقیقت میں یہ اللہ کو دشنام طرازیوں سے بچانے کی ہدایت ہے کیونکہ بتوں کو دشنام دینے کا نتیجہ اللہ کو دشنام دینا ہے۔ اس آیت سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو طاعت معصیت غالبہ تک پہنچانے والی ہو اس کو

ترک کرنا واجب ہے کیونکہ شر تک پہنچانے والی چیز بھی شر ہے۔

كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ (اسی طرح ہم نے ہر طریقہ والوں کی نظر میں ان کے اعمال پسندیدہ بنادیئے ہیں) یعنی جس طرح ان کافروں کی نظر میں اللہ کو دشنام دینا مرغوب بنادیا اسی طرح ہر طریقہ والوں کو لفظ امت سے مراد ہے طریقہ والے مؤمن ہوں یا کافر۔ پھر کافروں میں سے بھی جدا جدا طریقوں والے سب کو اپنے اپنے مذہبی اعمال مرغوب ہیں۔ عمل سے مراد ہے خیر و شر۔ اللہ اگر توفیق خیر دے تو خیر محبوب ہو جاتی ہے اگر خیر کی توفیق نہ دے تو شر پسند خاطر بن جاتی ہے۔ ہدایت یاب کرنا اور گمراہ کرنا ہر ایک کا اختیار اللہ ہی کو ہے۔ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ بندہ کے لئے مفید ہو وہ چیز عطا کرنا اللہ پر لازم نہیں (ایمان اور خیر ہر شخص کے لئے نافع ہے مگر اللہ بعض لوگوں کو کفر و شر مرغوب خاطر بنادیتا ہے)۔

ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ (پھر اپنے رب کے پاس ہی ان کو واپس جانا ہے وہی ان کو (حساب فہمی کر کے اور سزا جزا دے کے) جتلادے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے) یعنی نیکی یا بدی ان کے سامنے لے آئے گا۔

ابن جریر اور بغوی نے محمد بن کعب قرظی کی روایت سے نیز بغوی نے کلبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کی اور عرض کیا محمد ﷺ آپ ہم کو بتاتے ہیں کہ موسیٰؑ کے پاس ایک لاٹھی تھی جس کو پتھر پر مار کر پتھر کے اندر سے بارہ چشمے جاری کر دیتے تھے اور عیسیٰؑ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے اور صالح نے قوم ثمود کے لئے (پتھروں سے) ایک اونٹنی برآمد کر دی تھی، لہٰذا تم بھی اسی طرح کے معجزات میں سے کوئی معجزہ دکھاؤ تو ہم تم کو سچا مان لیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم مجھ سے کیا معجزہ چاہتے ہو۔ قریش نے کہا کوہ صفا کو ہمارے لئے سونے کا کر دو۔ بغوی کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ یا ہمارے بعض مردوں کو زندہ کر کے اٹھادو تاکہ تمہارے متعلق ہم ان سے دریافت کریں کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ صحیح ہے یا غلط یا ملائکہ کو ہمارے سامنے لے آؤ کہ وہ تمہاری تصدیق کریں۔ ابن جریرؒ اور بغویؒ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تمہاری درخواست کے مطابق میں کچھ کر دوں تو کیا پھر تم میری تصدیق کرو گے کہنے لگے۔ بے شک خدا کی قسم اگر تم ایسا کرو گے تو ہم سب تمہارے پیرو ہو جائیں گے۔

مسلمانوں نے بھی حضور ﷺ سے درخواست کی کہ ان کی گزارش کے مطابق کوئی معجزہ پیش کر دیجئے تاکہ یہ ایمان لے آئیں۔ رسول اللہ ﷺ دعا کرنے کھڑے ہوئے کہ اللہ کوہ صفا کو سونے کا کر دے۔ فوراً جبرئیل آگئے اور اللہ کی طرف سے پیام لائے کہ اگر آپ چاہتے ہیں تو کوہ صفا سونے کا ہو جائے گا لیکن اس کے بعد اگر انہوں نے تصدیق نہ کی تو میں ان پر عذاب نازل کروں گا اور اگر آپ کی خواہش ہو تو میں ان کو یونہی رہنے دوں تاکہ ان میں سے جو توبہ کرنے والے ہیں توبہ کر لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (یونہی چھوڑ دیا جائے تاکہ ان پر عذاب نہ آئے) بلکہ جو توبہ کرنے والے ہیں وہ توبہ کر لیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ (اور (کافروں نے) قسموں میں بڑا زور لگا کر اللہ کی قسم کھائی کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی (مطلوبہ معجزہ) آجائے تو وہ ضرور ہی اس پر ایمان لے آئیں گے) یعنی جس قدر محکم ترین قسم کھانا ان کے بس میں ہے اتنی مضبوط قسم کھانے کی کوشش کرتے ہوئے انہوں نے کہا اس ترجمہ پر جهد مصدر (بمعنی اسم فاعل) ترکیب عبارت میں حال ہو گا یا جَهْد کو مفعول مطلق کہا جائے گا یعنی پختہ قسمیں کھا کر انہوں نے کہا چونکہ پیش نظر معجزات کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی اور اپنے مطلوبہ معجزات پر ان کو اڑ تھی اس لئے کلام کو پختہ قسموں کے ساتھ محکم کیا۔ اٰيَةٌ سے مراد ہے مطلوبہ معجزہ۔

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ (آپ کہہ دیجئے تمام معجزات اللہ کے بس میں ہیں) وہی جو معجزہ چاہتا ہے نمودار کرتا ہے، میرے اختیار میں کوئی معجزہ نہیں۔

وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ (اور تم کو اس کی کیا خبر (بلکہ ہم کو خبر ہے) کہ وہ نشانیاں

جس وقت آجائیں گی جب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے) مَا یُشْعِرُکُمْ میں مَا نافیہ ہے یا مَا استفہامیہ انکاریہ ہے۔ پرزور طور پر مسبب کے انکار کے لئے سبب کا انکار کیا گیا ہے۔ دونوں صورتوں میں مخاطب یا قسمیں کھانے والے مشرک ہیں یا مؤمن۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو (اے مسلمانو یا اے مشرکو) نہیں معلوم کہ معجزہ آنے کے بعد بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے، یعنی اللہ ہی جانتا ہے کہ ایمان نہیں لائیں گے، ان کے مبادیٔ تعین اللہ کے اسم مضل کا پرتو ہیں، ان کا ہدایت یاب ہونا ممکن ہی نہیں۔ بعض علماء کے نزدیک لَا یُؤْمِنُوْنَ میں لَا زائد ہے جیسے آیت حَرَامٌ عَلٰی قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَا اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ میں لَا زائد ہے۔ اس وقت ترجمہ اس طرح ہوگا کہ تم کو کیا معلوم کہ ظہور معجزہ کے بعد وہ ایمان لے آئیں گے۔ بعض اہل علم کے نزدیک اَنَّھَا کا معنی لَعَلَّھَا ہے یعنی تم کو کیا معلوم کہ ظہور معجزہ کے بعد مشرکوں کی کیا رفتار ہے، شاید وہ ایمان نہ لائیں، بعض کے نزدیک لَا یُؤْمِنُوْنَ کے بعد اَوْ یُؤْمِنُوْنَ محذوف ہے یعنی تم کو نہیں معلوم کہ معجزہ آنے کے بعد یہ ایمان نہیں لائیں گے یا لائیں گے۔

وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَھُمْ وَاَبْصَارَھُمْ کَمَا لَمْ یُؤْمِنُوْا بِہٖٓ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّنَذَرُھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ ۱۳ ع ۱۰ ۱۹

(اور ہم بھی ان کے دلوں کو (حق کو سمجھنے سے) اور ان کی آنکھوں کو (سبق اندوز نظر سے دیکھنے سے) پھیر دیں گے) (کہ آیات مطلوبہ سامنے آنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے) جس طرح پہلی دفعہ (کھلے ہوئے محسوس) معجزات پر ایمان نہیں لائے (مثلاً معجزۂ شق القمر وغیرہ دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائے) اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں حیران پڑا رہنے دیں گے۔ راہ حق پر نہیں چلائیں گے۔

﴿ساتواں پارہ ختم، الحمد للہ﴾

...... آٹھواں پارہ شروع ......

بفضلہٖ و توفیقہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اور اگر ہم ان کے پاس فرشتوں کو بھیج دیتے اور ان سے مردے باتیں کرنے لگتے اور ہم تمام موجودات (غیبیہ) کو ان کی آنکھوں کے روبرو لا کر جمع کر دیتے تب بھی یہ ایمان نہ لاتے، ہاں اگر اللہ ہی چاہے تو اور بات ہے۔

مردوں کے کلام کرنے سے یہ مراد ہے کہ مردے ان سے آپ کی نبوت کی تصدیق کر دیں۔ قُبُلًا یا مصدر ہے سامنے آنا یا قبیل کی جمع ہے اور قبیل یا قبیلۃ کی جمع ہے بمعنی جماعت یا صفت مشبہ کا صیغہ ہے بمعنی کفیل یعنی جو کچھ ان کو (جنت کی) بشارت اور (دوزخ سے) تخویف کی گئی ہے اس سب کی کفیل اور ذمہ دار۔

مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ ان کے کافر ہونے کا ازل میں فیصلہ ہو چکا ہے اور ان کا مبدأ تعین اللہ کے اسم مضل کا پرتو ہے اسلئے وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ کا یہ مطلب ہے کہ اگر ان کیلئے ازل میں مؤمن ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اللہ کی ازلی مشیت کا اقتضاء ہے تو وہ مؤمن ہو جائیں گے ورنہ اور کسی صورت سے ایمان نہیں لائیں گے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ (لیکن ان میں زیادہ لوگ نہیں جانتے)۔ باوجودیکہ نادانی تمام مشرکوں کو محیط تھی مگر اکثر مشرکوں کو نادان فرمایا، اس کی وجہ کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جہالت سے ہر طرح کی نادانی مراد نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے کہ ہر طرح کے نشانات و معجزات نمودار ہونے کے بعد بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے، اسی بناء پر وہ انجانی بات پر پختہ قسمیں کھاتے ہیں یا ھُمْ کی ضمیر مسلمانوں کی طرف راجع ہے یعنی اکثر مسلمان ناواقف ہیں کہ یہ مشرک کسی طرح ایمان نہیں لائیں گے اس نادانی کی وجہ سے وہ آرزو کرتے ہیں کہ مطلوبہ معجزات کا ظہور ہو جائے تاکہ یہ لوگ ایمان لے آئیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (اور (جس طرح کفار قریش کو ہم نے آپ کا دشمن بنایا ہے کہ وہ آپ کی مخالفت کرتے اور آپ کو دکھ دیتے ہیں) اسی طرح ہر (گزشتہ) پیغمبر کا دشمن جن و بشر میں سے شیطانوں کو بنا دیا تھا)۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کا انبیاء سے عداوت رکھنا بھی اللہ کے زیر تخلیق ہے (کافر خود خالق کفر و عداوت نہیں۔ اس سے معتزلہ کے قول کی تردید ہوتی ہے کہ بندہ خود اپنے افعال کا خالق ہے) شَيٰطِيْنَ سے مراد ہیں سرکش جن و انس۔ قتادہؒ، مجاہدؒ اور حسنؒ نے فرمایا انسانوں میں سے کچھ شیطان ہوتے ہیں۔ جو چیز بھی حد سے تجاوز کرنے والی سرکش ہو وہ شیطان ہے۔

میں کہتا ہوں اس کی تائید حضرت جابرؓ کے بیان سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اول ہم کو کتوں کو قتل کر دینے کا حکم دیا تھا پھر ممانعت فرما دی اور فرمایا کالے بھجنگ کتے کو جو دو نقطوں والا ہو قتل کر دیا کرو، وہ بلا شبہ شیطان ہوتا ہے۔ رواہ مسلم۔ علماء نے لکھا ہے کہ جب مؤمن کو اغوا کرنے سے شیطان عاجز ہو جاتا ہے تو پھر کسی شیطان آدمی یعنی سرکش انسان کے

پاس جاکر مومن کو بہکانے پر اکساتا ہے۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت بھی اسی پر دلالت کر رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کیا شیاطین جن وانس کے شر سے تو نے اللہ کی پناہ مانگی۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا انسانوں میں بھی شیاطین ہوتے ہیں فرمایا ہاں وہ شیاطین جن سے زیادہ شریر ہوتے ہیں۔

مالک بن دینار کا قول ہے کہ شیاطین انس شیاطین جن سے زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ جب میں اللہ کی پناہ لے لیتا ہوں تو شیاطین جن تو میرے پاس سے چلے جاتے ہیں اور شیاطین انس آکر مجھے علے الاعلان گناہ کی طرف کھینچتے ہیں۔ عکرمہ، ضحاک، سدی اور کلبی کے نزدیک شیاطین الانس سے مراد وہ شیاطین ہیں جو آدمیوں (کو بہکانے کے لئے ان) کے ساتھ رہتے ہیں اور شیاطین الجن وہ ہیں جو جنات کے ساتھ رہتے ہیں۔ انسان شیطان نہیں ہوتا۔ ابلیس نے اپنی (جناتی) فوج کو دو حصوں میں تقسیم کرر کھا ہے ایک حصہ کو جنات (کو بہکانے) کے لئے اور دوسرے حصہ کو آدمیوں (کو اغواء کرنے) کیلئے مقرر کرر کھا ہے۔ دونوں فریق رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دوستوں کے دشمن ہیں۔ ہر فریق ہر وقت دوسرے فریق سے ملتا رہتا ہے۔ شیاطین انس شیاطین جن سے کہتے ہیں ہم نے اپنی آسامی کو اس طرح بہکایا تم بھی اپنی آسامی کو اسی طرح گمراہ کرو۔ شیاطین جن بھی شیاطین انس سے یہی کہتے ہیں یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ کا یہی مطلب ہے، اول الذکر تفسیر سیاق آیات کے موافق اور قابل ترجیح ہے۔

یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (جن میں سے بعض دوسرے بعض کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ ان کو دھوکہ میں ڈال رکھیں) یعنی شیاطین جن شیاطین انس کے دلوں میں ڈالتے تھے یا بعض جنات بعض جنات کو القاء کرتے تھے اور بعض انسان بعض انسانوں کو۔ زُخْرُفَ الْقَوْلِ بیہودہ لچر پر فریب باتیں غُرُوْرًا دھوکہ فریب۔ یہ مفعول لہ ہے یعنی علت فعل سابق یا مفعول مطلق (تاکیدی) یا مصدر بمعنی اسم فاعل جو حال واقع ہوا ہے۔

وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ (اور اگر آپ کا رب چاہتا (کہ شیاطین انبیاء کے دشمن نہ ہوں یا دلوں میں گمراہی کے خیالات نہ پیدا کریں یا دھوکہ نہ دیں) تو وہ ایسا (انبیاء سے دشمنی دلوں میں القاء دھوکہ) نہ کرتے۔ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ گمراہی اور گمراہ کنی کا خالق بھی اللہ ہے) پس معتزلہ کا قول کہ خالق شر بندہ ہے غلط ہے۔

فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ (سو آپ ان لوگوں کو اور ان کی افتراپردازیوں کو رہنے دیجئے) یعنی آپ پر اور اللہ پر جو افتراء بندی اور بہتان تراشی یہ کرتے ہیں اس کی طرف آپ التفات نہ کریں۔ اللہ آپ کی مدد کریگا اور ان کو سزا دیگا اور رسوا کریگا۔

وَلِتَصْغٰۤى اِلَیْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِیَرْضَوْهُ وَلِیَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

(اور تاکہ اس کی طرف ان لوگوں کے دل مائل ہو جائیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اس کو اختیار کر لیں اور جن امور کے مرتکب ہیں ان کا ارتکاب کرتے رہیں)۔

وَلِتَصْغٰۤى کا عطف غُرُوْرًا پر ہے اگر غُرُوْرًا کو مفعول لہ مانا جائے۔ یا فعل محذوف سے اس کا تعلق ہے یعنی ہم نے ایسا اس لئے کیا کہ آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل اس کی طرف مائل ہوں۔ قریش رسول اللہ ﷺ سے کہتے تھے کہ اپنے اور ہمارے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک ثالث مقرر کر دو اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اَفَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِیْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ اِلَیْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ آپ کہہ دیجئے (کیا اللہ کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں حالانکہ اللہ ہی نے تو تمہارے پاس ایک کامل کتاب بھیج دی ہے جو تفصیل وار ہے)۔ افغیر میں فاء عطف کیلئے ہے اور معطوف علیہ محذوف ہے یعنی کیا میں تمہاری بات مان لوں اور اپنے تمہارے درمیان اللہ کے سوا کسی اور کو حاکم بنالوں جو فیصلہ کرے کہ ہم میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر کون ہے حالانکہ اللہ نے قرآن تمہارے پاس بھیج دیا ہے جو بجائے خود معجزہ ہے۔ کتب سابقہ کے مطابق غیبی امور کی خبریں دے رہا ہے اور حق و باطل کو اس میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ اب کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا۔ حکم کے مفہوم میں حاکم کے معنی سے زیادہ زور ہے اسی لئے اس لفظ کا اطلاق صرف منصف پر ہوتا ہے۔ آیت میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ قرآن کے اعجاز و تقریر کے بعد کسی معجزہ کی ضرورت باقی

نہیں رہتی۔

وَالَّذِينَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (جن لوگوں کو (یعنی یہودیوں کو) ہم نے کتاب دی ہے وہ اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ قرآن بلا شبہ آپ ﷺ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ بھیجا گیا ہے)۔ رسول اللہ ﷺ امی تھے یہودیوں کی کتابیں آپ نے نہیں پڑھی تھیں اور نہ یہودی علماء کے ساتھ رہے تھے۔ اس کے باوجود ایسا قرآن پیش کیا جو یہودیوں کی کتابوں کے مطابق تھا۔ قرآن کو پڑھ کر ہی اہل کتاب کو یقین ہو جاتا تھا کہ یہ اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب ہے۔

اگرچہ بعض یہودی ہی قرآن کی حقانیت سے واقفیت تھے مگر باقی لوگ بھی خود غور و خوض کر کے یا اپنے علماء سے دریافت کر کے قرآن کی حقانیت من اللہ کا علم حاصل کر سکتے تھے، اسی لئے تمام اہل کتاب کو قرآنی صداقت کا جاننے والا قرار دیا۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ (پس (اے سامع) تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو) یعنی اس بات میں شک نہ کر کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (اور اللہ کی باتیں سچائی اور اعتدال کے اعتبار سے کامل ہیں)۔ اللہ کی بات پوری ہونے کا مطلب ہے کہ اللہ کی دی ہوئی خبروں کا اور وعدہ و وعید کا سچا ہونا اور احکام (امر و نہی) کا مبنی بہ عدل ہونا۔ قتادہ اور مقاتل نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔ صِدْقًا وَّعَدْلًا کا نصب تمیز یا حال ہونے کی بناء پر ہے۔

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں)۔ یعنی کسی بات کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس کے (ابدی) فیصلہ کو کوئی پلٹنے والا اور اس کے حکم کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ یا یہ معنی ہے کہ قرآن کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا نہ کتاب کہ قرآن کو بدل دے اور قرآن کے احکام تبدیل کر دے۔

وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾ (اور (جو کچھ یہ کہتے ہیں اس کو) وہ سننے والا ہے) اور جو کچھ دلوں میں چھپائے رکھتے ہیں اس سے) وہ واقف ہے) پس ان کو مہلت نہیں دے گا۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (اور اگر آپ اکثر اہل زمین کی پیروی کریں گے تو وہ آپ کو اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیں گے)۔ اکثر اہل زمین سے مراد ہیں کفار، کیونکہ اہل ایمان سے کافروں کی تعداد زائد ہے اور راہ خدا سے مراد ہے اللہ تک پہنچانے والا راستہ یعنی دین اسلام۔

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ (اکثر لوگ تو محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں) یعنی اپنی جہالت اور خود ساختہ حلت مردار اور حرمت بحیرہ وغیرہ پر۔

وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ (اور بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں) یعنی جو کچھ کہتے ہیں محض گمان اور تخمین سے کہتے ہیں کسی صحیح دلیل سے حاصل شدہ یقین کی روشنی میں نہیں کہتے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ (بلاشبہ آپ کا رب ہی ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو اس کے راستے سے بھٹکے ہوئے ہیں اور وہی راہ راست پر چلنے والوں سے بھی بخوبی واقف ہے) یعنی دونوں فریقوں کو جانتا ہے ہر ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق بدلہ دے گا۔ مَنْ يَّضِلُّ میں مَنْ موصولہ ہے یا موصوفہ یا استفہامیہ ابتدائیہ اور يَضِلُّ صلہ ہے یا صفت یا خبر۔

ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ لوگ خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ (کیا وجہ کہ) جس کو ہم خود قتل کریں اس کو کھائیں اور جس کو اللہ (بغیر ہمارے ذبح کئے) مار ڈالے اس کو نہ کھائیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (پس جس پر اللہ کا نام لے لیا گیا ہو اس کو کھاؤ)۔

فاء سببیہ ہے گمراہ کن کافروں کے اتباع سے گزشتہ کلام میں ممانعت کی گئی ہے اسی ممانعت پر یہ حکم متفرع ہے یعنی حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دینے میں کافروں کے خیالات پر نہ چلو، جو مردار کو حلال اور ذبیحہ کو حرام قرار دیتے ہیں۔

اِنۡ كُنۡتُمۡ بِاٰيٰتِهٖ مُؤۡمِنِيۡنَ ۱۱۸ (اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو) کیونکہ اللہ پر ایمان رکھنے کا تو تقاضا ہے کہ جس چیز کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے اس کو مباح سمجھا جائے اور جس کو حرام قرار دیا ہے اس سے پرہیز کیا جائے۔

وَمَا لَكُمۡ اَلَّا تَاۡكُلُوۡا مِمَّا ذُكِرَ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ (اور کیا وجہ کہ جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لے لیا گیا اس کو نہ کھاؤ)۔ ما استفہامیہ مبتدا اور لکم خبر ہے۔

وَقَدۡ فَصَّلَ لَكُمۡ مَّا حَرَّمَ عَلَيۡكُمۡ (حالانکہ جن چیزوں کو تمہارے لئے اللہ نے حرام کیا ہے ان کی تفصیل وہ خود کر چکا ہے) تفصیل محرمات سے مراد آیت قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِيۡ مَاۤ اُوۡحِىَ اِلَىَّ مُحَرَّمًا الخ ہے۔

اِلَّا مَا اضۡطُرِرۡتُمۡ اِلَيۡهِ‌ؕ (مگر وہ بھی جب سخت ضرورت پڑ جائے) تو حلال ہیں ما بمعنی وقت ہے یعنی اللہ نے ان چیزوں کی تفصیل کر دی ہے جن کو ہر وقت (کھانا) حرام کر دیا ہے سوائے مجبوری کے وقت کے

ایک شبہ

اس استثناء کا فائدہ ہی کیا ہے فَصَّلَ لَكُمۡ مَّا حَرَّمَ عَلَيۡكُمۡ کے اندر تو خود استثناء داخل ہے۔

ازالہ

جس چیز کو حرام نہیں کیا گیا اس کو نہ کھانے کی ممانعت کی تاکید مقصود ہے کیونکہ حرام چیز تو مجبوری کے وقت حلال ہو جاتی ہے لیکن حلال چیز کو کسی وقت حرام نہیں کیا جا سکتا۔

وَاِنَّ كَثِيۡرًا لَّيُضِلُّوۡنَ بِاَهۡوَآئِهِمۡ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ‌ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُعۡتَدِيۡنَ ۱۱۹ (یقیناً بہت سے آدمی اپنے من گھڑت خیالات پر بغیر کسی (عقلی یا نقلی) دلیل کے (لوگوں کو) بے راہ کرتے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ حد سے نکلنے والوں کو خوب جانتا ہے) یعنی جو حق سے نکل کر باطل کی طرف اور حلال سے آگے بڑھ کر حرام کی طرف جاتے ہیں ان کو خوب جانتا ہے۔

وَذَرُوۡا ظَاهِرَ الۡاِثۡمِ وَبَاطِنَهٗ‌ؕ (اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی)۔

یعنی تمام گناہ چھوڑ دو۔ ظاہری گناہ بھی جن کا تعلق بیرونی جسمانی اعضاء (کان، ناک، آنکھ، زبان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ) سے ہے اور اندرونی گناہ بھی جن کا تعلق محض دل اور اندرونی جذبات نفس سے ہے۔ کلبی اور اکثر مفسرین کے نزدیک اثم سے زنا مراد ہے یعنی ظاہری طور پر اور چھپ کر زنا کرنے سے بچو۔ سعید بن جبیرؒ نے ظاہر اثم سے محرمات کے ساتھ نکاح کرنا اور باطن اثم سے زنا مراد لیا ہے۔ ابن زید نے کہا ظاہر اثم کپڑے اتار کر ننگے ہو کر طواف کرنا اور باطن اثم زنا ہے۔ ایک روایت میں کلبی کا قول یہ بھی آیا ہے کہ دن میں برہنہ ہو کر مردوں کا طواف کرنا ظاہر اثم ہے اور رات کو برہنہ ہو کر عورتوں کا طواف کرنا باطن اثم ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡسِبُوۡنَ الۡاِثۡمَ سَيُجۡزَوۡنَ بِمَا كَانُوۡا يَقۡتَرِفُوۡنَ ۱۲۰ (جو لوگ (دنیا میں) گناہ کماتے ہیں عنقریب ان کو (آخرت میں) ان کے کئے کی سزا دی جائے گی)۔

وَلَا تَاۡكُلُوۡا مِمَّا لَمۡ يُذۡكَرِ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ (اور جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس میں سے نہ کھاؤ)۔ اس آیت کے عموم سے امام احمد نے استدلال کیا ہے کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا بھول گیا ہو یا قصداً نہ لیا ہو دونوں صورتوں میں ایسے ذبیحہ کا کھانا حرام ہے۔ داؤد، ابو ثور، شعبی اور محمد بن سیرین کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک کے نزدیک

آیت کے عموم میں وہ ذبیحہ داخل نہیں جس کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا بھول کر رہ گیا ہو۔ اس کا ثبوت حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ہوتا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا یا رسول اللہ اگر ہم میں سے کوئی ذبح کرے اور اللہ کا نام لینا بھول جائے تو کیا حکم ہے حضور ﷺ نے فرمایا اللہ کا نام ہر مسلمان کے منہ میں ہے (تلفظ کرے یا نہ کرے) رواہ الدار قطنی حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان اگر ذبح کرنے کے وقت بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بعد کو بسم اللہ کہہ لے اور پھر کھالے، رواہ الدار قطنی۔ یہ دونوں حدیثیں ضعیف ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں ایک راوی مروان بن سالم ہے جس کے متعلق امام احمد نے کہا ہے کہ یہ ثقہ نہیں ہے اور نسائی و دار قطنی نے اس کو متروک کہا ہے۔ رہی حضرت ابن عباسؓ کی روایت تو اس میں معقل مجہول راوی ہے۔ امام ابوحنیفہ کا قول بھی امام مالکؒ کی رائے کے موافق ہے لیکن آپ کے ضابطہ پر اخبار احاد کے ذریعہ سے نص قرآنی کے عموم کی تخصیص درست نہیں (اس لئے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت کردہ حدیثوں کی وجہ سے آیت مذکورہ کے عموم کو مخصوص البعض نہیں قرار دیا جاسکتا)۔

صاحب ہدایہؒ نے حنفیہ کے قول کی تائید میں لکھا ہے کہ اگر آیت کے حکم کو عام قرار دیا جائے گا تو بھول کر بسم اللہ ترک کرنے والے کے لئے بھی غیر معمولی دشواری ہو جائے گی اور دشواری بہر حال قابل ازالہ ہے۔ انسان کثیر النسیان ہے بھول ہی جاتا ہے اگر آیت کا وہی معنی ہو جو ظاہر کلام سے سمجھا جا رہا ہے تو جھگڑا پڑ جائے گا اور اختلاف رونما ہو جائے گا بلکہ قرن اول میں سب ہی اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے، کوئی اختلاف ہی نہ ہوتا (کہ اب اختلاف کی نوبت آتی) صاحب ہدایہ کی یہ دلیل نہایت کمزور ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک مَالَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ سے مراد ہے مردار اور وہ ذبیحہ جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو کیونکہ آگے آیا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ (اور بلاشبہ یہ امر بے حکمی ہے) اور فسق اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کا نام ذکر کرنے میں ہوتا ہے۔ اسی سورت کے آخر میں آیا ہے اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔

اگر قصداً ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو تب بھی امام شافعی کے نزدیک ذبیحہ حلال ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے شرک کا زمانہ ابھی گذرا ہے (حال ہی میں مسلمان ہوئے ہیں) وہ لوگ ہمارے سامنے کچھ گوشت لاتے ہیں، معلوم نہیں ذبح کے وقت اللہ کا نام لیتے ہیں یا نہیں لیتے (ہم وہ گوشت کھائیں یا نہ کھائیں)۔

حضور ﷺ نے فرمایا تم اللہ کا نام لے لیا کرو اور کھالیا کرو۔ رواہ البخاری، بغوی نے اس دلیل کی تشریح میں بیان کیا ہے کہ اگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا اباحت کے لئے ضروری ہوتا تو بسم اللہ کہنے میں شک پیدا ہونا ہی کھانے کی ممانعت کے لئے کافی ہوتا، جس طرح اگر ذبح کے متعلق شک ہو (کہ معلوم نہیں یہ ذبیحہ ہے یا نہیں) تو کھانا ممنوع ہے اور سوال کرنے والوں نے اپنے شک کا اظہار کیا تھا اور عرض کیا تھا معلوم نہیں ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں۔ اس صورت میں یقیناً ممانعت ہونی چاہئے تھی لیکن حضور ﷺ نے ممانعت نہیں فرمائی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان سے اللہ کا نام لینا اباحت کی شرط نہیں ہے۔ اس کے علاوہ صلت کی مرسل حدیث ہے جس کو ابوداؤد نے مراسیل میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے، اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ صلت کی حدیث میں اللہ کا نام نہ لئے جانے سے مراد بھول جانا اور حضرت عائشہؓ والی حدیث ہمارے خلاف نہیں جاتی بلکہ ہماری تائید کرتی ہے کیونکہ سوال کرنے والے یہ تو جانتے تھے کہ ذبح کرنے والا مسلمان ہے۔ شک ان کو اس بات میں تھا کہ اللہ کا نام لیا گیا ہے یا نہیں۔ اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ صحابہؓ کے نزدیک ذبیحہ کے حلال ہونے کی یہ شرط تھی کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ اب رسول اللہ ﷺ نے جو کھانے کے جواز کا حکم دیا تو اس کی بنا مسلمان کی ظاہری حالت پر ہے۔ ظاہر یہی تھا کہ مسلمان قصداً اللہ کا نام لینا ترک نہیں کرتا۔ جیسے کہ مسلمانوں کے بازار سے اگر گوشت خرید اگیا ہو تو اس کو

کھانا حلال ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ مسلمان کا ذبیحہ ہو گا اگرچہ اس کا بھی احتمال ہے کہ مجوسی کا ذبح کیا ہوا ہو۔

رہا شافعیؒ کا یہ قول کہ مَالَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ سے مراد مردار اور وہ ذبیحہ ہے جو دوسرے کے نام پر ذبح کیا گیا ہو یہ الفاظ کے عموم کے خلاف ہے اور اعتبار الفاظ کے عموم ہی کا ہوتا ہے۔ ذبح اور شکار کی بحث میں ہر قرآنی نص اور حدیث میں اللہ کے نام کا ذکر ضرور آیا ہے۔ سورۂ مائدہ کی تفسیر میں اس مبحث اور دوسرے مسائل ذبح کی تفصیل گزر چکی ہے۔

شرح المقدمتہ المالکیہ میں آیا ہے کہ بروایت ابو القاسم امام مالکؒ کے نزدیک وہ ذبیحہ کھانا درست ہے جس کے ذبح کے وقت قصداً اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، لیکن امام مالکؒ کی مدونہ فقہ میں اس کی اجازت نہیں ہے اور امام مالک کا مشہور قول بھی یہی ہے کہ ترک تسمیہ اگر قصداً ہو تو ذبیحہ نہ کھایا جائے۔ ابن الحارث اور ابن البشیر نے کہا تارک التسمیہ کے ذبیحہ میں یہ اختلاف اس وقت ہے جب تارک التسمیہ متہاون (اللہ کے نام لینے کی پروانہ کرنے والا) نہ ہو متہاون کا ذبیحہ تو باتفاق آراء حرام ہے۔ متہاون وہ شخص ہے جو بار بار ترک تسمیہ کرتا ہو، واللہ اعلم۔

طبرانی وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب آیت وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ نازل ہوئی تو فارس والوں نے قریش کے پاس پیام بھیجا۔ محمد ﷺ سے مناظرہ کرو اور پوچھو کہ (تمہارے نزدیک) جو چھری سے ذبح کیا گیا ہو تو وہ حلال ہے اور جو خود مرا ہو وہ حرام ہے۔ ابو داؤد اور حاکم نے بھی یہ روایت نقل کی ہے مگر اس میں یہ قول فارس والوں کا نہیں بلکہ کافروں کا قرار دیا ہے، اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع ۱۴ ۱۱

(اور یقیناً شیاطین اپنے دوستوں کو تعلیم کر رہے ہیں کہ وہ تم سے (بے کار) جدال کریں اور اگر (عقائد و اعمال میں) تم ان کی اطاعت کرنے لگو تو بلاشبہ تم مشرک ہو جاؤ)۔

شیاطین سے مراد ہیں ملک فارس کے شیطان آدمی یا شیاطین جن۔ وحی کرنے سے مراد ہے دل میں ڈالنا یا وسوسہ پیدا کرنا۔ اولیاء سے مراد ہیں کفار قریش یا عام کافر۔ اطاعت سے مراد ہے حرام کو حلال سمجھنا۔

مشرک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو اللہ کی طاعت ترک کر دے اور دینی امور میں دوسروں کے کہے پر چلے اور ان کا اتباع کرے تو یقیناً وہ مشرک ہو جائے گا (کیونکہ اللہ کو چھوڑ کر دینی مطاع اس نے دوسروں کو مانا)۔

زجاج نے کہا اس آیت میں اس امر کی دلیل ہے کہ جس نے اللہ کے حرام کو حلال یا اللہ کے حلال کو حرام قرار دیا وہ مشرک ہے۔ میں کہتا ہوں اس کی شرط یہ ہے کہ اس کی حلت اور حرمت قطعی دلیل (یعنی عبارت قرآن) سے ثابت ہو۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِى النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِى الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ

(ایسا شخص جو کہ پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ بنا دیا اور ہم نے اس کو روشنی عطا کر دی جس کو لئے ہوئے وہ آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے کیا اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کی حالت یہ ہو کہ وہ تاریکیوں میں (پھنسا ہوا) ہو ان سے نکلنے ہی نہیں پاتا)۔ یہ استعارہ تمثیلیہ ہے۔ مردہ سے مراد ہے کافر، جس کا دل حق سے غافل ہوتا ہے اور مردہ کی طرح اس کو فائدہ بخش اور ضرر رساں چیزوں میں امتیاز نہیں ہوتا۔ زندہ کرنے سے مراد ہے نور ایمان سے دل کو زندہ کر دینا۔ نور سے مراد ہے مؤمن کی وہ فطری دانائی جس کی وجہ سے اس کو حق و باطل کی شناخت ہو جاتی ہے یعنی نور فطرت کے ساتھ وہ اس راستہ پر چلتا ہے جو عقل سلیم، طبع درست اور شریعت الٰہیہ کے تقاضوں کے موافق ہوتا ہے۔ مَثَل سے مراد ہے حالت۔ مطلب کا خلاصہ یہ ہے کہ مؤمن کافر کی طرح نہیں ہو سکتا (ایک روشنی کا حامل ہے دوسرا اندھیریوں میں پھنسا ہوا۔ ایک کی راہ زندگی عقل و شرع کی بتائی ہوئی ہے دوسرے کی راہ غیر عقلی اور غیر شرعی۔ ایک کا دل زندہ ہے دوسرے کا مردہ)۔

ابو الشیخ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت عمر بن خطابؓ اور ابو جہل کے حق میں ہوا۔ ابن جریر نے ضحاک کی روایت سے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آیت

میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور ابوجہل مراد ہیں۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ ابوجہل نے رسول اللہ ﷺ کے اوپر (اونٹ کا) اوجھ ڈال دیا تھا۔ حضرت حمزہؓ شکار سے لوٹ رہے تھے کہ ابوجہل کی اس حرکت کی اطلاع آپ کو ملی آپ کے ہاتھ میں اس وقت کمان تھی یہ قصہ حضرت حمزہ کے مسلمان ہونے سے پہلے کا ہے۔ آپ غصہ میں بھرے ہوئے کمان لے کر ابوجہل کے پاس پہنچے۔ ابوجہل عاجزی کے ساتھ کہنے لگا، ابویعلی دیکھئے تو محمد ﷺ کیا پیش کر رہے ہیں یہ تو ہماری عقلوں کو بے وقوف بناتے، ہمارے معبودوں کو گالیاں دیتے اور ہمارے اسلاف کی مخالفت کرتے ہیں۔ حضرت حمزہؓ نے فرمایا تم سے زیادہ احمق اور کون ہوگا، اللہ کو چھوڑ کر پتھروں کی پوجا کرتے ہو۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور پیغام رساں ہیں۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ عکرمہ اور کلبی نے موردِ نزول حضرت عمار بن یاسر اور ابوجہل کو قرار دیا ہے[1]۔

ان تینوں روایات کا اس امر پر اتفاق ہے کہ مَثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ سے مراد ابوجہل ہے اور اس کے مقابل مَنْ اَحْيَيْنٰهُ سے مراد باختلاف روایت تینوں حضرات میں سے کوئی ایک ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ان تینوں حضرات کے مسلمان ہونے کا زمانہ کچھ زیادہ فصل سے نہ تھا قریب ہی وقت میں ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا مسلمان ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں اس آیت کا نزول ہوا اور الفاظ میں عموم ہے اس لئے ہر ایک کو موردِ نزول قرار دیا جاسکتا ہے۔ آیت میں ابوجہل کے اس خیال کی تردید ہے کہ مسلمان چونکہ اپنے (سابق) معبودوں کو گالیاں دیتے اور اپنے باپ دادا کی مخالفت کرتے ہیں اس لئے میں ان سے افضل ہوں۔ رفتارِ بیان کا تقاضا تھا کہ کافروں کے افضل ہونے کی نفی کی جاتی لیکن آیت میں مؤمن و کافر کی مساوات کی نفی کی گئی اس سے کافروں کی افضلیت کی پرزور طور پر نفی ہوگئی اور دونوں کے برابر ہونے کی طرف گمان بھی نہیں جاسکتا۔ آیت میں مساوات کی نفی اس طور پر کی جس سے مؤمن کا افضل ہونا ثابت ہو رہا ہے بلکہ مؤمن کے کمالات کی خصوصیت اور کافروں کے اندر اس خصوصیت کا فقدان بدلالت مطابقی اشارۃ النص ہے اور افضلیت کفار کی نفی بدلالت التزامی عبارۃ النص ہے۔

كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ جس طرح ابوجہل کیلئے اس کی بداعمالی دل پسند بنادی گئی کہ وہ اپنے کو مسلمانوں سے افضل جاننے لگا (اسی طرح کافروں کیلئے ہم نے ان کی تمام بداعمالیاں دل پسند بنادیں)۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ (اور (جس طرح ہم نے مکہ میں بڑے لوگوں کو مجرم بنادیا) اسی طرح ہم نے ہر بستی میں وہاں کے رئیسوں کو ہی جرائم کا مرتکب بنایا تاکہ وہ لوگ وہاں شرارتیں کیا کریں۔ جَعَلْنَا کا ترجمہ اگر "بنادیا" کیا جائے تو اس کے دو مفعول ہوں گے ایک فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اور دوسرا اَكٰبِرَ اور مُجْرِمِيْهَا، اَكٰبِرَ سے بدل ہوگا۔ یا اَكٰبِرَ مفعول دوئم اور مُجْرِمِيْهَا مفعول اول ہوگا یا اَكٰبِرَ، مُجْرِمِيْهَا بصورت اضافت ایک مفعول ہوگا اور فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ دوسرا مفعول۔ اور اگر جَعَلْنَا کا ترجمہ کیا جائے "ہم نے جمادیا، ہم نے طاقت عطا کی" تو اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا بصورت اضافت اس کا مفعول ہوگا۔

اگر صیغۂ اسم تفضیل مضاف ہو اور مضاف الیہ جمع ہو تو مضاف کو واحد لانا بھی درست ہے اور جمع لانا بھی (آیت میں اَكٰبِرَ بصیغۂ جمع ہی آیا ہے) بڑے لوگوں کے پیچھے چونکہ چھوٹے لوگ لگ جاتے ہیں اور بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کو اپنا تابع بنانے کی زیادہ طاقت رکھتے ہیں اس لئے اَكٰبِرَ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا۔ اللہ کا ضابطہ ہی یہ ہے کہ شروع میں پیغمبروں کا اتباع چھوٹے لوگ کرتے اور بڑے لوگ سرکشی کرتے ہیں۔ مکر کا معنی ہے دھوکہ، فریب (قاموس) صحاح میں ہے کہ مکر کا معنی ہے تدبیر کے ساتھ کسی کو اس کے مقصد سے پھیر دینا (یا پھیر دینے کی کوشش کرنا) قریش کے مکر کی صورت یہ تھی کہ انہوں نے مکہ کے چہار طرف کے راستوں پر ایک ایک آدمی بٹھار کھا تھا کہ جو لوگ مسلمان ہونے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آنا چاہیں ان کو راستہ سے ہی لوٹا دے۔ خدمت گرامی میں پہنچنے نہ دے اور کہے یہ شخص تو کاہن اور جھوٹا جادوگر ہے۔

---

[1] زید بن اسلم کی روایت ہے کہ آیت کا نزول حضرت عمر بن خطابؓ اور ابوجہل کے حق میں ہوا، حسن بصریؒ اور ابوسنان کی راویات بھی اسی طرح ہیں۔

وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ (اور وہ صرف اپنے ہی ساتھ شرارت کرتے تھے) کیونکہ اس فریب کا نتیجۂ بدانہی پر پڑتا تھا۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ (اور ان کو ذرا خبر نہ تھی)۔

بغوی نے قتادہ کا بیان نقل کیا ہے کہ ابوجہل نے کہا عبد مناف کی اولاد نے شرف میں ہم سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ جب ریس کے دو گھوڑوں کی طرح (مقابلہ پر) دوڑنے لگے تو انہوں نے (اپنی برتری ظاہر کرنے کے لئے) کہا کہ ہم میں ایک نبی ہے جس کے پاس وحی آتی ہے۔ خدا کی قسم ہم تو اس کو نہیں مانیں گے اور نہ کبھی اس کے تابع بن کر رہیں گے، ہاں اگر ہمارے پاس بھی اسی طرح وحی آجائے جس طرح اس کے پاس آتی ہے تو خیر (مان لیں گے) ایک روایت میں آیا ہے کہ ولید بن مغیرہ نے کہا تھا کہ اگر نبوت واقعی کوئی ضروری چیز ہے تو میں تجھ سے نبوت کا زیادہ حقدار ہوں عمر میں بھی زیادہ ہوں، اور مال میں بھی۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ

(اور جب ان کو کوئی آیت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم ہرگز یقین نہیں کریں گے جب تک ہم کو بھی ایسی ہی چیز نہ دی جائے جیسی اللہ کے رسولوں کو دی گئی ہے جہاں اللہ اپنی پیغمبری رکھتا ہے اس کو وہی خوب جانتا ہے) واللہ اعلم کے جملہ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ نسب یا مال یا عمر کی وجہ سے نبوت کا استحقاق نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ کا فضل ہے، وہی خوب جانتا ہے کہ کون نبوت کا اہل ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لکھا ہے کہ تعین نبوت کا مبدأ محض صفت الٰہی ہے جس میں پرتو (اور ظلیت) کی کوئی آمیزش ہی نہیں ہے، باقی انسانوں کے (مؤمن، کافر اور نیک بد ہونے کے) مبادی اللہ کے اسماء و صفات کے پرتو ہیں (یعنی نبوت کا سرچشمہ براہ راست اور بالذات صفات خداوندی ہیں اور دوسری مخلوق کا مبدء تعین اور سرچشمہ براہ راست صفات نہیں بلکہ صفات کے پرتو اور ظلال ہیں [1] اللہ کی صفات اگرچہ واجب ہیں لیکن (ان کا وجوب بذات خود نہیں بلکہ) وہ واجب بالغیر ہیں یعنی ذات الٰہی کے لئے ان کا وجوب ہے (اور ذات الٰہی واجب ہے لہٰذا اس کی صفات بھی واجب ہیں) پس وہ چونکہ ذات کی محتاج ہیں اسی اعتبار سے وہ ملائکہ اور انبیاء کے تعین کا مبدأ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ معصوم صرف انبیاء اور ملائکہ ہیں صفات اگرچہ ملائکہ اور انبیاء دونوں کے تعین کا مبدء ہیں لیکن مبدئیت کی دو حیثیتیں ہیں ایک بطونی دوسری ظہوری۔ بطونی اعتبار سے ان صفات کا قیام اللہ کی ذات سے ہے اور اسی اعتبار سے وہ تعین ملائکہ کی مبدأ ہیں اور ظہوری اعتبار سے وہ عالم کا سرچشمہ اور مصدر ہیں اس لحاظ سے وہ تعین انبیاء کا مبدأ ہیں۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ ملائکہ کی ولایت انبیاء کی ولایت سے زیادہ اونچی اور اقرب الی اللہ ہے، مگر ملائکہ پر انبیاء کی فضیلت نبوت کی وجہ سے ہے کیونکہ نبوت انسان کی خصوصیت ہے اور نبوت نام ہے خالص ذاتی جلوہ اندازی کے نتیجہ کا۔ خلاصہ کلام یہ کہ نبوت اور رسالت کا استحقاق نسب، مال یا عمر سے نہیں ہو سکتا اس کا مبدأ التعین (اور موجب) تو صفات الٰہیہ ہیں۔

سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

(عنقریب ان لوگوں کو جنہوں نے یہ جرم کیا ہے اللہ کے پاس پہنچ کر ذلت پہنچے گی اور سخت سزا ان کی شرارتوں کے بدلے میں ملے گی)، صَغَارٌ ذلت اور حقارت۔ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی قیامت کے دن۔ بعض علماء کے نزدیک عِنْدَ اللّٰهِ اصل میں مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ تھا (اللہ کی طرف سے) یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ عذاب شدید دنیا میں قتل اور قید ہونا جیسے بدر کی

---

[1] حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ اللہ نے بندوں کے دلوں کو دیکھا اور محمد ﷺ کے دل کو سب سے بہتر پایا تو آپ کو اپنے لئے چن لیا اور اپنا پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا، پھر آپ کے بعد اور لوگوں کے دلوں پر نظر کی تو آپ کے صحابہ کے دلوں کو دوسروں کے دلوں سے بہتر پایا تو ان کو اپنے پیغمبر کے وزیر (مددگار) بنا دیا جو اللہ کے دین کے لئے جہاد کرتے ہیں۔ پس جس بات کو مؤمن اچھا جانتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے اور جس بات کو مؤمن برا جانتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک بھی بری ہے۔

لڑائی کے دن ہوا اور آخرت میں دوزخ میں جانا۔ بِمَا کَانُوْا میں باء سببیہ ہے یعنی شرارتوں کی وجہ سے۔ یا مقابلہ کی ہے یعنی شرارتوں کے بدلے میں۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (پس جس شخص کو اللہ راہ حق کی ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کیلئے کھول دیتا ہے) جب یہ آیت اتری تو رسول اللہ ﷺ سے شرح صدر کی تشریح دریافت کی گئی، فرمایا مومن کے دل کے اندر اللہ ایک نور ڈال دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کا دل کشادہ اور وسیع ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں مراد یہ ہے کہ معرفت حق کے لئے کھل جاتا ہے۔ اور ایمان لے آتا ہے صحابہؓ نے عرض کیا، کیا اس کی کوئی علامت ہوتی ہے۔ فرمایا ہاں غیر فانی گھر (آخرت) کی طرف میلان قلب، اس فریب خانہ (دنیا) سے طبیعت کی دوری اور موت آنے سے پہلے موت کی تیاری۔ یہ حدیث حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں لکھی ہے اور ابو جعفر کی روایت سے مرسلاً فریابی اور ابن جریر اور عبد بن حمید نے بھی ذکر کی ہے۔

صوفیہ کے نزدیک شرح صدر اس وقت ہوتا ہے جب نفس کو فنا کر دیا جائے، نفسانیت کا کوئی شان بھی باقی نہ رہے اور ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب ولایت کبریٰ یعنی ولایت انبیاء میں تجلی صفات نمودار ہو، اس وقت حقیقی ایمان حاصل ہو جاتا ہے۔

وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ (اور جس کو وہ بے راہ رکھنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو تنگ بہت تنگ کر دیتا ہے (اس کو ایسی دشواری معلوم ہوتی ہے) جیسے اس کو آسمان پر چڑھنا پڑ رہا ہو) سیبویہ نے کہا کہ حَرَج بفتح راء مصدر ہے بمعنی فاعل اور صیغہ صفت بھی۔ اس کا معنی ہے بہت ہی تنگ، مطلب یہ ہے کہ اللہ اس کے سینہ کو ایسا کر دیتا ہے کہ اس کے اندر ایمان داخل ہی نہیں ہو سکتا، حق کو قبول کرنا اس کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے وہ حق کو ناممکن سمجھنے لگتا ہے۔ خیر کے داخل ہونے کا اس میں کوئی راستہ ہی نہیں ہوتا (کلبی) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ کا ذکر سن کر اس میں انقباض ہو جاتا ہے اور بتوں کی پوجا کا تذکرہ سن لیتا ہے تو کھل جاتا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب نے یہ آیت تلاوت فرما کر بنی کنانہ کے ایک اعرابی سے دریافت کیا حَرَجَۃٌ کا کیا معنی ہے اعرابی نے کہا ہماری بولی میں حَرَجَۃٌ اس درخت کو کہتے ہیں جو درختوں کے اتنا اندر ہو کہ وہاں تک نہ کوئی چرنے والا مویشی پہنچتا ہو نہ جنگلی چوپایہ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا منافق کا دل بھی ایسا ہی ہوتا ہے کوئی بھلائی اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ آسمان پر چڑھنا یعنی ایسا کام کرنا جو طاقت سے باہر ہو۔ انتہائی تنگ دل ہونے کی تشبیہ اس شخص کی حالت سے دی ہے جو خارج از قدرت کام کر رہا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح آسمان پر چڑھنا عام طور پر ناممکن ہے اسی طرح ایمان کا اس کے دل میں داخل ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ بعض علماء نے اس تشبیہ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ وہ ایمان سے اتنی دور بھاگتا ہے جیسے کوئی شخص بھاگ کر آسمان پر چڑھ جائے (وجہ شبہ دوری ہے)۔

كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ جس طرح بے ایمان کا سینہ تنگ اور دل ایمان سے دور ہوتا ہے (اسی طرح ایمان نہ لانے والوں پر اللہ پھٹکار ڈالتا ہے)۔

رجس سے مراد عذاب (عطاء) دنیا میں پھٹکار اور آخرت میں عذاب (زجاج) گناہ (کلبی) ایسی چیز جس میں کوئی بھلائی نہیں (مجاہد) شیطان (حضرت ابن عباسؓ) یعنی شیطان کو مسلط کر دیتا ہے۔ عَلَيْهِمْ کی جگہ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا ایمان نہ لانا پھٹکار کا سبب ہے۔ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ معتزلہ کا قول غلط ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ معصیت کا ارادہ نہیں کرتا (کیونکہ گناہ شر ہے اور اللہ شر کا خالق نہیں)

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا (اور یہ ہی (یعنی جس کو اللہ ہدایت کرنا چاہے اس کا سینہ ایمان کے لئے کھول دینا اور جس کو گمراہ رکھنا چاہئے اس کے سینہ کو بہت تنگ کر دینا)۔ تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے)۔

رب کے راستہ سے مراد ہے وہ راستہ جو تقاضائے حکمت اور اللہ کے مقررہ ضابطہ کے مطابق ہے۔ بعض نے کہا یہ راستہ

جس پر اے محمد ﷺ آپ چل رہے ہیں اور قرآن نے جس کو پیش کیا ہے یعنی اسلام آپ کے رب تک پہنچانے والا راستہ ہے مُسْتَقِيمًا حال ہے۔ اول الذکر تفسیر پر اس کا معنی ہوگا، معتدل، ہموار اور مؤخر الذکر تفسیر پر اس کا معنی ہوگا سیدھا جس میں کوئی کجی نہ ہو۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ (نصیحت پذیر لوگوں کے لئے ہم نے آیات صاف صاف بیان کر دیں)۔ قوم سے مراد اہل السنت والجماعت ہیں کیونکہ آیات قرآنیہ سے یہی جماعت نفع اندوز ہے، جو عقیدہ رکھتی ہے کہ اللہ ہی قادر ہے کسی اور میں (حقیقی) قدرت نہیں عالم میں جو کچھ اچھا برا ہوتا ہے وہ اللہ کے ازلی فیصلہ کے مطابق اور اسی کے زیر تخلیق ہوتا ہے۔ وہ بندوں کے احوال سے بخوبی واقف ہے، اس کا ہر فعل پر حکمت ہے، وہ عادل ہے، کسی کو مجال نہیں کہ اس پر اعتراض کر سکے۔

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ (ان (نصیحت پذیر) لوگوں کے لئے ان کے رب کے پاس سلامتی کا گھر ہے)۔ دَارُ السَّلٰمِ سے مراد جنت ہے کیونکہ جنت تمام نامرغوب، مکروہ چیزوں سے محفوظ ہے یا دار السلام سے وہ گھر مراد ہے جہاں ان کا استقبال اور (باہم ملاپ) سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ سے ہوگا۔ یا سَلٰمٌ اللہ کا نام ہے، اللہ کا گھر ان کے لئے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جس گھر کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے وہ کیسا عظیم الشان ہوگا۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ سے مراد ہے اللہ کی ذمہ داری میں اللہ کے پاس موجود، جس کی حقیقت سے اللہ کے سوا کوئی واقف نہیں۔

وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ (اور ان کے اعمال کی وجہ سے اللہ ان سے محبت رکھتا ہے)۔ ولی سے مراد (یا محبت کرنے والا ہے جیسا کہ ترجمہ کیا گیا یا اس سے مراد) ہے تمام امور کا ذمہ دار، کارساز، دنیا میں توفیق ایمان و صلاح دے کر، قبر میں منکر نکیر کے سوال کے وقت توحید پر قائم رکھ کر اور آخرت میں کامل ثواب اور مراتب قرب مرحمت فرما کر۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ (اور جس روز اللہ سب مخلوق کو جمع کرے گا (اور فرمائے گا) اے گروہ جنات تم نے انسانوں (کے گمراہ کرنے) میں بڑا حصہ لیا) یا یہ مطلب ہے کہ تم نے بہت آدمیوں کو گمراہی میں اپنا تابع بنایا۔

وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۚ (اور جو انسان گمراہ کرنے والے جنات سے تعلق رکھنے والے تھے وہ (اقراراً) کہیں گے اے ہمارے رب ہم میں سے ایک نے دوسرے سے فائدہ حاصل کیا تھا اور ہم اپنی اس معین میعاد تک آپہنچے جو تو نے ہمارے لئے مقرر کی تھی)۔ بعض نے بعض سے فائدہ اٹھایا کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں نے جنات سے کچھ افسوں، جادو اور کہانت کی تعلیم حاصل کی اور جن جن امور و مقاصد کی تکمیل کی ان کو ضرورت تھی جنات نے ان کی خواہشات پوری کرنے اور مقصد تک پہنچانے میں ان کی اطاعت کی اور اپنی مرغوبات کو ان کے لئے دل پسند بنایا اور جب کہیں بیابان میں، سنسان رات میں تنہا مسافر نے آواز دے کر کہا اعوذ بسید هذا الوادی من سفهاء قومه "میں قوم جنات کے شریروں سے اس وادی کے سردار کی پناہ کا خواستگار ہوں" تو اس نے رات امن چین سے گزاری (یہ تو ہوا انسان کا جنات سے نفع اندوز ہونا) اور جنات کے انسانوں سے بہرہ اندوز ہونے کی یہ صورت ہوئی کہ انسانوں نے جنات کی پرستش کی گناہ اور گمراہی میں جنات کا اتباع کیا۔ اَجَلَنَا سے مراد ہے روز قیامت یہ قول اظہار ندامت وحسرت اور اعتراف گناہ پر دلالت کر رہا ہے۔

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ (اللہ فرمائے گا تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے جس میں ہمیشہ ہمیشہ رہو گے مگر یہ کہ خدا ہی کو (کچھ اور) منظور ہو تو خیر) اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کا مطلب چند طرح سے بیان کیا گیا ہے۔

۱...... مگر اتنی مہلت جو اللہ نے تم کو اپنی مشیت کے مطابق (دوزخ میں داخل ہونے اور قبروں سے اٹھنے کے بعد) دیدی اتنی مدت میں دوزخ تمہاری قیام گاہ نہیں ہوئی۔ ۲...... مگر ان اوقات میں دوزخ تمہارا ٹھکانا نہ ہوگی جن اوقات میں آگ سے

برفستان (زمہریر) کی طرف تم کو منتقل کیا جائے گا۔ ۳......اِلَّا بمعنی سِوٰی کے ہے یعنی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے سوائے ان چند در چند عذابوں کے جو اللہ ان کے لئے چاہے گا۔ ۴......حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہمانے فرمایا آیت میں وہ قوم مستثنیٰ کی گئی ہے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ پہلے سے جانتا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں گے اور دوزخ سے ان کو نکال دیا جائے گا اس مطلب پر مَاشَاءَ اللّٰہُ میں مابمعنی مَن ہو گا۔[1]

اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ (کوئی شک نہیں کہ آپ کا رب حکیم ہے (جو کچھ اپنے دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ کرتا ہے حکمت کے ساتھ کرتا ہے اور) سب کے دلوں کی حالت سے واقف ہے) وہ دلوں کے اندر کے ایمان و نفاق کو جانتا ہے اور تمام جن و انس کے احوال سے واقف ہے۔

۱۵ ع ۸/۲ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ (اور (جس طرح ہم نے کفار جن و انس کو بے مدد چھوڑ دیا اور ایک دوسرے سے فائدہ اندوز ہونے کا موقع دیا) اسی طرح ہم بعض کافروں کو بعض کے قریب رکھیں گے ان کے اعمال کے سبب سے) نُوَلِّیْ کا ترجمہ علماء نے مختلف طور پر کیا ہے ہم بعض کو بعض کا دوست بنادیتے ہیں۔ مؤمن کا دوست مؤمن کو خیر پر ابھارتا اور نیکی میں اس کی مدد کرتا ہے اور کافر کا دوست کافر کو شر پر اکساتا اور شر میں اس کی مدد کرتا ہے۔ (قتادہ) معمر کی روایت سے قتادہ کا قول اس طرح آیا ہے کہ ہم دوزخ کے اندر ایک کے پیچھے دوسرے کو (قطار در قطار) بھیجیں گے۔ نُوَلِّیْ کا لفظ مُوَالَاۃ سے ماخوذ ہے اور موالات کا معنی ہے پے در پے چلنا (یا موالات کا معنی ہے ایک دوسرے سے متصل اور قریب ہونا اس وقت وہ ترجمہ ہوگا جو آیت کے بعد ہم نے ذکر کیا ہے اور یہی ترجمہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اختیار کیا ہے، مترجم۔ بعض نے کہا تولیت کا معنی ہے سپرد کرنا یعنی ہم بعض کافر انسانوں کو کافر جنات کے اور کافر جنات کو کافر انسانوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ کلبی نے بروایت ابو صالح حضرت ابن عباسؓ کا قول اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں اس طرح نقل کیا ہے کہ جب اللہ کسی قوم کی بھلائی چاہتا ہے تو نیک لوگوں کو ان کے امور کا حاکم بنادیتا ہے اور اگر کسی قوم کی برائی چاہتا ہے تو بدوں کو ان کا حاکم بنادیتا ہے۔ اس قول کی روشنی میں آیت کا ترجمہ اس طرح ہوگا، ہم بعض ظالموں کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں اور ظالم کے ذریعہ سے ظالم کی گرفت کرتے ہیں جیسے (بعض روایات میں) آیا ہے جو ظالم کی مدد کرتا ہے اللہ اس پر ظالم کو مسلط کر دیتا ہے۔ کلبی کی اس تشریح کی تائید حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے ہوتی ہے جو حاکم نے صعصہ بن صوحان کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جب ابن ملجم کی ضرب سے حضرت علیؓ کی شہادت کا وقت آیا اور لوگوں نے درخواست کی امیر المؤمنین کسی کو اپنی جگہ ہم پر خلیفہ بنادیجئے، تو آپ نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اندر خیر دیکھے گا تو تمہارا حاکم نیکوں کو کردے گا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا اللہ نے ہمارے اندر خیر دیکھی تھی تو ابو بکر کو حاکم بنادیا تھا۔ روایت میں آیا ہے کہ ظالم زمین پر اللہ کا قہر ہے ظالم کے ذریعہ سے اللہ لوگوں کو سزا دیتا ہے پھر اس ظالم کو سزا دیتا ہے۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ (اے گروہ جن و بشر کیا تمہارے پاس میرے پیغام رساں نہیں پہنچے جو تم میں سے ہی تھے)۔

یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ کیا جنات بھی پیغمبر ہوئے یا نہیں۔ ضحاک سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا ضرور ہوئے تھے، دیکھو اللہ نے فرمایا ہے يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یعنی انسانوں میں سے (انسان) اور جنات میں سے (جن) پیغمبر بنا کر کیا نہیں بھیجے گئے۔ کلبی کا قول ہے رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے جن و انس سب کی طرف پیغمبر بھیجے جاتے تھے، یعنی مختلف پیغمبر مختلف اقوام و اطراف کے لئے۔ تمام جن و انس کی طرف تو صرف رسول اللہ ﷺ کو بھیجا گیا (آپ

---

[1] شاید حضرت ابن عباسؓ کی مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کو پیغمبروں کی دعوت نہیں پہنچی لیکن اللہ جانتا تھا کہ اگر ان کو دعوت پہنچتی تو وہ ضرور ایمان لے آتے تو ایسے لوگوں کو دوزخ سے (کبھی) نکال لیا جائے گا لیکن اگر اللہ کے علم میں یہ بات تھی کہ دعوت پہنچنے کے بعد بھی یہ لوگ ایمان نہ لائے تو ایسے لوگوں کو ہمیشہ دوزخ میں رکھا جائے گا۔

سے پہلے کسی پیغمبر کی بعثت نہ تمام انسانوں کے لئے ہوئی نہ تمام جنات کے لئے) مجاہد نے کہا انسانوں میں تو پیغمبر ہوئے اور جنات میں صرف ڈرانے والے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ڈرانے والوں سے مراد ہیں پیغمبروں کے قاصد۔ کچھ جنات پیغمبروں کا کلام سن کر اپنی قوم والوں کو جا کر سناتے تھے یہ پیغمبروں کے قاصد ہوتے تھے جنات پیغمبر نہیں ہوئے۔ اس قول پر مِنْكُمْ کا خطاب صرف انسانوں کو ہوگا جیسے آیت يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ میں هُمَا تثنیہ کی ضمیر ہے مگر مراد واحد ہے یعنی نمکین سمندر سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں۔ دوسری آیت ہے وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ اس میں هِنَّ ضمیر جمع ہے اور مراد ایک آسمان ہے کیونکہ چاند ایک ہی آسمان میں ہے۔

میں کہتا ہوں آیت سے یہ بات یقیناً معلوم ہو رہی ہے کہ جن ہوں یا انسان ہر فریق کی ہدایت کے لئے پیغمبروں کو بھیجا گیا پیغمبر صرف انسان کو بنایا گیا یا جنات میں سے بھی، بعض کو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ان کی قوم کی ہدایت کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا یہ دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔ دیکھو اللہ نے فرمایا ہے لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا یعنی اگر زمین پر فرشتوں کی بستی ہوتی تو آسمان سے ان کے لئے فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجا جاتا۔ اس آیت کے مفہوم کا تقاضا ہے کہ جنات کی ہدایت کے لئے جنات کو ہی پیغمبر بنا کر بھیجا گیا کیونکہ مرسل اور مرسل الیہ کے درمیان کامل مناسبت اور ربط طبعی ہونا چاہئے (اور یہ صرف اتحاد نوعی کی صورت میں ہو سکتا ہے) پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جنات اہل فہم و عقل ہیں آدم علیہ السلام سے پہلے ان کی تخلیق ہوئی تھی اور ذی عقل ہونے کی وجہ سے بھی یہ اوامر و نواہی کے لئے مکلف تھے۔ اسی لئے فرمایا لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ۔ اب اگر ان میں سے کسی کو پیغمبر نہ بنایا گیا ہوتا تو ان کو عذاب بھی نہ دیا جاتا کیونکہ اللہ نے خود فرمایا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا پس اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے پہلے جنات میں سے کچھ افراد اپنی قوم کے لئے پیغمبر تھے۔

ہندوستان کے ہندو جن کو اوتار کہتے ہیں اور تاریخ میں جن کو لاکھوں کروڑوں سال پہلے کی ہستیاں قرار دیتے ہیں۔ شاید وہ بھی یہی جنات ہوں، جن کو پرماتما کی طرف سے جنات کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہو اور ممکن ہے کہ ایشور کی طرف سے جنات کے لئے کوئی دین دھرم اتارا گیا ہو اور پھر انسانوں نے بھی اس سے استفادہ کیا ہو کیونکہ ان انسانوں کی پیدائش کسی پری کے بطن سے ہوئی ہو۔ اس کے بعد اس مذہب کو منسوخ کر دیا گیا ہو کیونکہ اصل دین کو شیطان نے اپنی بدعات و اختراعات کے ساتھ مخلوط کر دیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ہند کے اصول دین اکثر تو قرآن و سنت کے مطابق ہیں اور جہاں اختلاف ہے وہ شیطان کی کارستانی کا نتیجہ ہے۔

يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا (جو میری آیات یعنی کتابیں تم کو پڑھ کر سناتے تھے اور آج کے دن کی پیشی سے تم کو ڈراتے تھے) یعنی قیامت کے دن کی پیشی سے۔

قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓى اَنْفُسِنَا (وہ کہیں گے ہم اپنے خلاف شہادت دیتے ہیں)۔

یعنی ہم شہادت دیتے ہیں کہ پیغمبروں نے ہم کو تیرا پیام پہنچا دیا تھا اور ہم نے ماننے سے انکار کیا تھا۔ مقاتل کا قول ہے کہ کافر یہ شہادت اس وقت دیں گے جب ان کے ہاتھ پاؤں ان کے شرک و کفر کی شہادت دے چکے ہوں گے (اور سوائے اقرار کرنے کے ان کے لئے کوئی صورت نہ ہوگی۔

وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ (اور ان کو دنیوی زندگانی نے فریب دے رکھا تھا اور ان کو اپنے خلاف (خود) شہادت دینی پڑی کہ وہ کافر تھے)۔ اس آیت میں کافروں کی اس بات پر مذمت کی گئی ہے کہ دنیا میں انہوں نے (حق و باطل میں سے) اپنے لئے بری چیز کا انتخاب کیا اور بالآخر ایسی بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے جس نے ان کو دوزخ کا مستحق بنا دیا۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ (اس کی وجہ یہ ہے کہ

اللہ ظلم کے ساتھ بستیوں کو ایسی حالت میں تباہ نہیں کیا کرتا کہ ان کے رہنے والے بے خبر ہوں) ذٰلِکَ سے بعثت انبیاء کی طرف اشارہ ہے اور اس سے حکم کی علت بیان کی گئی ہے۔ اَنْ مصدریہ ہے یعنی انبیاء کی بعثت کی علت اللہ کا مہلک بالظلم نہ ہونا ہے یا اَنْ مخففہ ہے اور اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے۔ مُهْلِكَ الْقُرٰى بستیوں کو یعنی بستیوں کے رہنے والوں کو ہلاک کرنے والا۔ غَافِلُوْنَ کا یہ مطلب ہے کہ کسی پیغمبر کو بھیج کر ان کو متنبہ نہ کیا گیا ہو۔ بِظُلْمٍ یا حال ہے یعنی ظلم کے ساتھ اللہ بستیوں کو تباہ نہیں کرتا یا یہ مطلب ہے کہ بستی والوں کے ظلم کرنے کی وجہ سے اللہ بغیر پیغمبر بھیجے اور بغیر تنبیہ کئے ان کو ہلاک نہیں کرتا۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (ہر ایک کے لئے درجے ہیں ان کے اعمال کے سبب) یعنی اللہ کے قرب و بعد کے اعتبار سے ہر مکلف کا مرتبہ جدا جدا ہے۔ مِمَّا عَمِلُوْا اپنے اپنے اعمال کی وجہ سے کسی کو بہت بڑا ثواب اور مرتبہ قرب نصیب ہوگا اور کوئی رحمت سے دور سخت ترین عذاب میں پڑا ہوگا۔

وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ (اور آپ کا رب ان کے اعمال سے لاعلم نہیں ہے) اس لئے ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دے گا۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ (اور آپ کا رب بے نیاز ہے) بندوں کی عبادت سے بندوں کو اوامر و نواہی کا مکلف بنانے میں اس کی کوئی غرض نہیں بلکہ

ذُو الرَّحْمَةِ (وہ (اپنی مخلوق پر) رحمت کرنے والا ہے) مہربان ہے بندوں کے منافع کی تکمیل کے لئے ہی اس نے پیغمبر بھیجے اور لوگوں کو اوامر و نواہی کا مکلف کیا۔ یہ بھی اسی کی رحمت ہے کہ گناہوں کے باوجود گناہ گاروں کو ڈھیل دیتا رہتا ہے اور فوری گرفت نہیں کرتا لیکن

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اے اہل مکہ (اگر وہ چاہے تو (تمہارے گناہوں کی پاداش میں) تم کو فنا کر دے) تمہارے فنا ہونے سے اس کی کوئی غرض فوت نہیں ہو جائے گی۔

وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ (اور تمہارے بعد تمہاری جگہ جس کو چاہے پیدا کر دے) جو تم سے زیادہ اس کا فرماں بردار ہو۔

كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ (جس طرح تم کو دوسری قوم کی نسل سے اس نے پیدا کیا) یعنی قرن در قرن لیکن اپنی مہربانی سے اس نے تم کو مہلت دی اور باقی رکھا۔

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ (جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ یقیناً آنے والی چیز ہے)۔ یعنی حشر و نشر، حساب، ثواب عذاب ضرور ہوگا اس میں کوئی شک نہیں

وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ (اور تم عاجز نہیں کر سکتے) یعنی پکڑنے والے کو عاجز نہیں کر سکتے۔ تم جہاں بھی ہو گے وہ تم کو ضرور پکڑ لے گا۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ

(آپ کہہ دیجئے اے میری قوم تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو میں بھی عمل کر رہا ہوں (آئندہ) جلد ہی تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اس عالم کا انجام کار کس کے لئے نافع ہوگا)۔ مَكَانَةٌ یا مصدر ہے مَكُنَ مَكَانَةً وہ جم گیا، کسی چیز پر مسلط ہو گیا۔ یعنی جتنی انتہائی طاقت رکھتے ہو اور جتنا ہو سکے کئے جاؤ یا اسم ظرف ہے مجازاً حالت مراد ہے۔ اگر کسی شخص کو حکم دیا جائے کہ وہ اپنی حالت پر قائم رہے، تو کہا جاتا ہے علی مکانتک (اپنی جگہ پر اپنی حالت پر رہو) یعنی جس حالت پر تم ہو اسی پر رہتے ہوئے عمل کرو۔ دونوں صورتوں میں کلام کا مقصود تہدید و وعید ہے، مراد یہ ہے کہ کفر و دشمنی کی حالت پر جمے رہو۔

اِنِّيْ عَامِلٌ سے یہ مراد ہے کہ میں اپنی حالت اسلام پر قائم اور اپنے رب کے حکم پر ثابت قدم رہ کر عمل کر رہا ہوں۔ انجام کار سے مراد ہے دوسرے عالم میں اچھا انجام اور مَنْ موصولہ ہے یا استفہامیہ یہ کلام مبنی بر انصاف ہے مگر تخویف

آگئیں اور اس میں در پردہ اس طرف اشارہ ہے کہ متقیوں کا انجام یقیناً اچھا ہو گا۔

اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ (اس میں شبہ نہیں کہ ظالم (یعنی جو معبودیت کے قابل نہیں ان کی عبادت کرنے والے) فلاح یاب نہیں ہوں گے)۔

بغویؒ نے لکھا ہے مشرکوں کا دستور تھا کہ اپنی کھیتیوں، باغوں کے پھلوں، مویشیوں کے بچوں اور تمام مالوں میں ایک حصہ اللہ کا اور ایک حصہ بتوں کا مقرر کرتے تھے۔ خدا کا حصہ تو مہمانوں اور مسکینوں پر صرف کرتے تھے اور بتوں کا حصہ نوکروں چاکروں اور خدمت گاروں کے صرف میں لاتے تھے اور خدا کے حصہ میں سے اگر کچھ بتوں کے حصہ میں شامل ہو جاتا تو پروا نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے خدا محتاج نہیں اس کو اس کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اگر بتوں کے حصہ میں سے کچھ خدا کے حصہ میں شامل ہو جاتا تو فوراً نکال کر بتوں کے حصہ میں ملا دیتے اور کہہ دیتے یہ حاجت مند ہیں پھر خدا کے حصہ کی اگر کوئی چیز تلف یا کم ہو جاتی تو ان کو پروا بھی نہ ہوتی اور بتوں کے حصہ کی کوئی چیز تلف یا کم ہو جاتی تو فوراً اس کے عوض پوری کر دیتے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا (اور اللہ کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور چوپایوں میں انہوں نے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا) اور کچھ حصہ اپنے (مفروضہ) معبودوں کا، چونکہ تقابل کی وجہ سے یہ آخری فقرہ ظاہر تھا اس لئے ذکر نہیں فرمایا۔

فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ (اور بزعم خود کہتے ہیں یہ حصہ تو اللہ کا ہے) یعنی اللہ نے ان کو حکم نہیں دیا اور نہ یہ تقسیم شریعت خداوندی میں آئی بلکہ محض ان کی خود ساختہ ہے۔

وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا (اور یہ ہمارے شریکوں کا ہے) یعنی اللہ کی عبادت میں ہم جن کو شریک کرتے ہیں یہ انکا حصہ ہے۔

فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا یَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ یَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ (پھر جو چیز ان کے معبودوں (کے نام) کی ہوتی ہے وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتی اور جو چیز اللہ (کے نام) کی ہوتی ہے وہ ان کے معبودوں کی طرف پہنچ جاتی ہے) کیونکہ اللہ کے نام کی چیزوں میں سے معبودوں کے حصہ کو یہ پورا کر دیتے ہیں اور معبودوں کے نام کی چیزوں میں سے اللہ کے نام کا حصہ پورا نہیں کرتے۔ قتادہ نے فرمایا جب کال پڑتا تھا تو مشرکین کچھ حصہ اللہ کا مقرر کر کے اس کو کھا لیتے تھے اور جو حصہ بتوں کا مقرر کرتے تھے اس میں سے کچھ نہیں کھاتے تھے۔

سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ (برا ہے ان کا یہ فیصلہ) اور عاجز جمادات کو اس اللہ کا شریک قرار دینا جو تمام کھیتوں کا چوپایوں کا اور ساری مخلوق کا خالق ہے اور خالق عالم پر بے بس جماد کو ترجیح دینا۔

وَكَذٰلِكَ زَیَّنَ لِكَثِیْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِیُرْدُوْهُمْ وَلِیَلْبِسُوْا عَلَیْهِمْ دِیْنَهُمْ ؕ

(اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے خیال میں ان کے معبودوں نے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو مستحسن بنا رکھا ہے تاکہ وہ ان کو برباد کر دیں اور ان کے مذہبی طریقہ کو مشتبہ کر دیں)۔

وَكَذٰلِكَ یہ مفعول محذوف کی صفت ہے یعنی جس طرح کھیتی اور چوپایوں کی تقسیم کو ان کے معبودوں نے ان کی نظر میں مستحسن بنا دیا ہے اسی طرح قتل اولاد کو بھی پسندیدہ فعل بنا دیا ہے۔ قتل اولاد سے مراد ہے لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینا اور دیوتاؤں کے نام پر بھینٹ چڑھانا۔ شُرَكَآؤُهُمْ سے مجاہد کے نزدیک شیاطین مراد ہیں، جنہوں نے مشرکوں کے لئے اس بات کو پسندیدہ فعل بنا دیا تھا کہ ناداری کے اندیشہ سے لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیں۔ شیاطین کو شرکاء اس لئے کہا کہ (اللہ کی طرح) انہوں نے اللہ کے حکم کے علاوہ شیطانوں کا حکم مانا۔ شُرَكَآؤُهُمْ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بغیر کسی دلیل کے انہوں نے شیطانوں کو معبود مطاع بنا رکھا تھا۔ کلبی کے نزدیک شرکاء سے مراد ہیں بتوں کے مجاور، جو قتل اولاد کی ترغیب دیتے تھے اور انہی کی ترغیب سے لوگ منت مان لیتے تھے کہ اگر میرے اتنے لڑکے پیدا ہو گئے تو میں ایک کو بھینٹ چڑھا دوں

گا۔ شرکاء کی جانب تزئین قتل کی نسبت اس لئے کی کہ داعی اور سبب تزئین وہی تھے اگرچہ خود انہوں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ لِيُرْدُوْهُمْ یعنی بہکا کر تباہ کر دیں۔ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ کا مطلب یہ ہے کہ اصل دین اسماعیل کو جس پر یہ پہلے تھے گڑبڑ اور مخلوط بنا دینا اس اغواء کا نتیجہ ہے گویا دِيْنَهُمْ سے مراد ہے دین اسماعیل۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول ہے یا دین سے مراد ہے وہ دین جس پر مشرکوں کو ہونا چاہئے تھا۔ یعنی دین توحید۔

لِيُرْدُوْا اور لِيَلْبِسُوْا میں لام علت کا ہے اگر شیاطین کو ان کو فاعل قرار دیا جائے اور اگر مجاوروں کی طرف ضمیر راجع کی جائے تو لام عاقبت (نتیجہ فعل) ہوگا۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ (اور اگر اللہ چاہتا (کہ وہ اغواء اور دین میں خلط ملط یا قتل اولاد یا بتوں کی منت بھینٹ نہ کریں) تو وہ ایسا نہ کرتے)۔

فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ (اب آپ ان کو اور جو کچھ یہ غلط باتیں بنا رہے ہیں یونہی رہنے دیجئے) مَا يَفْتَرُوْنَ میں ما موصولہ ہے یعنی افترا کردہ باتیں یا مصدریہ ہے یعنی افتراء کرنا۔

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ (اور وہ یہ بھی کہتے ہیں) کہ یہ یعنی جو کھیتی اور چوپائے اللہ کے نام اور بتوں کے نام کے وہ کرر کھتے ہیں وہ

اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ (ممنوع چوپائے اور ممنوع کھیت ہیں) یعنی حرام ہیں۔ حِجْرٌ مصدر ہے اس کا اطلاق واحد جمع اور مذکر مونث سب پر یکساں ہوتا ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ اَنْعَام سے مراد ہیں بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام۔

لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ (جن کو (ان کے گمان کے مطابق) سوائے اس کے جس کو وہ چاہیں اور کوئی نہیں کھا سکتا) یعنی عورتیں نہیں کھا سکتیں، صرف مرد اور بتوں کے مجاور کھا سکتے ہیں۔ بِزَعْمِهِمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے خیال سے بغیر کسی دلیل کے حرمت حلت بناتے ہیں۔

وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا (اور کچھ مخصوص چوپائے ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے ان چوپایوں سے مراد ہیں بحیرہ، سائبہ اور حامی۔

وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا (اور کچھ مخصوص مواشی ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے) یعنی ذبح کے وقت اللہ کا نام نہیں لیتے بلکہ بتوں کے نام لے کر ذبح کرتے ہیں۔ ابووائل نے کہا اللہ کا نام ذکر کرنے سے مراد نیک عمل ہے، کیونکہ عام دستور تھا کہ ہر نیک عمل اللہ کا نام لے کر شروع کیا جاتا تھا۔ اس صورت میں آیات کا مطلب اس طرح ہوگا وہ ان چوپایوں پر سوار ہو کر حج کے لئے نہیں جائیں گے اور نہ کوئی نیک عمل کرنے کے لئے ان پر سوار ہوں گے۔

افْتِرَآءً عَلَيْهِ ایسا (محض اللہ پر افترا باندھنے کے طور پر کہتے ہیں) اِفْتِرَاءً مفعول مطلق ہے یا حال اور عَلَيْهِ کا تعلق قَالُوْا سے ہے یا فعل محذوف سے یعنی یہ بات انہوں نے اللہ پر بطور افترا باندھی یا اللہ پر افتراء کرتے ہوئے کہی۔ یا اِفْتِرَاءً مفعول لہ ہے یعنی علت قول ہے۔

سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ (عنقریب اللہ ان کو ان کی افترابندی کی سزا دے گا)۔ یعنی اِفْتِرَاءً کے سبب سے (باء سببیہ) یا اِفْتِرَاءً کے عوض (باء بدلیت کے لئے دونوں صورتوں میں ما مصدری ہوگا)۔

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ (اور وہ (یہ بھی) کہتے ہیں کہ جو بچے ان چوپایوں کے پیٹ کے اندر سے نکلتے ہیں وہ (اگر زندہ نکلیں تو) ہمارے مردوں کے لئے خالص ہیں اور عورتوں کیلئے حرام اور اگر مردہ نکلیں تو سب مرد عورتیں اس میں شریک ہیں) سب کیلئے حلال ہیں یعنی بحیرہ اور سائبہ کے پیٹ کے اندر کے بچے اگر زندہ برآمد ہوں تو صرف مردوں کیلئے حلال ہیں، عورتوں کے لئے حرام اور اگر مردہ برآمد ہوں تو مرد عورتیں سب اس کو کھا سکتے ہیں۔ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ سے مراد ہیں بحیرہ اور سائبہ۔ خَالِصَةٌ بمعنی خالص جس میں کوئی آمیزش نہ ہو۔ اس لفظ میں آخری تاء تاکید یا مبالغہ کی ہے (بالکل خالص) کسائی نے کہا

خالص اور خَالِصَۃٌ کا ایک ہی معنی ہے (تاء نہ تاکید کی ہے نہ مبالغہ کی) جیسے وعظ اور موعظۃ ہم معنی ہیں، فراء نے کہا تاء تانیث کی ہے کیونکہ انعام مونث ہیں ان کے لحاظ سے پیٹ کے اندر کے بچوں کو بھی مونث قرار دیا۔ بعض نے کہا مَافِیْ بُطُوْنِهَا کے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے خَالِصَۃٌ کو مونث ذکر کیا کیونکہ مَافِیْ بُطُوْنِهَا سے مراد ہیں۔ اَجِنَّۃٌ (جنین کی جمع) بہر حال خالصۃ سے مراد ہے خالص حلال۔

اَزْوَاجِنَا سے مراد ہیں عورتیں (خواہ زوجہ ہوں یا نہ ہوں یا لڑکیاں ہوں) فَهُمْ سے مراد ہیں سب مرد عورتیں فِیْهِ کی واحد مذکر کی ضمیر مَیْتَۃً کی طرف راجع ہے کیونکہ مَیْتَۃً کا لفظ مذکر مونث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

سَیَجْزِیْهِمْ وَصْفَهُمْ اِنَّهٗ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۳۹﴾ (ابھی اللہ ان کی غلط بیانی کی سزا دیدیتا ہے بلاشبہ وہ بڑی حکمت والا اور بڑے علم والا ہے) وَصْفَهُمْ یعنی بِوَصْفِهِمْ مطلب یہ کہ حلت حرمت کے مذکورہ احکام کی جو نسبت یہ اللہ کی طرف کرتے ہیں اس کی سزا اللہ ان کو دے گا اور اللہ کی یہ سزا وہی مبنی بر حکمت ہے جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَیْرِ عِلْمٍ (بے شک گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت کی وجہ سے بغیر جانے قتل کر دیا) یعنی بغیر اس بات کے جاننے کے کہ اللہ ان کی اولاد کا بھی رازق ہے اولاد کو قتل کر دیا۔ بغوی نے لکھا ہے اس آیت کا نزول قبائل ربیعہ اور مضر اور بعض دوسرے عربوں کے حق میں ہوا جو مفلسی کے ڈر سے لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے قبیلۂ بنی کنانہ ایسا نہیں کرتا تھا۔

وَحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ (اور اللہ پر افترا بندی کرتے ہوئے انہوں نے ان 'جانوروں' کو حرام قرار دے لیا ہے جو اللہ نے ان کو عنایت فرمائے تھے) یعنی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کو انہوں نے حرام بنا لیا ہے اور اس حکم کی نسبت غلط طور پر اللہ کی طرف کی ہے۔ افتراء مفعول لہ ہے یا حال یا مفعول مطلق۔

قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ﴿۱۴۰﴾ (واقعی وہ راہ سے بھٹک گئے اور کبھی (حق و صواب کے) راستہ پر چلنے والے نہ ہوئے)۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ (اور وہی ہے جس نے باغات پیدا کئے جن کے کچھ پیڑوں کو ٹٹیوں پر چڑھایا جاتا ہے اور کچھ پیڑوں کو ٹٹیوں پر نہیں چڑھایا جاتا)۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس کی تشریح میں فرمایا مَعْرُوْشٰتٍ زمین پر پھیلنے والی بیلیں جن کو ٹٹیوں پر پھیلایا جاتا ہے جیسے کدو اور انگور اور خربوزہ کی بیلیں اور غَیْرَ مَعْرُوْشَاتٍ وہ پودے اور درخت جن کا تنا اور ڈنڈی ہوتی ہے جس پر وہ کھڑے ہوتے ہیں جیسے کھجور کا درخت اور (جو، گیہوں وغیرہ کی) کھیتی۔ ضحاک نے کہا مَعْرُوْشَاتٍ اور غَیْرَ مَعْرُوْشَاتٍ دونوں سے مراد انگور کی بیلیں ہیں۔ اول سے مراد وہ بیلیں ہیں جن کو لوگ بوتے اور ٹٹیوں پر پھیلاتے ہیں اور دوسرے سے مراد وہ بیلیں ہیں جو خودرو جنگلوں اور پہاڑوں میں ہوتی ہیں کوئی ان کے لئے ٹٹیاں نہیں باندھتا۔

وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ (اور کھجور کے درخت اور کھیتی جس کے پھل مختلف ہیں) اُكُلٌ پھل یعنی جسکے پھل رنگ، بو اور مزہ میں جدا جدا ہیں۔ اُكُلُهٗ کی ضمیر الزرع کی طرف راجع ہے یا اَلنَّخْل کی طرف راجع ہے اور زَرْعٌ نخلٌ کے حکم میں داخل ہے کیونکہ زرع کا عطف نخل پر ہے یا دونوں کی طرف راجع ہے اس وقت اُكُلُهٗ کا معنی ہوگا اکل کل واحد منہما۔ مُخْتَلِفًا حال مقدرہ ہے کیونکہ پیدا کرنے کے وقت تو پھل نہیں ہوتا (اور حال ذوالحال کا زمانہ ایک ہونا چاہئے۔

وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ (اور زیتون اور انار (کچھ) آپس میں ہم شکل اور (کچھ) الگ الگ شکلوں والے)۔

كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ (ان سب کی پیداوار کھاؤ جب نکل آئے) یعنی ان میں سے ہر ایک کا پھل نمودار ہوتے ہی کھا سکتے ہو پکنے کی ضرورت نہیں۔ اِذَآ اَثْمَرَ کی قید کا فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مالک کے لئے ادائے حق شرعی

سے پہلے خود کھانے کی اجازت مستفاد ہو رہی ہے۔

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (اور اس میں جو حق (شرع سے) واجب ہے کاٹنے (یا توڑنے) کے دن مسکینوں کو دیا کرو۔ حَصَادُ اور حِصَادُ بالفتح اور بالکسر دونوں ہم معنی ہیں جیسے صَرَام اور صِرَام، جِزاز اور جَزاز۔ حق سے کیا مراد ہے۔ اس کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ، طاؤس حسن، جابر بن زید اور سعید بن مسیب کے نزدیک اس سے مراد فرض زکوٰۃ ہے یعنی عشر ۱/۱۰ یا نصف عشر ۱/۲۰ کیونکہ امر وجوب کے لئے ہے اور حق کا استعمال عام طور پر واجب ہی کے لئے ہوتا ہے۔ پھر اجماع علماء بھی ہے کہ مال میں سوائے زکوٰۃ کے اور کوئی چیز واجب نہیں۔ صحیحین میں حضرت طلحہ بن عبد اللہ کی روایت سے آیا ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ حضور ﷺ نے پانچ نمازوں کا، ماہ رمضان کے روزوں کا اور زکوٰۃ کا ذکر فرمایا اس شخص نے عرض کیا، کیا مجھ پر اس کے علاوہ بھی کچھ (لازم) ہوگا۔ فرمایا نہیں، ہاں اگر تو اپنی خوشی سے (کچھ اور کار خیر اور نفل عبادت وغیرہ) کرے تو خیر۔ اس قول کے بموجب یہ آیت مدنی قرار پائے گی اور اس صورت پر آیت میں امام ابو حنیفہؒ کے قول کی دلیل بھی مل جائے گی کہ انار جیسے پھلوں میں (بھی) زکوٰۃ واجب ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا قول اس کے خلاف ہے۔ ان دونوں اماموں کے نزدیک زکوٰۃ کا وجوب صرف انہی چیزوں میں ہے جو روزی کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ کی تفسیر کے ذیل میں کھیتی کی زکوٰۃ کے مسائل کی تفصیل گزر چکی ہے۔

امام زینؒ العابدین، عطاء، مجاہد اور حماد کا قول ہے کہ آیت میں جس حق کا ذکر ہے اس سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ حق ہے جس کو ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ آیت مکی ہے اور زکوٰۃ کی فرضیت مدینہ میں ہوئی۔ ابراہیم نے کہا حق سے مراد ہے ایک گٹھا۔ ربیع نے کہا سیلا (گری پڑی بالیں) مراد ہے۔ نحاس نے ناسخ میں اور ابن مردویہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا (حق سے مراد) گری پڑی بالیں ہیں۔ مجاہد نے کہا کھجوریں کاٹنے کا وقت لوگ ایک گچھا لٹکا دیا کرتے تھے ادھر سے جو گزرتا تھا کھالیا کرتا تھا۔ یزید بن اصم کا بیان ہے کہ اہل مدینہ جب کھجوریں کاٹتے تھے تو ان کا ایک خوشہ لا کر مسجد کے ایک گوشہ میں لٹکا دیا کرتے تھے اور مسکین آکر لاٹھی مار کر اس میں سے کھجوریں گرا کر لے لیتا تھا۔ اس قول کی تائید حضرت فاطمہؓ بنت قیس کی روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی (فقراء کا کچھ) حق ہے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ رواہ الترمذی و ابن ماجہ والدارمی۔ اس آیت کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے اور حق سے مراد عام ہے وجوبی ہو یا استحبابی۔ سعید بن جبیر نے فرمایا ابتداء اسلام میں یہ حق تھا جس کو ادا کرنے کا حکم دیا جاتا تھا پھر جب عشر واجب کر دیا گیا تو یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔ مقسم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن میں جس نفقہ (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے) کا بھی حکم دیا گیا ہے زکوٰۃ نے اس (کے وجوب) کو منسوخ کر دیا۔

وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۴۱﴾ (اور اسراف نہ کرو اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا)۔ اسراف میانہ روی کی ضد ہے کذا فی القاموس۔ صحاح میں ہے ہر کام میں حد سے آگے بڑھنے کو اسراف کہتے ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ اس جگہ اسراف سے مراد ہے کل مال دیدینا۔ بیضاوی نے کہا یہ آیت ویسی ہے جیسی آیت وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ (ہاتھ کو بلکل نہ کھول دو) ہے۔ بروایت کلبی حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس نے پانچ سو درختوں کی کھجوریں توڑ کر ایک دن میں (غریبوں کو) تقسیم کر دیں اور گھر والوں کے لئے کچھ نہ چھوڑا اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی کذا اخرج ابن جریر عن ابن جریج۔ بغویؒ نے سدی کا قول نقل کیا ہے کہ لَا تُسْرِفُوْا سے مراد یہ ہے کہ اپنا تمام مال نہ دیدو ورنہ فقیر ہو کر بیٹھ رہو گے۔

میں کہتا ہوں سارا مال دینا اس وقت ممنوع اور اسراف قرار پائے گا جب اپنے متعلقین اور بال بچوں کی حق تلفی کی ہو

اور حق داروں کے حقوق نہ دیئے ہوں۔ مستحقین کے حقوق ادا کرنے کے بعد اگر بقیہ سارا مال اللہ کی راہ میں دے دے تو یہ اسراف نہیں بلکہ افضل ہے، کذا قال الزجاج۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر میرے پاس (کوہ) احد کے برابر سونا ہو تو مجھے اس سے خوشی ہوگی کہ تین رات بھی اس میں سے میرے پاس سوائے اتنی مقدار کے جس کو میں قرض کی ادائیگی کے لئے روک لوں اور کچھ باقی نہ رہے، رواہ البخاری۔

ایک بار حضرت ابوذرؓ نے حضرت عثمانؓ سے داخلہ کی اجازت چاہی حضرت عثمانؓ نے اجازت دے دی۔ حضرت ابوذرؓ لاٹھی ہاتھ میں لئے اندر پہنچ گئے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا عبدالرحمنؓ بن عوف نے اپنے بعد کچھ مال ترکہ میں چھوڑا ہے، کعب بتاؤ اس کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے، حضرت کعبؓ نے کہا اگر اس میں اللہ کا حق پہنچتا ہے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ سنتے ہی ابوذرؓ نے لاٹھی اٹھا کر کعبؓ کے ماری اور بولے میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا آپ فرما رہے تھے اگر میرے پاس پہاڑ کے برابر سونا ہو اور میں اللہ کی راہ میں اس کو خرچ کروں اور اللہ قبول فرمالے تو مجھے پسند نہیں کہ اس میں سے چھ اوقیہ بھی اپنے بعد چھوڑ کر جاؤں۔ عثمانؓ میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم نے بھی رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث سنی ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے یہ سوال تین بار کیا۔ حضرت عثمان نے فرمایا، ہاں، رواہ احمد۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت بلالؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ بلال کے پاس اس وقت چھواروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، حضور ﷺ نے پوچھا بلالؓ یہ کیا ہے، بلالؓ نے عرض کیا میں نے کل کے لئے رکھ چھوڑا ہے فرمایا کیا تم کو ڈر نہیں لگتا کہ اس (ذخیرہ) کی بھاپ (گھٹن) دوزخ کے اندر کل تم کو محسوس ہوگی۔ بلالؓ خرچ کر اور عرش والے کی طرف سے کمی کرنے کا اندیشہ نہ کر۔ بیہقی فی شعب الایمان۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کون سا صدقہ (خیرات) سب سے اعلیٰ ہے، فرمایا تنگدست کی محنت کی کمائی سے بقدر طاقت (خیرات کرنا سب سے) افضل ہے اور دینا شروع اپنے عیال سے کرو، رواہ ابوداؤد۔

سعید بن مسیّب کے نزدیک لَا تُسْرِفُوْا کا مطلب ہے صدقہ کو نہ روکو یعنی روکنے اور نہ دینے میں اتنی حد سے نہ بڑھو کہ واجب صدقہ بھی روکنے لگو۔

مقاتل نے کہا لَا تُسْرِفُوْا سے یہ مراد ہے کہ کھیتی اور چوپایوں میں بتوں کو شریک نہ بناؤ۔ زہری نے کہا اسراف نہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ گناہ کے کام میں خرچ نہ کرو۔ مجاہد نے کہا اسراف سے مراد ہے اللہ کے حق میں کوتاہی کرنا اگر کوہ ابو قیس کے برابر کسی کے پاس سونا ہو اور وہ اللہ کی طاعت میں سب خرچ کردے تو مسرف نہ ہوگا، لیکن اللہ کی نافرمانی میں ایک درہم یا ایک سیر بھی صرف کیا تو مسرف ہو جائے گا۔ ایاس بن معاویہ نے کہا اللہ کے حکم کی حد سے ہٹنا سرف اور اسراف ہے۔

ابن وہب نے ابوزید کا قول نقل کیا ہے لَا تُسْرِفُوْا کے مخاطب حکام ہیں اللہ نے حاکموں کو حکم دیا ہے کہ اپنے حق سے زائد نہ لینا اس قول پر آیت کا مطلب وہی ہوگا جو حدیث ایاکم وکرائم اموال الناس کا ہے (لوگوں کا سب سے بڑھیا مال زکوٰۃ میں وصول کرنے سے اجتناب کرو)۔

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۚ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۗ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴۲﴾

(اور مویشیوں میں اونچے قد کے اور چھوٹے قد کے جو کچھ اللہ نے تم کو دیا ہے کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو بلاشک وہ تمہارا صریح دشمن ہے)۔

حَمُوْلَةً سواری یا بار برداری کے جانور جیسے اونٹ بیل۔ فَرْشًا وہ پست قد چھوٹے جانور جو سواری یا بار برداری کے کام میں نہیں آتے جیسے بھیڑ بکری اور اونٹ اور گائے کے بچے۔ كُلُوْا میں امر اباحت کے لئے ہے یعنی کھا سکتے ہو کھانے کی اجازت ہے۔ مِمَّا میں مِنْ تبعیضیہ ہے کیونکہ اللہ نے جو رزق دیا ہے وہ سب تو نہیں کھایا جا سکتا۔ شیطان کی پیروی نہ کرو کا یہ مطلب ہے کہ شیطانی راستہ پر نہ چلو کہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دینے لگو۔ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا کا عطف جَنّٰتٍ پر ہے یعنی اللہ

نے یہ جانور بھی پیدا کئے۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ
اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ
ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ

اور یہ مواشی (آٹھ نر و مادہ (پیدا کئے) یعنی بھیڑ (اور دنبہ) میں دو قسم (نر و مادہ) اور بکری میں دو قسم (نر و مادہ) آپ ان سے کہئے کہ کیا اللہ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو یا اس بچہ کو جس کو دونوں مادہ اپنے پیٹ میں لئے ہوئے ہوں تم مجھے کسی دلیل سے تو بتلاؤ اگر تم سچے ہو اور اونٹ میں دو قسم اور گائے (بھینس) میں دو قسم، آپ کہئے کہ اللہ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو یا اس مادہ کو جس کو دونوں مادہ اپنے پیٹ میں لئے ہوئے ہوں۔ ثَمَانِيَةَ اَزْوَاجٍ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا سے بدل ہے یا كُلُوْا کا مفعول ہے یا مَا سے حال ہے اور اَزْوَاج سے مراد ہیں مختلف یا متعدد، زوج وہ واحد (مذکر یا مؤنث) جس کا ہم جنس کوئی جوڑا ہو (مذکر یا مؤنث) کبھی دو (ہم جنس) کے مجموعہ کو بھی زوج کہا جاتا ہے، یہاں مراد اول معنی ہے۔ ضَاْنٌ اسم جنس ہے (مذکر مؤنث واحد جمع سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے) اس کی جمع ضَئِيْن ہے یا ضَانٌ، ضَائِن کی جمع ہے جس کا مؤنث ضَائِنَة اور ضَائِنَة کی جمع ضَوَائِن ہے اون والی بھیڑ کو ضان کہتے ہیں۔ اثنین دو یعنی مذکر اور مؤنث مذکر مینڈھا مؤنث بھیڑ، مَعْزٌ بالوں والی بکری یا بکرا، مَعْزٌ، مَاعِز کی جمع ہے جیسے صَحْبٌ، صَاحِب کی۔ بغویؒ نے لکھا ہے کہ معز جمع ہے مگر اس کا واحد نہیں، ماعز کی جمع معزی اور مَاعِزَہ کی مَوَاعِز آتی ہے۔ اول الذکرین سے مینڈھا اور بکرا مراد ہیں اور اول اُنْثَيَيْنِ سے بھیڑ اور بکری اور مَا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ سے مراد ہیں بھیڑ بکری کے پیٹ کے اندر کے بچے خواہ نر ہوں یا مادہ۔ اسی طرح اَلْاِبِلُ اور اَلْبَقَرُ ہیں (دونوں کا اطلاق نر و مادہ پر ہوتا ہے) خلاصہ مطلب یہ ہے کہ کیا اللہ نے بھیڑ مینڈھا یا ان کے شکمی نر مادہ بچے حرام کئے ہیں یا بکری بکرا یا ان کے پیٹ کے بچے یا اونٹنی اونٹ گائے بیل اور ان کے شکمی بچے۔ اگر اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا کوئی حکم ہو جس سے تمہارے خود ساختہ حرام کی اللہ کی طرف سے حرمت ثابت ہو رہی ہو تو پیش کرو اگر تحریم کے دعویٰ میں سچے ہو تو اللہ کا حکم لاؤ۔ بات یہ تھی کہ مشرک کہتے تھے هٰذِهٖ اَلْاَنْعَامُ وَحَرْثٌ حِجْرٌ (یہ چوپائے اور کھیتی ممنوع الاستعمال ہیں) اور یہ بھی کہتے تھے مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ان چوپایوں کے پیٹ سے جو بچے زندہ بر آمد ہوں وہ صرف مردوں کے لئے حلال ہیں عورتوں کے لئے حرام ہیں اور اگر مردہ بر آمد ہوں تو سب کے لئے حلال ہیں، وہ بحیرہ سائبہ وصیلہ اور حام میں سے بھی بعض کو عورتوں کے لئے اور بعض کو مردوں اور عورتوں سب کے لئے حرام قرار دیتے تھے۔ احکام اسلامی کے نزول کے بعد ابوالاحوص مالک بن عوف جشمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، محمد ہم کو اطلاع ملی ہے کہ تم ہمارے باپ دادا کے بعض اعمال و افعال کو حرام قرار دیتے ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم نے بعض قسم کے چوپایوں کو بے دلیل حرام بنا رکھا ہے اللہ نے یہ آٹھوں طرح کے جانور کھانے اور فائدہ حاصل کرنے کے لئے پیدا کئے ہیں یہ حرمت کس طرف سے آئی نر کی طرف سے یا مادہ کی طرف سے۔ مالک بن عوف متحیر ہو کر لاجواب ہو گیا نہ یہ کہتے بن پڑی کہ نر کی طرف سے حرمت آئی ورنہ سب نروں کو حرام کہنا پڑتا نہ یہ کہہ سکا کہ حرمت مادہ کی طرف سے آئی ورنہ ہر مادہ کی حرمت کا قائل ہونا پڑتا اور اگر پیٹ کے اندر (پیدا) ہونے کی وجہ سے حرمت کا قائل ہوتا تو نر مادہ سب کو حرام کہنا پڑتا۔ پانچویں ساتویں حمل کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں نہ اس کی کوئی وجہ کہ عورتوں کے لئے حلال اور مردوں کے لئے حرام قرار دیا جائے، روایت میں آیا ہے کہ حضور صلعم نے مالک سے فرمایا مالک بولتے کیوں نہیں (بات کہو) مالک نے کہا آپ بولتے جائیے میں آپ کی بات سن رہا ہوں۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ ع ۱۷
(کیا تم اس وقت حاضر تھے جس وقت اللہ نے تم کو

اس (تحلیل و تحریم) کا حکم دیا (اگر ایسا نہیں) تو اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر بلا دلیل جھوٹی تہمت لگائے تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے بے شک اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔

اَمْ بمعنی بَلْ ہے۔ کُنْتُمْ سے خطاب اہل مکہ کو ہے۔ ھٰذَا سے اشارہ تحریم کی جانب ہے مِنِ افْتَرٰی سے مراد عمر بن لحی اور وہ لوگ ہیں جو بعد کو اس کے طریقہ پر چلے۔ خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ اے اہل مکہ کیا تم اس وقت حاضر اور موجود تھے جب اللہ نے تم کو اس تحریم کا حکم دیا تھا۔ تمہارا ایمان تو نہ کسی نبی پر ہے نہ اللہ کی کسی کتاب پر۔ پھر جاننے کا طریقہ سوائے دیکھنے اور سننے کے اور کوئی نہیں (لامحالہ تم کو اس وقت موجود ہونا چاہئے اور موجود نہ تھے تو علم کس طرح ہوا) جو شخص تحریم و تحلیل کے سلسلہ میں اللہ پر جھوٹی افترابندی کرے اس سے بڑھ کر ظالم (بے جا کوش) اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کی افترابندی کی غرض صرف یہ (ہو سکتی) ہے کہ راہ مستقیم سے وہ لوگوں کو بہکا دے ایسے ظالموں کو اللہ ہدایت نہیں کرتا۔

روایت میں آیا ہے کہ اس کے بعد لوگوں نے دریافت کیا کہ حرام کیا کیا چیزیں ہیں تو مندرجہ ذیل آیت کا نزول ہوا۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ (آپ کہہ دیجئے میں نہیں پاتا ان ہدایات میں جو مجھے وحی کی گئی ہیں)۔ اس جگہ وحی سے مراد صرف قرآن ہی نہیں بلکہ عام وحی مراد ہے۔ مشرکوں نے بحیرہ وغیرہ کی از خود تحریم کر رکھی تھی اللہ کے حکم کا ان کو علم نہ تھا ان کی تردید کے لئے اس آیت کا نزول ہوا اور تکمیل تردید اسی وقت ہوگی جب عام وحی مراد لی جائے کیونکہ کلام کی اصل غرض یہ ہے کہ تحریم و تحلیل وغیرہ کا حکم وحی سے ہی معلوم ہو سکتا ہے اپنی طرف سے نہیں کیا جا سکتا۔

اَجِدُ اس جگہ افعال قلوب میں سے ہے جو دو مفعول چاہتا ہے پہلا مفعول (طَعَامًا) محذوف ہے اور دوسرا مفعول مُحَرَّمًا ہے یعنی میں کسی غذا کو حرام نہیں جانتا۔

مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ (کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے) اکثر اہل تفسیر نے مُحَرَّمًا سے پہلے طَعَامًا محذوف مانا ہے تاکہ آئندہ خنزیر کا اس سے استثناء متصل صحیح ہو جائے۔

اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَةً (مگر یہ کہ وہ غذا مردار ہو، مَیْتَةً وہ مردار جانور جو بغیر کسی انسان کے فعل کے خود (بغیر مارے) مرا ہو۔ اس تعریف کے بموجب وہ جانور جو لاٹھی یا پتھر کی ضرب سے یا اوپر سے لڑھک کر یا آپس کی ٹکر سے مرا ہو یا کسی درندہ نے اس کو کھا لیا ہو، مَیْتَةً میں داخل نہ ہوگا۔ سورۂ مائدہ کی آیت حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ پر (مذکورہ اقسام کا) عطف اسی پر دلالت کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی اسی قول کی تائید کرتی ہے کہ کافروں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا محمد ﷺ تم کہتے ہو کہ تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا قتل کیا ہوا جانور تو حلال ہے اور جس کو کتے یا شکاری پرندے نے قتل کیا ہو وہ بھی حلال ہے اور جس کو اللہ نے (بغیر انسانی عمل اور شکاری جانور کے شکار کرنے کے) مار ڈالا ہو وہ حرام ہے۔ مذکورہ بالا جانوروں کی حرمت دوسری آیت سے ثابت ہوتی ہے (اس آیت سے ثابت نہیں ہوتی)۔

اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا (یا بہتا ہوا خون ہو)، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے مراد وہ سیال خون ہے جو زندہ جانور کی گردن کی رگوں سے ذبح کرتے وقت نکلتا ہے۔ اس میں جگر اور طحال داخل نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں جامد خون ہوتے ہیں۔ شریعت کی صراحت اور اجماع علماء نے دونوں کو حلال کہا ہے وہ خون بھی اس میں شامل نہیں ہے جو گوشت کے ساتھ مخلوط رہ جاتا ہے کیونکہ وہ سیال نہیں ہوتا۔

اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ (یا خنزیر کا گوشت ہو پس بلا شبہ وہ گندگی ہے) یعنی خنزیر ناپاک ہے، قرب کی وجہ سے ہٗ ضمیر خنزیر کی طرف راجع ہے۔ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ خنزیر عین نجاست ہے اسی لئے اس کے کسی جزء کی بیع یا اس سے انتفاع درست نہیں۔

اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ (یا جو (جانور) فسق کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے نام زد کر دیا گیا ہو)۔

فِسْقًا کا عطف خنزیر پر ہے اور اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔ فِسْقًا کی صفت ہے اور فَاِنَّهٗ رِجْسٌ جملہ معترضہ ہے بتوں کے

نام پر بھینٹ کئے ہوئے جانور کو اللہ نے فسق اس لئے فرمایا کہ اس عمل کا فسق میں انتہائی توغل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فِسْقًا، اُهِلَّ بِهٖ کا مفعول ہو اور اُهِلَّ کا عطف یَكُوْنُ پر ہو اور جو یَكُوْنُ کا اسم ہے وہی اُهِلَّ کا نائب فاعل ہو اس وقت ترجمہ اس طرح ہو گا یا وہ غیر اللہ کے نام پر اللہ کے حکم کی مخالفت کر کے ذبح کیا گیا ہو۔

فَمَنِ اضْطُرَّ (پھر جو بیتاب ہو جائے) یعنی ضرورت اس کو مذکورۂ بالا اشیاء میں سے کسی چیز کو کھانے پر مجبور کر دے۔

غَيْرَ بَاغٍ بشرطیکہ (لذت اور خواہش کا طالب نہ ہو)۔

وَّلَا عَادٍ (اور نہ (قدر ضرورت سے) تجاوز کرنے والا ہو)۔

فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴿۱۴۵﴾ (تو بلاشبہ آپ کا رب بخشنے والا مہربان ہے) اس کا مواخذہ نہ کرے گا، سورۂ بقرہ میں بھی اسی مضمون کی آیت گزر چکی ہے اور ہم نے اس سے متعلقہ مباحث کا وہاں ذکر کر دیا ہے۔

مسئلہ :- بعض علماء کا قول ہے کہ اس آیت میں جن چیزوں کو کھانے کی ممانعت کر دی گئی ہے صرف انہی کو کھانا نص قرآنی سے حرام ہے۔ خبر احاد سے قرآن کے حکم کو منسوخ قرار دینا جائز نہیں۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی اس قول کی نسبت بعض روایات میں کی گئی ہے اور امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔ حدیث میں جن جن چیزوں کی ممانعت آئی ہے۔ امام مالکؒ کے نزدیک اس ممانعت سے کراہت مراد ہے (یعنی ممانعت تحریمی نہیں ہے) ان علماء کے نزدیک گلا گھونٹے ہوئے جانور اور کسی ضرب سے کوٹے ہوئے جانور کا شمار بھی میتہ میں ہے بلکہ سورۂ مائدہ میں جن جانوروں کی ممانعت کی گئی ہے وہ سب ان کے نزدیک میتہ میں داخل ہیں[1]

میں کہتا ہوں ان اقسام کا جن کا ذکر سورۂ مائدہ میں آیا ہے مَيْتَةً میں شمار نہیں کیا جا سکتا اس کی وجہ ہم نے اوپر ذکر کر دی ہے (کہ ان اقسام کا عطف مَيْتَةً پر کیا گیا ہے اور معطوف کو معطوف علیہ سے مغایر ہونا چاہئے) امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور اکثر علماء قائل ہیں کہ حکم تحریم انہی چیزوں میں محدود نہیں ہے جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے۔ بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے محکم ہے کیونکہ اس آیت سے تو اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کے وقتِ نزول تک کسی اور چیز کی حرمت وحی میں نہیں آئی۔ اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ کسی اور چیز کی تحریم (کبھی) نہیں ہوئی لہٰذا خبر احاد سے آیت قرآنی کا منسوخ ہونا لازم نہیں آتا۔ میرے نزدیک بیضاوی کا یہ قول غلط ہے کیونکہ کوئی آیت ہو یا حدیث اگر اس کے اندر کوئی حکم دیا گیا ہو اور دوامی یا وقتی کی کوئی قید نہ لگائی گئی ہو تو بظاہر استصحاب (کسی حکم کو سابق حالت پر چھوڑ دینا) پر نظر کرتے ہوئے وہ حکم دوامی ہو گا اور اللہ کے علم میں وہ ایک معین وقت کے لئے ہو گا اسی قسم کی نص قابل نسخ ہوتی ہے پس ناسخ حقیقت میں مدت حکم کا اظہار ہوتا ہے اس لئے نسخ کو بیان تبدیل کہا جاتا ہے ورنہ لازم آئے گا کہ اللہ کو جدید حکم کی خوبی اب معلوم ہوئی پہلے سے معلوم نہ تھی اور یہ محال ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس آیت سے اشیاء مذکورہ کے علاوہ ہر چیز کی حلت معلوم ہو رہی ہے اور حلت غیر مقید ہے نہ اس میں دوامی کی قید ہے نہ وقتی کی۔ اسی لئے بحیرہ وغیرہ کی تحریم کی اس آیت سے تردید ہو رہی ہے اور بعض حلال

[1] علامہ جلال الدینؒ سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ نے اس آیت کی تشریح میں حسب ذیل صراحت کی، کافروں نے جب اللہ کے حرام کردہ کو حلال اور حلال کردہ کو حرام قرار دیا تو اس کے خلاف یہ آیت نازل ہوئی گویا اللہ نے اس طرح فرمایا کہ جن چوپایوں (بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام وغیرہ) کو تم نے حرام قرار دے رکھا ہے وہ تو حلال ہی ہیں اور جن چیزوں (مردار، بہتا ہوا خون، خنزیر کا گوشت وغیرہ) کو تم نے حلال سمجھ رکھا ہے وہ حرام ہی ہیں اگر کوئی کسی سے کہے آج تم مٹھائی نہ کھاؤ اور وہ جواب میں کہے میں تو آج مٹھائی ہی کھاؤں گا اور کچھ نہیں کھاؤں گا تو یہ حکم دینے والے کے حکم کی ضد کا اظہار ہو گا، یہ آیت بھی اسی ذیل میں داخل ہے۔ اس میں بھی کافروں کی خود ساختہ تحلیل و تحریم کی ضد کا اظہار مقصود ہے حقیقی (منطقی) نفی و اثبات مقصود نہیں ہے۔ امام الحرمین نے اس تاویل کو پسند کیا ہے اور لکھا ہے یہ بہت اچھا مطلب ہے۔

چیزوں کی آئندہ تحریم کا احتمال باقی ہے لیکن تحریم بعض اشیاء کا یہ احتمال اس امر کے منافی اور مخالف نہیں کہ مذکورہ اقسام کے علاوہ تمام اشیاء کی حلت حکم شرعی ہے جو قرآن کی صراحت سے ثابت ہے۔ پس اس کے بعد حدیث میں جو بعض دوسری اشیاء کی حرمت کا حکم آیا ہے وہ یقیناً اس حلت کا ناسخ ہوگا اور نسخ کتاب حدیث سے لازم آجائے گا، لہٰذا بہترین جواب یہ ہے کہ اس جگہ آیت عام ہے اور سورۂ مائدہ والی آیت میں جو مُنْخَنِقَة اور مَوْقُوْذَة وغیرہ کی حرمت کا ذکر آیا ہے اس سے اس کی عام حلت سے بعض اقسام کی حرمت کو خاص کرلیا گیا بلکہ تحریم شراب کو بھی اس سے خاص کرلیا گیا کیونکہ شراب بھی طعام ہی کی ایک قسم ہے اللہ نے شراب کے متعلق ہی فرمایا ہے لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا گویا یہ آیت اب عام مطلق نہیں بلکہ عام مخصوص البعض ہوگئی۔ مگر یہ تخصیص دوسری آیت سے ہوئی ہے اس کے بعد اس عام مخصوص البعض کی مزید تخصیص خبر احاد سے ہوگئی اور یہ جائز ہے بلکہ عام مخصوص البعض کی مزید تخصیص تو قیاس سے بھی ہوسکتی ہے اگر دونوں تخصیص ایک وقت میں ہونے کی شرط لگائی جائے تو یہ شرط قابل تسلیم نہیں، تخصیص میں اختلاف زمانہ جائز ہے کلام مستقل کے حکم سے جو جدید حکم بعض افراد کو خارج کردے وہ مخصوص ہے خواہ ایک زمانہ میں دونوں حکم ہوں یا آگے پیچھے مختلف اوقات میں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہ تخصیص ہے (اول کتاب کی تخصیص کتاب کے ذریعہ سے پھر کتاب کے عام مخصوص البعض کی تخصیص حدیث کے ذریعہ سے) نسخ نہیں ہے ناسخ تو وہ ہوگا جو تمام افراد سے حکم کو سلب کردے اور اگر دونوں تخصیصوں کے ہم زمانہ ہونے کی شرط مان بھی لی جائے تب بھی کہا جاسکتا ہے میتہ اور دم وغیرہ کے علاوہ تمام حیوانات کی حلت جو اس آیت سے مستفاد ہو رہی ہے وہ تحریم خبائث والی آیت سے منسوخ ہے اللہ نے فرمایا ہے يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ مگر طیبٰت اور خبائث میں اجمال ہے جو بیان کا محتاج ہے اور اس کا بیان اس حدیث میں آگیا ہے جس میں درندوں اور خانگی گدھوں کے گوشت کی حرمت ظاہر کی گئی ہے (گویا حدیث نہ قرآن کی ناسخ ہے نہ مخصص بلکہ کتاب کے مجمل کا بیان ہے) یا ہم کہیں گے کہ یہ احادیث اگرچہ اخبار احاد میں سے ہیں مگر تمام امت نے ان کو قبول کیا ہے یہاں تک کہ امام مالک جو تحریم سباع وغیرہ کے قائل نہیں ہیں انہوں نے بھی ان کو صحیح مانا ہے کیونکہ انہی احادیث کی بناء پر آپ سباع وغیرہ کو مکروہ تحریمی کہتے ہیں لہٰذا ان احادیث کی صحت اجماع مسلمہ ہوگئی اور اس اجماعی تسلیم کی وجہ سے ان کو قطعیت کا درجہ حاصل ہوگیا پس ان احادیث سے کتاب کے حکم کا منسوخ ہونا جائز ہوگیا۔

بجو، لومڑی، گھونس اور گوہ کے متعلق جو علماء کا اختلاف ہے وہ امام ابوحنیفہؒ کے خلاف نہیں جاتا کیونکہ امام صاحب بجو اور لومڑی کو درندوں میں اور گھونس و گوہ کو حشرات میں شمار کرتے ہیں اور سباع و حشرات کی حرمت میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں، اختلاف تو صرف اس امر میں ہے کہ یہ جانور سباع و حشرات میں داخل ہیں یا نہیں۔ حلال و حرام جانوروں کے مسائل کی تفصیل ہم نے سورۂ مائدہ کی آیت اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ کی تفسیر کے ذیل میں کردی ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ (اور یہودیوں پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کردیئے تھے) یعنی جن جانوروں کی انگلیاں ہوتی ہیں جیسے اونٹ درندے اور پرندے۔ قتیبی نے کہا پرندوں میں سے ناخن والا وہ پرندہ ہے جس کا پنجہ ہوتا ہے اور چوپایوں میں سے ناخن والا وہ چوپایہ ہے جو ٹاپ والا ہوتا ہے۔ قتیبی نے اس تشریح کی نسبت بعض اہل تفسیر کی طرف کی ہے۔ ٹاپ کو ناخن کہنا مجازاً ہے۔

شاید ظلم کی وجہ سے یہودیوں کے لئے عموماً یہ تمام جانور حرام کردیئے گئے تھے، ورنہ ان میں سے بعض جانوروں کی حرمت تو اسلام میں بھی ہے (اور یہ حرمت کسی جرم کی سزا کے طور پر نہیں ہے)۔

وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ (اور گائے اور بکری کے اجزاء میں سے ان دونوں کی چربیاں ہم نے ان پر حرام کردی تھیں سوائے اس چربی کے جو ان جانوروں کی پشت پر ہو یا انتڑیوں میں لگی ہو یا جو ہڈی سے ملی ہو، مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَا سے مراد وہ چربی ہے جو ان جانوروں کی پشت یا پہلو پر ہو،

اَلْحَوَایَا، الحاویہ کی جمع ہو یا الحاویاء کی، اس کا عطف ظُھُوْرُھُمَا پر ہے یعنی جو چربی انتڑیوں سے چسپاں ہو۔ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ سے مراد پٹھے اور سرین کی چربی ہے، اس کا اتصال دم کی جڑ اور حرام مغز سے ہوتا ہے۔ استثناء کے بعد حرام چربی صرف پیٹ کی اور گردن کی رہ گئی۔

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ (ہم نے (تحریم کی) یہ سزا ان کو ان کی شرارت کی وجہ سے دی تھی اور ہم سچے ہیں)، انبیاء کا قتل، راہ خدا سے روکنا، سود لینا، بغیر کسی حق کے لوگوں کا مال کھانا یہ ان کی شرارتیں تھیں۔

ایک شبہ

مذکورہ جرائم کے ارتکاب کرنے والوں کو حکم تحریم کی پرواہی نہیں تھی پھر اس حکم سے ان کو سزا کیا ملی۔

ازالہ

شاید آخرت کا عذاب بڑھانے کے لئے یہ حکم تحریم دیا گیا حضرت جابرؓ بن عبد اللہ کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے سال جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں تھے میں نے خود سنا، حضور ﷺ فرمارہے تھے اللہ نے شراب، مردار خنزیر اور بتوں کی تجارت کو حرام کر دیا ہے، عرض کیا گیا مردار کی چربی کا کیا حکم ہے اس سے تو کشتیوں پر پالش اور چمڑے پر روغن کیا جاتا ہے اور اس کو چراغ میں جلایا جاتا ہے فرمایا نہیں، مردار کی چربی حرام ہے۔ پھر فرمایا یہودیوں پر اللہ کی لعنت جب اللہ نے ان پر مردار کی چربی حرام کر دی تو انہوں نے چربی کو پکا کر اور ٹھیک بنا کر فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی، رواہ البخاری وغیرہ، واللہ اعلم۔

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ کا یہ مطلب ہے کہ عذاب کی وعید ثواب کے وعدہ اور واقعات کے خبر دینے میں ہم بلاشبہ سچے ہیں۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ (پس اگر وہ (یہودی) آپ کو جھوٹا کہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ تمہارا رب وسیع رحمت والا ہے) یعنی آپ کے پاس جو وحی کے ذریعہ سے ہدایات بھیجی گئی ہیں اگر یہودی ان کی تکذیب کریں تو ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ بڑی وسیع رحمت والا ہے کہ باوجود تمہاری تکذیب کے اس نے تم کو ڈھیل دے رکھی ہے۔ اللہ کے ڈھیل دینے سے تم فریب نہ کھانا وہ ڈھیل دیتا ہے چھوڑ نہیں دے گا (گرفت آخر میں ضرور کرے گا)۔

وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ (اور (جب وقت آجائے گا) اس کا عذاب مجرموں سے لوٹایا نہیں جائے گا)۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ مؤمنوں کے لئے وسیع رحمت والا اور تکذیب کرنے والوں کو سخت عذاب دینے والا ہے۔ اس آخری فقرہ کی جگہ فرمایا اس کا عذاب مجرموں سے نہیں لوٹایا جائے گا۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ۭ (عنقریب مشرک کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا نہ کسی (حلال) چیز کو حرام قرار دیتے)۔ یہ مستقبل کے متعلق اطلاع ہے اور معجزہ ہے خبر کے مطابق آئندہ واقعہ یہی ہوا جب مشرک دلیل کا جواب دینے سے عاجز ہو گئے تو انہوں نے اپنے طریقہ کے مطابق مشیت اور پسندیدہ خدا ہونے پر بصورت بالا استدلال کیا اگر اللہ چاہتا یعنی اگر ہمارے طریقہ عمل کے خلاف خدا چاہتا۔ مطلب یہ کہ اللہ کو قدرت حاصل ہے کہ وہ ہم کو ہمارے معمولات سے روک دے اور ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کو نہ کرپائیں۔ اگر اس کو ہمارا یہ طریقہ اور عمل پسند نہ ہوتا اور اس کے خلاف ہم سے کرانا چاہتا تو ضرور ہم کو اس طریقہ سے روک دیتا۔ یہ استدلال مشرکوں کی جہالت پر مبنی ہے انہوں نے ارادے اور پسندیدگی میں فرق نہیں کیا اللہ کے ارادہ اور مشیت کا تعلق تو ہر خیر و شر سے ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے ہوتا ہے نہیں چاہتا نہیں ہوتا، لیکن پسندیدگی کا تعلق کفر سے نہیں اللہ بندوں کے کافر ہونے کو پسند نہیں کرتا۔

كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ۭ (اسی طرح ان لوگوں نے (پیغمبروں کی) تکذیب کی تھی جو ان سے پہلے گزر گئے آخر انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا)۔

یعنی اللہ نے شرک کی ممانعت فرمائی ہے اس کو شرک پسند نہیں اور جن چیزوں کو مشرکوں نے از خود حرام بنا رکھا ہے اللہ نے ان کو حرام نہیں کیا مگر مشرکوں نے اس حکم کی تکذیب کی۔ اسی طرح اللہ کے پیغمبروں کی تکذیب پہلے لوگ بھی کر چکے ہیں آخر اس تکذیب کے نتیجہ میں ان پر اللہ کا عذاب آگیا اور انہوں نے عذاب خداوندی کا مزہ چکھ لیا۔

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۭ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۱۴۸

(آپ کہئے کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو اس کو ہمارے سامنے ظاہر کرو، تم لوگ محض خیالی باتوں پر چلتے ہو اور اٹکل سے باتیں بناتے ہو)۔

علم سے مراد ہے وہ علم جو (اللہ کی) کسی کتاب سے حاصل کیا گیا ہو۔ یا دلیل مراد ہے جو یہ ثابت کرے کہ اللہ شرک کو پسند کرتا ہے اور جن چیزوں کو انہوں نے حرام بنا رکھا ہے ان کی تحریم اللہ کی طرف سے ہے یا علم سے مراد ہے معلوم (مصدر بمعنی اسم مفعول) یعنی کوئی ایسا امر معلوم جس کو دعویٰ کے ثبوت میں پیش کیا جائے اَفَتُخْرِجُوْهُ یعنی کیا تم ہمارے سامنے ظاہر کرو گے کہ یہ علم تم کو کہاں سے ہوا لیکن ایسا نہیں ہے وہ قائل ہی نہیں ہیں کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں دلیل و علم سے کہتے ہیں۔ ظن سے مراد ہے وہ علم جو بغیر کسی دلیل کے محض باپ دادا کی تقلید سے حاصل ہو۔ تَخْرُصُوْنَ (تم اٹکل چلاتے ہو) یعنی جھوٹ بات کہتے ہو۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَاۗءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۱۴۹ (آپ کہیئے کہ پوری غالب دلیل تو اللہ ہی کی رہی پس اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت یاب کر دیتا)۔ یعنی اللہ نے اپنے اوامر و نواہی کی جو دلیل بیان کی وہ تو تمہارے خلاف کامل ہے اور تم نے جو اللہ کی مشیت کے مسئلہ کو استدلال میں پیش کیا ہے وہ استدلال ناقص ہے کیونکہ مشیت کے لئے رضامندی لازم نہیں، اللہ جو چاہتا ہے اپنی حکمت کے مطابق کرتا ہے اور جیسا ارادہ کرتا ہے ویسا حکم دیتا ہے اس سے کسی بات کی بازپرس نہیں کی جا سکتی وہ سب بندوں سے بازپرس کرے گا اس سے سوال کون کر سکتا ہے۔

فرقۂ معتزلہ کہتا ہے کہ کفر اللہ کی مشیت اور ارادہ سے نہیں ہوتا بندہ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ معتزلہ نے اس آیت سے اپنے قول پر استدلال کیا ہے اگر واقع میں کفر اللہ کی مشیت سے ہوتا تو پھر کافروں کا قول لَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا صحیح تھا اس کو غلط کیوں قرار دیا اور کیوں اس کی تکذیب کی۔

ہماری تفسیر سے معتزلہ کی اس دلیل کی غلطی واضح ہو رہی ہے، ہر چیز کا وجود مشیت خدا پر موقوف ہے اس کی تکذیب تو اللہ نے نہیں کی بلکہ آیت کا آخری جملہ فَلَوْ شَاۗءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ عموم مشیت کی تائید کر رہا ہے۔ اللہ نے مشرکوں کی مذمت صرف اس بات پر کی کہ انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی اور اس تکذیب پر اللہ کے رضامند ہونے کا دعویٰ کیا اور جس چیز کو اللہ نے حرام نہیں کیا اس کو از خود حرام کرنے پر اللہ کو راضی قرار دیا اور یہ بات کہی کہ چونکہ بحیرہ، سائبہ وغیرہ کی تحریم اللہ کی مشیت کے زیر اثر ہے اس لئے وہ ضرور اس پر راضی ہے (گویا اللہ نے مشرکوں کی تکذیب مشیت اور رضامندی میں فرق نہ کرنے پر کی، کفر شرک اور تحریم مالم یحرم کو مشیت کے زیر اثر قرار دینے پر نہیں کی۔

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَاۗءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ (آپ کہہ دیجئے کہ اپنے پیشواؤں کو لاؤ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کر دیا ہے۔ هَلُمَّ لاؤ، حاضر کرو۔ یہ اسم فعل ہے اور اس کی گردان اہل حجاز کے استعمال میں نہیں آتی۔ واحد اور جمع سب کے لئے اسی کا استعمال ہوتا ہے۔ شُهَدَاۗءَكُمْ یعنی اس قول میں جو تمہارے پیشوا ہیں ان کو بلاؤ تاکہ سب پر اتمام حجت ہو جائے اور سب کی گمراہی ظاہر ہو جائے، کیونکہ مقلدوں کی طرح پیشواؤں کے پاس بھی اس قول کی دلیل نہیں ہے۔ حَرَّمَ هٰذَا یعنی وہ شہادت دیں کہ جس چیز کو تم حرام کہتے ہو اللہ نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔

فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ (پھر اگر وہ (جھوٹی) شہادت دے بھی دیں تب بھی آپ ان کے ساتھ شہادت نہ دینا) یعنی ان کی تصدیق نہ کرنا بلکہ ان کی شہادت کی خرابی ظاہر کرتے رہنا۔

۱۸ ع ۵

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

(اور آپ ایسے لوگوں کے باطل خیالات کا اتباع نہ کرنا جو ہماری آیتوں کو جھوٹا کہتے ہیں اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ اپنے رب کے برابر دوسروں کو ٹھہراتے ہیں)۔ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ اصل میں اَهْوَاءَ هُمْ تھا (هُمْ) ضمیر کی جگہ اسم ظاہر (الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا) کو ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ آیات الٰہیہ کو جھوٹا کہنے والے حقیقت میں اپنی نفسانی خواہشات کا اتباع کرنے والے ہیں۔

جب تحریم اشیاء کے سلسلہ میں مشرکوں کے قول کی غلطی ظاہر ہوگئی تو لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اللہ نے کیا کیا چیزیں حرام کی ہیں اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ

(آپ کہہ دیجئے آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے لئے تمہارے رب نے حرام کردی ہیں وہ یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا کرو)۔ قُلْ سے خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ تَعَالَوْا تعالیٰ (باب تفاعل) سے امر حاضر جمع کا صیغہ ہے اس کی اصل وضع تو اس موقع کے لئے ہے جب کوئی شخص اوپر ہو اور نیچے والے آدمی سے کہے اوپر آجاؤ لیکن استعمال میں اس کے معنی عام ہوگئے، آؤ۔ مَا حَرَّمَ میں مَا موصولہ ہے (وہ چیز جو) یا مصدریہ ہے (بمعنی تحریم) دونوں صورتوں میں اَتْلُ کا مفعول ہے یا مَا استفہامیہ ہے اور حَرَّمَ کا مفعول ہے پھر پورا جملہ اَتْلُ کا مفعول ہے عَلَيْكُمْ کا تعلق حرم سے ہے یا اَتْلُ سے یا یہ اسم فعل ہے جس کا استعمال کسی کام پر برانگیختہ کرنے کے لئے کیا جاتا ہے یعنی اپنے اوپر لازم کرلو۔ اَلَّا تُشْرِكُوْا میں اَنْ مصدریہ ہے جبکہ عَلَيْكُمْ کو اسم فعل بمعنی اِلْزَمُوا کے کہا جائے ورنہ یہ فعل تلاوت کی تشریح ہے، میں یہ پڑھ کر سناتا ہوں کہ شریک نہ کرو الخ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اَلَّا تُشْرِكُوْا الخ فعل محذوف کا مفعول ہو اُوْصِيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ شرک نہ کرو یا اَنْ مصدری ہو اور لَا تُشْرِكُوْا میں لا زائد ہو اللہ نے شرک کرنا تم پر حرام کردیا ہے۔ شَيْـًٔا (مفعول مطلق ہے مگر ہم نے ترجمہ مفعول بہ کا کیا ہے یعنی) کسی طرح کا شرک نہ کرو نہ جلی (کھلا ہوا) نہ خفی یا مفعول بہ ہے یعنی کسی چیز کو (اسی کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے، مترجم) بِالْوَالِدَيْنِ کا تعلق محذوف فعل سے ہے یعنی اچھا سلوک کرو والدین کے ساتھ۔ اصل میں باپ ماں کے ساتھ بدسلوکی کی ممانعت مقصود ہے لیکن اس طرف اشارہ کرنا بھی ہے کہ بدسلوکی نہ کرنا کافی نہیں ہے والدین سے اچھا سلوک نہ کرنا بھی بجائے خود برا سلوک ہے اور گناہ ہے اس لئے کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے فرمایا کہ اچھا سلوک کرو، اس مطلب پر بِالْوَالِدَيْنِ کا لَا تُشْرِكُوْا پر عطف ہوگا لیکن اگر اَلَّا تُشْرِكُوْا میں لا کو زائد مانا جائے گا تو کلام کا مطلب اس طرح ہوگا اللہ نے تم پر شرک کرنے کو حرام کردیا ہے اور والدین کے ساتھ برا سلوک کرنے کو بھی اور والدین کے ساتھ خوب اچھا سلوک کرو۔

وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ (اور ناداری (کے اندیشہ) سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو یعنی لڑکیوں کو زندہ دفن نہ کرو ہم تم کو بھی کھانے کو دیں گے اور ان کو بھی)۔ حضرت معاذؓ کا بیان ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے دس باتوں کی نصیحت فرمائی کسی کو اللہ کا ساجھی نہ بنانا خواہ تجھے قتل کردیا جائے یا تو جلا دیا جائے اور والدین کی نافرمانی نہ کرنا خواہ ماں باپ تجھے تیری بیوی اور تیرے مال سے تعلق منقطع کرلینے کا حکم دیں، الخ رواہ احمد۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے فرمایا یہ کہ تو کسی کو اللہ کا مثل قرار دے باوجودیکہ تجھے پیدا اللہ ہی نے کیا ہے۔ سائل نے عرض کیا اس کے بعد فرمایا اس اندیشہ کی وجہ سے اولاد کو قتل کردینا کہ وہ تیرے ساتھ تیرے کھانے میں شریک ہوجائے گی، الیٰ آخر الحدیث (متفق علیہ)

وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ (اور بے حیائی کے کاموں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ علانیہ ہوں (بیرونی) یا پوشیدہ (اندرونی)۔

اَلْفَوَاحِشَ سے مراد ہیں کبیرہ گناہ یا صرف زنا، ظاہر گناہوں سے مراد وہ گناہ ہیں جو بیرونی اعضاء جسم سے علانیہ کئے جاتے ہیں اور پوشیدہ گناہ وہ ہیں جو بیرونی اعضاء جسمانی (ہاتھ پاؤں آنکھ وغیرہ) سے کئے جاتے ہیں مگر چھپ کر نفاق (حسد کینہ) وغیرہ جن کا تعلق دل سے ہے یہ بھی باطنی فواحش میں داخل ہے ۱؎

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ (اور جس شخص کے قتل کرنے کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل نہ کرو)۔ خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم معاہد یعنی اگر کسی سے کوئی ایسا جرم ہو جائے جس کی وجہ سے اس کو قتل کرنا جائز ہو جاتا ہے مثلاً کوئی مسلمان مرتد ہو جائے یا کوئی عمداً قتل کر دے یا کوئی محصن زنا کر لے یا مسلمانوں سے کئے ہوئے معاہدہ کو کوئی حربی توڑ دے یا اسلامی حکومت کے خلاف کوئی باغی ہو جائے یا کوئی رہزنی کرے تو ان صورتوں میں مجرم کو قتل کرنا مباح ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص شہادت دے رہا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اس کا خون حلال نہیں مگر تین امور میں سے کسی ایک امر کی وجہ سے یا تو وہ شادی شدہ زانی ہو یا جان کے بدلے جان یا اپنے دین کو چھوڑ دینے والا اور (مسلمانوں کی) جماعت سے الگ ہو جانے والا ہو، رواہ البغوی۔ اللہ نے فرمایا ہے وَإِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ الخ (یعنی معاہدہ شکن کافروں کو قتل کرو) دوسری آیت میں فرمایا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ (یعنی باغی مسلمانوں کو قتل کرنا جائز ہے) تیسری آیت میں آیا ہے اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ الخ (یعنی قاتلوں ڈاکوؤں اور راہزنوں کا قتل درست ہے)۔

ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ (اس کا اللہ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو) یعنی اس کی نگہداشت کا تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھ لو اور رشد حاصل کر لو، تکمیل عقل رشد ہی ہے۔ رشد کی ضد کا نام سفاہت یعنی سبک سری ہے۔

۱؎ حضرت علیؓ بن ابی طالب کی روایت ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو قبائل عرب کے پاس جانے اور ان کو تبلیغ کرنے کا حکم دیا تو آپ منی کو تشریف لائے میں اور حضرت ابو بکرؓ ہمراہ تھے حضرت ابو بکرؓ انساب عرب سے واقف تھے حضور والا منی میں قبائل کی فرودگاہوں اور ڈیروں پر جا کر ٹھہرے اور سلام کیا انہوں نے سلام کا جواب دیا ان لوگوں میں مفروق بن عمرو، ہانی بن قبیصہ مثنی بن حارثہ اور نعمان بن شریک موجود تھے۔ حضرت ابو بکر سے سب سے زیادہ تعلق رکھنے والا مفروق تھا جو فصاحت اور لسانی میں سب پر غالب تھا اس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف التفات کیا اور پوچھا قریشی بھائی آپ ہم کو کس چیز کی دعوت دے رہے ہیں۔ حضور آگے بڑھے اور آپ کے سر پر حضرت ابو بکرؓ نے اپنے کپڑے سے سایہ کر لیا، پھر حضورؐ نے فرمایا میں تم کو دعوت دیتا ہوں کہ تم اس امر کی شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ وحدہ لاشریک ہے اور میں اس کا رسول ہوں اور تم لوگ مجھے کوئی دکھ نہ دو، نہ مارو، بلکہ میری حفاظت کرو کہ میں اللہ کی طرف سے اس پیام کو پہنچادوں جس کا حکم اس نے مجھے دیا ہے کیونکہ قریش نے اللہ کے امر کے خلاف اجتماع کر لیا ہے اور اس کے رسول کو جھوٹا قرار دیا ہے اور حق کے خلاف باطل کی مدد کی ہے وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ۔ مفروق نے کہا ہمارے لئے تمہارا پیام دعوت اور کیا ہے، حضور نے جواب میں آیت قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ سے تَتَّقُوْنَ تک تلاوت فرمائی۔ مفروق نے کہا قریشی بھائی اور کس چیز کی طرف ہم کو بلاتے ہو خدا کی قسم یہ زمین والوں کا کلام نہیں ہے اگر اہل زمین کا کلام ہوتا تو ہم ضرور پہچان لیتے اس پر حضور نے تلاوت فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الخ المفروق نے کہا قریشی خدا کی قسم تم تو بزرگ اخلاق اور اچھے کاموں کی دعوت دے رہے ہو تمہاری قوم جھوٹی ہے جس نے تمہاری تکذیب کی اور تمہارے خلاف گٹھ جوڑ کیا ہانی بن قبیصہ کہنے لگا قریشی بھائی میں نے تمہاری بات سنی اور تمہارے قول کو پسند کیا اور جو کچھ تم نے کہا میرے دل نے اس کو اچھا سمجھا اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا تم لوگوں کو زیادہ مدت ٹھہرنا نہیں پڑے گا کہ اللہ تم کو ان کے ملک اور ان کی اولاد مرحمت فرمادے گا یعنی سرزمین فارس اور کسری کی نہریں عنایت کر دے گا اور ان کی لڑکیوں کو تمہاری بستری خادمائیں بنادے گا اور تم اللہ کی تسبیح وتقدیس بیان کرو گے۔ نعمان بن شریک نے کہا اللہ قریشی برادر تم کو یہ کہاں سے معلوم ہوا حضور نے آیت اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا تلاوت فرمادی، پھر آپ حضرت ابو بکرؓ کا ہاتھ پکڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انتہی

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ (اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو کہ مستحسن ہے یہاں تک کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ جائے)۔ وَلَا تَقْرَبُوْا یعنی یتیم کے مال کو کھانا اور تباہ کرنا تو درکنار اس کے مال کے پاس بھی نہ جاؤ۔ مگر اس طریقہ سے جس سے اس کے مال کی نگہداشت، درستی اور ترقی ہوتی ہو۔ مجاہد نے کہا اَلَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ سے مراد تجارت ہے۔ اَشُدَّ، شد کی جمع ہے جیسے افلس فلس کی جمع ہے یعنی بلوغ اور بلوغ کے بعد پوری سمجھ کے تمام اوصاف یتیم کو حاصل ہو جائیں بعض کے نزدیک اَشُدَّ مفرد ہے جس کا معنی ہے (قوتوں کا) کمال اَشُدَّ تک پہنچنے کی شرط احترازی نہیں عادی ہے۔ اسلام سے پہلے یتیم کے مال میں اس کے بچپن کے زمانہ میں ہر طرح کا تصرف کر لیا کرتے تھے لیکن جب وہ طاقتور ہو جاتا اور اس کے قویٰ کی تکمیل ہو جاتی تو وہ خود دوسروں کو اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک دیتا تھا اس پر اللہ نے فرمایا کہ یتیم کے بچپن کے زمانہ میں بھی اس کے مال کے پاس نہ جاؤ اور اس کے بعد تو وہ خود ہی تم کو روک دے گا تم تصرف کر ہی نہ سکو گے۔ بغویؒ نے لکھا ہے (معنی کے لحاظ سے) اصل آیت اس طرح ہے کہ یتیم کے مال کے پاس کبھی بھی نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو مستحسن ہے یہاں تک کہ جب وہ قوت کو پہنچ جائے تو اس کا مال اس کو دیدو بشرطیکہ وہ سبک سر نہ ہو۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ حتی مستثنیٰ کی غایت ہو اور مطلب اس طرح ہو یتیم کے مال سے اچھا معاملہ کرو۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کمال بلوغ کو پہنچ جائے (تو اچھے تصرف سے بھی دست کش ہو جاؤ)۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ (اور ناپ تول پوری پوری بغیر کمی بیشی کے کیا کرو)۔

قِسْط عدل، کمی بیشی نہ کرنا۔ امر کو بجائے نہی کے لایا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ تول ناپ میں کمی نہ کرو اس سے پورا پورا دینے کی اہمیت معلوم ہو گئی کیونکہ کسی چیز کی ممانعت سے التزاماً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس چیز کی ضد کا حکم دیا گیا ہے۔

لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ (ہم کسی شخص کو اس کی سمائی (امکان) سے زیادہ مکلف نہیں کرتے)۔ پورا پورا دینے کے حکم کے بعد اس جملہ سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جس پر حق ہو وہ مقدار حق سے زیادہ اگر حقدار کو دیدے تو زیادہ بہتر ہے اور یہ زیادتی وہ خود اپنی طرف سے کر دے۔ ابن مردویہ نے ضعیف سند سے سعید بن مسیب کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے ہاتھ پر ناپ تول پوری کی اور اس کے پوری کرنے کی نیت کو اللہ جانتا ہے اس کا مواخذہ نہ ہوگا (خواہ تول ناپ میں نادانستہ کمی بیشی ہو گئی ہو) اور وسعها سے یہی مراد ہے۔ احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت سوید بن قیس رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر ایک گھوڑے کی قیمت واجب تھی آپ نے اس کی ادائیگی کے سلسلہ میں فرمایا وزن کر کے (قیمت) دیدو اور جھکتی ہوئی دینا۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنے قرض کا تقاضا کرنے آیا اور کلام میں کچھ درشتی کی، بعض صحابیوں نے اس (کو مارنے) کا ارادہ کیا لیکن حضور ﷺ نے فرمایا رہنے دو، حقدار کو کہنے کا حق ہے پھر فرمایا جس عمر کا اس کا (اونٹ) تھا اسی عمر کا اس کو دیدو صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر ہم عمر نہ ملے بلکہ اس سے بہتر ملے فرمایا وہی دیدو کیونکہ تم میں سب سے اچھا وہ آدمی ہے جو ادائیگی قرض میں سب سے اچھا ہو۔ مسلم نے حضرت ابورافع کی روایت سے اسی کی ہم معنی حدیث بیان کی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص سے رسول اللہ ﷺ نے آدھا وسق (تقریباً تین من) قرض لیا تھا وہ تقاضا کرنے آیا حضور ﷺ نے اس کو ایک وسق (تقریباً چھ من) دے دیا اور فرمایا آدھا وسق تیرا ہے اور آدھا وسق میری طرف سے ہے، پھر ایک شخص ایک وسق کا تقاضا کرنے آیا آپ نے اس کو دو وسق دیدیا اور فرمایا ایک وسق تیرا ہے اور ایک وسق میری طرف سے ہے۔ رواہ الترمذی۔ اس حدیث کی سند میں کوئی سقم نہیں ہے۔

اسی لئے صاحب حق کے لئے افضل یہ ہے کہ اپنے حق سے کم واپس لے۔ حضرت جابرؓ کی راویت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی رحمت ہو اس جوانمردی کرنے والے شخص پر جو بیچنے خریدنے اور (قرض کا) مطالبہ کرنے کے وقت جوانمردی کرتا ہے، رواہ البخاری۔

چونکہ صاحب حق کے حق سے زیادہ ادا کرنا اور اپنے حق سے کم لینا اور اس پر راضی ہو جانا لوگوں کی طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے اس لئے اللہ نے نہ زیادہ دینا واجب کیا نہ کم لینا لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا کا یہی مطلب ہے۔ ان تمام احادیث سے امام شافعیؒ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ اگر قرضدار قرض خواہ کو کوئی چیز ہدیہ میں دیدے یا اس کو سواری کے لئے (بلا کرایہ) کوئی جانور دیدے یا اپنے مکان میں (بلا کرایہ) رکھ لے تو جائز ہے بشرطیکہ یہ شرطیں پہلے سے قرض لینے کے وقت طے نہ کی گئی ہوں۔ باقی تینوں اماموں کے نزدیک یہ تمام صورتیں مکروہ تحریمی ہیں کوئی بھی جائز نہیں۔ سورۂ بقرہ کی آیت مداینت کی تفسیر میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (اور جب تم بات کہو (خواہ پنچایت اور فیصلہ ہو یا شہادت) تو انصاف رکھا کرو اگرچہ وہ شخص (جو مدعی یا مدعی علیہ ہے تمہارا) قرابت دار ہو) اس جملہ سے مقصود بھی جنبہ داری اور جھوٹی شہادت دینے کی ممانعت تاکید کے ساتھ کرنی ہے، یہاں تک کہ گمان اور راجح خیال کی بنیاد پر بھی شہادت دینا ناجائز ہے بلکہ شہادت کے لئے پورا پورا الیقین ہونا ضروری ہے۔ لفظ شہادت (حضور اور معاینہ) اسی پر دلالت کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا تھا جھوٹی شہادت شرک کے مساوی ہے۔ پھر حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ، رواہ ابوداؤد و ابن ماجہ عن حزیم بن فاتک، واحمد والترمذی عن احمد بن حزیم ابن ماجۃ نے رسول اللہ ﷺ کی قرأت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حضرت بریدہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قاضی تین (قسم کے) ہوں گے، ایک جنت میں جائے گا اور دو دوزخ میں۔ جنت میں وہ قاضی جائے گا جس نے حق کو پہچانا اور حق کے مطابق ہی فیصلہ کیا اور جس نے حق کو پہچان لیا مگر فیصلہ میں ظلم کیا وہ دوزخ میں جائے گا اور جس نے جہالت کے باوجود فیصلہ کیا وہ بھی دوزخ میں جائے گا، رواہ ابوداؤد۔

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا (اور اللہ سے کیا ہوا عہد پورا کرو)، عہد اللہ سے مراد یا نذر اور قسم ہے یا تمام اوامر و نواہی کی پابندی احکام شرع کی ادائیگی اور عدل پر کاربند رہنے کا اقرار۔ اَوْفُوْا امر کا صیغہ ہے جس سے مقصود ہے ضد سے پر زور باز داشت مقصد یہ ہے کہ اللہ سے کئے ہوئے مضبوط عہد کی خلاف ورزی نہ کرو اور پختہ قسموں کو نہ توڑو۔ اوامر نواہی کی مضبوط پابندی کا تقاضا ہے کہ آدمی ان چیزوں سے بھی پرہیز رکھے جن کی حرمت و حلت مشتبہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح اور حلال و حرام کے درمیان کچھ امور غیر واضح ہیں، جن کو بہت آدمی نہیں جانتے پس جو شخص ان مشتبہ امور سے بچا رہا وہ اپنی آبرو اور دین کو بے داغ بچالے گیا اور جو مشتبہات میں پڑ گیا وہ (آخر کار) حرام میں پڑ جائے گا جیسے کوئی چرواہا اگر محفوظ چراگاہ کے آس پاس چراتا ہے تو اغلب ہے کہ وہ چراگاہ کے اندر بھی جا پڑے الخ متفق علیہ من حدیث النعمان بن بشیر۔ طبرانی نے صغیر میں صحیح سند سے حضرت عمرؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے جو چیز شک آفریں ہو اس کو چھوڑ دو اور اس چیز کو اختیار کرو جو شک آفریں نہ ہو۔

ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ (ان سب کا اللہ تعالیٰ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو (اور عمل کرو) اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے سیدھا سو اس پر چلو)۔ فراء نے کہا وَاَنَّ هٰذَا (سے پہلے فعل محذوف ہے) اصل میں وَاَتْلُ عَلَيْكُمْ اَنَّ هٰذَا تھا اور میں تم کو سناتا ہوں کہ یہ میرا راستہ ہے۔ مُسْتَقِيْمًا، صِرَاطِيْ سے حال ہے۔ هٰذَا سے اشارہ اس مجموعہ مضامین کی طرف ہے جن کا ذکر اس سورت میں آیا ہے یعنی توحید، نبوت، انبیاء کا دین میرا راستہ اور میرا دین ہے۔

میں کہتا ہوں ان سے پہلے حرف جر بھی محذوف ہو سکتا ہے اور اس وقت اس کا عطف بِهٖ پر ہوگا۔ بیضاوی نے لام کو محذوف قرار دیا ہے کیونکہ اس کے بعد فَاتَّبِعُوْهُ آیا ہے راستہ کا مستقیم ہونا اتباع کی علت ہے۔ بعض علماء کے نزدیک هٰذَا سے اشارہ (صرف) اس مضمون کی طرف ہے جس کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے۔ بغویؒ نے لکھا ہے یہ آیات محکم ہیں کوئی آیت ان

کی ناسخ نہیں، تمام مذاہب میں یہ امور حرام ہیں یہی اصول کتاب ہیں جو ان پر چلے گا جنت میں جائے گا جو ان کو ترک کرے گا دوزخی ہوگا، انتہی کلامہ۔

وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

(اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دے گی اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم (اس کے خلاف کرنے سے) احتیاط رکھو)۔

یعنی اپنی اپنی من مانی مختلف راہوں پر نہ چلو ورنہ یہ خواہش پرستی کی راہیں تم کو اتباع وحی کے راستہ سے پراگندہ کر دیں گی اتباع کتاب وسنت شریعت کا تقاضا ہے۔ عقل ودانش کی رسائی وہاں تک ہو سکے یا نہ ہو سکے اور خود تراشیدہ نظریات فاسدہ کا تقاضا ہے کہ کتاب وسنت اگر خواہش پرست طبقہ کے خیالات کے مطابق ہوں تو ان کو مان لیا جائے مخالف ہوں تو نہ مانا جائے اور جہاں تک ہو سکے کتاب وسنت کی صراحتوں کی توجیہ کی جائے۔ فرقہ پرستی اور گروہ بندی کا یہی سنگ بنیاد ہے۔ رافضی، خارجی، مجسمہ، جبریہ، قدریہ اور مختلف فرقے اسی نظریہ کے زیر اثر وجود میں آئے۔ میں نے سورۂ بقرہ کی آیت كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا کی تفسیر کے ذیل میں یہ مسئلہ تفصیل سے لکھ دیا ہے۔ اللہ نے تم کو اتباع وحی کی نصیحت اس لئے کی ہے کہ تم گمراہی اور تفریق عن الحق سے بچ جاؤ۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے پھر اس لکیر سے دائیں بائیں مختلف لکیریں کھینچیں اور فرمایا یہ مختلف راستے ہیں ان میں سے ہر راستہ پر ایک شیطان بیٹھا ہے اور لوگوں کو اس راستہ کی طرف بلا رہا ہے پھر حضور نے آیت أَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ الخ تلاوت فرمائی، رواہ احمد والنسائی، والدارمی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مؤمن نہ ہوگا جب تک اس کا قلبی جھکاؤ اس (دین) کا تابع نہ بن جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔ رواہ البغوی فی شرح السنۃ۔ نووی نے اربعین میں لکھا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔

ثُمَّ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ (پھر ہم نے موسیٰؑ کو کتاب (یعنی توریت) دی)

(ایک شبہ ثم کلام عربی میں تراخی کے لئے آتا ہے یعنی ثُمَّ کے بعد والے کلام کا وقوع ثم سے پہلے والے کلام کے وقوع سے بعد کو ہوتا ہے لیکن اس جگہ ایسا نہیں حضرت موسیٰؑ کی کتاب تو مذکورہ نصائح سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی۔

اس شبہ کا جواب بوجوہ ذیل دیا جا سکتا ہے) آتَيْنَا کا عطف وَصَّاكُم بِهِ پر ہے اور ثم صرف تاخیر بیان کے لئے استعمال ہوا ہے (واقعی تقدیم وتاخیر ملحوظ نہیں ہے) یعنی مذکورہ بالا نصیحت کرنے کے بعد اب ہم تم کو بتاتے ہیں کہ ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی تھی یا مرتبہ کے تفاوت کے لئے ہے (یعنی عموم سے خصوص کی طرف ترقی کی گئی ہے) مطلب یہ کہ مذکورہ نصائح تو اللہ نے پرانے اور نئے زمانوں میں یکساں کی ہیں پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ نے موسیٰؑ کو کتاب دی اور اس کتاب میں کچھ مزید احکام بھی بیان کئے۔

تَمَامًا عَلَى الَّذِي أَحْسَنَ (جس سے اچھی طرح عمل کرنے والوں پر نعمت پوری ہو) مفسرؒ نے مطلب اس طرح بیان کیا ہے تاکہ تکمیل نعمت ہو جائے ان لوگوں پر جو سابق شریعتوں پر کاربند رہے ہوں لیکن جو شخص کہ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان ہی نہ لایا ہو اور نہ گزشتہ شریعتوں کی پابندی کی ہو اس کو نہ توریت سے کچھ فائدہ ہو سکتا تھا نہ قرآن سے نہ اس پر نعمت کی تکمیل ہوئی۔ الَّذِي أَحْسَنَ سے حضرت موسیٰؑ مراد ہیں یعنی تاکہ توریت سے موسیٰؑ پر جنہوں نے گزشتہ شرائع کی بحسن وخوبی پابندی کی، نعمت کی تکمیل ہو جائے یہ بھی کہا گیا ہے کہ الَّذِي کا اطلاق واحد اور جمع سب پر ہوتا ہے اور اس سے مراد امت موسویہ کے وہ تمام افراد ہیں جنہوں نے (ایمان کے ساتھ) نیک عمل کئے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت الَّذِينَ

اَحْسَنُوْا سے اس قول کی تائید ہوتی ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا اَلَّذِیْ اَحْسَنَ سے مراد انبیاء ہیں یعنی انبیاء پر موسیٰؑ کی فضیلت کامل کرنے کے لئے ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی مطلب یہ کہ موسیٰؑ کی فضیلت کتاب دے کر ہم نے ظاہر کر دی۔

وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً (اور تمام احکام کی تفصیل ہو جائے اور ہدایت ہو اور رحمت ہو)۔ تَفْصِیْل مصدر بمعنی اسم مفعول ہے اور موصوف محذوف کی صفت ہے یعنی ان امور کا مفصل بیان جن کی دین میں ضرورت پڑتی ہے۔

لَّعَلَّهُم بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ﴿١٥٤﴾ (تاکہ وہ لوگ (یعنی حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کے لوگ مراد بنی اسرائیل ہیں) اپنے رب سے ملنے پر یقین کر لیں)۔ رب کی ملاقات سے مراد ہے حشر و نشر، عذاب و ثواب۔

وَهَٰذَا كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿١٥٥﴾ (اور یا (قرآن) ایک کتاب ہے جس کو ہم نے بھیجا ہے بڑی خیر و برکت والی سو اس پر چلو اور (گناہوں سے) بچو تاکہ تم پر رحمت کی جائے)۔ یعنی موسیٰؑ کے بعد اللہ نے قرآن نازل کیا جو خیر و برکت میں توریت سے بڑھ چڑھ کر ہے کیونکہ اس کے الفاظ مختصر ہیں اور مختصر عبارت میں علوم کا کثیر ذخیرہ موجود ہے گویا یہ محیط دائرہ کا مرکز ہے پس توریت کی جگہ اس کے احکام کا اتباع کرو اور مخالفت کی صورت میں اللہ کے عذاب سے ڈرو۔

أَن تَقُولُوا إِنَّمَا أُنزِلَ الْكِتَابُ عَلَىٰ طَائِفَتَيْنِ مِن قَبْلِنَا وَإِن كُنَّا عَن دِرَاسَتِهِمْ لَغَافِلِينَ ﴿١٥٦﴾

(کہیں تم یوں کہنے لگتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے صرف دونوں فرقوں پر اتری تھی اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل ناواقف تھے)۔

طَائِفَتَیْنِ سے مراد ہیں یہودی اور عیسائی اگرچہ صحیفے اور کتابیں توریت و انجیل کے علاوہ بھی نازل ہوئیں، لیکن توریت و انجیل کے علاوہ اس وقت کوئی مشہور نہیں تھی اسی لئے صرف یہودیوں اور عیسائیوں کے کتاب کا ذکر کیا۔ وَاِنْ کُنَّا میں اِنْ مخففہ ہے اسی لئے خبر میں لام لایا گیا۔ مطلب یہ کہ ہم ان پڑھ امی تھے اور شریعتیں ہم سے پہلے والے دونوں گروہوں پر اتاری گئی تھیں اس حجت کو دور کرنے کے لئے محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجا گیا اور قرآن اتارا گیا تاکہ اہل مکہ کو عذر کا موقع نہ مل سکے اور سارے جہان کے لئے نبوت و قرآن رحمت ہو جائے۔

أَوْ تَقُولُوا لَوْ أَنَّا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْكِتَابُ لَكُنَّا أَهْدَىٰ مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَاءَكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ ۚ

(یا یوں کہتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل ہوتی تو ہم ان سے بھی زیادہ ہدایت یاب ہوتے سو اب تمہارے رب کی طرف سے تم پر ایک واضح کتاب اور ہدایت اور رحمت آچکی ہے۔ اس کا عطف سابق اَنْ تَقُوْلُوْا پر ہے یعنی یہ بات پسندنہ تھی کہ تم یہ کہنے لگتے کہ جس طرح ہم سے پہلے لوگوں کو کتاب دی گئی اسی طرح اگر ہم پر بھی اتاری جاتی تو ہم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو جاتے۔ بغویؒ نے لکھا ہے کافروں کی ایک جماعت نے کہا تھا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح اگر ہم پر کتاب نازل ہوتی تو ہم ان سے بہتر ہوتے۔ بَیِّنَةٌ واضح دلیل ایسی زبان میں جس کو تم جانتے ہو اور اس کے باوجود اس کی چھوٹی سورت کی طرح بھی پیش نہ کر سکے۔ ھُدًی یعنی غور کرنے والے کے لئے واضح ہدایت۔ رَحْمَةٌ جو اس پر عمل کرے اس کے لئے نعمت۔ جملہ فَقَدْ جَاءَكُمْ محذوف شرط کی جزا ہے، مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو تمہاری تمنا کے مطابق روشن دلیل اور قاطع برہان آگئی۔

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَذَّبَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۗ سَنَجْزِي الَّذِينَ يَصْدِفُونَ عَنْ آيَاتِنَا سُوءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يَصْدِفُونَ ﴿١٥٧﴾ (پس اس شخص سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی ان آیتوں کو جھوٹا کہتا اور ان سے اعراض کرتا ہے جو لوگ ہماری آیات سے اعراض کرتے ہیں ہم ابھی ان کو ان کے اعراض کی سخت سزا دیں گے)۔ استفہام انکاری ہے۔

صَدَفَ خود رکنا اور دوسروں کو روکنا۔ سُوْٓءَ الْعَذَابِ شدت عذاب یعنی جب اللہ کی آیات نازل ہونے کی تمنا تھی اور آیات کا اللہ کی طرف سے نازل ہونا بالکل واضح بھی ہو گیا، اب اگر کوئی ان کو نہیں مانتا اور تکذیب کرتا ہے یا دوسروں کو روکتا ہے تو اس سے بڑا حق کوش کوئی نہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ

یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آجائیں یا آپ کا رب آجائے یا آپ کے رب کی کوئی بڑی نشانی آجائے۔ هَلْ يَنْتَظِرُوْنَ میں استفہام انکاری ہے یعنی اہل مکہ قرآن پر ایمان لانے کے لئے بس اس بات کے منتظر ہیں کہ الخ۔ الْمَلٰٓئِكَةُ سے موت کے یا عذاب کے فرشتے مراد ہیں یا وہ ملائکہ مراد ہیں جو روبرو آکر رسول اللہ کی صداقت اور قرآن مجید کی حقانیت کی شہادت دیں۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جس چیز کی اہل مکہ آرزومند تھے وہ آگئی لیکن وہ ایمان نہ لائے تو شاید ایمان لانے کے لئے وہ ملائکہ کے آنے کے منتظر ہیں حالانکہ فرشتوں کے آنے کے بعد کوئی ایمان مفید نہ ہوگا۔ بیضاوی نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ (حقیقت میں وہ لوگ منتظر نہیں تھے بلکہ) ان کی حالت منتظر کی سی حالت تھی اس لئے بطور تشبیہ مَا يَنْتَظِرُوْنَ فرمایا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ملائکہ کے آنے سے مراد ہو قیامت کے دن میدان حشر میں فرشتوں کا آسمان سے اترنا، اس کی تائید او یاتی ربک کے فقرہ سے ہو رہی ہے۔ قیامت کے دن میدان حشر میں مخلوق کا فیصلہ کرنے کے لئے اللہ رونق افروز ہوگا۔ جس کی رونق افروزی ہر کیفیت سے ماوراء ہوگی۔ اسی کی مثل سورہ بقرہ میں آیت هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ گزر چکی ہے اور اس کی تفسیر میں سلف خلف کا جو اختلاف تھا وہ وہاں ذکر کر دیا گیا ہے۔ فمن شاء فلیرجع۔

ایت ربک سے مراد ہیں خصوصی علامات قیامت۔ بغویؒ نے لکھا ہے اس سے مراد ہے آفتاب کا پچھم کی طرف سے نکلنا اکثر اہل تفسیر کا یہی قول ہے حضرت ابوسعید خدری کی مرفوع روایت بھی اسی طرح کی آئی ہے [1]

فصل :۔ "علامات قیامت" حضرت حذیفہؓ بن اسید غفاری کا بیان ہے کہ ہم قیامت کے متعلق باہم گفتگو میں مشغول تھے کہ رسول اللہ ﷺ برآمد ہوئے اور فرمایا جب تک قیامت سے پہلے تم دس نشانیاں نہیں دیکھ لو گے قیامت نہیں آئے گی۔ پھر آپ نے (مندرجہ ذیل امور کا) ذکر فرمایا دھواں، دجال، دابۃ الارض، مغرب سے سورج کا طلوع، عیسیٰؑ بن مریم کا اترنا، یاجوج ماجوج کا خروج، تین مرتبہ زمین کا دھنسنا ایک بار مشرق میں ایک بار مغرب میں ایک بار جزیرہ عرب میں آخر میں یمن سے ایک آگ کا نکلنا جو لوگوں کو میدان حشر کی طرف کھدیڑ کر لے جائے گی۔ دوسری روایت میں ہے کہ قعر عدن سے ایک آگ برآمد ہوگی جو لوگوں کو میدان حشر کی طرف ہنکا کر لے جائے گی۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ دسویں چیز ایک ہوائی طوفان ہوگا جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گا، رواہ مسلم۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے سب سے پہلی نشانی مغرب سے طلوع آفتاب اور دن چڑھتے دابۃ الارض کا خروج ہوگا ان دونوں علامتوں میں سے جو بھی پہلے ہو جائے گی فوراً اس کے پیچھے دوسری علامت بھی آجائے گی، رواہ مسلم۔ حضرت نواس بن سمعان کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دجال کا ذکر کیا اور فرمایا اگر میری موجودگی میں وہ برآمد ہو گیا تو میں تمہاری طرف سے اس سے نمٹ لوں گا اور اگر میں نہ ہوا اور وہ نکلا تو اس وقت ہر شخص اپنا دفاع کرے، ہر مسلمان کا میرے بجائے (براہ راست) اللہ نگہبان ہے۔ دجال جوان زولیدہ مو ہوگا جس کی ایک آنکھ باہر کو ابھری ہوئی

[1] حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں فرمایا لوگو! اس امت میں عنقریب کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو حکم رجم کا انکار کریں گے خروج دجال کی تکذیب کریں گے پچھم کی طرف سے آفتاب کے طلوع (کی اطلاع) کو جھوٹا قرار دیں گے، عذاب قبر کی بھی تکذیب کریں گے، وقوع شفاعت کے بھی قائل نہ ہوں گے اور اس بات کو بھی نہیں مانیں گے کہ دوزخ سے کچھ لوگوں کو جھلسنے کے بعد نکالا جائے گا۔

یعنی پھولے والی ہوگی گویا عبدالعزی بن قطن سے میں اس کو تشبیہ دے سکتا ہوں، اگر تم میں سے کوئی اس کو پالے تو سورۂ کہف کی ابتدائی آیات اس پر پڑھے وہ آیات دجال کے فتنہ سے پڑھنے والے کے لئے بچاؤ ہو جائیں گی۔ دجال شام و عراق کے درمیان خلہ میں برآمد ہوگا۔ دائیں بائیں تباہی مچائے گا، اللہ کے بندو تم (ایمان پر) جمے رہنا، ہم نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اس کا قیام زمین پر کتنی مدت ہوگا فرمایا چالیس روز اس میں ایک دن ایک سال کے برابر ایک دن ایک ماہ کے برابر ایک دن ایک ہفتہ کے برابر اور باقی دن تمہارے انہی دنوں کی طرح ہوں گے ہم نے عرض کیا جو دن ایک سال کے برابر ہوگا، کیا اس میں ایک دن کی نمازیں ہوں گی فرمایا نہیں اس کا اندازہ کر لینا۔ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ وہ زمین میں کتنی تیز رفتار سے چلے گا فرمایا جیسے ہوا اپنے پیچھے بارش لاتی ہے بعض لوگوں کی طرف سے جب اس کا گزر ہوگا تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے اس پر آسمان اس کے حکم سے ان پر مینہ برسائے گا اور زمین سبزہ پیدا کر دے گی ان کے مویشی شام کو جنگل سے واپس آئیں گے تو ان کے تھن (دودھ سے) خوب بھرپور اور کوکیں پھولی ہوں گی (یعنی موٹے ہو جائیں گے) پھر کچھ اور لوگوں کی طرف سے گزرے گا اور ان کو دعوت دے گا مگر وہ دجال کی دعوت کو رد کر دیں گے جب دجال ان کے پاس سے واپس ہوگا تو وہ سب کال میں مبتلا ہو چکے ہوں گے مال بالکل ختم ہو چکا ہوگا ان کے پاس کچھ نہ ہوگا دجال ویرانے کی طرف سے گزرے گا وہ اپنے دفینے باہر نکال دے گا فوراً سارے خزانے اس کے پیچھے ہولیں گے جیسے شہد کی مکھیاں یعسوب کے پیچھے ہوتی ہیں۔ پھر دجال ایک شخص کو بلائے گا جو جوانی سے بھرپور ہوگا تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر کے (الگ الگ) بقدر نشانہ تیر پھینک دے گا پھر اس کو بلائے گا تو وہ شگفتہ رو ہنستا ہوا سامنے سے آجائے گا۔ دجال اپنی اسی حالت میں ہوگا کہ اللہ مسیح بن مریم کو بھیج دے گا مسیح دمشق کے شرقی جانب سفید منارہ کے پاس دو فرشتوں کے بازوؤں پر دونوں ہاتھوں کا سہارا دیئے اتریں گے سر جھکائیں گے تو چاندی کے موتیوں کی طرح (پسینہ کے) قطرے ٹپکیں گے اور سر اٹھائیں گے تب بھی موتیوں کی طرح (چہرہ سے) قطرے بہیں گے۔ جس کافر کو ان کے سانس کی ہوا پہنچے گی وہ مر جائے گا اور ان کے سانس کی رسائی وہاں تک ہوگی جہاں تک نظر کی پہنچ ہوگی مسیح دجال کو ڈھونڈیں گے اور باب لد کے پاس اس کو پا کر قتل کر دیں گے۔ پھر عیسیٰؑ کے پاس کچھ لوگ آئیں گے جن کو اللہ نے دجال سے محفوظ رکھا ہوگا۔ عیسیٰؑ ان کے چہروں سے غبار صاف کریں گے اور جنت میں (ملنے والے) ان کے مراتب بیان کریں گے۔

اس کے بعد اللہ عیسیٰؑ کے پاس وحی بھیجے گا کہ اب میں نے اپنے کچھ بندے ایسے پیدا کر دیئے ہیں جن سے لڑنے کی کسی میں طاقت نہیں تم میرے ان بندوں کو سمیٹ کر طور کی طرف لے جاؤ اس کے بعد اللہ یاجوج ماجوج کو بھیج دے گا جو ہر ٹیلہ کے پیچھے سے پھیلتے جائیں گے (ان کی تعداد اتنی ہوگی کہ) ان کا اگلا گروہ جب بحیرہ طبریہ پر گزرے گا تو سب پانی پی جائے گا اور آخری لوگ جب وہاں سے گزریں گے تو کہیں گے یہاں کبھی پانی تھا یاجوج ماجوج چلتے پھرتے جب کوہ خمر یعنی کوہ بیت المقدس تک آئیں گے تو کہیں گے ہم نے زمین کے باشندوں کو تو قتل کر دیا اب ہم آسمان والوں کو قتل کرنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ اپنے چھوٹے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے اور اللہ ان کے تیروں کو خون سے رنگین کر کے واپس کر دے گا (تو وہ بہت خوش ہوں گے) اللہ کا نبی اور اس کے ساتھی (اس پوری مدت میں کوہ طور پر) محصور رہیں گے یہاں تک کہ ایک بیل کی سری ان کے لئے اس سے زیادہ بہتر ہوگی جتنے آج کل سو دینار تمہارے لئے اس کے بعد اللہ کے نبی عیسیٰ اور ان کے ساتھی دعا کریں گے تو اللہ یاجوج ماجوج کی گردنوں میں گلٹیاں پیدا کر دے گا جن کی وجہ سے سب کے سب ایک آدمی کی طرح صبح کو مر جائیں گے پھر عیسیٰ نبی اللہ اور ان کے ساتھی نیچے اتر کر آئیں گے لیکن زمین پر بالشت بھر جگہ ان کو ایسی نہیں ملے گی جو سڑاند اور تعفن سے بھری نہ ہو عیسیٰ نبی اللہ اور ان کے ساتھی اللہ سے دعا کریں گے تو اللہ کچھ پرندوں کو بھیج دے گا۔ جو بختی اونٹوں کی گردنوں کی طرح (لمبے لمبے) ہوں گے یہ پرندے ان کو اٹھا کر لے جائیں گے اور جہاں اللہ کی مرضی ہوگی پھینک دیں گے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اللہ ان کو نہبل میں پھینک دے گا[1] اور مسلمان یاجوج ماجوج کی کمانوں تیروں اور تیر دانوں کو سات برس تک ایندھن کے طور پر استعمال

[1] صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ ترمذی میں حدیث دجال میں نہبل کا لفظ آیا ہے مگر یہ غلط ہے صحیح میم کے ساتھ ہے۔

کریں گے پھر اللہ بارش کر دے گا جو ساری زمین کو دھو کر باغ کی طرح کر دے گا۔ کسی کچے مکان یا ڈیرے کی چھت محفوظ نہیں رہے گی اس کے بعد زمین کو حکم ہو گا اپنی سبزی اگا اور پیداوار کو لوٹا کر دیدے چنانچہ اس زمانہ میں ایک انار ایک جماعت کے لئے کافی ہو گا اور انار کے چھلکے سے لوگ سائبان بنائیں گے دودھ میں برکت ہو جائے گی دودھ دینے والی ایک اونٹنی ایک بڑے گروہ کے لئے دودھ دینے والی ایک گائے ایک قبیلہ کے لئے اور دودھ دینے والی ایک بکری قبیلہ کے ایک خاندان کے لئے کافی ہو گی اسی حالت میں اللہ ایک خوشگوار ہوا بھیجے گا جو لوگوں کی بغلوں کے نیچے لگے گی اور ہر مومن و مسلم کی روح قبض ہو جائے گی صرف شریر لوگ باقی رہ جائیں گے جو فتنے فساد اور گڑبڑ کریں گے جیسے گدھے آپس میں کرتے ہیں انہی پر قیامت بپا ہو گی رواہ مسلم مسلم کی روایت میں ثم یطرحھم بالنھبل سے سبع سنین تک نہیں ہے اور ترمذی کی روایت میں یہ بھی مذکور ہے۔

حضرت حذیفہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دجال خروج کرے گا اس کے ساتھ پانی بھی ہو گا اور آگ بھی لوگ جس کو پانی خیال کریں گے وہ آتش سوزاں ہو گی اور جس کو آگ سمجھیں گے وہ ٹھنڈا میٹھا پانی ہو گا تم لوگوں میں جو شخص اس کو پائے تو جس کو آگ سمجھتا ہو اسی میں پڑ جائے وہ حقیقت میں شیریں پاکیزہ پانی ہو گا (متفق علیہ) مسلم کی روایت میں اتنا زائد ہے کہ دجال کی ایک آنکھ پٹ ہو گی ایک موٹا ناخونہ اس پر چڑھا ہو گا اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لفظ کافر لکھا ہو گا جس کو ہر مومن پڑھ لے گا لکھنے والا ہو یا لکھنے والا نہ ہو۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ دجال کے ساتھ جنت و دوزخ کی شبیہ (یعنی راحت و دکھ کی چیزیں) ہوں گی جس کو وہ جنت کہے گا وہ دوزخ ہو گی۔ حضرت حذیفہؓ کی روایت سے مسلم نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ مسلم نے حضرت ابوسعیدؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ اس کو یعنی دجال کو جب مومن دیکھے گا تو کہے گا لوگو! یہ وہی دجال ہے جس کا ذکر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا دجال کے حکم سے اس کو سر کی مانگ سے نیچے تک آرے سے چیر کر دونوں ٹانگیں الگ الگ کر دی جائیں گی، پھر دجال دونوں ٹکڑوں کے درمیان جا کر کہے گا اٹھ جا، مؤمن زندہ ہو کر سیدھا کھڑا ہو جائے گا۔ دجال اس سے کہے گا کیا (اب) تجھے میرا یقین ہوا مومن کہے گا تیرے اس فعل سے تو میری بصیرت اور بڑھ گئی (یقیناً تو دجال ہے)، الحدیث۔

امام احمدؒ نے حضرت اسماء بنت یزید کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ دجال کے شدید ترین فتنوں میں سے ایک واقعہ یہ ہو گا کہ دجال ایک اعرابی سے جا کر کہے گا اگر میں تیرے اونٹ زندہ کر دوں تو کیا تو جب بھی مجھے اپنا رب نہ مانے گا اعرابی کہے گا ضرور مانوں گا فوراً شیطان اس کے اونٹوں کے بھیس میں اس کے سامنے آجائے گا ان کے لمبے لمبے خوبصورت تھن اور اونچے اونچے کوہان ہوں گے ایک شخص کا بھائی اور باپ مر چکا ہو گا، دجال اس سے کہے گا اگر میں تیرے باپ اور بھائی کو زندہ کر دوں تو کیا تو مجھے اپنا رب نہیں مانے گا۔ وہ شخص کہے گا بے شک مان لوں گا فوراً شیطان اس کے باپ اور بھائی کی شکل میں نمودار ہو جائے گا۔ الحدیث

فصل :- (امام) مہدی کا ظہور مذکورہ بالا نشانیوں سے پہلے ہو گا حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر دنیا کی عمر کا صرف ایک دن رہ جائے گا تب بھی اللہ اس دن کو اتنا لمبا کر دے گا کہ ایک شخص کو مبعوث فرما دے جو مجھ سے ہو گا یا فرمایا وہ میرے اہل بیت میں سے ہو گا اس کا نام میرے نام کے اور اس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام کے موافق ہو گا (یعنی وہ بھی محمد بن عبداللہ ہو گا) جس طرح (اس زمانہ میں) زمین ظلم اور ناانصافی سے بھری ہو گی وہ اتنا ہی زمین کو انصاف اور عدل سے بھر دے گا ترمذی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں دنیا ختم نہ ہو گی جب تک عرب کا مالک ایک ایسا شخص نہ ہو جائے گا، جو میرے اہل بیت میں سے ہو گا اور اس کا نام میرا نام ہو گا۔

حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک خلیفہ کے مرنے پر لوگوں میں اختلاف ہو جائے گا تو اہل مدینہ میں سے ایک شخص بھاگ کر مکہ کو چلا جائے گا وہاں مکہ والے اس کو (گھر کے اندر سے) نکال کر باہر لائیں گے وہ پسند نہ کرے گا مگر اس کی ناگواری کے باوجود رکن اور مقام ابراہیمؑ کے درمیان اس کی بیعت کریں گے۔ اس کے پاس ایک وفد شام سے بھیجا جائے گا مگر مکہ اور مدینہ کے درمیان بیداء میں اللہ اس کو زمین کے اندر دھنسا دے گا لوگ جب یہ حالت دیکھیں گے تو پھر

اس کے پاس شام کے ابدال اور اہل عراق کی جماعتیں آئیں گی اور اس کی بیعت کریں گے۔ یہ شخص نبی کی سنت پر عمل کرے گا اور اسلام اپنا سینہ زمین پر ٹکا دے گا (یعنی ساری زمین پر اسلام بپا ہو جائے گا) سات برس تک یہ شخص رہے گا پھر اس کی وفات ہو جائے گی اور مسلمان اس کی نماز پڑھیں گے، رواہ ابوداؤد۔

ابوداؤد کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے صاحبزادے (امام) حسنؓ کی طرف دیکھ کر فرمایا میرا یہ بیٹا سید ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے سید (کے لفظ) کے ساتھ اس کو نام زد فرمایا تھا اس کی پشت سے ایک آدمی پیدا ہوگا جو تمہارے نبیؐ کا ہم نام ہوگا اور خوخصلت میں تمہارے نبی کے مشابہ ہوگا اگرچہ جسمانی بناوٹ میں آپ کے مشابہ نہ ہوگا وہ زمین کو انصاف سے بھر دے گا۔

حضرت ابو سعیدؓ خدری کا بیان مہدی کے قصہ کے سلسلہ میں آیا ہے پھر ایک شخص آکر مہدی سے کہے گا مہدی مجھے کچھ دیجئے مجھے کچھ عنایت کیجئے مہدی لپوں سے بھر کر (یعنی دونوں ہاتھوں سے بھر کر) اس کے کپڑے میں اتنا ڈال دیں گے جتنا وہ اٹھا سکتا ہوگا۔ (رواہ الترمذی) حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے آسمان کے رہنے والے اور زمین کے رہنے والے اس سے راضی ہوں گے آسمان سے خوب موسلا دھار بارشیں ہوں گی اور زمین اپنے اندر کی ہر سبزی بر آمد کر دے گی یہاں تک کہ زندے مردوں کی تمنا کریں گے (کہ کاش وہ بھی زندہ ہوتے اور یہ ارزانی و فراوانی دیکھتے) مہدی اس حالت میں سات یا آٹھ یا نو سال رہیں گے (پھر آپ کی وفات ہو جائے گی)۔

يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ

(جس روز آپ کے رب کی بڑی نشانی آپہنچے گی کسی ایسے شخص کا ایمان اس کے کام نہ آئے گا جو پہلے سے ایمان نہیں رکھتا اس نے اپنے ایمان میں کوئی نیک عمل نہ کیا ہو) مثلاً جو شخص مر رہا ہو اور یقینی موت نظر کے سامنے آگئی ہو تو اس حالت میں ایمان غیر مفید ہے کیونکہ ایمان بالغیب واجب ہے (مشاہدۂ موت اور معائنۂ ملائکۂ موت کی حالت میں ایمان بالغیب نہیں رہتا)۔

لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ نَفْسًا کی صفت ہے اور كَسَبَتْ کا عطف اٰمَنَتْ پر ہے (یعنی كَسَبَتْ بھی نفی کے تحت ہے)

بعض علماء قائل ہیں کہ صرف ایمان جو عمل سے بالکل خالی ہو غیر مفید اور نا قابل اعتبار ہے کیونکہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جو شخص پہلے سے ایمان نہ لایا ہو، مرنے کے وقت اس کا ایمان فائدہ بخش نہیں یا ایمان تو پہلے سے لایا ہو مگر اس نے ایمان کے مطابق کوئی عمل نہ کیا ہو، اس کا ایمان بھی غیر مفید ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ آیت کا مفہوم یہ نہیں کہ ایمان کی حالت میں اور مؤمن ہونے کے بعد اگر کسی نے کوئی نیکی نہ کی تو اس کا ایمان بالکل غیر مفید ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ صرف اس روز اس کا وہ سابقہ ایمان جو عمل صالح سے خالی ہو کار آمد نہ ہوگا۔ یوں بھی جواب دیا جا سکتا ہے کہ اگر دو امور مذکور ہوں اور نکرہ ہوں اور ایک نفی کے دائرہ میں داخل ہو تو نفی کا ورود دوسرے پر بھی قرار دیا جاتا ہے جیسے آیت وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا میں اثم اور کفور دونوں کی اطاعت کی ممانعت کی گئی ہے اٰثِمًا، لا کے تحت ہے اور كَفُوْرًا، او کے بعد آیا ہے مگر ممانعت اطاعت کا تعلق دونوں سے ہے) اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جو نفس ایمان نہ لایا ہو اس کو بھی موت کے وقت ایمان لانا مفید نہ ہوگا اور جس نے نیکی نہ کی ہو اس کو بھی مرنے کے وقت ایمان لانے سے فائدہ نہ ہو۔ بغویؒ نے لکھا ہے آیت کا معنی یہ ہے کہ ایسے وقت میں نہ کافر کا ایمان مقبول ہے نہ فاسق کی توبہ۔

اس قول پر فِيْٓ اِيْمَانِهَا میں ایمان سے بطور عموم مجاز توبہ مراد ہوگی کیونکہ لفظ توبہ دونوں قسموں کو حاوی ہے، کفر سے توبہ گناہوں سے توبہ۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ نے مغرب میں توبہ کا ایک دروازہ بنایا ہے جس کی چوڑائی ستر سال کے راستہ کے برابر ہے جب تک سورج کا طلوع اس طرف سے نہ ہوگا وہ دروازہ بند نہیں کیا جائے گا یہی مراد ہے اللہ کے اس فرمان کی يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ (یعنی آیت میں بعض آیات سے مغرب سے آفتاب کا طلوع مراد ہے) رواہ الترمذی وابن ماجۃ من حدیث صفوان بن عسال۔ مسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری

کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ (قبول توبہ کے لئے) رات میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن کا گناہ گار (رات کو) توبہ کرلے اور دن میں اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات کا گناہ گار (دن کو) توبہ کرلے یہ سلسلہ اس وقت تک رہے گا جب آفتاب پچھم کی طرف سے نکلے گا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے مسلم نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مغرب کی طرف سے سورج نکلنے سے پہلے توبہ کرلی اللہ اس کی توبہ قبول فرمالے گا۔ احمد، دارمی اور ابوداؤد نے حضرت معاویہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہجرت منقطع نہ ہوگی جب تک توبہ بند نہ ہو جائے اور توبہ بند نہ ہوگی جب تک سورج مغرب کی طرف سے بر آمد نہ ہو جائے۔

ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا میں ایمان سے مراد توبہ ہے لیکن کچھ احادیث میں ایمان سے توبہ کے علاوہ دوسرا معنی بھی مراد لیا گیا ہے۔ بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا قیامت بپا نہ ہوگی جب تک سورج مغرب کی طرف سے بر آمد نہ ہو جائے جب سورج (مغرب سے) نکل آئے گا اور لوگ اس کو دیکھ لیں گے تو سب کے سب ایمان لے آئیں گے لیکن جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو گا یا ایمان کی حالت میں اس نے کوئی نیکی نہ کی ہوگی اس وقت اس کا ایمان لانا مفید نہ ہوگا۔ مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین امور ہیں جب وہ ظاہر ہو جائیں گے تو جو پہلے سے ایمان نہ لایا ہو گا یا ایمان کی حالت میں اس نے کوئی نیکی نہ کی ہوگی اس وقت اس کا ایمان مفید نہ ہوگا۔ دجال، دابۃ الارض اور آفتاب کا مغرب سے طلوع۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا میں ایمان سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اس وقت سے پہلے مومن نہ ہو گیا ہو اس وقت اس کا ایمان لانا معتبر نہ ہوگا۔

فائدہ:- اس آیت سے بظاہر صرف اتنا معلوم ہو رہا ہے کہ جو شخص بعض آیات کے ظہور سے پہلے کافر ہو ایمان نہ لایا ہو اور اس وقت ایمان لائے تو اس کا ایمان قبول نہ ہوگا لیکن جس شخص کی پیدائش ہی بعض آیات کے ظہور کے بعد ہوئی یا علامات کے نمودار ہونے کے بعد وہ عاقل بالغ ہوا اور اس کے بعد ایمان لایا تو ظاہر ہے کہ اس کا ایمان معتبر ہوگا۔ ابن جوزی نے کتاب الوفاء میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عیسیٰؑ بن مریمؑ زمین پر اتریں گے نکاح کریں گے ان کی اولاد ہوگی اور ۴۵ برس (زندہ) رہیں گے پھر مر جائیں گے اور میرے ساتھ میری قبر میں دفن کئے جائیں گے میں اور عیسیٰؑ بن مریمؑ ایک قبر سے ابوبکرؓ و عمرؓ کے درمیان اٹھیں گے۔

قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ (آپ کہہ دیجئے (اے مکہ والو) تم انتظار رکھو ہم بھی بلاشبہ منتظر ہیں)۔ یہ اہل مکہ کو عذاب کی دھمکی ہے یعنی اس وقت ہم کو کامیابی حاصل ہوگی اور تم عذاب میں مبتلا ہو گے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ (بلاشبہ جنہوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا)۔

یعنی دین کے بعض حصوں پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کر دیا یا یہ مطلب کہ مختلف فرقے بن گئے۔ مجاہدؒ، قتادہؒ اور سدیؒ نے کہا اس سے یہودی اور عیسائی مراد ہیں کچھ لوگ یہودی بن گئے اور کچھ عیسائی حالانکہ دین (سب کا) ایک ہی تھا۔ یہ قول غلط ہے کیونکہ یہودیت کی بنا حضرت موسیٰؑ کی نبوت و شریعت پر ہے اور نصرانیت کی بنا حضرت عیسیٰؑ کی بعثت پر ہے دونوں کے دینی اصول ایک ہی تھے یعنی حضرت ابراہیم کے دین کے اصول ہی دونوں کے اصول تھے۔ پھر یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا چونکہ انکار کر دیا اس لئے اور عیسائیوں نے حضور اکرم محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو نہیں مانا اس لئے وہ بھی کافر ہو گئے۔ مگر آیت کا مطلب یہ نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ انہوں نے اصلی دین حق کے ساتھ اپنی من پسند چیزوں کو شامل کر لیا خواہ شیطانی اغواء سے یا اپنی نفسانی خواہشات کے دباؤ سے۔ بہر حال دین میں خلط ملط کر کے اپنے اپنے گروہ بنا لئے۔ اس مطلب پر تفریق دین کرنے والوں سے مراد صرف گزشتہ فرقے ہی نہ ہوں گے بلکہ سلف ہوں یا اسلام میں بدعتوں کو شامل کرنے والے سب ہی کو یہ لفظ شامل ہو گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت پر بھی قدم بقدم وہی واقعات

آئیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے یہاں تک کہ اگر بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت کے پھٹ کر تہتر فرقے ہو جائیں گے، جن میں سے سوائے ایک کے سب دوزخی ہوں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کون سا فرقہ ہوگا فرمایا (وہ فرقہ وہ ہوگا جو) اسی طریقہ پر ہوگا جس پر میں اور میرے ساتھی ہیں، رواہ الترمذی، احمد اور ابوداؤد نے حضرت معاویہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے بہتر (فرقے) دوزخ میں اور ایک جنت میں جائے گا اور وہ (جنتی فرقہ) جمہور کا ہوگا عنقریب میری امت میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے جن کے اندر نفسانی خواہشات اس طرح نفوذ کریں گی جس طرح کتا اپنے مالک کے ساتھ ہر کوچے اور موڑ میں گھستا پھرتا ہے۔ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور ترمذی و حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ یہود کے اکہتر فرقے ہو گئے جن میں سے ایک کے سوا سب گڑھے (دوزخ) میں جائیں گے اور عیسائیوں کے بہتر فرقے ہو گئے جن میں سے ایک کے سوا سب گڑھے (دوزخ) میں جائیں گے۔

بغویؒ نے حضرت عمرؓ بن خطاب کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا عائشہؓ جن لوگوں نے دین کو پارہ پارہ کیا اور گروہ گروہ بن گئے وہ اس امت میں بدعتی ہوا پرست ہیں (یعنی اس امت میں جو بدعتی اور اصحاب الھوی ہیں وہ اس آیت کے ذیل میں آتے ہیں) اخرجہ الطبرانی وغیرہ بسند جید۔ طبرانی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی عمدہ سند کے ساتھ ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔ احمد ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عرباض بن ساریہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے ہم کو نماز پڑھائی نماز کے بعد ہماری طرف رخ کر کے ایسا بلیغ وعظ فرمایا جس کو سن کر دل ڈر گئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ارشاد فرمایا میں تم کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی نصیحت کرتا ہوں اور اس بات کی کہ (امیر کی) اطاعت کرنا خواہ وہ حبشی غلام ہی ہو میرے بعد تم میں سے جو شخص زندہ رہے گا وہ (مسلمانوں میں) بڑا اختلاف دیکھے گا مگر تم میرے طریقہ اور ان خلفاء راشدین کے طریقہ پر جو ہدایت کار اور ہدایت یافتہ ہوں گے جمے رہنا اس پر مضبوط گرفت رکھنا اور اس کو دانتوں سے پکڑے رہنا اور نئی باتوں سے بچتے رہنا کیونکہ (دین کے اندر پیدا کی ہوئی) ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے، ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت میں نماز پڑھانے کا ذکر نہیں ہے باقی حدیث موجود ہے۔ صاحب مصابیح نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عظمت والے گروہ کی پیروی کرو جو (اس سے) بچھڑا بچھڑ کر دوزخ میں گیا۔ ابن ماجہ نے یہ حدیث حضرت انسؓ کی روایت سے لکھی ہے، ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔ جمہور پر اللہ کا ہاتھ ہے جو (جمہور سے) بچھڑا وہ بچھڑ کر دوزخ میں گیا۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پگڈنڈیوں سے (یا مختلف گھاٹیوں سے) پرہیز رکھو اور جماعت و جمہور کو اختیار کرو، حضرت ابوذر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بالشت بھر جماعت سے علیحدہ ہوا اس نے اسلام کی رسی اپنے گلے سے نکال دی رواہ احمد وابوداؤد۔ جماعت سے مراد ہے صحابہؓ اور صحابہؓ کے پیچھے چلنے والوں کی جماعت۔

اللہ نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی کتاب دے کر مبعوث فرمایا اور کتاب کے ساتھ کچھ اور علم بھی وحی کے ذریعہ سے عنایت کیا لیکن اس وحی کے الفاظ اللہ کے نہ تھے معانی کی تعلیم اللہ کی طرف سے تھی (اور الفاظ حضرت جبرئیل کے یا رسول اللہ کے تھے ایسی وحی کو غیر متلو یا غیر منطوق وحی کہتے ہیں) کتاب کے اندر کچھ عبارت اور کلمات تو محکم تھے جن کی مراد (سمجھنے) میں کوئی شبہ نہ تھا کچھ خفی المراد عبارت بھی تھی کچھ مشکل یا مجمل یا متشابہ آیات تھیں مگر ان سب کے مقصد کی وضاحت اللہ نے اپنے پیغمبر کے لئے کر دی خود ہی فرمایا ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو اور صحابہؓ نے اپنے شاگردوں کو اس کی تعلیم دی اور اس طرح یہ تعلیم و تعلم کا سلسلہ ہم تک پہنچا لہٰذا اللہ کی کتاب اس کے رسول کی سنت اور صحابہؓ و تابعین کے اجماعی اقوال کو ماننا اور ان پر چلنا ہمارے لئے لازم ہے اور جو آیات و احادیث ایسی ہیں جن کی مراد ظاہر نہیں ہے ان کی تشریح یہی مراد و ہی قرار دینا ضروری ہے جو صحابہؓ نے اختیار کی ہو۔ جو لوگ پرستاران رائے ہیں وہ اپنی رائے اور خواہش کے پیچھے چلتے ہیں قرآن کا جو حصہ ان کی رائے کے مطابق ہوتا ہے اس کو لے لیتے ہیں اور مانتے ہیں اور جس حصہ کا ان کی دانش و رائے سے ٹکراؤ ہوتا ہے اس کا انکار

کردیتے ہیں (یعنی اپنی رائے کے مطابق بنانے کے لئے اس کی تاویلیں کرتے اور رسول و صحابہ کی تفسیر سے موڑ دیتے ہیں) چنانچہ آخرت میں اللہ کے دیدار کا عذاب قبر کا وزن اعمال کا پل صراط اور حساب کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کے کلام کو مخلوق کہتے ہیں حالانکہ یہ سب اقوال ایسے ہیں جن کے خلاف کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ ﷺ کی صراحتیں اور صحابہؓ کا اجماع موجود ہے انہوں نے دین کو چھوڑ دیا اللہ کی کتاب کو پارہ پارہ کر دیا بعض حصہ کو مانا بعض کو نہ مانا۔ فرقہ معتزلہ اسی راستہ کا راہی ہے، بہت سے معتزلی تو اس کے بھی قائل ہیں کہ اللہ پر وہی کام کرنا واجب ہے جو بندوں کے لئے مفید ہو، یہ لوگ تقدیر کے بھی منکر ہیں اور گناہوں کی مغفرت کو بھی ناممکن کہتے ہیں یہ بھی ان کا قول ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے اللہ (اگرچہ بندہ کا خالق ہے مگر) بندہ کے افعال کا خالق نہیں ہے اسی لئے اس گروہ کو امت اسلامیہ کے مجوسی کہا گیا ہے (مجوسی خیر اور نور کا خالق یزداں کو اور شر و ظلمت کا خالق اہرمن کو قرار دیتے ہیں اس طرح دو طاقتوں کو خالق کہتے ہیں ایک خیر کی طاقت، ایک شر کی طاقت معتزلہ بھی دو خالق مانتے ہیں ان کے نزدیک ساری کائنات اور تمام انسانوں کا خالق اگرچہ اللہ ہے مگر بندوں کے افعال کے خالق بندے خود ہیں) رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے قدریہ (یعنی معتزلہ جو بندہ کو اپنے تمام افعال کا قادر مطلق جانتے ہیں) اس امت کے مجوسی ہیں اگر یہ بیمار ہو جائیں تو ان کی بیمار پرسی نہ کرو مر جائیں تو جنازہ میں شرکت نہ کرو، رواہ احمد و ابوداؤد من حدیث ابن عمرؓ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے دو قسم کے لوگوں (یعنی دو فرقوں) کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں مرجئہ اور قدریہ (مرجیٔ فرقہ قائل ہے کہ صرف ایمان ہر قسم کے عذاب سے بچانے کے لئے کافی ہے عمل کی کوئی ضرورت نہیں، ایمان کی موجودگی میں کوئی گناہ ضرر رساں نہیں) رواہ الترمذی۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھ (طرح کے لوگ) ہیں جن پر میں نے بھی لعنت کی اور اللہ نے بھی اور ہر مقبول الدعا نبی نے بھی۔ اللہ کی کتاب میں بیشی کرنے والا، تقدیر خداوندی کا انکار کرنے والا، زبردستی لوگوں پر تسلط جمانے والا تاکہ جن لوگوں کو اللہ نے عزت دی ہے ان کو ذلیل کردے اور جن کو اللہ نے ذلت دی ہے ان کو معزز بنادے، اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دینے والا میری عترت (اولاد نسل) کے ساتھ اس عمل کو حلال سمجھنے والا جس کو اللہ نے حرام کردیا ہے اور میرے طریقے کو چھوڑنے والا، یہ حدیث رزین نے اپنی کتاب میں اور بیہقی نے المدخل میں ذکر کی ہے۔

میں کہتا ہوں اللہ کی کتاب میں بیشی کرنے والے رافضی ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ پورا قرآن اس موجودہ مصحف سے زائد تھا کچھ حصہ صحابہؓ نے اس میں سے نکال دیا ہے، آیت اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ پر رافضیوں کا ایمان نہیں ہے اور تقدیر خداوندی کے منکر قدریہ فرقہ والے ہیں (جو انسان کو اپنے افعال کا قادر مطلق جانتے ہیں اور اللہ کو افعال عباد کا خالق نہیں مانتے) اور عترت رسول سے (ممنوعہ) سلوک کو حلال سمجھنے والے خارجی ہیں اور طریقۂ رسول کو چھوڑنے والے تمام بدعتی ہیں جو اپنی رائے پر چلتے ہیں اور قرآن کی آیات متشابہات کی خود ساختہ تاویلیں کرتے ہیں اور سلف صالحین نے ان آیات کی جو تفسیر کی ہے اس کو نہیں مانتے، یہ مشبہ اور مجسمہ (اللہ کے اندر مخلوق کی ایسی صفات ماننے والے اور اللہ کا جسم قرار دینے والے) فرقے ہیں اور انہی کی طرح جو دوسرے گروہ ہیں ان کا شمار بھی طریقۂ رسول کے ترک کرنے والوں میں ہے۔ رافضیوں نے تو دین کو ہی چھوڑ دیا کیونکہ دین کا حصول قرآن حدیث اور اجماع سے ہی ہوتا ہے اور انہوں نے قرآن کو چھوڑ دیا بلکہ اس پر اعتماد کرنے ہی سے منکر ہوگئے ان کا قول ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اصل قرآن کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ حذف کردیا اور جو کچھ بڑھانا چاہا بڑھادیا۔ انہوں نے سنت رسول اللہ ﷺ کو بھی ترک کردیا یہ سب صحابہؓ کو کافر اور مرتد کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ آنے والوں کو حدیث کا علم صرف انہی لوگوں کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے جنہوں نے خود سنکر نقل کیا ہو اور نقل کرنے والے صحابیؓ ہی ہو سکتے ہیں اس لئے حدیث کا علم بغیر صحابہؓ کے ممکن نہیں اور جب صحابہؓ کو کافر مرتد قرار دیدیا تو حدیث کا انکار ہو گیا، انہوں نے اجماع صحابہؓ کا بھی انکار کردیا اور خود ساختہ احادیث و اقوال کی نسبت حضرت امام جعفر صادقؒ اور حضرت امام محمدؒ باقر اور ان کے اسلاف کرام کی طرف کردی اور چونکہ تواتر سے ثابت ہو گیا کہ ان سچے اماموں کے اقوال آثار صحابہؓ کے مطابق ہیں (اور اس مطابقت کی کوئی

تاویل بن نہ پڑی) تو تقیہ کی فرضیت کا قول گڑھ لیا (اور کہہ دیا کہ ان سچے اماموں نے تقیہ کر لیا تھا) ان کا ظاہری کلام صحابہؓ کی روایات کے مطابق ہے اور حقیقت میں انہوں نے تقیہ کیا تھا ہمارے اسلاف کو اماموں نے پوشیدہ طور پر اصل حقیقت سے واقف کر دیا تھا اور ہدایت کر دی تھی کہ ان اسرار کو ظاہر نہ کرنا، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں احتیاط رکھنا۔ اور یہ بات نا قابل شک ہے کہ جو بات اخفاء اور اسرار کے طور پر کہی جائے اس کی روایت شہرت و تواتر کی حد تک نہیں ہو سکتی۔ اخبار احاد خواہ ان کے راوی کتنے ہی قابل بھروسہ اور ثقہ ہوں پھر بھی ظن کی حد سے آگے نہیں بڑھتیں اور یقین عطا نہیں کرتیں اور یہاں تو راویوں کے ثقہ ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں۔ مشہور دروغ گو شیطان ان اقوال کے راوی ہیں جن کی نسبت ائمہ کرام کی طرف کی گئی ہے جیسے عبداللہ بن سبا منافق یہودی، ہشام بن سالم، ہشام بن حکم، زید بن جہیم الہلالی، شیطان الطاق اور دیک الجن شاعر وغیرہ ہم نے ان کے اور دوسرے رافضی راویوں کے احوال السیف المسلول میں لکھ دیئے ہیں۔ شاید قرآن کا یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ اس نے رافضیوں کی طرف جو اپنے آپ کو شیعہ کہتے ہیں آیت ذیل میں اشارہ کر دیا۔

وَكَانُوا شِيَعًا (اور ہو گئے وہ گروہ) ہر گروہ اپنے خود ساختہ لیڈر کا شیعہ (پیرو متبع) بن گیا۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرے اندر عیسیٰؑ کی (حالت کی) مشابہت ہے عیسیٰ سے یہودیوں نے اتنا بغض کیا کہ ان کی ماں پر بھی تہمت لگائی اور نصاریٰ نے ان سے اتنی محبت کی کہ ان کا اتنا (اونچا) مرتبہ قرار دیا جو ان کے لئے جائز نہ تھا (یعنی خدا کا بیٹا بنا دیا) حضرت علیؓ نے فرمایا میرے سلسلہ میں دو (قسم کے) آدمی تباہ ہو گئے ایک تو حد سے بڑھ کر محبت کرنے والا جو میرے اندر ایسے (اعلیٰ) اوصاف مانتا ہے جو میرے اندر نہیں ہیں دوسرا مجھ سے بغض رکھنے والا جس کو میری دشمنی اس امر پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ مجھ پر تہمت تراشی کرتا ہے، رواہ احمد۔

حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگ ہوں گے جن کو رافضی کہا جائے گا وہ اسلام کو چھوڑ دیں گے، رواہ البیہقی۔

حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عن قریب میرے بعد کچھ لوگ ہوں گے جن کو رافضی کہا جائے گا اگر تم ان کو پالو تو قتل کر دینا وہ یقیناً مشرک ہوں گے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ان کی شناخت کیا ہے فرمایا وہ حد سے بڑھ کر تمہارے ایسے اوصاف قرار دیں گے جو تمہارے اندر نہیں ہیں اور سلف پر نکتہ چینی کریں گے، رواہ الدار قطنی۔ دار قطنی نے دوسرے طریق روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے اس روایت میں اتنا زائد ہے وہ ہماری یعنی ہمارے اہل بیت کی محبت کے مدعی ہوں گے مگر واقع میں وہ ایسے نہیں ہوں گے ان کی شناخت یہ ہو گی کہ وہ ابو بکرؓ و عمرؓ کو گالیاں دیں گے۔ اس موضوع کی حدیثیں اور بھی ہیں جن کو السیف المسلول میں ہم نے ذکر کیا ہے۔

لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں)۔

یعنی اے محمد ﷺ آپ کا ان سے اور ان کا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔ لَسْتَ مِنْهُمْ کا یہ مطلب عربی محاورہ کے مطابق ہے۔ عرب محاورہ میں کہتے ہیں اگر تو نے ایسا کیا تو مجھ سے اور میں تجھ سے نہیں یعنی میرا تیرا کوئی تعلق نہیں۔ میں تجھ سے الگ اور تو مجھ سے الگ۔

إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ (ان (کی سزا اور بدلے) کا معاملہ اللہ ہی کے ذمہ ہے) یعنی حق سے وہ جتنے دور ہوں گے اللہ اتنا ہی ان کو سزا دے گا۔

ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۱۵۹﴾ پھر (قیامت کے دن) اللہ ان کو بتا دے گا جو کچھ وہ کرتے تھے) یعنی پہلے ان کو دین میں پھوٹ ڈالنے اور بد اعتقاد ہونے کی سزا دی جائے گی پھر بد اعمالی اور گناہوں کی۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا (جو ایک نیکی لے کر آئے گا اس کو اس جیسی دس نیکیوں کا ثواب ملے گا)۔ میرے خیال میں اس جگہ ایک شبہ ہو سکتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ نیکی بدی کا بدلہ صرف خدا کا مقرر کردہ

ہے، رائے اور سمجھ کو اس میں کوئی دخل نہیں کیونکہ کسی عمل اور اس کے بدلہ میں کوئی مشابہت نہیں (نیکی یا گناہ ایک قول یا عمل ہے اور اس کا بدلہ جنت کی نعمت اور دوزخ کے عذاب کی شکل میں ہوگا اور عمل و قول کی نعمت و عذاب سے کوئی مشابہت نہیں) ایک مزدور کو کام کے عوض روپیہ دیا جاتا ہے کام روپیہ کا ہم شکل نہیں ہوتا صرف مزدور اور کام لینے والا کام کی اجرت روپیہ کو قرار دے لیتے ہیں۔ جب اچھائی برائی کے بدلہ کی مقدار اللہ کی مقرر کردہ ہے تو پھر کسی نیکی کے بدلہ کا دس گنا ہونا قابل تصور بھی نہیں ہے اس کا تصور اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب کسی ایک شخص کو نیکی کا بدلہ کسی خاص مقدار میں دیا جائے اور دوسرے آدمی کو اس مقدار کا دس گنا دے دیا جائے، مثلاً ایک کام کی اجرت ایک مزدور کو طے شدہ تجویز کے تحت ایک روپیہ دیا جائے اور دوسرے مزدور کو اسی کام کے دس روپیہ دیئے جائیں لیکن اگر سب کو دس دس روپیہ دیئے جائیں تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مزدوری دس گنا دی گئی دس کا اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ایک روپیہ طے شدہ ہو پس کسی نیکی کا دس گنا ثواب اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب کسی ایک شخص کو اسی نیکی کا ایک ثواب دیا جائے لیکن جب از روئے آیت حکم میں عموم مانا جائے اور ہر شخص کو ایک نیکی کا دس گنا ثواب قرار دیا جائے تو چونکہ دس گنے کی مقدار کا تعین ہی نہیں کیا جاسکتا اس لئے آیت کا مطلب واضح نہیں ہوتا۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ آیت کے حکم میں عموم نہیں ہے بعض لوگوں کو نیکی کے ثواب کی ادنیٰ مقدار بھی دی جائے گی جو اللہ کے علم میں طے شدہ ہے پھر دوسرے لوگوں کا جتنا اخلاص نیت بڑھتا جائے گا یا اللہ کی مہربانی جس کسی کے حال پر زیادہ ہوتی جائے گی اتنا ہی اجر تفضلی بڑھتا جائے گا جس کو چاہے گا وہ دس گناہ دے گا اور جس کو چاہے گا ستر گنا اور جس کو چاہے گا سات سو گنا یا چند در چند ان گنت بے حساب۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث اسی مفہوم پر دلالت کر رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کوئی اپنے اسلام کو خوب ٹھیک کرلے تو پھر اگر ایک نیکی کرے گا تو اس کے لئے اس جیسی نیکیاں دس گنے سے لے کر سات سو گنا تک لکھی جائیں گی اور اگر کوئی بدی کرے گا تو اتنی ہی بدی لکھی جائے گی یہاں تک کہ وہ اللہ سے جاملے (متفق علیہ) اس فرمان میں رسول اللہ ﷺ نے چند گنا کرنے کو حسن اسلام سے وابستہ کیا اور حسن اسلام صرف دل کی صفائی اور نفس کے تزکیہ سے حاصل ہوتا ہے اور ان دونوں کا تعلق اخلاص عمل سے ہے تزکیہ قلب و نفس کے بعد ہی عمل میں اخلاص پیدا ہوتا ہے۔

ایک جواب یہ بھی دیا جاسکتا ہے کہ گزشتہ امتوں کے لئے ایک نیکی کا جتنا ثواب مقرر کیا گیا تھا اس سے دس گناہ ثواب اس نیکی کا امت محمدیہ کے لئے مقرر کیا گیا ہے حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم لوگوں کی میعاد گزشتہ امتوں کی میعاد کی نسبت سے ایسی ہے جیسے عصر سے مغرب تک کا وقت اور یہود و نصاریٰ کی حالت کے مقابلہ میں تم لوگوں کی حالت ایسی ہے جیسے کسی شخص نے کام کرنے کے لئے کچھ مزدور رکھے اور کہہ دیا کہ جو شخص دوپہر تک کام کرے گا اس کو ایک ایک قیراط ملے گا۔ یہودیوں نے اس قول کے مطابق ایک ایک قیراط مزدوری پر آدھے دن کام کیا پھر اس شخص نے کہا اب جو شخص دوپہر سے عصر کی نماز تک کام کرے گا اس کو ایک ایک قیراط ملے گا اس قول کے مطابق نصاریٰ نے دوپہر سے عصر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا، پھر اس شخص نے کہا اب جو شخص عصر کی نماز سے سورج غروب ہونے تک کام کرے گا اس کو دو دو قیراط ملیں گے۔ سنو تم ہی وہ لوگ ہو جو عصر سے مغرب تک کام کرو گے اور دوہرا اجر پاؤ گے۔ یہ فیصلہ سن کر یہودی اور عیسائی ناراض ہو گئے اور بولے کام تو ہمارا زیادہ اور اجرت سب سے کم اللہ نے فرمایا تو کیا میں نے تمہاری کچھ حق تلفی کرلی انہوں نے جواب دیا یہ بات تو نہیں ہوئی اس پر اللہ نے فرمایا پھر یہ میری مہربانی ہے جس کو چاہتا ہوں دیتا ہوں، رواہ البخاری۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کے نیک عمل کا گزشتہ امتوں کے نیک اعمال سے دوگنا ثواب ملے گا دس گنا ثواب ملنا اس سے ثابت نہیں ہوتا اس لئے اول الذکر جواب ہی زیادہ صحیح ہے۔ پس ایسا ہوسکتا ہے کہ اس امت کے ادنیٰ نیکوکار کو گزشتہ امتوں کے نیکوکاروں کے مقابلہ میں کم سے کم دوہرا ثواب دیا جائے پھر عمل میں جتنا خلوص بڑھتا جائے اور اللہ کی مہربانی میں جس قدر اضافہ ہوا تنی ہی مرتبہ میں ترقی ہوتی جائے۔

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا (اور جو بدی لے کر آئے گا اس کو اتنی ہی سزا دی جائے گی)۔ کسی کی بدی (کی سزا) میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ (اور ان کی حق تلفی نہیں کی جائے گی (ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا)۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا اور میں اس پر زیادتی کرتا ہوں (کہ اللہ نے وحی غیر متلو میں یہ بھی فرمایا ہے) کہ جو شخص بدی لے کر آئے گا اس کی بدی کی سزا بقدر بدی ہو گی اور میں معاف بھی کر دوں گا (جس کو چاہوں گا) جو بالشت بھر میرے قریب آئے گا میں ایک ہاتھ اس کے قریب آجاؤں گا اور جو ایک ہاتھ میرے قریب آئے گا میں ایک گز اس سے قریب ہو جاؤں گا جو میرے پاس معمولی چال سے آئے گا میں اس کے پاس لپک کر آؤں گا اور جو مجھ سے زمین بھر گناہوں کے ساتھ ملے گا بشرطیکہ مشرک نہ ہو۔ میں اس سے اتنی ہی مغفرت کے ساتھ ملوں گا، رواہ البغوی۔

اس آخری جملہ کا معنی یہ ہے کہ اگر میں چاہوں گا تو اتنی ہی مغفرت کے ساتھ اس سے ملوں گا (یعنی گناہوں کو بخشنا لازم نہیں بلکہ میری مشیت پر موقوف ہے، میں چاہوں گا تو سارے گناہ معاف کر دوں گا اور مغفرت کرنا نہ چاہوں گا تو گناہوں کی سزا دوں گا) کیونکہ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا بھی اللہ کا قول ہے (کہ گناہ کے بقدر گناہ کی سزا ہو گی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا آیت میں صدقات کے علاوہ دوسری نیکیاں مراد ہیں کیونکہ صدقات کا ثواب تو سات سو گنا تک چند در چند ہو تا جائے گا۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عمرؓ کی اس تشریح کی علت یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ اور حضرت ابن عمرؓ کے نزدیک یہ حکم صرف صدقات کے ساتھ مخصوص ہے (یعنی اس آیت میں جو سات سو گنا ثواب ملنے کی صراحت فرمائی ہے وہ صرف مالی خیرات سے تعلق رکھتی ہے) حالانکہ مالی صدقات کے ساتھ اس حکم کی خصوصیت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے ہر تسبیح (ایک بار سبحان اللہ پڑھنا) صدقہ ہے ہر تحمید (ایک بار الحمد للہ کہنا) صدقہ ہے ہر تہلیل (ایک بار لا الہ الا اللہ کہنا) صدقہ ہے اور ہر تکبیر (ایک بار اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے، رواہ مسلم و ابو داؤد و ابن ماجۃ من حدیث ابی ذرؓ۔ بلکہ اللہ کے ذکر کا ثواب صدقات سے زائد ہے۔ حضرت ابو الدرداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تم کو ایسی چیز بتاؤں جو تمہارے سارے اعمال سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک پاکیزہ تر اور تمہارے درجات کو سب اعمال سے زیادہ اونچا کرنے والی ہے اور سونا چاندی خیرات کرنے سے بھی اعلیٰ ہے اور دشمن کا مقابلہ کر کے ان کی گردنیں کاٹنے اور اپنے گلے کٹوانے سے بھی افضل ہے صحابہؓ نے عرض کیا ضرور فرمایئے ارشاد فرمایا اللہ کی یاد۔ رواہ ابن ماجۃ والحاکم والترمذی واحمد۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے ذکر سے افضل کوئی صدقہ نہیں، واللہ اعلم۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے مجھے ایک سیدھا راستہ بتا دیا ہے یعنی فطری اور تخلیقی طور پر بھی معصوم بنایا ہے پھر وحی اور دلائل واضحہ کے ذریعہ سے بھی ہدایت فرما دی ہے۔

دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ (کہ وہ ایک دین ہے مستحکم جو طریقہ ہے ابراہیم کا ابراہیم میں کوئی کجی نہ تھی اور نہ وہ مشرکوں میں سے تھے) قِيَمًا مخفف ہے مصدر ہے بمعنی صفت، اصل میں قِيَمًا تھا، چونکہ مادہ واوی ہے اس لئے قِيَمًا کی اصل بھی قِوَمًا تھی جیسے قیام کی اصل قوام تھی، بغویؒ نے لکھا ہے کہ مُسْتَقِيْم اور قِيَم ہم معنی ہیں۔ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ عطف بیان ہے اور حَنِيْفًا، اِبْرٰهِيْمَ سے حال ہے۔ یعنی ابراہیم مشرک نہ تھے پس اے اہل مکہ تم اپنے باپ کے طریقہ کے خلاف شرک کیوں کرتے ہو تم تو ابراہیم کے طریقے پر چلنے کے دعویدار ہو۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ (آپ کہہ دیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادات اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کا ہے جو سارے جہان کا مالک ہے)۔

نُسُک سے مراد ہے حج وعمرہ میں قربانی۔ مقاتل نے کہا حج مراد ہے۔ بعض نے دین مراد لیا ہے۔ بعض نے عبادت۔ یہ سب معانی قاموس وصحاح میں مذکور ہیں۔ مَحْیَا اور مَمَات مصدر ہیں یعنی موت وحیات۔ زندگی اور موت کا مالک اللہ ہے یعنی وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ بعض علماء نے کہا مطلب یہ ہے کہ ایمان وطاعت جس پر میں زندہ ہوں اور جس پر میں مروں گا سب اللہ کے لئے ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مَحْیَا سے مراد ہیں زندگی کی طاعتیں جیسے نماز روزہ وغیرہ اور ممات سے مراد ہیں وہ طاعتیں جن کا تعلق مرنے سے ہے جیسے وصیت اور مرنے کے بعد غلاموں کی آزادی یعنی غلاموں کو مدبر بنانا۔ بعض نے یہ مطلب بیان کیا کہ زندگی میں میری ساری بندگیاں اللہ کے لئے ہیں اور مرنے کے بعد ان کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ بعض نے اس طرح تفسیر کی کہ عمل صالح کے ساتھ میری زندگی اور ایمان کے ساتھ میری موت اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔

لَا شَرِیْكَ لَهٗ (اس کا کوئی شریک نہیں) یعنی اس کے ساتھ میں کسی کو شریک نہیں قرار دیتا۔

وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ (اور اسی (اقرار واخلاص) کا مجھے حکم دیا گیا ہے)۔

وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۶۳﴾ (اور میں سب ماننے والوں سے پہلا ہوں)۔ یعنی اس امت میں سب سے پہلا مسلم ہوں اور جس بات کو تم سے پہلے میں حاصل کرچکا ہوں اسی کی تم کو دعوت دیتا ہوں اس سے تم کو سمجھ لینا چاہئے کہ میں تمہارا اب بھی خیر خواہ ہوں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ کفار قریش رسول اللہ ﷺ سے درخواست کرتے تھے کہ آپ ہمارے مذہب کی طرف لوٹ آئیے اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا۔

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ (آپ کہہ دیجئے کہ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کے لئے تلاش کروں حالانکہ وہ ہر چیز کا مالک ہے)۔ استفہام انکاری ہے اور وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ حال ہے مگر علت انکار کی جگہ اس کو ذکر کیا گیا ہے (گویا واؤ تعلیل کا ہے) مطلب یہ ہے کہ کیا اللہ کی عبادت میں میں کسی اور کو شریک کروں اور دوسرے کو رب بنانے کی خواہش کروں میں ایسا نہیں کرسکتا کیونکہ وہ ہر چیز کا رب ہے اور میری طرح کائنات کی ہر چیز اسی کی مربوب ہے معبود ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ سابق آیت میں حکم دیا تھا کہ آپ کہہ دیں میرا دین ابراہیم کا دین ہے اس سے وہم ہوسکتا تھا کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے دین ابراہیم کو بطور تقلید اختیار کیا ہے اور جس طرح کفار آباء واجداد کے دین کی تقلید کرتے تھے اسی طرح آپ بھی دین اسلاف کے پابند تھے اس وہم کو اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ کہہ کر زائل فرمادیا۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ ولید بن مغیرہ کہتا تھا میرے راستہ پر چلو تمہارا بار (گناہ) اپنے اوپر اٹھانے کا میں ذمہ دار ہوں اس کی تردید میں اللہ نے فرمان صادر فرمایا۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا (اور جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے وہی اسی پر رہتا ہے) یعنی جو شخص کوئی جرم کرے گا اس کا گناہ اپنے اوپر اٹھائے گا اگر کوئی اللہ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کا طلب گار ہوگا تو اس کا وبال خود اس پر پڑے گا کسی دوسرے کا ذمہ دار رہنا کچھ فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (اور کوئی اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ (اپنے اوپر) نہیں اٹھائے گا) وَازِرَۃٌ اور اُخْرٰی کا موصوف محذوف ہے یعنی نفس وازرۃ اور نفس اخری یعنی گناہ گار نفس کے گناہوں کا بوجھ کوئی اپنے اوپر نہیں اٹھائے گا۔

ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ (پھر تم سب کو اپنے رب کے پاس لوٹ کر جانا ہوگا پھر وہ تم کو جتلادے گا جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے) یعنی قیامت کے دن تم سب کو اپنے رب کے پاس

لوٹ کر جانا ہے تمہارے اندر جو دینی اختلاف ہے اس میں کون حق پر ہے کون باطل پر اس کا فیصلہ اس روز اللہ کر دے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل اور اعتقاد کے بموجب سزا جزا دے گا۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین پر (پہلی قوموں کی جگہ) بااختیار بنایا) یعنی اے امت محمد ﷺ اللہ نے گزشتہ اقوام کی ہلاکت کے بعد تم کو اس زمین کا والی وارث بنا دیا۔

وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَآ اٰتٰىكُمْ (اور اس نے تم میں سے بعض سے بعض کے درجے اونچے کئے تاکہ اللہ نے جو کچھ تم کو عطا فرمایا ہے اس میں (ظاہراً) تمہاری جانچ کرے) یعنی جو جاہ و مال تم کو دیا ہے اس میں ظاہر ہو جائے کہ تم شرک کرتے ہو (یا شکر)۔

اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٦٥﴾ (بالیقین آپ کا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بلاشبہ وہ بڑی مغفرت اور مہربانی کرنے والا (بھی) ہے)۔

النصف ع ۲۰/۷

یعنی جب چاہے گا اپنے دشمنوں پر فوراً عذاب لے آئے گا موت کے بعد یا قیامت کے دن تک عذاب کو موخر کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عذاب دور ہے کوئی آنے والی چیز دور نہیں ہوتی۔ اللہ نے آیت اِنَّ رَبَّكَ میں سرعت کی نسبت عذاب کی طرف کی (کیونکہ سَرِيْعُ الْعِقَابِ کا معنی ہے سریع عقابہ) براہ راست اپنی ذات کی طرف کی (کیونکہ سَرِيْعُ الْعِقَابِ اللہ کی صفت ہے مگر صفت بحال متعلقہ) اور مغفرت و رحمت کی نسبت اپنی ذات کی طرف مبالغہ کے صیغہ اور لام تاکید کے ساتھ براہ راست کی، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اللہ بذات خود تو رحیم و غفور ہے لیکن صفت ربوبیت کا تقاضا ہے کہ مجموعہ کا نظم درست ہو اس لئے بالعرض سرکشوں کو عذاب دینے والا بھی ہے۔ اس کی رحمت کثیر ہے اور عذاب قلیل بیشتر درگزر فرماتا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ پر سورۂ انعام پوری ایک ہی مرتبہ میں اتری اس کی مشایعت میں ستر ہزار فرشتے تھے۔ جن کی تسبیح و تحمید کا ایک غلغلہ تھا، رواہ الطبرانی فی المعجم الصغیر و ابو نعیم فی الحلیۃ و ابن مردویہ فی التفسیر۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جب سورۃ الانعام نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے سبحان اللہ پڑھا، پھر فرمایا اس سورت کے پیچھے اتنے فرشتے تھے کہ آسمان کے کنارے انہوں نے بند کر دیئے تھے (یعنی پورے آسمان پر کناروں تک چھا گئے تھے) رواہ الحاکم فی المستدرک۔ یہ حدیث بھی دلالت کر رہی ہے کہ سورۂ انعام یک دم پوری اتری تھی۔ مختلف آیات کے اسباب نزول جو الگ الگ بیان کئے گئے ہیں شاید اس کی صورت یہ ہوئی کہ مختلف واقعات قریب قریب اوقات میں ظاہر ہوئے اور چونکہ بعض آیات کا بعض اسباب سے اور دوسری بعض آیات کا دوسرے اسباب سے ربط اور تناسب تھا اس لئے آیت کے نزول کا سبب اس واقعہ کو قرار دے دیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ یہ آیت فلاں واقعہ کے متعلق اور یہ آیت فلاں سبب کے تحت نازل ہوئی (ورنہ احادیث مذکورہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ پوری سورت ایک ہی وقت میں نازل ہوئی)۔ [1]

۱۹ ربیع الثانی ۱۱۹۹ھ کو اس جگہ تک تفسیر مظہری کی تالیف

ختم ہوئی اور بعون اللہ ۲۸ جمادی الاول ۱۳۸۴ھ کو یہاں تک

ترجمہ پورا ہوا۔

[1] حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا سورۃ الانعام قرآن مجید کی بزرگ ترین سورتوں میں سے ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں مجہول سند سے حضرت علیؓ کا قول موقوفاً نقل کیا ہے کہ سورۃ الانعام جس بیمار پر پڑھی جائے گی اللہ اس کو شفاء مرحمت فرمائے گا۔

سورۂ الاعراف

بیشتر آیات مکہ میں نازل ہوئیں کچھ آیات مدنی بھی ہیں کل ۲۰۵ آیات ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓمّٓصٓ ① سورۂ بقرہ میں ایسے الفاظ کی تشریح کردی گئی ہے۔

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (یہ ایک کتاب ہے جو آپ ﷺ کے اوپر اتاری گئی ہے)۔ کِتَابٌ خبر ہے مبتدا محذوف ہے یعنی ھٰذَا کِتَابٌ یا الٓمّٓصٓ مبتدا ہے اگر اس سے سورت یا قرآن مراد ہو اور کِتَابٌ اس کی خبر ہے اُنْزِلَ اِلَیْکَ، کِتَابٌ کی صفت ہے

فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ (آپ کے دل میں اس سے بالکل تنگی نہ ہونا چاہئے) حَرَجٌ کا لغوی معنی ہے تنگی۔ مجاہدؒ کے نزدیک اس جگہ شک مراد ہے کیونکہ دل کی تنگی شک کا سبب ہے اور سینہ کی کشائش یقین کا سبب۔ سینہ کی کشائش اور تنگی کی بحث سورۂ انعام کی آیت فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ کی تفسیر کے ذیل میں گزرچکی ہے۔ ابو العالیہ نے کہا کہ تبلیغ قرآن کی راہ میں لوگوں کے خوف کا حائل ہونا حرج ہے یعنی اس بات سے ڈر کر تبلیغ میں کمی نہ کرو کہ لوگ مخالفت کریں گے اور ایذا پہنچائیں گے کیونکہ اگر کوئی کام کرنے میں ڈر لگا ہو تو آدمی بشاشت خاطر اور چستی سے اس کام کو نہیں کرتا اور اس کام کے لئے سینہ میں کشائش نہیں پیدا ہوتی۔ بعض نے کہا کہ قرآن کا پورا پورا حق ادا کرنے سے ڈرنا مراد ہے۔

اصل خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے (یعنی آپ ایسا نہ کریں) لیکن ممانعت میں زور پیدا کرنے کے لئے نہی کا رخ حرج کی طرف پھیر دیا گیا (اور فرمایا کہ تمہارے دل میں تنگی نہ ہو) مراد آیت یہ کہ آپ اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے میں شک نہ کریں۔ یا کسی شخص سے نہ ڈریں، کسی کی پروانہ کریں ہم آپ کے محافظ ہیں۔ یا حقوق کتاب کو پورے طور پر ادا نہ کرنے کا آپ اندیشہ نہ کریں ہم آپ کو اس کی سہولت فراہم کردیں گے اور اداء حقوق کی توفیق عطا کریں گے۔

لِتُنْذِرَ بِهٖ (تاکہ اس کے ذریعہ سے آپ (منکروں اور نافرمانوں کو) ڈرائیں)۔ لِتُنْذِرَ کا تعلق اُنْزِلَ سے ہے (کتاب اس لئے نازل کی گئی کہ آپ ڈرائیں) یا لَا یَکُنْ سے مربوط ہے کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ یقین ہوجائے گا کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے آئی ہے تو جرأت کے ساتھ لوگوں کو نافرمانی سے ڈرائیں گے یا کافروں سے بالکل خوف نہ کریں گے یا اس بات کا یقین کرلیں گے کہ اللہ اس کتاب کی تبلیغ واقامت میں میری مدد کرے گا مجھے توفیق عطا فرمائے گا (یہ تینوں شقیں جدا جدا مولف نے حَرَجٌ کے مرادی معنی کے اختلاف کے پیش نظر بیان کی ہیں۔

وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ② اور اہل ایمان کے لئے یہ یادداشت یعنی نصیحت ہے۔ ذِکْرٰی کا عطف کِتَابٌ پر ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے یا محذوف فعل کا مفعول ہے یا محل تُنْذِرَ پر معطوف ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (رسول کے ذریعہ سے) جو ہدایت تم پر تمہارے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے اس پر چلو)۔ خواہ وحی جلی ہو یا خفی۔ مَا اُنْزِلَ کے تحت حدیث بھی آگئی۔

وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ (اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے رفیقوں کا اتباع نہ کرو) یعنی جن وانس کی

اطاعت اللہ کی معصیت میں نہ کرو۔ من دونہ کے لفظ سے انبیاء واولیاء کے اتباع کی ممانعت آیت کے حکم سے خارج ہو گئی کیونکہ اس مقدس گروہ کی ولایت کا حکم تو اللہ کی طرف سے ہے۔

قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۞ (تم لوگ بہت ہی کم نصیحت مانتے ہو)۔

قلیلا کا موصوف محذوف ہے یعنی تذکّرًا قلیلًا یا زمانًا قلیلًا لفظ مَا کی زیادتی قلت کی تاکید کے لئے ہے یہ مَا مصدری نہیں ہے ورنہ قَلِيلًا، تَذَكَّرُونَ کا مفعول نہیں ہو سکتا۔ قلت تذکر کا مخاطب پورا انسانی گروہ ہے اس گروہ میں سے کچھ لوگ یعنی اہل ایمان تذکر کی کثرت رکھتے ہیں۔

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۞ (اور بہت بستیوں کو ہم نے تباہ کر دیا اور ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت پہنچایا ایسی حالت میں کہ دوپہر کے وقت وہ آرام میں تھے)۔ ہلاک کرنے سے مراد ہے بستی والوں کو تباہ کرنے کا ارادہ کرنا یا ان کو بے مدد چھوڑ دینا۔ باس عذاب۔ بیات مصدر ہے بمعنی اسم فاعل (جب وہ رات کو آرام کر رہے تھے) قیلولہ دوپہر کو آرام کے لئے لیٹنا نیند ہو یا نہ ہو۔ جَآءَهَا بَاْسُنَا، اَهْلَكْنٰهَا سے بدل ہے اس صورت میں ہلاک کرنے کی تشریح اور توضیح اس سے ہو رہی ہے جیسے محاورہ میں بولا جاتا ہے تم نے میرے ساتھ احسان کیا کہ مجھے انتامال دے دیا۔

خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ بہت بستیاں ایسی تھی کہ جب ان کے باشندوں کو ہلاک کرنے کا ہم نے ارادہ کیا اور وہ غفلت کی حالت میں پڑے تھے ان کو کوئی اندیشہ نہ تھا بس ان کو رات کے وقت سوتے میں کبھی ہمارے عذاب نے آلیا جیسے قوم لوط پر آیا اور کبھی دوپہر کو آرام کے وقت غیبی عذاب آگیا جیسے قوم شعیب پر آیا، رات اور دوپہر کے وقت کا خصوصی ذکر بستی والوں کی انتہائی غفلت کو ظاہر کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔

فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۞ (سو جس وقت ان پر ہمارا عذاب آیا اس وقت ان کے منہ سے بجز اس کے کوئی بات نہیں نکلتی تھی کہ واقعی ہم ظالم تھے، دَعْوٰى بمعنی قول۔ دعاء، گڑگڑانا۔ سیبویہ نے کہا عرب کہتے ہیں اے اللہ مسلمانوں کے اچھے دعوے میں تم ہم کو شامل کر دے۔ یعنی اچھی دعاؤں میں۔ مقصد یہ ہے کہ عذاب کو رد کر دینے کی تو ان میں سکت نہیں تھی۔ مجبوراً اپنی ناحق کوشیوں کا ان کو اقرار کرنا پڑا مگر ایسے وقت میں اعتراف سود مند نہ تھا۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۞ (پھر ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبروں کو بھیجا گیا تھا اور پیغمبروں سے بھی ضرور پوچھیں گے)۔

بیہقی نے ابوطلحہؓ کی سند سے بیان کیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہم لوگوں سے پوچھیں گے کہ پیغمبروں کی دعوت کا تم نے کیا جواب دیا اور پیغمبروں سے سوال کریں گے کہ تم نے ہمارے احکام پہنچا دیئے یا نہیں۔ ابن مبارک نے وہب (بن منبہ) کا قول بیان کیا کہ قیامت کے دن اسرافیلؑ کو طلب کیا جائے گا اسرافیل لرزتے کپکپاتے حاضر ہوں گے دریافت کیا جائے گا۔ لوح محفوظ نے جو کچھ تم کو دیا تھا تم نے اس کا کیا کیا۔ اسرافیل عرض کریں گے میں نے جبرئیلؑ کو پہنچا دیا۔ جبرئیل کو بلایا جائے گا۔ جبرئیلؑ عرض کریں گے میں نے پیغمبروں کو پہنچا دیا۔ پیغمبروں کی پیشی ہوگی اور دریافت کیا جائے گا جبرئیل نے تم کو جو کچھ پہنچایا تھا تم نے اس کے متعلق کیا کیا۔ پیغمبر عرض کریں گے ہم نے لوگوں تک پہنچا دیا۔ یہی مطلب ہے آیت فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ کا۔

مسلمؒ نے حضرت جابرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج وداع کے خطبہ میں فرمایا تم سے میرے متعلق دریافت کیا جائے گا تم کیا کہو گے۔ حاضرین نے عرض کیا ہم شہادت دیں گے کہ آپ نے (اللہ کا پیام) پہنچا دیا، ادا کر دیا اور نصیحت کر دی۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے اللہ تو گواہ رہنا۔ امام احمد نے حضرت معاویہ بن جیدہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا رب مجھے بلائے گا اور پوچھے گا کیا تو نے میرے بندوں کو (میرا پیام) پہنچا دیا۔ میں جواب دوں گا۔ بے شک

میں نے ان کو پہنچادیا۔ لہٰذا جو لوگ موجود ہیں وہ غیر موجود لوگوں تک یہ پیام پہنچادیں۔ پھر (قیامت کے دن) تم کو طلب کیا جائے گا اس وقت تمہارے منہ بند ہوں گے (کچھ بول نہ سکو گے) سب سے پہلے تمہاری ران اور ہتھیلی (بولے گی اور) اظہار حال کرے گی۔

ابو الشیخ نے العظمۃ میں ابو سنان کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن حساب فہمی کے لئے سب سے پہلے لوح کو طلب کیا جائے گا۔ لوح لرزاں ترساں حاضر ہوگی، دریافت کیا جائے گا کہ تو نے (میرے احکام) پہنچادیئے۔ لوح عرض کرے گی جی ہاں! اللہ فرمائے گا تیرا گواہ کون ہے لوح عرض کرے گی اسرافیل۔ اسرافیل کو طلب کیا جائے وہ لرزتے کپکپاتے حاضر ہوں گے اللہ فرمائے گا کیا لوح نے تجھے پہنچادیا اسرافیل عرض کریں گے جی ہاں اس پر لوح کہی گی اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے محاسبہ کے برے نتیجہ سے محفوظ رکھا۔

ابن مبارک نے الزہد میں ابو حیلہ کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے اسرافیل کو طلب کیا جائے گا اور اللہ فرمائے گا کیا تو نے میرا حکم پہنچادیا اسرافیلؑ عرض کریں گے جی ہاں میں نے جبرئیل کو پہنچادیا۔ جبرئیلؑ کی طلبی ہوگی اور ان سے اللہ پوچھے گا کیا اسرافیلؑ نے تجھے میرا حکم پہنچادیا۔ جبرئیلؑ عرض کریں گے جی ہاں اس پر اسرافیل کی چھوٹ ہو جائے گی پھر جبرئیل سے اللہ فرمائے گا تو نے میرے حکم کے متعلق کیا کیا، جبرئیل عرض کریں گے پروردگار میں نے پیغمبروں کو پہنچادیا۔ اس پر پیغمبر بلائے جائیں گے اور ان سے دریافت ہوگا کہ کیا میرا حکم جبرائیل نے تم کو پہنچادیا پیغمبر عرض کریں گے جی ہاں دریافت کیا جائے گا پھر تم نے کیا کیا پیغمبر عرض کریں گے ہم نے امتوں کو پہنچادیا۔ امتوں سے دریافت کیا جائے گا کہ پیغمبروں نے تم کو پہنچادیا تھا۔ اس پر کچھ لوگ پیغمبروں کے قول کی تکذیب کریں گے اور کچھ تصدیق۔ پیغمبر عرض کریں گے ہمارے پاس اپنے قول کے گواہ ہیں جو ان (تکذیب کرنے والوں) کے خلاف شہادت دے سکتے ہیں۔ اللہ فرمائے گا وہ کون ہیں پیغمبر عرض کریں گے۔ محمد ﷺ کی امت۔ اس پر امت محمدیہ ﷺ کی طلبی ہوگی اور اس سے دریافت کیا جائے گا کیا تم شہادت دیتے ہو کہ پیغمبروں نے اپنی امتوں کو میرا حکم پہنچادیا تھا۔ امت محمدیہ جواب دے گی جی ہاں! انبیاء کی امتیں کہیں گی جو لوگ ہمارے زمانہ میں نہیں ہوئے وہ ہمارے خلاف کیسے شہادت دیتے ہیں۔ اللہ امت محمدیہ سے فرمائے گا تم ان پر کس طرح شہادت دیتے ہو تم تو ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے۔ وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب تو نے ہمارے پاس پیغمبر بھیجا تھا اور اپنی کتاب بھی اتاری تھی جس میں تو نے بیان فرمادیا تھا کہ پیغمبروں نے اپنی امتوں کو تیرا پیام پہنچادیا آیت وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا الخ کا یہی مطلب ہے۔

سورۂ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں ہم نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت کردہ حدیث جس کا تعلق شہادت امت سے ہے ذکر کردی ہے وہاں مطالعہ کرو۔

وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم پیغمبروں سے پوچھیں گے تمہاری امتوں نے کیا جواب دیا۔ یہی مضمون دوسری آیت میں آیا ہے فرمایا ہے يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ اس آیت کی تفسیر سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝ (پھر چونکہ ہم پوری خبر رکھتے تھے ان کے روبرو بیان کردیں گے اور ہم بے خبر نہ تھے)۔ یعنی جب پیغمبر کہیں گے ہم کو کوئی علم نہیں یا جب امتیں تبلیغ کا انکار کردیں گی اور امت محمدیہ شہادت دے گی تو ہم پیغمبروں اور ان کی امتوں کے روبرو بیان کردیں گے۔ بِعِلْمٍ کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو چونکہ معلوم تھا یا ہم ان کے ظاہر و باطن کو جانتے تھے (اول صورت میں مصدر بمعنی اسم مفعول اور دوسری صورت میں بمعنی اسم فاعل ہوگا) ہم غافل نہ تھے کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبروں کی تبلیغ سے یا امتوں کے جواب اور امت محمدیہ ﷺ کی شہادت سے بے خبر نہ تھے مگر کافروں کو زجر و سرزنش کرنا انبیاء اور مسلمانوں کے شرف کو ظاہر کرنا اور شہادت دلوا کر امت محمدیہ کو فضیلت عطا کرنا چونکہ مقصود ہوگا اس لئے یہ سوالات کئے جائیں گے۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ ج (اور ٹھیک ٹھیک تول اس روز ہو گی)۔
یعنی جس روز پیغمبروں سے اور ان کی امتوں سے سوال ہو گا اس روز میزان عدل سے اعمال کا ٹھیک ٹھیک وزن ضرور ہو گا۔ اَلْوَزْنُ مبتدا ہے اور یَوْمَئِذٍ خبر اور اَلْحَقُّ مبتدا کی صفت۔ اَلْحَقُّ سے مراد ہے ٹھیک برابر یا اَلْحَقُّ خبر ہے اور مبتدا محذوف ہے، یعنی وہ حق ہے اس میں کوئی شک نہیں اس پر ایمان لانا واجب ہے۔

حدیث جبرئیل میں حضرت عمرؓ بن خطاب کی روایت سے آیا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے کہا محمد ﷺ ایمان (سے مراد) کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (ایمان یہ ہے کہ) تم اللہ کو اس کے فرشتوں اور اس کے پیغمبروں کو مانو اور جنت و دوزخ اور میزان پر یقین رکھو اور مرنے کے بعد حشر جسمانی کو تسلیم کرو اور اس بات پر ایمان رکھو کہ ہر اچھی بری چیز قدر (الٰہی) کے اندر ہے (یعنی اللہ کی تقدیر سابق سے کوئی چیز خارج نہیں) اگر تم نے ایسا کہہ لیا تو بس قطعی مؤمن ہو۔ حضرت جبرئیلؑ نے کہا جی ہاں آپ نے سچ فرمایا۔ رواہ البیہقی فی البعث عن ابن عمر۔ ابن مبارک نے الزہد میں اور اجری نے الشریعتہ میں حضرت سلمان کی روایت سے اور ابوالشیخ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ میزان کی ایک زبان اور دو پلڑے ہوں گے۔

وزن کس چیز کا اور کس طرح ہو گا، اس کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض علماء نے کہا اعمال نامے تولے جائیں گے۔ ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میری امت کے ایک آدمی کو سب کے سامنے لایا جائے گا اور اس کے ننانوے اعمال نامے کھولے جائیں گے ہر اعمال نامہ کی لمبائی بقدر رسائی نگاہ ہو گی۔ اللہ اس سے فرمائے گا کیا تجھے اس میں سے کسی بات کا انکار ہے، کیا میرے نگراں محرروں نے (لکھنے میں) کچھ تیری حق تلفی کی ہے، وہ شخص جواب دے گا، نہیں میرے مالک (حق تلفی نہیں کی) اللہ فرمائے گا کیوں نہیں۔ تیری ایک نیکی ہمارے پاس موجود ہے اور آج تجھ پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا پرچہ نکالا جائے گا جس میں اشہدان لاالہ الااللہ واشہدان محمدا عبدہ ورسولہ لکھا ہو گا وہ شخص عرض کرے گا میرے مالک ان دفتروں کے مقابلہ میں اس چھوٹے پرچہ کی کیا حقیقت ہے۔ اللہ فرمائے گا تجھ پر ظلم نہیں ہو گا پھر تمام دفاتر اعمال ایک پلڑے میں اور وہ چھوٹا پرچہ دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا اور اعمال ناموں والا پلڑا اوپر اٹھ جائے گا اور پرچہ والا پلڑا بھاری نکلے گا اللہ کے نام سے کوئی چیز بھاری نہیں۔

امام احمد نے حسن سند سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ترازوئیں قائم کی جائیں گے پھر ایک آدمی کو لا کر ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے گا اور اس چیز کو بھی اس پلڑے میں رکھ دیا جائے گا جس میں اس کے اعمال کا گنتی کے ساتھ اندراج کیا گیا تھا ترازو اس کو لے کر جھک جائے گی نتیجہ میں اس کو دوزخ کی طرف بھیج دیا جائے گا جوں ہی اس کی پشت پھرائی جائے گی۔ رحمٰن کی طرف سے ایک منادی بلند آواز سے پکارے گا جلدی نہ کرو ابھی اس کا کچھ رہ گیا ہے، چنانچہ ایک چھوٹا پرچہ لایا جائے گا جس میں لاالہ الااللہ لکھا ہو گا وہ پرچہ (دوسرے پلڑے میں) اس آدمی کے ساتھ رکھ دیا جائے گا، فوراً ترازو ادھر کو جھک جائے گی۔

ابن ابی الدنیا نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ کی طرف سے حضرت آدم کے ٹھہرنے کا ایک خاص مقام ہو گا۔ دو سبز کپڑے پہنے وہ ایسے معلوم ہوں گے جیسے کوئی کھجور کا لمبا درخت۔ اپنی جگہ کھڑے کھڑے دوزخ کی طرف جانے والوں کو دیکھتے ہوں گے اسی اثناء میں امت محمدی کے ایک شخص کو دوزخ کی طرف لے جاتا دیکھ کر پکاریں گے، احمد۔ میں جواب دوں گا ابوالبشر میں یہ ہوں۔ حضرت آدمؑ کہیں گے تمہاری امت کے اس آدمی کو دوزخ کی طرف لے جایا جا رہا ہے میں یہ سنتے ہی فوراً جلد جلد تیاری کر کے فرشتوں کے پیچھے جاؤں گا اور کہوں گا اے اللہ کے قاصدو ٹھہر جاؤ فرشتے کہیں گے ہم سخت خو اور طاقتور ہیں اللہ جو حکم دیتا ہے اس کے خلاف نہیں کر سکتے جیسا حکم ملتا ہے ویسا ہی کرتے ہیں (راوی نے کہا) جب رسول اللہ ﷺ ناامید ہو جائیں گے تو بائیں ہاتھ کی مٹھی میں ریش مبارک پکڑ کر عرش کی طرف رخ

کر کے عرض کریں گے میرے مالک تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے میری امت میں رسوا نہ کرے گا فوراً عرش سے ندا آئے گی۔ محمد کا کہنا مانو اور مقام (میزان) کی طرف اس بندہ کو واپس لے آؤ (حضور نے فرمایا) پھر میں پورے برابر ایک سفید پرچہ اپنی گود سے نکال کر بسم اللہ کہہ کے ترازو کے دائیں پلڑے میں ڈالوں گا جس سے نیکیوں کا پلڑہ جھک جائے گا فوراً ندا ہوگی کامیاب ہو گیا۔ اس کی کوشش کامیاب ہو گئی (اس کی نیکیوں کا وزن) بھاری نکلا اس کو جنت کو لے جاؤ وہ شخص (فرشتوں سے) کہے گا اے میرے رب کے کارندو ذرا ٹھہر جاؤ میں اس معزز بندہ سے کچھ دریافت کر لوں جس کی بارگاہ الٰہی میں اتنی عزت ہے پھر (رسول اللہ کی طرف رخ کر کے) کہے گا آپ پر میرے ماں باپ قربان۔ آپ کون ہیں آپ کا چہرہ کتنا حسین اور آپ کے اخلاق کتنے اعلیٰ ہیں آپ نے مجھے لوٹا دیا اور میری آبرو پر رحم فرمایا میں جواب دوں گا میں تیرا نبی محمد ﷺ ہوں اور یہ تیری وہ درودیں تھیں جو تو مجھ پر پڑھتا تھا آڑے وقت میں یہ تیرے کام آئیں۔

بعض علماء کا قول ہے کہ (اعمال کو نہیں) اشخاص کو تولا جائے گا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کچھ بڑے قد آور موٹے آدمی قیامت کے دن ایسے ہوں گے کہ اللہ کے نزدیک ان کا وزن مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوگا۔ پھر حضور ﷺ نے آیت فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا تلاوت فرمائی، ابو نعیم اور اجری نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے اس آیت کی تشریح کے ذیل میں فرمایا کہ (بعض) طاقتور قوی الجثہ بہت کھانے پینے والے آدمیوں کو ترازو میں رکھا جائے گا۔ تو ان کا وزن جو برابر بھی نہیں نکلے گا۔ فرشتہ ایسے ستر ہزار آدمیوں کو ایک دم دھکا دے کر دوزخ میں پھینک دے گا۔

بعض علماء کا قول ہے کہ اعمال کو مجسم بنا دیا جائے گا اور پھر ان کو تولا جائے گا۔ کیونکہ بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو کلمے ہیں جو زبان پر ہلکے ہیں (لیکن) میزان میں بھاری (اور) اللہ کو پیارے ہیں سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔ اصبہانی نے الترغیب میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ فرما رہے تھے ،سبحان اللہ ترازو کے آدھے پلڑے کو اور الحمد للہ پوری ترازو کو بھر دے گا۔ مسلم نے حضرت ابومالک اشعری کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طہارت نصف ایمان ہے اور الحمد للہ ترزو کو پر کر دے گا۔ ابن عساکر نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی ترغیب کی روایت کی طرح حدیث نقل کی ہے۔ بزاز اور حاکم نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت نوح نے اپنی وفات کے وقت دو بیٹوں کو بلایا اور فرمایا میں تم کو لا الہ الا اللہ کے یقین رکھنے اور اعتراف کرنے) کا حکم دیتا ہوں کیونکہ آسمانوں اور زمین کو مع اس کی موجودات کے اگر میزان کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں لا الہ الا اللہ کو رکھا جائے تو یہ (موخر الذکر) پلڑا بھاری پڑے گا۔ ابویعلیٰ، ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ نے (حضرت موسیٰؑ سے) فرمایا موسیٰؑ اگر تمام آسمان اور میرے علاوہ ان کی ساری موجودات اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں ہوں اور دوسرے پلڑے میں لا الہ الا اللہ ہو تو یہ ان (آسمان و زمین) کو لے جھکے گا (یعنی ان کا پلڑا اونچا ہو جائے گا)۔

طبرانی نے حضرت ابن عباس ﷺ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تمام آسمان و زمین اور ان کے اندر کی موجودات اور دونوں کے درمیان کی کائنات اور زمینوں کے نیچے کی مخلوقات سب کو لا کر میزان کے ایک پلڑے میں اور لا الہ الا اللہ کی شہادت دوسرے پلڑے میں رکھ دی جائے تو یہ ان سب سے وزنی ہوگی۔ ابوداؤد، ترمذی اور ابن حبان نے حضرت ابودرداء کی روایت سے لکھا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حسن اخلاق سے زیادہ بھاری، میزان میں کوئی چیز نہیں (ہوگی) بزاز، طبرانی، ابویعلیٰ، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حسن سند سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (حضرت ابوذرؓ سے) فرمایا ابوذر کیا میں تجھے دو خصلتیں ایسی بتاؤں جو

پشت پر تو ہلکی ہیں (یعنی جن کو اٹھانا آسان ہے) مگر میزان میں تمام دوسری چیزوں سے بھاری ہوں گی۔ حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ضرور ارشاد فرمائیے۔ فرمایا حسن خلق اور زیادہ خاموشی کو اختیار کر، قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور ان دونوں کے برابر مخلوق کا کوئی عمل نہیں۔ امام احمدؒ نے الزہد میں حازم نامی ایک شخص کی روایت سے لکھا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں ایک شخص (بیٹھا) رو رہا تھا اتنے میں حضرت جبرئیلؑ اترے اور پوچھا یہ کون ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا فلاں شخص ہے۔ حضرت جبرئیلؑ نے کہا اولاد آدمؑ کے تمام اعمال کا وزن ہو سکتا ہے صرف رونے کا وزن نہیں ہو سکتا، اللہ ایک آنسو سے آگ کے سمندر بجھا دے گا۔ بیہقی نے حضرت معقل بن یسار کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آنکھ آنسو بہاتی ہے تو اللہ تمام جسم کو (اس کی وجہ سے) دوزخ پر حرام کر دیتا ہے اور جب قطرہ رخسار پر بہتا ہے تو اس چہرہ پر بدرونقی اور ذلت نہیں چھائے گی۔ ہر چیز (یعنی عمل) کا ایک اندازہ اور وزن ہے مگر کسی قوم میں سے اگر کوئی شخص (اللہ کے سامنے اس کے خوف سے) روتا ہے تو اس کا ایک آنسو آگ کے سمندروں کو بجھا دیتا ہے۔

میں کہتا ہوں مذکورۂ بالا احادیث سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ نفس اعمال کا وزن کیا جائے گا لیکن ان ہی احادیث کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اعمال ناموں کا اور اعمال کرنے والوں کا وزن کیا جائے گا۔ اعمال کو مجسم بنا کر تولنے کا ثبوت مندرجہ ذیل روایات سے ملتا ہے۔

بیہقی نے شعب الایمان میں (بطریق سدی صغیر از کلبی از ابو صالح) حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ میزان کی ایک زبان اور دو پلڑے ہوں گے نیکیاں اور بدیاں اس میں تولی جائیں گی۔ نیکیوں کو حسین ترین شکل میں لا کر میزان کے پلڑے میں رکھ دیا جائے گا اور بدیوں کے پلڑے سے اس کا وزن زیادہ نکلے گا تو اس خوبصورت شکل کو لے کر جنت کے اندر اس کے مقام پر رکھ دیا جائے گا پھر مؤمن سے کہا جائے گا اپنے عمل سے جا کر مل جا۔ مؤمن جنت کی طرف چلا جائے گا اور وہاں اپنا مقام اپنے عمل کی وجہ سے پہچان لے گا (کیونکہ اس کا عمل حسین شکل میں وہاں پہلے سے موجود ہوگا) اور بدیوں کو مکروہ ترین شکل میں لا کر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا۔ یہ پلڑا ہلکا نکلے گا اور باطل کا وزن ہلکا ہوتا ہی ہے پھر اس کو جہنم میں اس کے مقام پر پھینک دیا جائے گا اور اس (گناہ گار، بدکار) سے کہا جائے گا دوزخ میں اپنے عمل سے جا کر مل جا۔ وہ دوزخ میں چلا جائے گا اور اپنے عمل کو دیکھ کر ہی اپنا مقام اور طرح طرح کے ان عذابوں کو پہچان جائے گا جو اللہ نے اس کے لئے فراہم کر رکھے ہوں گے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جو لوگ جمعہ کے دن (جمعہ کی نماز کے بعد) اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں اور اپنے اپنے مقاموں کو پہچان لیتے ہیں۔ دوزخی اور جنتی دوزخ اور جنت کے اندر اپنے اعمال کی موجودگی کی وجہ سے اپنے اپنے مقاموں کو ان نمازیوں سے بھی زیادہ جانتے ہوں گے چونکہ اس حدیث کی روایت سدی صغیر کے طریق سند سے ہے اس لئے یہ حدیث ضعیف ہے۔

ابن مبارک نے حماد بن ابی سلیمان کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص کو اپنا عمل حقیر دکھائی دے گا اتنے میں ایک چیز بادل کی طرح آکر میزان کے پلڑے میں گر جائے گی اور (فرشتہ یا کوئی اور) کہے گا یہ وہی نیکی ہے جس کی تعلیم تو لوگوں کو دیتا تھا۔ تیرے بعد وہ نیکی نسل در نسل چلتی رہی (یہاں تک کہ آج) اسی کا تجھے اجر دیا جا رہا ہے۔ ابن عبد الرزاق نے ابراہیم نخعی کی روایت سے بھی یہ قول نقل کیا ہے۔

طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے، حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جو شخص کسی جنازہ کے ساتھ جائے گا اس کے لئے میزان میں (نیکی کے) دو قیراط جو کوہ کے برابر ہوں گے رکھے جائیں گے۔ اصبہانی نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فرض نماز کا اللہ کے نزدیک ایک وزن ہے جو شخص فرض نماز میں کچھ کمی کرے گا اس سے اس کمی کی حساب فہمی ہوگی۔ ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ فرض نماز میں اگر کچھ نقصان ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ (فرشتوں سے) فرماتا ہے دیکھو میرے بندہ کے کچھ نوافل ہیں اگر کچھ نوافل ہوئے تو فرض کی کمی نوافل سے پوری کر دی جاتی ہے۔

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل سے تعلق رکھنے والے جسم کا وزن کیا جائے گا۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت جابرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن بندہ کی ترازو میں سب سے پہلے اس نفقہ کو رکھا جائے گا جو بندہ نے اپنے گھر والوں کے لئے کیا ہوگا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اللہ کے وعدہ کو سچا جانتے ہوئے اور ایمان رکھتے ہوئے کوئی گھوڑا (اپنے جہاد یا دوسرے مسلمان مجاہد کے لئے) روک رکھا ہوگا تو اس گھوڑے کا کھانا پینا، لید اور پیشاب (سب کچھ) قیامت کے دن اس کی میزان (کے نیکیوں کے پلڑے) میں رکھا جائے گا۔ طبرانی نے حضرت علیؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کوئی گھوڑا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے باندھ رکھا تو گھوڑے کا چارہ اور نشانات قدم قیامت کے دن اس کی (نیکیوں کی) میزان میں رکھے جائیں گے۔ اصفہانی نے حسن سند سے حضرت علیؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا اٹھو اور اپنی قربانی (ذبح) ہونے کے وقت اس کے پاس خود موجود رہو جو قطرہ اس کے خون کا ٹپکے گا وہ تمہارے لئے ہر گناہ کی مغفرت کا سبب ہوگا۔ خوب سن لو اس کا خون اور گوشت لاکر ستر گنا کر کے تمہاری میزان میں (قیامت کے دن وزن کے وقت) رکھ دیا جائے گا، یہ سن کر ابوسعید نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ حکم آل محمد ﷺ کے لئے مخصوص ہے فرمایا آل محمد ﷺ کے لئے بھی ہے اور عام مسلمانوں کے لئے بھی۔ بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے اور بن حبان نے حضرت ابوذرؓ کی روایت سے اور ابن عساکر نے ضعیف سند سے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے وضو کر کے صاف کپڑے سے (وضو کا پانی پونچھ لیا تو کوئی حرج نہیں اور اگر ایسا نہیں کیا (یعنی وضو کا پانی نہ پونچھا) تو یہ افضل ہے کیونکہ قیامت کے دن دوسرے اعمال کے ساتھ وضو کو بھی طلب کیا جائے گا۔ ابن ابی شیبہ نے مصنف میں لکھا ہے کہ سعید بن مسیب نے وضو کے بعد رومال کو پسند نہیں کیا اور فرمایا اس کا بھی (نیکیوں کے ساتھ) وزن کیا جائے گا۔

طبرانی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا میں نے ایک اونٹنی اللہ کی راہ میں دے دی پھر اس کا بچہ خرید لینے کا ارادہ کیا اور رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا فرمایا رہنے دو، قیامت کے دن یہ اور اس کی اولاد سب تمہاری میزان میں آئے گی۔ ذہبی نے حضرت عمران بن حصین کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن علماء کی روشنائی اور شہیدوں کے خون کا وزن کیا جائے گا۔ علماء کی روشنائی شہیدوں کے خون سے بھاری نکلے گی۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ⑧ (سو جن لوگوں (کی نیکیوں) کے پلڑے بھاری ہوں گے تو ایسے ہی لوگ (پورے پورے) کامیاب ہوں گے)۔

مَوَازِيْنُ مَوْزُوْن کی جمع ہے یعنی تولے جانے والے اعمال مراد ہیں نیکیاں، مجاہد کا یہی قول ہے۔ یا مَوَازِيْن، میزان کی جمع ہے اور اس سے مراد ہے میزان کا نیکیوں والا پلڑا اس توجیہ پر یہ ماننا پڑے گا کہ آیت کی روشنی میں ہر شخص کی میزان جدا جدا ہے۔ اَلْمُفْلِحُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ وہی لوگ نجات اور ثواب پائیں گے (باقی مسلمان گناہ گار جن کی مغفرت ہو جائے گی وہ اگرچہ عذاب سے نجات پالیں گے مگر چونکہ ان کے پاس نیکیاں نہ ہوں گی اس لئے ثواب نہیں پائیں گے۔

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ⑨

(اور جن (کی نیکیوں) کے پلڑے ہلکے ہوں گے سو وہ لوگ وہی ہوں گے جنہوں نے خود اپنا نقصان کر لیا ہماری آیتوں کی حق تلفی کرنے کے سبب)۔

مَوَازِيْن سے اس جگہ بھی نیکیاں یا نیکیوں کا پلڑا مراد ہے۔ بظاہر اس آیت کے عموم میں بدکار کافر بھی داخل ہیں اور وہ مؤمن بھی جن کی بدیوں کا پلڑا نیکیوں کے پلڑے سے بھاری ہو، لیکن اس جگہ صرف کفار مراد ہیں کیونکہ قرآنی بیان کا اسلوب ہی یہ ہے کہ نیکوکار مؤمنوں کے مقابلہ میں کافروں کا تذکرہ کرتا ہے باقی جو مسلمان مخلوط الاعمال ہیں نیکیاں بھی کرتے ہیں اور بدیاں بھی، ان کا ذکر عموماً نہیں کیا جاتا۔ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا سے یہ مراد ہے کہ ان لوگوں نے اپنی پیدائشی فطرت سلیمہ کو کھو دیا اور

عذاب آفریں اعمال کا ارتکاب کیا اور آیات کی تصدیق کرنے کے بجائے تکذیب کرنے لگے۔ اس طرح آیات کے ساتھ ظلم کیا۔ سورۃ القارعہ کی آیات فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ کی تفسیر کے ذیل میں ہم نے حاضر الذکر آیت کے مضمون کی تشریح کر دی ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے وفات کے وقت حضرت عمر فاروقؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا قیامت کے دن جس کی میزان بھاری ہو گی وہ صرف اس وجہ سے بھاری ہو گی کہ دنیا میں وہ حق کا اتباع کرتا تھا جس میزان میں کل حق کو رکھا جائے گا اس کو بھاری ہونا ہی چاہئے اور جس کی میزان قیامت کے دن، ہلکی ہو گی اس کے ہلکے ہونے کی وجہ صرف یہ ہو گی کہ وہ دنیا میں باطل کا اتباع کرتا تھا اور جس میزان میں باطل کو رکھا جائے گا اس کو ہلکا ہونا ہی چاہئے۔

میں کہتا ہوں اس میں میزان سے مراد ہے نیکیوں کا پلڑا اور باطل سے مراد ہیں وہ باطل عقائد و اعمال جن کو اہل باطل نیکیاں سمجھتے ہیں مگر اللہ کے نزدیک وہ سراسر کفریات اور بدعات ہیں اللہ کے نزدیک ان کا کوئی وزن نہیں، جیسے لق و دق بیابان میں سراب جس کو دور سے دیکھنے والا پیاسا پانی سمجھتا ہے اور قریب جاتا ہے تو کچھ نہیں پاتا اسی طرح کافر اور مبتدع کو اللہ کے پاس جا کر کچھ نہیں ملے گا اور اللہ تعالیٰ اس سے پوری پوری حساب فہمی کرے گا۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ (اور بے شک ہم نے تم کو زمین پر جمایا) یعنی زمین پر رہنے کھیتی اور دوسرے کاروبار کرنے کی ہم نے تم کو قدرت عطا کی۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ (اور ہم نے تمہارے لئے اس میں سامان زندگی پیدا کیا)۔

مَعَايِشَ، معیشۃ کی جمع ہے یعنی زندگی بسر کرنے کے اسباب کھیتی باڑی، مویشی، کھانے پینے کا سامان، تجارت اور کمائی کے پیشے وغیرہ۔

قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۟ ع (مگر تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو)۔ یعنی میرے ان احسانات کا تم تھوڑا شکریہ یا تھوڑے وقت شکریہ ادا کرتے ہو۔ ۸

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ (اور ہم نے تمہارا اندازہ کیا) یعنی اپنے علم میں ہم نے تمہارا اندازہ کر لیا تھا جبکہ تم (عالم وجود و مادیت میں آنے سے پہلے) اعیان ثابتہ (حقائق کونیہ، ماہیات امکانیہ اور مرتبۂ تقرر) میں تھے (اعیان ثابتہ کا مرتبہ موجود ہونے سے پہلے کا تھا جب کہ ہر ممکن الوجود چیز اللہ کے کشفی اجمالی علم کے اندر اپنی تمام کیفیات و کمیات کے ساتھ متقرر تھی)۔

ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ (پھر تمہاری صورت بنائی) یعنی تمہارے باپ آدمؑ کی صورت بنائی مطلب یہ کہ تمہاری تخلیق اور صورت سازی کا آغاز اس طرح کیا کہ تمہارے باپ آدمؑ کا اول علمی اندازہ کیا پھر اس کی صورت بنائی یہی تمہاری تخلیق و صورت گری کی ابتدا ہوئی۔ حضرت ابن عباسؓ، قتادہؒ، ضحاکؒ اور سدیؒ نے آیت کی تشریح اس طرح کی کہ ہم نے تمہارے اصول و آباء کو پیدا کیا۔ پھر ماؤں کے پیٹوں میں تمہاری صورتیں بنائیں۔ مجاہد نے کہا ہم نے تم کو یعنی تمہارے باپ آدمؑ کو بنایا، پھر آدمؑ کی پشت میں تمہاری صورتیں بنائیں۔ آدم چونکہ ابو البشر تھے اس لئے ان کی تخلیق کو تمام نسل کی تخلیق قرار دیا۔ بعض نے صَوَّرْنٰكُمْ کا مطلب اور اس طرح لکھا ہے کہ روز میثاق میں تمہاری صورتیں پیدا کیں جبکہ چیونٹیوں کی طرح تم کو بر آمد کیا۔

عکرمہ نے کہا ہم نے باپوں کی پشت میں تم کو پیدا کیا پھر ماؤں کے پیٹوں کے اندر تمہاری شکلیں پیدا کیں۔ یمان نے کہا رحم کے اندر انسان کو بنایا پھر اس کی صورت گری کی۔ کان، آنکھیں اور انگلیاں چیریں۔ بعض علماء کے نزدیک آیت میں لفظ ثُمَّ (تراخی کے لئے نہیں ہے بلکہ) واو کی طرح صرف عطف کے لئے ہے یعنی تم کو پیدا کیا اور تمہاری صورت بنائی (یہ صراحت کرنے کی وجہ یہ ہے کہ) بعض مخلوقات کو صورت نہیں دی گئی ہے جیسے ارواح (اور ہوائیں)۔

ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۟ ۱۱

(پھر ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو سوسب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا)۔ اگر مخاطب کی ضمیر (جمع) سے صرف آدم مراد ہوں تو کسی تاویل کی ضرورت نہیں اور اگر نسل آدم مراد ہو تو (اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ نسل آدم کو پیدا کرنے کے بعد تو سجدہ کرنے کا فرشتوں کو حکم نہیں دیا گیا) اس وقت توجیہ کرنی ہوگی اس صورت میں بعض کے نزدیک ثم مطلق عطف کے لئے ہوگا اور بعض کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم کو پیدا کرنے کے بعد ہم نے تم کو اطلاع دی کہ ہم نے فرشتوں کو سجدہ آدم کا حکم دیا تھا۔ آیت کی پوری تفسیر سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ اللہ نے فرمایا (اے ابلیس) جب میں نے تجھ کو حکم دے دیا تو سجدہ نہ کرنے کی وجہ مانع کونسی ہے۔ اَلَّا تَسْجُدَ میں لا زائد ہے جیسے لِئَلَّا یَعْلَمَ میں یہ جس فعل پر داخل ہوا ہے اس کو مضبوط کررہا ہے اور اس بات پر تنبیہ کررہا ہے کہ ترک سجود موجب سرزنش ہے۔ بعض نے کہا کہ (لا زائد نہیں ہے) جس شخص کو کسی کام سے روک دیا جائے تو وہ اس کام کے مخالف کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے گویا اس وقت مطلب اس طرح ہوگا۔ کس چیز نے تجھے سجدہ نہ کرنے پر مجبور کیا۔ بعض نے کہا کلام کا کچھ حصہ محذوف ہے، اصل کلام اس طرح تھا تجھے تعمیل حکم سے کس چیز نے روکا اور سجدہ نہ کرنے کا باعث کیا ہے۔ اللہ کو تعمیل حکم نہ کرنے کی وجہ معلوم تھی لیکن باوجود علم کے اس لئے استفسار کیا کہ ابلیس کو سرزنش ہو اور اس کے عناد و کفر اور غرور کا اظہار ہو جائے۔ آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ مطلق امر وجوب کے لئے ہوتا ہے (یعنی امر کا صیغہ اگر استعمال کیا جائے اور خلاف وجوب کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو اس کی تعمیل لازم ہے)۔

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾ (ابلیس نے کہا میں اس سے افضل ہوں تو نے مجھے آگ سے بنایا ہے اور اس کو مٹی سے) یہ کلام بظاہر لفظ کے اعتبار سے تو سوال کا جواب نہیں ہے مگر معنی کے لحاظ سے سوال کا پورا جواب ہے اسی لئے جملہ کو (بغیر حرف ربط کے) بصورت استقلال ذکر کیا گویا ابلیس نے اپنی ہستی کو آدمؑ کے سامنے سجدہ ریز ہونے سے بہت بعید قرار دیتے ہوئے کہا کہ میرے لئے سجدہ سے مانع میری افضلیت اور برتری ہے، فاضل کا مفضول کو سجدہ کرنا زیبا نہیں اس لئے مفضول کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا فاضل کو حکم دینا نامناسب ہے۔ ابلیس کے کلام میں اللہ کے حکم پر اعتراض ہے۔ نار سے مراد ہے اوپر کو چڑھنے والا نورانی جوہر اور طِیْن سے نیچے گرنے والی تاریک شئے مراد ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا سب سے پہلے ابلیس نے قیاس سے کام لیا اور قیاس میں غلطی کی لہٰذا جو شخص دین کا قیاس اپنی رائے پر کرتا ہے اللہ ابلیس سے اس کا جوڑ لگا دے گا۔ ابن سیرینؒ نے فرمایا سورج کی پوجا محض قیاس کے ہی گھوڑے دوڑانے کی بنیاد پر کی گئی۔

میں کہتا ہوں ان دونوں قولوں سے قیاس کا بے حقیقت ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ ابلیس کے قیاس کا غلط ہونا ظاہر کیا گیا ہے (صحیح قیاس کی ممانعت نہیں کی گئی) کیونکہ ابلیس نے نص شرع کے مقابل اپنے قیاس سے کام لیا تھا اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا من قاس الدین بشیئی من رأیہ یعنی شرعی نصوص کے مقابل اور مخالف جس نے اپنی رائے چلائی اس کو اللہ ابلیس کا جوڑی دار بنا دیتا ہے پھر بجائے خود بھی یہ بات غلط ہے کہ برتری اور افضلیت کی بنیاد روشنی اور بلندی کی جانب حرکت کو قرار دیا جائے (جیسا کہ آگ میں ہوتا ہے اور اسی علت کو ابلیس نے اپنی دلیل میں پیش کیا) بلکہ عطائے برتری اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہتا ہے فضیلت سے نوازتا ہے۔ اللہ نے اپنی مشیت سے آدم کو تمام مخلوق پر بزرگی عطا فرمائی اپنے دست قدرت سے خصوصی طور پر ان کو بنایا، اپنی روح (کا ایک جلوہ) ان کے اندر پھونک دیا، ان کو تمام اسماء کو سیکھنے کے قابل بنایا، اپنی تجلیات کی پرتواندازی کی منزل ان کو کر دیا، تعمیل احکام اور اجتناب از ممنوعات کے ساتھ فرائض و نوافل کی ادائیگی کے ذریعہ سے ان کو اپنا قرب عطا فرما دیا، وہ امانت جس کو برداشت کرنے سے آسمان، زمین اور پہاڑ بھی خوف زدہ ہو گئے تھے اس کا حامل ان کو بنا دیا۔

...... ایک شبہ ......

اجتہادی خطا تو معاف ہے پھر قیاسی غلطی سے شیطان کی کیوں گرفت کی گئی۔

ازالہ

اجتہادی غلطی معاف ہے بشرطیکہ اجتہاد کرنے والا حق کا طلب گار ہو اور حق کی تلاش میں اپنی امکانی اجتہادی کوشش صرف کردے۔ اس شخص کی اجتہادی خطا معاف نہیں جو سرکش ہو، بہر طور اپنے حریف پر غالب آجانے کا خواستگار اور اپنے تفوق کا طالب ہو۔ دیکھو اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کے جواب میں فرشتوں نے بھی تو کہا تھا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ اور اس قیاس میں انہوں نے غلطی بھی کی تھی اسی لئے اللہ نے ان کے قول کی تردید میں فرمایا اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ مگر چونکہ فرشتوں کا قول غرور تکبر اور سرکشی کے زیر اثر نہ تھا بلکہ طلب حق اور استفہام حکمت کے ماتحت تھا اس لئے ان کو مردود نہیں بنایا فرشتوں کے گویائے حق ہونے اور سرکشی نہ کرنے کا ثبوت ان کے آخری قول سے ملتا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ۔ اہل دانش کا قول ہے کہ مٹی کی سرشت میں وزن و قار، برداشت اور صبر داخل ہے۔ یوں تو آدم کے لئے پہلے سے ہی ازلی سعادت مقدر تھی مگر مٹی کی سرشت ہی ان کو توبہ، عجز اور زاری کی طرف لے گئی اور اس فطرت کی وجہ سے اس کو توبہ، ہدایت اور برگزیدگی نصیب ہوئی۔ اور آگ کی فطرت میں ہلکاپن، اضطراب، تیزی اور بلند طلبی داخل ہے۔ ابلیس کے لئے یوں تو پہلے سے بدبختی مقدر ہو چکی تھی مگر اس کی آتشیں فطرت نے ہی اس کو تکبر اور ضد پر آمادہ کیا اور لعنت و شقاوت کا مستحق بنایا۔ اس سے آگ پر مٹی کی برتری ثابت ہوتی ہے۔ آگ پر مٹی کی فضیلت اس وجہ سے بھی ہے کہ مٹی اشیاء کو سمیٹتی اور جمع کرتی ہے اور آگ منتشر اور پراگندہ کرتی ہے مٹی نباتات کی زندگی کا سبب ہے اور آگ نباتات کو تباہ کر دیتی ہے۔

انسان کی مکمل ساخت مٹی کی اور شیطان کی پوری بناوٹ آگ کی اگرچہ نہیں ہے لیکن انسان کی ساخت میں بیشتر حصہ مٹی کا اور شیطان کی ساخت میں بیشتر حصہ آگ کا ہے اور دونوں کا غالب عنصر مٹی اور آگ ہے۔ اس اول الذکر کو مٹی کا ساختہ اور مؤخر الذکر کو آگ کا ساختہ قرار دیا۔ مِنْ طِیْنٍ کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ انسان کا امتیازی نشان عالم خلق (یعنی مادی عنصر) ہے۔ عالم امر (یعنی روح اور اس کی غیر مادی طاقتیں) عالم خلق کا تابع ہے اس کو خیر و شر سے متصف عالم خلق کی نیکی و بدی کی وجہ سے بالتبع کر لیا جاتا ہے اور عالم خلق کے رنگ ہی سے عالم امر رنگ جاتا ہے جیسے سورج کا عکس اگر آئینہ پر پڑتا ہے تو آئینہ کی جیسی شکل ہوتی ہے، سورج کی روشنی کی بھی وہی شکل ہو جاتی ہے (پس روح سورج کی شعاعوں کی طرح اور جسم آئینہ کی طرح) حضرت مجددؒ نے فرمایا عالم امر کی وجہ سے نفس کی انتہائی ترقی صفات کے پر تو تک ہوتی ہے (صفات تک پہنچ نہیں ہوتی) ہاں مرتبہ اخفی کی ترقی بعض صفات تک ہو جاتی ہے اور ہوا، پانی، آگ ان تینوں عناصر کی ترقی کا منتہا باطن صفات ہے (ظاہر صفات اور باطن صفات کا فرق یہ ہے کہ ظاہر صفات میں اس بات کا عرفان نہیں ہوتا کہ ان صفات کا قیام کسی ذات سے ہے یا نہیں اور باطن صفات میں ذات کے ساتھ صفات کا قیام ملحوظ ہوتا ہے) اور مرتبہ ذات تک ترقی صرف عنصر خاک کے ساتھ مخصوص ہے جیسے آفتاب کی شعاعیں لطیف ترین چیز میں نمایاں نہیں ہوتیں اندر گھس کر پار نکل جاتی ہیں اور کثیف جسم پر پڑتی ہیں تو نمایاں ہوتی ہے۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا (پس اللہ نے (ابلیس سے) فرمایا یہاں (یعنی جنت یا آسمان) سے اتر جا) یعنی جب تو مغرور ہے تو اتر جا یہ جگہ اہل تواضع اور اطاعت شعار بندوں کی ہے۔

فَمَا یَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِیْهَا (ہو نہیں سکتا کہ آسمان میں رہ کر تو تکبر کرے)۔ یعنی تیرے لئے آسمان میں رہ کر تکبر جائز نہیں۔ اس جملہ میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ اہل جنت کے لئے تکبر زیبا نہیں۔ کبریائی تو اللہ ہی کے لئے ہے۔ ابلیس تکبر کی وجہ سے ہی راندہ درگاہ ہوا اور آسمان سے نکالا گیا۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بڑائی ہوگی جنت میں نہیں جائے گا (رواہ مسلم) مسلم کی دوسری روایت میں اس کے بعد یہ بھی آیا

ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ بعض لوگ (اپنے لئے) اچھا کپڑا اور اچھا جوتہ پسند کرتے ہیں (کیا یہ بھی غرور کی علامت ہے) فرمایا اللہ (خود) جمیل ہے، جمال کی پسند فرماتا ہے۔ غرور تو حق کے مقابلہ میں اکڑنا اور لوگوں کی تحقیر کرنا ہے۔

حضرت حارثہ بن وہبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے اور دوزخی کون۔ وہ کمزور آدمی جس کو لوگ کمزور سمجھتے ہیں (یعنی ذلیل سمجھتے ہیں) لیکن اگر وہ اللہ کے اعتماد پر قسم کھالیتا ہے تو اس کی قسم پوری کر دیتا ہے (جنتی ہے) اور ہر بد خلق، درشت خو، تند مزاج، مغرور دوزخی ہے، متفق علیہ۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (اللہ کا ارشاد ہے کہ) بزرگی میری چادر اور بڑائی میری لنگی ہے جو شخص ان دونوں میں سے کسی ایک کے لئے بھی مجھ سے کشاکشی کرے گا میں اس کو دوزخ میں داخل کر دونگا۔ دوسری روایت میں ہے میں اس کو دوزخ میں پھینک دونگا، رواہ مسلم۔

فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّٰغِرِينَ ﴿۱۳﴾ (یہاں سے) نکل جا بلا شبہ تو ذلت پانے والوں میں سے ہے) یعنی اللہ اور اللہ کے دوستوں کی نظر میں ذلیل ہے۔ ہر شخص تجھے برا کہے گا اور ہر زبان تجھ پر لعنت کرے گی۔ قاموس اور دوسری لغت کی کتابوں میں ہے کہ صاغر وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے ذلیل مقام پر خوش ہو۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ غرور کرنے اور بڑائی کا جھوٹا دعویٰ کرنے کے لئے ذلت و حقارت لازم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو اللہ کے فروتنی کرتا ہے اللہ اس کو اونچا کرتا ہے وہ خود اپنے کو تو چھوٹا سمجھتا ہے مگر لوگوں کی نظروں میں بڑا ہوتا ہے اور جو تکبر کرتا ہے اللہ اس کو پست کر دیتا ہے وہ اپنے خیال میں تو بڑا ہوتا ہے مگر لوگوں کی آنکھوں میں کتے اور سور سے بھی زیادہ ذلیل ہوتا ہے، رواہ البیہقی فی شعب الایمان از عمرؓ۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا برا ہے وہ بندہ جو غرور کرتا اور اتراتا ہے اور اللہ بزرگ و برتر کو بھول جاتا ہے۔ ترمذی نے حضرت اسماءؓ کی روایت سے اس حدیث کو نقل کیا ہے لیکن صراحت کر دی ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اس کی سند قوی نہیں ہے۔

قَالَ أَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿۱۴﴾ (ابلیس نے کہا مجھے اس دن تک چھوٹ دے دے جس دن لوگوں کو اٹھایا جائے گا) یعنی تو میری میعاد زندگی طویل کر دے اور روز بعثت تک یعنی اس روز تک کہ دوبارہ صور پھونکا جائے اور لوگوں کو قبروں سے اٹھایا جائے مجھ پر موت کو مسلط نہ کر۔

قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿۱۵﴾ (اللہ نے فرمایا یقیناً تو مہلت پانے والوں میں سے ہے) یعنی تجھے موت سے چھوٹ دے دی گئی۔

یہاں وقت مہلت کی حد بندی نہیں کی گئی مگر دوسری آیت میں مہلت زندگی کی تعیین فرمادی ہے فرمایا ہے إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ وقت معلوم کے دن تک تجھے چھوٹ دے دی گئی۔ وقت معلوم سے مراد یا تو وہ وقت ہے جس کی انتہا اللہ کے علم میں ہے (ہم کو نہیں بتائی گئی) یا وہ وقت مراد ہے جب پہلا صور پھونکنے سے سب لوگ مر جائیں گے۔ آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ دعا کی قبولیت صرف فرماں بردار اور اطاعت گزاروں کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے نہ یہ ضروری ہے کہ دعا کرنے والا مقبول بندہ ہو بلکہ کبھی کافر کی دعا ڈھیل دینے کے لئے بھی قبول کرلی جاتی ہے، اس میں بندوں کا امتحان ہوتا ہے اور در پردہ اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بہتری اس کی دعا کے خلاف کرنے میں ہی ہوتی ہے۔

قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ﴿۱۶﴾ (وہ کہنے لگا اب چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر ہی دیا ہے تو میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کو گمراہ کرنے کے لئے تیرے سیدھے راستہ پر بیٹھوں گا)۔ فَبِمَا میں ف تعقیبیہ اور با سببیہ ہے فعل قسم مقدر ہے اور ما مصدری ہے یعنی اب جب کہ تو نے مجھے مہلت دے دی اور ان انسانوں کے سبب سے کجراہ بنا دیا میں تیری قسم کھاتا ہوں کہ جس طریقہ سے مجھ سے ممکن ہو گا میں ان کو بے راہ کرنے کی کوشش کروں گا چونکہ لَأَقْعُدَنَّ میں لام تاکیدی موجود ہے اس لئے بِمَا کا تعلق أَقْعُدَنَّ سے نہیں ہو سکتا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ بِمَا أَغْوَيْتَنِي میں ب قسمیہ ہے یعنی تیرے اغواء کرنے کی قسم، مراد یہ ہے کہ تیری نافذ الحکم قدرت کی قسم۔

لَاَقْعُدَنَّ جواب قسم ہے اور صِرَاط سے مراد ہے اسلام۔ صِرَاطَكَ میں حرف جر مقدر ہے جیسے عسل الطریق الثعلب لومڑی راستہ میں تیز بھاگی۔ یا حرف جر نکال لیا گیا ہے اور مجرور کو منصوب کر دیا گیا ہے جیسے ضرب زید الظهرو البطن زید نے پشت اور پیٹ پر مارا۔ راستے پر بیٹھنے سے مراد ہے راہ روی سے روکنے کی انتہائی کوشش کرنا، جیسے راہزن قافلہ کے لئے بیٹھے ہوتے ہیں۔

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۗ (پھر ان پر حملہ کروں گا ان کے سامنے سے بھی اور پیچھے سے بھی اور ان کے دائیں اور بائیں جانب سے بھی) دشمن کے آنے اور حملہ کرنے کی جہات چار ہی ہیں بطور تشبیہ ان ہی چہار جہات کا ذکر کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ سے گمراہ کرنا اور بہکانا ممکن ہو گا میں بہکاؤں گا، اسی لئے جہت فوق و تحت کا ذکر نہیں کیا (کیونکہ دشمن کا حملہ عموماً مذکورہ چار جہات سے ہی ہوتا ہے) بعض علماء نے کہا کہ جہت فوق کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ اوپر سے رحمت آتی ہے اور جہت تحت کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ نیچے سے آنا باعث توحش ہے۔ آگے پیچھے کے ساتھ لفظ مِنْ ذکر کیا جو ابتداء غایت کے لئے ہے اور اَیمان و شَمائل کے ساتھ لفظ عن ذکر کیا کیونکہ عن کا معنی ہے تجاوز کرنا یعنی دائیں بائیں ہٹنا۔

بغویؒ نے علی بن طلحہؓ کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سے مراد ہے من قبل الاخرة یعنی آخرت کے معاملہ میں ان کو شک میں ڈال دوں گا اور مِنْ خَلْفِهِمْ سے مراد ہے من دنیا هم یعنی دنیا کی رغبت دلاؤں گا اور عَنْ اَيْمَانِهِمْ سے مراد ہے امر دین یعنی امر دین کو مشتبہ بنا دوں گا اور عَنْ شَمَآئِلِهِمْ سے مراد ہیں گناہ یعنی گناہوں کی طرف راغب کر دوں گا۔ عطیہ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا تفسیری قول اس طرح آیا ہے۔ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ دنیا کی طرف سے یعنی دنیا کو ان کے دلوں میں رچا دوں گا۔ مِنْ خَلْفِهِمْ آخرت کی طرف سے یعنی ان سے کہوں گا کہ نہ جنت ہے نہ دوزخ نہ کبھی حشر ہو گا۔ عَنْ اَيْمَانِهِمْ نیکیوں کی طرف سے۔ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ بدیوں کی طرف سے۔ قتادہ کا قول بھی یہی ہے اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اے انسان ابلیس ہر طرف سے تیرے پاس پہنچا مگر اوپر سے نہیں پہنچا کیونکہ اس میں یہ سکت نہیں کہ اللہ کی رحمت اور تیرے درمیان حائل ہو سکے۔ کذا ذکر السیوطی قول ابن عباسؓ۔

مجاہدؒ نے مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ کی تشریح میں کہا یعنی ادھر سے آؤں گا جدھر وہ دیکھتے ہوں گے اور مِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ کی تشریح میں کہا یعنی اس طرف سے آؤں گا جہاں وہ نہیں دیکھتے ہوں گے۔ ابن جریج نے مجاہد کے قول کی تشریح میں کہا دیکھتے ہوں گے اور نہیں دیکھتے ہوں گے یعنی دانستہ خطا کرتے ہوں گے یا نادانستہ۔

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ (اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار (یعنی مومن) نہیں پائے گا)۔ ابلیس نے یہ بات اپنے ظن کے اعتبار سے کہی تھی (اس کو علم غیب نہ تھا) کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا (اس آیت میں صراحت ہے کہ ابلیس نے اپنے ظن کو انسانوں کے متعلق صحیح پایا چنانچہ ایک خاص گروہ کو چھوڑ کر اکثر نے شیطان کی پیروی کی۔

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ (اللہ نے فرمایا (جنت یا آسمان سے) نکل جا ذلیل و خوار ہو کر)۔

قاموس میں ہے، ذَأَمَهٗ جیسے مَنَعَهٗ اس کو حقیر کر دیا، برا قرار دے دیا، دھتکار کر نکال دیا، رسوا کر دیا۔

ہدایت :- جوہری نے لکھا ہے ذَأَمَهٗ ذأما یعنی ہمزہ کے ساتھ اور ذَامَهٗ ذَيْمًا یعنی یاء کے ساتھ اور ذَمَّهٗ ذَمًّا یعنی میم کی تشدید کے ساتھ تینوں ہم معنی ہیں۔ بغویؒ نے لکھا ہے ذیم اور ذأم سخت ترین مذمت کرنا۔ (یعنی بغویؒ کے نزدیک ذم کے معنی سے ذیم اور ذأم کے معنی میں شدت ہے) مَدْحُوْر کا معنی ہے دور دور دھتکارا ہوا۔

لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾ (ان میں سے (یعنی آدمیوں میں سے) جو تیرے پیچھے چلیں گے۔ میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا)۔ یعنی ابلیس سے اور ابلیس کی پیروی کرنے والوں سے۔

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾

اور اے آدمؑ تم اور تمہاری بی بی جنت میں رہو پھر جس جگہ سے چاہو کھاؤ مگر دونوں اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ ان لوگوں کی شمار میں آجاؤ گے جو بے جا کام کرتے ہیں) اس آیت کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے وہاں مطالعہ کرنا چاہئے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا (پھر شیطان نے دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کے پردہ کا بدن جو ان تک دونوں سے پوشیدہ تھا دونوں کے روبرو کردے)۔ قاموس میں ہے دل کے اندر پیدا ہونے والا یا شیطان کا ڈالا ہوا ایسا خیال جو غیر مفید ہو وسوسہ ہے۔ بغویؒ نے لکھا ہے وسوسہ وہ بات جو شیطان دل میں ڈال دیتا ہے۔ وسوسہ کا اصل لغوی معنی ہے زیور کی آواز اور پست آہٹ۔ لَهُمَا میں لام اجلیہ ہے دونوں کے لئے۔ لِيُبْدِيَ میں لام نتیجیہ ہے یا لام غرض کیونکہ کشف ستر کرا کے شیطان کو دونوں سے برائی کرنی مقصود ہی تھی، سَوْاٰتِهِمَا یعنی قابل ستر اعضاء جن کو دونوں میں سے کوئی بھی نہیں دیکھتا تھا نہ اپنے نہ دوسرے کے۔ اس فقرہ سے اس امر پر روشنی پڑ رہی ہے کہ بے ضرورت تنہائی میں ہو یا شوہر کے سامنے اپنی عورت کھولنا طبعاً بھی قبیح ہے اور شرعاً و عقلاً بھی۔

وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ (اور کہنے لگا تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت سے اور کسی سبب سے نہیں روکا، مگر صرف اس وجہ سے کہ تم دونوں کہیں فرشتہ ہو جاؤ یا ہمیشہ ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ اور دونوں کے سامنے قسم کھائی کہ یقین جانئے میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں)۔

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا اور تَكُوْنَا سے پہلے لا محذوف ہے یا لفظ کراہیۃ مقدر ہے۔ یعنی ابلیس نے آدم و حواء سے کہا تمہارے رب نے جو اس درخت کے پاس جانے کی ممانعت کی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ ہو جاؤ یا ہمیشہ کی زندگی تم کو نہ مل جائے یا یہ مطلب ہے کہ اس کو تمہارا فرشتہ ہو جانا یا دوامی زندگی پانا پسند نہ تھا صرف اس لئے درخت کے پاس جانے کی ممانعت کر دی۔ بعض لوگوں نے اس آیت سے انبیاء پر ملائکہ کی فضیلت کو ثابت کیا ہے مگر یہ غلط ہے اس سے انبیاء پر ملائکہ کی بہمہ وجوہ کلی فضیلت ثابت نہیں ہوتی، صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آدم و حوا کو ان کمالات و فضائل کی رغبت تھی جو فرشتوں کو حاصل تھے۔ کھانے پینے اور دوسرے لوازم مادی سے بے نیازی ملائکہ کی خصوصیت ہے اور فضیلت عمومی کا معیار یہ نہیں بلکہ اللہ کا مقرب ترین ہونا فضیلت تامہ کا معیار ہے (جو ملائکہ کو حاصل نہ تھا آدم کو حاصل تھا)۔

قَاسَمَهُمَا یعنی ابلیس نے آدم و حوا کے سامنے اللہ کی پر زور قسم کھائی۔ قَاسَمَ (باب مفاعلت) کا استعمال مبالغہ کے لئے ہے۔ پورا قصہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ قتادہ نے کہا شیطان نے اللہ کی قسم کھا کر دونوں کو دھوکہ دے دیا اور اللہ کے نام پر مؤمن کبھی فریب بھی کھا جاتا ہے۔ کہنے لگا میں تم سے پہلے پیدا ہوا ہوں اور تم سے زیادہ علم رکھتا ہوں تم دونوں میرے کہے پر چلو میں تمہاری صحیح رہنمائی کروں گا۔ ابلیس نے ہی سب سے پہلے اللہ کی جھوٹی قسم کھائی۔ آدم علیہ السلام کا گمان تھا کہ کوئی بھی اللہ کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا اس لئے دھوکہ کھا گئے۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ (پس ان دونوں کو فریب سے نیچے لے آیا)۔

بغویؒ نے لکھا ہے یعنی ابلیس نے دونوں کو فریب دیا۔ عرب کہتے ہیں مازال فلان یدلی بفلان بغرور یعنی وہ اس کو برابر فریب دیتا اور اس سے چکنی چپڑی باتیں کرتا رہا۔ غرور سے مراد ہے بے حقیقت (فریب) بعض علماء کا قول ہے کہ دَلّٰىهُمَا (کا مصدر تدلیہ ہے، تدلیۃ اور ادلاء کا معنی ہے نیچے اتارنا، لٹکانا) اس سے مراد یہ ہے کہ ابلیس نے آدمؑ و حواؑ کو اونچے درجے سے نچلے درجہ پر اتار دیا، مقام طاعت سے مقام معصیت پر لا گرایا۔

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ

(پھر جب ان دونوں نے اس درخت (کے پھل) کا مزہ چکھ لیا تو دونوں کے پوشیدہ اعضاء ایک دوسرے پر بے پردہ ہوگئے اور (شرم کے مارے) اپنے برہنہ شدہ اعضاء پر جنت کے پتے چپکانے لگے)۔ مطلب یہ ہے کہ پورے طور پر کھانے بھی نہ پائے تھے فقط مزہ ہی چکھا تھا کہ نافرمانی کی نحوست سے دوچار ہوگئے، سزا میں پکڑے گئے اور بدن سے (جنت کا) لباس اتر گیا۔

عبد بن حمید نے وہب بن منبہ کا قول نقل کیا ہے کہ دونوں کا لباس نور کا تھا۔ ابن ابی حاتم نے بروایت سدی فریابی کا قول اور ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، ابن مردویہ، بیہقی اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آدم و حوا کا لباس ناخن کا تھا لیکن درخت کا مزہ چکھنے کے بعد وہ کل لباس اتر گیا صرف ناخن رہ گئے۔ جنت کے ورق سے مراد ہیں انجیر کے پتے۔ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، ابن مردویہ، بیہقی اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے۔

حضرت ابیّ بن کعبؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمؑ دراز قامت ایسے تھے جیسے کھجور کا پرانا لمبا درخت۔ سر کے بال بڑے بڑے تھے۔ جب گناہ میں پڑگئے اور پوشیدہ اعضاء ظاہر ہوگئے اور پہلے کوئی ان اعضاء کو نہیں دیکھتا تھا تو بھاگ کر آپ ایک باغ میں پہنچے، باغ کے ایک درخت نے ان کے بالوں کو الجھالیا آدم نے کہا مجھے چھوڑ دے درخت نے جواب دیا میں تم کو چھوڑنے والا نہیں۔ اس پر اللہ کی آواز آئی آدمؑ کیا مجھ سے بھاگ رہا ہے آدمؑ نے کہا نہیں میرے رب۔ بلکہ مجھے تجھ سے شرم آرہی ہے۔

وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾

(اور ان کے رب نے دونوں کو ندا دی کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت (کے پاس بھی جانے) سے منع نہیں کر دیا تھا اور کیا تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تم دونوں کا صریحی دشمن ہے)۔ اس نے خود اقرار کیا تھا کہ میں ان کو گمراہ کرنے کے لئے تیرے سیدھے راستہ پر بیٹھوں گا۔ اس آیت میں ممانعت کی خلاف ورزی کرنے اور دشمن کی بات سے فریب کھانے پر عتاب کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ (اگر استحباب، ندب وغیرہ کا قرینہ نہ ہو اور) ممانعت غیر مشروط ہو تو اس کا تقاضا وجوب ہے۔ محمد بن قیس نے کہا اللہ نے ندا دی آدمؑ تو نے کیوں کھایا، میں نے تو تجھے منع کر دیا تھا۔ آدم نے عرض کیا مجھے حوا نے کھلا دیا۔ اللہ نے حواؑ سے فرمایا تو نے کیوں کھلایا۔ حوا نے عرض کیا مجھے سانپ نے مشورہ دیا تھا۔ سانپ سے سوال ہوا تو نے کیوں مشورہ دیا۔ سانپ نے عرض کیا مجھے ابلیس نے مشورہ دیا تھا۔ اللہ نے فرمایا حوا تو نے درخت کو خون آلود کیا تو بھی ہر ماہ خون آلود رہے گی اور اے سانپ تیرے پاؤں میں کاٹے دیتا ہوں تو منہ کے بل چلے گا اور تجھے جو بھی پائے گا تیرا سر پھاڑ دے گا اور اے ابلیس تو ملعون و مردود ہے۔

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا سکتہ (آدم و حواؑ نے عرض کیا پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر خود ظلم کیا)۔ گناہ کر کے اور جنت سے نکالے جانے کا سامان کر کے خود اپنا نقصان کیا اپنے کو خود تباہ کیا۔

وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ (اگر تو ہماری خطا معاف نہیں کرے گا اور ہم پر رحم نہیں فرمائے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے)۔

اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اگر صغیرہ گناہ معاف نہ گئے تو ان کی سزا ہو سکتی ہے۔ معتزلہ کے نزدیک صغیر گناہوں کی سزا نہیں دی جائے گی (خواہ ان کو معاف نہ کیا گیا ہو) بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے آدمی اجتناب رکھتا ہو (کبیرہ کا مرتکب نہ ہو)۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾

(اللہ نے فرمایا تم سب باہم دشمن ہونے کی حالت میں ہی اترو۔ تمہیں زمین میں ہی رہنا اور ایک وقت تک نفع اندوز ہونا ہے)۔ اھبطوا اگرچہ جمع کا صیغہ ہے مگر مخاطب صرف آدم و حواؑ ہیں۔ ابلیس کو اس سے پہلے اتارا جا چکا ہے شاید (دو کے لئے)

جمع کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا کہ ان دونوں کا نزول ساری نسل کے نزول کا سبب ہے (یعنی تم دونوں اور آئندہ ہونے والی تمہاری نسل سب اترو) بعض کے نزدیک ابلیس کو بھی ذیلی طور پر اس وقت بھی خطاب میں داخل کر لیا گیا (اور تینوں کو حکم دیا گیا) تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمیشہ (دنیا میں) ان کو ساتھ رہنا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الگ الگ جو حکم ان کو دیا گیا تھا اس کے مجموعہ کی خبر اس آیت میں (بصیغہ جمع) دے دی گئی۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ جملہ حالیہ ہے۔ مُسْتَقَرٌّ یا مصدر ہے (ٹھہرنا) یا ظرف مکان (ٹھہرنے کی جگہ) مَتَاعٌ مصدر ہے (فائدہ اندوز ہونا) اِلٰی حِیْنٍ سے مراد ہے مرنے کے وقت تک۔

ع ۲/۱۵/۹ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ﴿٢٥﴾ (یہ بھی فرما دیا (کہ) زمین میں ہی تم زندگی بسر کرو گے وہیں مرو گے اور اسی سے (پھر) نکالے جاؤ گے)۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿٢٦﴾ (اے اولاد آدمؑ ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہارے واجب الستر اعضاء کو چھپاتا بھی ہے اور موجب زینت بھی ہے اور تقویٰ کا لباس سب سے بڑھ کر ہے یہ اللہ کے احکام میں سے ہے تاکہ لوگ یاد رکھیں)۔

بغویؒ نے لکھا ہے جاہلیت کے زمانہ میں لوگ کعبہ کا طواف برہنہ ہو کر کیا کرتے تھے مردوں میں اور عورتیں رات میں۔ ان کا قول تھا کہ جن کپڑوں میں ہم نے گناہ کئے ہیں ان کو پہنے ہوئے ہم طواف نہیں کریں گے۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ قتادہؒ نے کہا عورت دوران طواف میں اپنی شرمگاہ پر ہاتھ رکھے ہوئے کہتی تھی آج اس کا کچھ حصہ کھلا ہو لیا سب برہنہ ہو میں اس کو کسی کے لئے حلال نہیں کروں گی اس پر اللہ نے کپڑے پہننے کا حکم دیا اور فرمایا ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا ہے۔ سَوْاٰتِهِمَا قابل ستر اعضاء یہ سوءۃ کی جمع ہے۔ واجب الستر حصہ کا کھلنا برا معلوم ہوتا ہے اس لئے اس کو سوءۃ کہا جاتا ہے۔ اَنْزَلْنَا سے مراد (یہ نہیں ہے کہ براہ راست لباس آسمان سے اترا ہے بلکہ مراد) یہ ہے کہ اسباب سماوی اور نظام علوی کے زیر اثر ہم نے لباس پیدا کیا ہے۔ ایسا ہی دوسری آیات میں بھی آیا ہے فرمایا ہے وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ تمہارے لئے مویشی اتارے۔ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ اور ہم نے لوہا اتارا۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے تم پر لباس پہننے کا حکم اتارا۔ شاید حضرت آدم کا قصہ اس بات کی تمہید ہے کہ کشف عورت ممنوع ہے شیطان کی طرف سے پہلی مصیبت انسان پر جو آئی وہ بے پردہ ہونے کی شکل میں ہی آئی۔ شیطان نے ہی حضرت آدم و حوا کو اغواء کر کے برہنہ کرایا اور ان کی اولاد کو بھی اسی طرح اغواء کر رہا ہے۔

رِيْشًا عمدہ لباس (قاموس) یا جمال (بیضاوی) یا مال (حضرت ابن عباسؓ، مجاہد، ضحاک، سدی) تَرَيَّشَ الرَّجُلُ وہ آدمی مالدار ہو گیا۔ لباس تقویٰ سے کیا مراد ہے، اس کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ قتادہ اور سدی کے نزدیک لباس تقویٰ ایمان ہے۔ حسن بصریؒ کے نزدیک حیا ہے، کیونکہ حیا ہی موجب تقویٰ ہے۔ عطیہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ عمل صالح لباس تقویٰ ہے۔ حضرت عثمان بن عفانؓ کا قول آیا ہے کہ خوبصورت نقشہ مراد ہے۔ عروہ بن زبیر نے خشیۃ اللہ کو لباس تقویٰ قرار دیا ہے۔ کلبی نے پاک دامنی کو یعنی صاحب تقویٰ کے لئے پاک دامنی سب سے خوبصورت لباس ہے۔ ابن الانباری نے کہا لباس التقویٰ سے مراد وہی لباس ہے جس کا ذکر اس سے پہلے فقرہ میں آ گیا مکرر لانے سے یہ غرض ہے کہ برہنہ طواف کرنے سے کپڑے پہن کر اعضاء پوشیدنی کو چھپانا بہتر ہے اور برہنگی کے گناہ سے بچنے کا سبب لباس ہے۔ زید بن علی نے فرمایا لباس تقویٰ سے مراد جنگی لباس ہے جو جنگ میں حفاظت کے لئے پہنا جاتا ہے۔ زرہ خود بکتر پٹی، گیٹس۔ بعض نے کہا لباس تقویٰ بالوں کے کھردرے موٹے موٹے کپڑے ہیں جو زاہد لوگ پہنتے ہیں۔

آیات اللہ سے مراد (یا احکام ہیں یا وہ) نشانیاں ہیں جو اللہ کی رحمت و مہربانی پر دلالت کر رہی ہیں۔ یاد رکھنے سے مراد ہے اللہ کی نعمتوں کا اقرار کرنا اور برائیوں سے بچا رہنا۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ

(اے اولاد آدم شیطان تم کو دھوکہ نہ دینے پائے (اور گمراہ کر کے جنت سے محروم نہ کر دے) جیسے تمہارے ماں باپ کو (یعنی آدم و حوا کو دھوکہ دے کر) جنت سے نکلوانے کا سبب بنا ایسی حالت میں کہ ان کا لباس بھی ان سے اتروا دیا تاکہ ان کو ان کا پردہ کا بدن دکھائی دینے لگے)۔ بظاہر شیطان کو ممانعت ہے لیکن حقیقت میں اولاد آدمؑ کو گمراہ ہونے سے نہی ہے۔ یعنی تم دھوکہ نہ کھاؤ اور شیطان کے پیچھے چل کر راستہ سے نہ بھٹکو۔ شیطان چونکہ آدم و حوا کے بدن سے جنت کا لباس اتروانے کا سبب تھا اس لئے يَنْزِعُ کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی۔

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ (بلاشبہ وہ اور اس کے گروہ والے تم کو اس طور پر دیکھتے ہیں کہ تم ان کو نہیں دیکھتے)۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک قبیلہ سے مراد ہے ابلیس کی اولاد۔ اور قتادہؒ کے نزدیک گروہ جن مراد ہے۔ غرض پورا جملہ نہی تحذیری کا ہے جس میں شیطان اور اس کے مددگاروں کی فریب دہی سے ڈرلیا گیا ہے کیونکہ وہ ایسا دشمن ہے جو ہم کو نظر نہیں آتا اور جو دشمن ہم کو دیکھ رہا ہوں مگر ہم کو نظر نہ آرہا ہو اس سے اللہ ہی محفوظ رکھے تو حفاظت ہو سکتی ہے۔ ذوالنونؒ نے فرمایا اگر شیطان تم کو دیکھتا ہو اور تم کو نظر نہیں اتا تو تم اس ذات سے مدد کی درخواست کرو جو شیطان کو دیکھ رہی ہے اور شیطان اس کو نہیں دیکھ سکتا۔

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۲۷ (ہم شیطانوں کو ان لوگوں کا رفیق بنائے رکھتے ہیں جو ایمان نہیں لائے) رفیق بنانے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ باطل کی پیروی اور حق سے نفرت دونوں فریق میں مشترکاً قائم رکھی جاتی ہے یا شیطانوں کو بے ایمانوں پر مسلط کر دیا جاتا ہے اور قدرت دے دی جاتی ہے کہ وہ ان کو فریب دیتے رہیں اور اس فریب کاری پر ان کو آمادہ رکھیں۔

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ (اور وہ لوگ جب کوئی بے حیائی کا کام (شرک یا برہنہ طواف وغیرہ) کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی پر پایا ہے اور اللہ نے ہم کو یہی حکم دیا ہے)۔ فَاحِشَةً حد سے زیادہ بری بات۔ اس سے مراد ہے شرک۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ کے نزدیک برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرنا مراد ہے۔ بظاہر لفظ فَاحِشَةً کے اندر ہر کبیرہ گناہ داخل ہے۔ یعنی جب وہ حد سے زیادہ کوئی بری حرکت کرتے ہیں اور ان کو منع کیا جاتا ہے تو اس کے جواز کی دو دلیلیں بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو یوں ہی کرتے پایا (لہٰذا یہ عمل صحیح ہے) اور اللہ نے بھی ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ پہلی دلیل کی تردید اس جگہ نہیں کی کیونکہ اس کی بے ہودگی ظاہر ہی تھی۔ پھر دوسری جگہ آیت میں اس کی تردید (بلیغ اسلوب کے ساتھ) آچکی ہے، فرمایا ہے اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ دوسری دلیل کی تردید مندرجہ ذیل آیت میں فرمائی۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۸ (آپ کہہ دیجئے کہ اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا کیا خدا کے ذمے ایسی بات لگاتے ہو جس کی سند کا تم کو علم نہیں)۔

کیونکہ بری بات کا حکم دینا بھی برا ہے۔ اس آیت میں ثبوت ہے اس امر کا کہ اشیاء کی اچھائی برائی اگرچہ خدا کی پیدا کردہ ہے لیکن عقل سے اس کو سمجھا جاتا ہے۔ قبیح سے مراد اس جگہ وہ امر شنیع ہے جس سے طبع سلیم نفرت کرتی اور دانش صحیح جس کو برا سمجھتی ہے۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ آیت مذکورہ میں دونوں جملے دو مرتب سوالوں کے جواب ہیں گویا کلام یوں تھا سوال: تم نے اس امر قبیح کا ارتکاب کیوں کیا۔ جواب: ہم نے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ سوال: تمہارے باپ دادا کو کہاں سے حکم ملا۔ جواب: ان کو اللہ نے اس کا حکم دیا تھا (اور ان کی وساطت سے اللہ کا وہ حکم ہم تک پہنچا پس اللہ ہی نے ہم کو اس کا حکم دیا) بہر حال آیت سے اسلاف کا بے دلیل اندھا دھند اتباع ممنوع قرار پاتا ہے۔ لیکن ہر تقلید آباء کی حرمت ثابت نہیں ہوتی (اگر آباء کا قول از روئے شریعت حق ہو تو اس پر چلنا اور اس کی تقلید کرنا تو ضروری ہے)۔

انقولون علی اللہ یعنی کیا تم اللہ پر بغیر یقین آفریں دلیل کے بہتان بندی کرتے ہو۔ یہ استفہام انکاری ہے مگر انکار حکم نہی میں ہے یعنی اللہ پر افترابندی نہ کرو۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ۬

(آپ کہہ دیجئے کہ میرے رب نے انصاف کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ (بھی کہہ دیجئے) کہ تم ہر سجدہ کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھا کرو اور اللہ کی عبادت اس طور پر کرو کہ اس عبادت (یا اطاعت) کو خالص اللہ ہی کے واسطے رکھا کرو۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اَلْقِسْط سے مراد لا الہ الا اللہ ہے۔ ضحاک نے کہا توحید مراد ہے۔ مجاہدؒ اور سدیؒ کے نزدیک عدل مراد ہے۔ لغت میں قِسْط کا معنی ہے امر متوسط جس کا جھکاؤ طرفین میں سے کسی ایک کی جانب زیادہ نہ ہو۔ افراط و تفریط کے درمیان امر کا نام قِسْط ہے۔

اَقِیْمُوْا مفعول ہے فعل محذوف ہے یعنی اللہ نے فرمایا ہے کہ اقامت وجوہ کرو۔ یا قُلْ کا مفعول ہے یعنی آپ یہ جملہ کہہ دیں۔ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ یعنی خالص اللہ کے لئے سجدہ کرو۔ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ یعنی ہر نماز اور سجدہ کے وقت یا ہر مقام سجود میں (اول مطلب پر لفظ مسجد ظرف زمان اور دوسرے مطلب پر ظرف مکان ہوگا) مجاہدؒ اور سدیؒ نے آیت کا تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا جہاں بھی ہو نماز کے اندر اپنا منہ کعبہ کی طرف رکھو۔ ضحاک نے کہا اگر تم کسی مسجد کے پاس ہو اور نماز تیار ہو تو مسجد میں جاکر نماز پڑھ لو یہ نہ کہو کہ میں اپنی مسجد میں جاکر پڑھوں گا۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہی مسلک ہے لیکن اتنی تفصیل ہے کہ اگر کوئی کسی دوسری مسجد کا امام ہو یا ایسا شخص ہو کہ اس کی غیر حاضری سے دوسری مسجد کی جماعت کے نظام میں خلل پڑ جائے تو ایسے شخص کے لئے مسجد سے اذان کے بعد بھی چلا جانا درست ہے۔ بعض علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا اللہ کی عبادت کی طرف سیدھے متوجہ ہو جاؤ کسی دوسرے کی طرف رخ نہ موڑو۔ وَادْعُوْهُ یعنی اس کی عبادت کرو۔ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ اطاعت اور عبادت کو ہر شرک وریاء اور شہرت طلبی سے پاک صاف رکھ کر۔

كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿۲۹﴾ (جس طرح اس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا اسی طرح تم دوبارہ لوٹو گے)۔

یعنی جس طرح اس نے پہلے تم کو مٹی سے، پھر نطفہ سے پیدا کیا اسی طرح مرنے کے بعد تم دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے اور اللہ تمہارے اعمال کے موافق بدلہ دے گا۔ تخلیق ثانی کو تخلیق اول سے تشبیہ دینے کی غرض یہ ہے کہ تخلیق ثانی ممکن ہے اور تخلیق اول کی طرح اللہ تخلیق دوئم پر قادر ہے۔ بعض علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ جس طرح اول بار تم کو برہنہ پا برہنہ بدن غیر مختون پیدا کیا تھا اسی طرح تم اس کے پاس لوٹو گے۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن برہنہ پا برہنہ بدن اٹھائے جاؤ گے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مرد بھی اور عورتیں بھی۔ فرمایا عائشہؓ اس روز معاملہ اس سے بہت سخت ہوگا (یعنی کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ ہوگی) صحیحین۔

بخاریؒ اور مسلمؒ نے صحیحین میں اور ترمذی نے سنن میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا لوگو! تم برہنہ پا، پیدل، برہنہ بدن، غیر مختون اللہ کی پاس لے جائے جاؤ گے۔ پھر حضور ﷺ نے تلاوت فرمائی كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ۔ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کو لباس پہنایا جائے گا۔ اس مبحث کی صحیح احادیث بکثرت آئی ہیں۔ لیکن ابو داؤد، ابن حبان، بیہقی اور حاکم نے نقل کیا اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے انتقال کے قریب ہی کپڑے طلب کئے اور پہن کر فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ میت کو انہی کپڑوں میں اٹھایا جائے گا جن کو پہنے ہوئے اس کا انتقال ہوا ہوگا۔ ابن ابی الدنیا نے حسن سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے نئے کپڑوں کا اپنی ماں کو کفن دلوایا اور فرمایا اپنے مردوں کو کفن اچھے دیا کرو، قیامت کی دن انہی کپڑوں میں ان کو اٹھایا جائے گا۔ سعید بن منصور نے سنن میں بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا اپنے مردوں کو کفن اچھے دیا کرو، قیامت کے دن انہی میں ان کو اٹھایا جائے گا۔ یہ تینوں احادیث قوت میں ان احادیث کی طرح نہیں ہیں جن میں برہنہ اٹھائے جانے کی صراحت آئی ہے۔ اکثر علماء

نے مؤخر الذکر احادیث کا مصداق شہیدوں کو قرار دیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ نے شہید کے متعلق حدیث سنی تھی مگر (اجتہادی غلطی سے) عام مردوں کے لئے اس کو سمجھ لیا۔ بیہقی نے ان متعارض احادیث کو باہم توفیق دینے کے لئے کہا کہ بعض لوگوں کو برہنہ بدن اٹھایا جائے گا اور بعض کو کپڑوں میں۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ قبروں سے نکلتے وقت لوگ کپڑے پہنے ہوں گے پھر ان کے کپڑے ابتداء حشر کے وقت بدن سے گر جائیں گے اور میدان حشر میں ان کو برہنہ لے جایا جائے گا۔ بعض علماء نے کہا یہ جو حدیث آئی کہ میت کو اس کے کپڑوں میں اٹھایا جائے گا اس میں (کپڑوں سے) مراد نیک عمل ہیں جیسے (دوسری آیت میں تقویٰ کو لباس قرار دیا ہے اور) فرمایا ہے وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ۔

حضرت جابرؓ نے آیت کا معنی یہ بیان کیا کہ جن اعمال پر لوگ مریں گے انہی پر ان کو اٹھایا جائے گا، رواہ مسلم فی صحیحہ و ابن ماجتہ والبغوی۔ حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر بندہ کو اسی حالت پر اٹھایا جائے گا جس پر وہ مرا ہو گا، مؤمن کو ایمان پر اور کافر کو کفر پر۔ حضرت ابن عباسؓ نے آیت کی تشریح میں فرمایا اللہ نے پہلی تخلیق میں اولاد آدم کو مؤمن اور کافر بنایا۔ فرمایا هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ پھر قیامت کے دن ان کی بعثت بھی گزشتہ ایمان وکفر کی حالت پر ہو گی۔ ابو العالیہ نے تَعُوْدُوْنَ کی تشریح میں فرمایا لوگ اسی حالت کی طرف لوٹیں گے جو حالت ان کی اللہ کے علم (ازلی) میں ہو گی۔ سعید بن جبیرؒ نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا جیسا اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے تم ویسے ہی ہو جاؤ گے۔ محمد بن کعب نے کہا جس کی ابتدائی تخلیق اللہ نے بدبختی پر کی ہے وہ مآل کار شقاوت کی طرف چلا جائے گا خواہ اس نے اہل سعادت کے کام کئے ہوں جیسے ابلیس اہل سعادت کے اعمال کیا کرتا تھا، پھر شقاوت کی طرف چلا جائے گا اور جس کی ابتدائی تخلیق سعادت پر ہو گی وہ سعادت کی طرف (مآل میں) چلا جائے گا خواہ اس نے اہل شقاوت کے کام کئے ہوں جیسے حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ پر آنے والے جادوگر اہل شقاوت کے کام کرتے تھے پھر آخر میں سعادت کی طرف آگئے۔ حضرت سہل بن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمی دوزخیوں کے کام کرتا ہے اور جنتیوں میں ہوتا ہے اور اہل جنت کے کام کرتا ہے مگر دوزخی ہوتا ہے خاتمہ کے اعمال کا اعتبار ہے، بخاری و مسلم۔ یہ تشریح آیت کے آخری حصہ کے بھی مناسب ہے فرمایا ہے۔

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ (بعض لوگوں کو تو اللہ نے ہدایت کر دی ہے اور بعض پر گمراہی کا ثبوت ہو چکا ہے) یعنی اللہ نے تم میں سے ایک فریق کو اپنے قدیم علم میں ہدایت یاب کرنے کا ارادہ کر لیا تھا تو اس کو ایمان اور نیک اعمال کی توفیق عطا کر دی اور ایک فریق کو گمراہ کر دیا جس کے لئے اللہ کے قدیم سابق فیصلہ میں گمراہی طے ہو چکی تھی۔

اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۳۰

(ان لوگوں نے شیطانوں کو رفیق بنایا اللہ کو چھوڑ کر اور خیال ان کا یہ ہے کہ وہ راہ راست پر چل رہے ہیں)۔

اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ جہالت عذر نہیں ہے اور کافر خواہ قصداً اور عناداً کافر ہو یا بلا قصد دونوں مذمت کے مستحق ہیں۔ مسلم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اسلام سے پہلے عورتیں برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں اور دوران طواف میں ایک ہاتھ شرمگاہ پر رکھتی تھیں اور کہتی تھیں آج یہ سب کھل جائے یا کچھ حصہ کھل جائے میں اس کو کسی کے تصرف میں نہیں دے سکتی اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ اور قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الخ بھی نازل ہوئی۔ اے اولاد آدم تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو)۔ باجماع اہل تفسیر زینت سے مراد وہ لباس ہے جس سے ستر عورت ہو جائے۔ مجاہدؒ نے کہا جس سے تیرا ستر عورت ہو جائے خواہ چوغہ ہو۔ کلبی کا بھی یہی قول ہے۔ اس آیت کی تشریح میں بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ زینت سے مراد کپڑے ہیں اور مسجد سے مسجد ہی مراد ہے اسی لئے آیت کا

مطلب اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ طواف یا نماز کے لئے مسجد میں لباس لے لو، اسی بنیاد پر ابن الہمام نے کہا ہے کہ آیت کا نزول برہنہ طواف کرنے کی حرمت کے لئے ہوا۔ اعتبار اگرچہ الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے خصوصیت سبب مدار حکم نہیں ہوتی لیکن سبب میں سب سے پہلے براہ راست حکم کا متحقق ہونا ضروری ہے (اگرچہ حکم کا حصر اس سبب میں ہی نہیں) کیونکہ سب سے پہلے اسی سبب میں حکم کا تحقق مقصود ہوتا ہے اور پھر بالواسطہ (الفاظ کے عموم کے پیش نظر) دوسری صورتوں کے لئے بھی وہ حکم عام ہو جاتا ہے اور ہمارے نزدیک طواف کرنے میں ستر عورت ہونا واجب ہے مگر طواف کی شرط نہیں ہے اگر برہنہ طواف کرے گا تو طواف واجب کی ادائیگی ہو جائے گی مگر گناہ گار ہو گا اسی طرح فرض نماز کی ادائیگی بھی برہنہ بدن نماز پڑھنے سے ہو جائے گی کیونکہ نماز کی حالت میں ستر عورت ہونا واجب ہے مگر شرط نہیں ہے ہاں گناہ گار ضرور ہو گا (پس آیت سے تو استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ تنہائی میں بھی برہنہ بدن طواف یا نماز کا فرض ادا نہ ہو گا) البتہ اجماع علماء ہے کہ نماز میں ستر عورت ہونا فرض ہے (بغیر ستر عورت کے نماز نہیں ہوتی خلوت میں ہو یا جلوت میں) بعض علماء مالکیہ (جیسے قاضی اسمٰعیل) کا قول اس کے خلاف بھی آیا ہے مگر اجماع کے خلاف منفرد قول ناقابل اعتبار ہے۔ حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت بھی ہے کہ اللہ بالغہ عورت کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں فرماتا۔ رواہ ابو داؤد والترمذی والحاکم وابن خزیمۃ۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ مسجد مصدر میمی ہے سجدہ کرنا اور اس سے مراد نماز ہے۔ جز بول کر کل مراد لے لیا جاتا ہے۔ جیسے آیت وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ میں رکوع سے مراد نماز ہے اسی طرح آیت فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ میں قرآن سے مراد بھی نماز ہے (رکوع اور قرأت نماز کے اجزاء ہیں) اس مطلب پر آیت کی عبارت دلالت کر رہی ہے کہ صرف نماز میں ستر عورت واجب ہے (یعنی طواف سے آیت کا کوئی تعلق نہ ہو گا)۔

عرب دور جاہلیت میں برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جن کپڑوں کو پہن کر ہم نے اللہ کی نافرمانیاں کی ہیں ان کو پہن کر طواف نہیں کریں گے۔ عورتیں بھی برہنہ طواف کرتی تھیں۔ یہ کل واقعات آیت يَا بَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ سے...... مَا بَطَنَ تک کے نزول کا سبب تھا۔ بلکہ حضرت آدمؑ کا قصہ بھی اسی کی تمہید کے طور پر ذکر کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ سب سے پہلا دکھ جو شیطان کی طرف سے انسان کو پہنچا وہ پوشیدنی اعضاء کی برہنگی کی شکل میں نمودار ہوا۔ تمام آیات بتا رہی ہیں کہ پوشیدنی اعضا کو چھپانے کے لئے لباس کی تخلیق اللہ کی عظیم الشان نعمت ہے اور یہی تقویٰ ہے۔ بے پردگی اور پوشیدنی اعضاء کی برہنگی عظیم الشر فتنہ اور شیطانی اغواء ہے، جس کا شکار ابلیس نے پہلے تمہارے باپ آدمؑ کو کیا اور اب تم کو کر رہا ہے۔ یہ پکی بے حیائی ہے جس کا ارتکاب باپ دادا کی پیروی میں عرب کرتے تھے اور اللہ پر بہتان باندھتے تھے کہ خدا نے ان کو اس کا حکم دیا ہے۔ اللہ بے حیائی کے کاموں کا حکم نہیں دیا کرتا اس نے تو ایک فریق کو ہدایت یاب کر دیا اور ایک فریق پر گمراہی کا ثبوت ہو گیا۔ یہ تمام آیات بتا رہی ہیں کہ پوشیدنی اعضاء کی پردہ کشائی بے حیائی ہے، مطلقاً حرام ہے۔ شریف طبیعتیں اس کو برا اور قابل عیب جانتی ہیں اور دانش و دین اس کو قبیح سمجھتے ہیں۔ اس بے حیائی کا ارتکاب طواف اور دوسری عبادات میں تو اور بھی برا ہے، اس کی حرمت تو بدرجۂ اولےٰ ہے اور عرب جو دعویٰ کرتے تھے کہ طواف کے وقت کپڑے پہنے رہنا درست نہیں اور حج میں گوشت اور چکنائی کھانا حرام ہے۔ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ اللہ نے اس کی تردید میں فرمادیا ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي الخ اور فرمایا ہے إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ الخ تمام بے حیائی کی باتیں اللہ نے حرام کر دی ہیں۔ کشف عورت بھی بے حیائی ہے اللہ نے اس کو بھی حرام کر دیا لیکن باوجود کشف عورت کی حرمت اور ستر عورت کے وجوب کے یہ بات کسی آیت میں نہیں آئی کہ پوشیدنی اعضاء کو چھپائے رکھنا (صحت) طواف کی شرط ہے (کہ اس کے بغیر طواف ادا نہ ہو) اسی لئے امام اعظمؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی برہنہ طواف کرے گا تو گناہگار ضرور ہو گا مگر فرض طواف ادا ہو جائے گا۔ ہاں اکثر ائمہ فرض طواف کی ادائیگی کے بھی قائل نہیں کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ حج وداع سے ایک سال پہلے جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا تو آپ نے مجھے ایک جماعت کے ساتھ مقرر فرما کر حکم دیا قربانی کے دن

سب لوگوں میں اعلان کردوں اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی برہنہ طواف کرے گا، متفق علیہ۔ امام اعظمؒ کے خلاف ائمہ کی عقلی دلیل یہ ہے کہ برہنہ طواف کرنے کی شرعاً ممانعت ہے لہٰذا ایسی حالت میں طواف کرنے سے فرض ادا نہ ہوگا جیسے قربانی کے دن روزہ رکھنے سے فرض روزہ کی قضا نہیں ہوتی یا طلوع وغروب اور زوال کے وقت نماز پڑھنے سے قضاء فوائت نہیں ہوتی۔

رہی آیت خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ تو اس کا تقاضا صرف اتنا ہے کہ نماز میں ستر عورت شرط ہے۔ ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ عام ستر عورت کا فرض ہونا اور کشف عورت کا حرام ہونا دوسری آیات سے ثابت ہے۔ اس آیت کا کوئی تعلق طواف سے نہیں ہے البتہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی آیا ہے کہ کعبہ کا طواف کرنا بھی نماز ہے مگر اس میں بات کرنا اللہ نے مباح فرمادیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ حدیث ترمذی، حاکم، دار قطنی، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے بیان کی ہے اور ابن خزیمہ وابن حبان نے اس کو صحیح بھی کہا ہے۔ اس حدیث کو اگر آیت سے ملا دیا جائے تو آیت کا تعلق طواف سے بھی ہو جائے گا اگر یہ مان لیا جائے کہ مجملہ دوسری آیات کے اس آیت کا نزول بھی عام کشف عورت کی برائی ظاہر کرنے کے لئے ہو اور کعبہ کا برہنہ طواف کرنے کی روایت کو اس آیت کا سبب نزول بھی قرار دیا جائے تب بھی یہ نہیں ثابت ہوتا کہ اس آیت کا نزول بھی طواف ہی کے سلسلہ میں ہوا، اگر کسی واقعہ کے متعلق یا کسی سوال کے جواب میں کوئی حکم نازل ہو تو اس واقعہ کا فیصلہ اور اس سوال کا جواب ضرور اس حکم سے معلوم ہو جائے گا لیکن مورد نزول سے آگے بڑھ کر کوئی اور حکم معلوم نہ ہو سکے ایسا کہنا درست نہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ برہنہ طواف نہ کرنے کا حکم اس آیت کے علاوہ دوسری آیات سے بھی معلوم ہوتا ہے اس لئے ابن ہمام کا وارد کیا ہوا اشکال درست نہیں۔

مسئلہ :۔ رحمتہ الامتہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک ستر عورت نماز کی شرط ہے۔ امام مالکؒ کے شاگردوں میں (امام مالک کے مسلک کے متعلق) روایت کا اختلاف ہے۔ بعض کا قول تو جمہور کے قول کے موافق ہے کہ اگر ستر عورت پر قدرت ہو اور اس کے باوجود پوشیدنی اعضاء کو برہنہ چھوڑ کر نماز پڑھے گا تو نماز صحیح نہ ہوگی گویا ستر عورت صحت نماز کی شرط ہے بعض کا قول ہے کہ ستر عورت اگرچہ بجائے خود واجب ہے لیکن صحت نماز کی ضروری شرط نہیں ہے، لہٰذا ستر عورت کی قدرت رکھتے ہوئے اگر کوئی برہنہ نماز پڑھے گا تو نماز فرض کی ادائیگی ہو جائے گی۔ مگر ستر عورت نہ کرنے کا گناہ اس پر ہوگا۔ متاخرین مالکیہ کے نزدیک بغیر ستر عورت کے کسی حال میں نماز صحیح نہیں۔ ابن ہمام نے اسی قول پر اجماع سلف نقل کیا ہے پچھلے زمانہ میں اگر آراء کا اختلاف ہو جائے تو اس سے اجماع سلف نہیں ٹوٹ سکتا۔

...... فصل ......

آیت سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ نماز میں ستر عورت واجب ہے لیکن عورت (یعنی پوشیدنی اعضاء کون سے ہیں اور کن اعضاء کے کتنے حصہ کو چھپانا واجب ہے اس معاملہ میں ایت مجمل ہے احادیث میں اس کا بیان آیا ہے۔

...... بیان حسب ذیل ہے ......

مسئلہ :۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مرد کے لئے ناف سے زانو تک چھپا رکھنا واجب ہے۔ امام احمدؒ و امام مالکؒ کے دو مختلف قول مروی ہیں ایک قول امام ابو حنیفہؒ کے موافق ہے اور دوسرے قول میں ہے کہ صرف عضو مخصوص اگلا اور پچھلا چھپا رکھنا واجب ہے۔ اس قول کے استدلال میں حضرت انسؓ کی روایت کردہ حدیث پیش کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر فتح کیا، الی آخر الحدیث۔ اس حدیث میں آیا ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنی ران سے تہبند ہٹایا، حضور ﷺ کی ران کی سفیدی اب بھی میری نظروں کے سامنے پھر رہی ہے۔ (رواہ البخاری) مسلم اور احمد کی روایت میں ہے پھر تہبند ہٹ گئی۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ گھر کے اندر دونوں رانیں یا دونوں پنڈلیاں کھولے لیٹے ہوئے تھے اتنے میں حضرت ابو بکرؓ نے

داخلہ کی اجازت طلب کی آپ نے اسی حالت پر (لیٹے لیٹے) اجازت دے دی، پھر عمرؓ داخل ہونے کے خواستگار ہوئے آپؐ نے اسی حالت میں ان کو بھی اجازت دے دی، کچھ دیر کے بعد عثمان طالب اجازت ہوئے تو آپ کپڑوں کو ٹھیک کر کے بیٹھ گئے۔ رواہ مسلم۔ اس حدیث میں چونکہ رانیں یا پنڈلیاں کوئی ایک لفظ وثوق کے ساتھ نہیں آیا ہے اس لئے نا قابل استدلال ہے۔ مگر امام احمدؒ نے چونکہ صرف رانیں کھولے لیٹنے کا ذکر کیا ہے اور حضرت حفصہؓ کی روایت سے امام احمدؒ نے جو حدیث ذکر کی ہے اس میں بھی صرف رانوں کا لفظ آیا ہے اس لئے حدیث قابل حجت ہے۔

طحاوی اور بیہقی نے ام المومنین حفصہؓ بنت عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز میرے ہاں دونوں رانوں سے کپڑا ہٹائے (لیٹے) ہوئے تھے اتنے میں حضرت ابو بکرؓ آگئے۔

حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت ہے کہ ایک جگہ جہاں پانی موجود تھا رسول اللہ ﷺ اپنے یا اپنا زانو کھولے بیٹھے ہوئے تھے جب حضرت عثمان آئے تو حضور ﷺ نے زانو ڈھانک لیا، رواہ البخاری۔

جمہور کے قول کی دلیل حضرت علیؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے ران ظاہر نہ کرو اور کسی زندہ مردہ کی ران نہ دیکھو۔ رواہ ابوداؤد وابن ماجۃ والحاکم والبزاز۔ بعض علماء نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اس کی سند اس طرح ہے ابن جریج از حبیب بن ثابت از عاصم بن ضمرہ۔ حافظ نے لکھا ہے اس سند میں ابن جریج اور حبیب کے درمیان انقطاع ہے۔ ابو حاتم نے العلل میں لکھا ہے کہ ابن جریج اور حبیب کے درمیان واسطہ حسن بن ذکوان ہے اور یہ ضعیف ہے پھر عاصم سے حبیب کا سماع بھی ثابت نہیں، یہ دوسری خرابی ہے۔ ابن معین نے کہا حبیب نے عاصم سے خود نہیں سنا دونوں کے درمیان ایک ایسا راوی ہے جو ثقہ نہیں ہے۔ بزاز نے کہا دونوں کے درمیان راوی عمرو بن خالد واسطی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک شخص کی طرف سے ہوا اس شخص کی ران کھلی ہوئی تھی حضور ﷺ نے فرمایا ران کو ڈھانپ لو، ران بھی پوشیدنی حصہ ہے، رواہ الترمذی والحاکم واحمد۔ بعض علماء نے اس کو صحیح قرار دیا ہے لیکن اس کی سند میں ابو یحییٰ قتات راوی ہے جو ضعیف ہے۔

رسول اللہ ﷺ حضرت جرہدؓ کی طرف سے گزرے، جرہدؓ مسجد میں تھے اور ان کی ران کھلی ہوئی تھی۔ فرمایا جرہدؓ اپنی ران ڈھانک لو، ران بھی پوشیدنی حصہ ہے، رواہ احمد۔ اس حدیث کی سند میں ابوزرعہ مجہول راوی ہے۔

حضرت محمد بن جحشؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت معمرؓ کی طرف سے گزرے معمر حبوہ[1] بنائے بیٹھے تھے ران کا کچھ حصہ کھلا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا معمر اپنی ران ڈھانک لو۔ ران بھی پوشیدنی عضو ہے۔ رواہ احمد والبخاری فی التاریخ والحاکم فی المستدرک۔ حافظ نے کہا اس حدیث کے تمام راوی سوائے ابو کثیر کے صحیح کے راوی ہیں ابو کثیر کی روایت ایک جماعت نے لی ہے اور اس کے متعلق میں نے کسی کی طرف سے جرح اور تعدیل نہیں پائی۔

حضرت ابو ایوبؓ کی روایت ہے میں نے سنا رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے زانو سے اوپر عورت ہے اور ناف سے نیچے عورت ہے، رواہ الدار قطنی۔ اس کی سند میں عباد بن کثیر اور سعید بن راشد ہیں اور دونوں متروک ہیں۔ عمرو بن شعیب کے دادا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کوئی اپنے غلام کا نکاح کرائے الی اخرہ۔ اس حدیث میں ہے کہ ناف کے نیچے سے زانو تک پوشیدنی حصہ ہے، رواہ الدار قطنی۔ اس کی سند میں سوار بن داؤد راوی ہے جس کو عقیلی نے نرم (یعنی ضعیف) قرار دیا ہے مگر ابن معین نے اس کو ثقہ کہا ہے۔

اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ ان احادیث میں سے کوئی حدیث کشف ران والی حدیث سے نہیں ٹکراتی لیکن چونکہ ان احادیث میں سے ایک دوسری کی موئید ہے اور امت نے اس کو قبول کیا ہے، اس لئے بطور احتیاط ہم نے اس کو لے لیا ہے، اسی بنیاد پر

[1] سرینوں کی نوک پر دونوں پاؤں کھڑے کر کے پنڈلیوں کو رانوں سے ملا کر بیٹھنے کی شکل کو حبوہ کہتے ہیں، کمر کے پیچھے سے کسی رومال یا چادر گھما کر لانے اور سامنے کے رخ پر پنڈلیوں پر گھما کر لے جانے سے تکیہ کی طرح پشت کو سہارا لگ جاتا ہے۔

بخاری نے کہا ہے کہ انسؓ والی حدیث کی سند زیادہ قوی ہے اور جرہد والی حدیث میں احتیاط زیادہ ہے اور چونکہ حضرت انس والی حدیث زیادہ قوی ہے بلکہ وہ احادیث بھی زیادہ قوی ہیں جو حدیث انسؓ کی ہم معنی ہیں اس لئے امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا برہنہ آدمی بیٹھ کر نماز پڑھے شرم گاہ پر ہاتھ رکھ لے اور رکوع سجود کے لئے اشارہ کرے یعنی ستر عورت جو نماز کے اندر اور باہر فرض ہے اس کی رعایت امام اعظمؒ نے کی ہے اور قیام، رکوع، سجود کو اس کی رعایت سے ترک کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

مسئلہ :- امام اعظمؒ کے نزدیک زانو بھی پوشیدنی اعضاء میں داخل ہے۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے زانو پوشیدنی اعضا میں سے ہے۔ اس حدیث کی روایت میں عقبہ بن علقمہ راوی ہے جس کو ابو حاتم، رازی اور نصر بن منصور نے ضعیف کہا ہے ابو حاتم نے کہا یہ مجہول ہے، منکر احادیث نقل کرتا ہے۔ ابن حبان نے کہا یہ ناقابل حجیت ہے۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے حضرت ابو ایوب اور عمرو بن شعیب کے دادا کی روایت کردہ احادیث مندرجہ بالا کی بناء پر زانو کو عورت میں داخل نہیں قرار دیا ہے۔ ہم کہتے ہیں زانو وہ جوڑ کا مقام ہے جہاں بالائی طرف سے پوشیدنی حصہ کی ہڈی اور نچلی طرف سے پنڈلی کی ہڈی ملتی ہے۔ اس سے اوپر کا حصہ کھلا رکھنا حرام ہے اور نیچے کا حصہ کھلا رکھنا جائز ہے۔ ہم نے بطور احتیاط حرمت کو حلت پر ترجیح دی ہے۔

مسئلہ :- آزاد عورت کا پورا جسم پوشیدنی ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک چہرہ دونوں قدم اور (گٹوں سے نیچے) دونوں ہاتھ پوشیدنی اعضاء میں داخل نہیں ہیں۔ ایک روایت میں امام شافعی امام مالک اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔ دوسری روایت میں ان ائمہ کے نزدیک صرف چہرہ اور قدم مستثنیٰ ہیں دونوں پنچے یعنی گٹوں سے نیچے ہاتھ عورت ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بالغہ کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں کی جاتی۔ یہ بھی فرمایا عورت (سراسر) پوشیدنی ہے۔ رواہ الترمذی من حدیث ابن مسعودؓ۔ ابو داؤد نے مرسلاً بیان کیا ہے کہ لڑکی جب بالغ ہو جائے تو اس کے چہرے اور پہنچوں سے دونوں ہاتھوں کے علاوہ دیکھا جانا درست نہیں۔

حضرت ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔ کیا عورت صرف کرتہ اور اوڑھنی پہن کر بغیر تہبند پہنے نماز پڑھ سکتی ہے، فرمایا (پڑھ سکتی ہے) اگر کرتہ اتنا لمبا ہو کہ قدموں کی پشت کو ڈھانک رہا ہو۔ رواہ الدار قطنی۔ اس روایت کی سند میں ایک شخص عبدالرحمٰن بن عبداللہ ہے جس کو یحییٰ نے ضعیف کہا ہے۔ ابو حاتم نے کہا اس کی روایت ناقابل احتجاج ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس حدیث کو مرفوع قرار دینے میں غلطی کی ہے کیونکہ امام مالکؒ اور ایک جماعت نے اس کو حضرت ام سلمہؓ کا قول قرار دیا ہے۔

مسئلہ :- النوازل میں ہے کہ عورت کی آواز کا بھی پردہ ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مردوں کے لئے سبحان اللہ پڑھنا ہے اور عورتوں کے لئے تالی بجانا۔ ابن ہمام نے کہا اگر اسی بنیاد پر کوئی کہے کہ نماز میں عورت اگر جہر کے ساتھ قرأت کرلے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے تو غلط نہ ہوگا۔

مسئلہ :- امام اعظمؒ کے نزدیک باندی کے پردہ کے اعضاء مرد کے پردہ کے اعضاء کی طرح ہیں، لیکن پیٹ اور پشت بھی پوشیدنی اعضاء میں داخل ہیں۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک باندی کے پردہ کے اعضاء بالکل مرد کی طرح ہیں کوئی فرق نہیں (یعنی پیٹ اور پیٹھ پردہ کے اعضاء میں داخل نہیں) بعض اصحاب شافعیؒ نے کہا سر کلائیوں اور پنڈلیوں کے علاوہ باندی کے باقی اعضاء پردہ کے ہیں۔

بیہقی نے بروایت نافع لکھا ہے کہ صفیہ بنت ابی عبید نے بیان کیا کہ ایک عورت اوڑھنی پہنے چادر ڈالے نکلی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کون ہے جواب دیا گیا آپ ہی کی اولاد میں سے فلاں شخص کی باندی ہے۔ آپ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیام بھیجا اور فرمایا کیا وجہ کہ تم نے اوڑھنی اور چادر پہنا کر باندی کو بیاہتا آزاد عورتوں جیسا بنا دیا یہاں تک کہ میں اس کو آزاد شوہر والی عورتوں

میں سے سمجھنے لگا اور آزاد شوہر والی خیال کر کے قریب تھا کہ میں اس کی گرفت کرتا۔ باندیوں کو آزاد، شوہر والی عورتوں جیسا نہ بنایا کرو۔ بیہقی نے لکھا ہے حضرت عمرؓ کے اس کے متعلق اقوال صحیح (الروایۃ) ہیں۔

مسئلہ :- امام احمدؒ کے نزدیک فرض نماز میں مونڈھے ڈھانکنا بھی فرض ہے۔ نفل میں مثبت منفی دونوں قول مروی ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی شخص ایک کپڑا پہنے اس طرح نماز نہ پڑھے کہ مونڈھوں پر کپڑے کا کوئی حصہ نہ ہو۔ (رواہ احمد) صحیحین میں بھی ایسی ہی روایت آئی ہے مگر بخاری نے مونڈھوں کی جگہ کندھے کا اور مسلم نے کاندھوں کا لفظ لکھا ہے۔ جمہور کے نزدیک یہ ممانعت تنزیہی ہے (تحریمی نہیں) (کرمانی) بظاہر ممانعت کا تقاضا تحریم ہے (کیونکہ جب نہی مطلق ہو تو تحریم ہی پر اس کو محمول کیا جاتا ہے) لیکن مونڈھے کھلے رکھنے کے جواز پر اجماع ہو چکا ہے (اس لئے نہی کو تنزیہی کہا جائے گا) حافظ نے کہا کرمانی نے اس کے بعد خود نووی کا بیان نقل کیا ہے کہ امام احمد مونڈھے کھلے رکھنے کو حرام کہتے ہیں۔ کرمانی کو مذکور اول بیان کے وقت یہ دوسرا بیان یاد نہیں رہا، ورنہ اجماع کا دعویٰ نہ کرتے۔ ابن المنذر نے بھی لکھا ہے کہ محمد بن علی مونڈھے کھلے رکھنے کو ناجائز فرماتے تھے۔ طحاوی نے شرح معانی آلاثار میں اس مسئلہ کے متعلق ایک باب مستقل قائم کیا ہے اور حضرت ابن عمرؓ کا قول بروایت طاؤس ونخعی نقل کیا ہے اور بعض لوگوں نے ابن وہب اور ابن جریر کی روایت سے بھی لکھا ہے (کہ مونڈھے کھلے رکھنا ناجائز ہے) شیخ تقی الدین سبکی نے تو امام شافعیؒ کی عبارت اس کے وجوب کے متعلق نقل کی ہے اور اسی قول کو مختار بھی قرار دیا ہے مگر شوافع کی عام کتابوں میں اسکے خلاف منقول ہے اور ستر منکبین کو واجب نہیں قرار دیا گیا ہے)۔

مسئلہ :- اپنے اچھے کپڑے پہن کر نماز پڑھنا مستحب ہے آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ آیت میں لباس کی تعبیر لفظ زینت سے فرمائی ہے اور زینت کو پہن کر نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا واجب مقدار اگرچہ اتنی ہے جس سے ستر عورت ہو جائے لیکن اس سے زیادہ لباس مستحب ہے۔ طحاوی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو دو کپڑے پہن لیا کرے کیونکہ اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے سامنے آنے کے وقت زینت کی جائے (یعنی پورا لباس پہنا جائے) بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک شخص کھڑا ہوا اور رسول اللہ ﷺ سے صرف ایک کپڑا پہن کر نماز پڑھنے کا حکم دریافت کیا حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے ہوتے ہیں (یعنی ہر شخص کو تو دو کپڑے اور پورا جوڑا پہننے کی توفیق نہیں پھر ایک کپڑا ہی پہن کر نماز پڑھے گا) پھر مدت کے بعد ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے یہی مسئلہ پوچھا تو آپ نے فرمایا جب اللہ نے کشائش عطا فرما دی ہے تو لوگوں نے بھی کشائش سے کام لیا لوگوں نے پورے کپڑے پہن کر نماز پڑھی۔ کسی نے تہبند اور چادر پہن کر، کسی نے تہبند اور قمیص پہن کر، کسی نے تہبند اور قبا پہن کر، کسی نے پائجامہ اور چادر پہن کر، کسی نے پائجامہ اور کرتہ پہن کر، کسی نے پائجامہ اور چوغہ پہن کر، کسی نے تبان اور قباء، تبان اور قمیص پہن کر اور شاید یہ بھی فرمایا کسی نے تبان اور چادر پہن کر۔

بغویؒ نے کلبی کا بیان نقل کیا ہے کہ (جاہلیت کے زمانہ میں) حج کی مدت میں بنی عامر صرف اتنا کھاتے تھے کہ زندگی باقی رہ جائے اور چربی چکنائی نہیں کھاتے تھے۔ یہ فعل حج کی عظمت کے پیش نظر کرتے تھے۔ مسلمانوں نے کہا (تعظیم حج کے تو) ہم زیادہ مستحق ہیں ہم بھی ایسا ہی کریں گے اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَّكُلُوْا (اور کھاؤ) یعنی گوشت اور چربی کھاؤ۔

وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾ (اور پیو اور حد سے مت نکلو، حد سے نکلنے والوں کو یقیناً اللہ پسند نہیں کرتا)۔ یعنی گوشت اور چربی کھانا اور لباس پہننا اللہ نے حلال کیا ہے اس کو حرام بنا کر حد سے نہ نکلو۔

ابن المنذر نے عکرمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ آیت قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ کا نزول قریش کے حمیس اور بنی عامر بن صعصعہ اور کنانہ بن بکر کے مختلف بطون کے متعلق ہوا، جو حج کے زمانہ میں گوشت نہیں کھاتے تھے اور گھروں میں (دروازوں سے نہیں داخل ہوتے تھے بلکہ) گھروں کے پیچھے کی طرف سے جاتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا

جو دل چاہے کھا جو دل چاہے پہن، لیکن دو باتوں سے پرہیز رکھ، حد سے تجاوز اور اترانا۔ اخرجہ ابن ابی شیبۃ فی المصنف و عبد بن حمید فی التفسیر ۱؎

حضرت ابن عمرؓ کی مرفوع روایت ہے کھاؤ اور پیو اور خیرات کرو اور پہنو، بغیر اسراف اور اترانے کے، رواہ احمد بسند صحیح و ابن ماجۃ والحاکم ۲؎

روایت میں آیا ہے کہ ہارون رشید کے پاس ایک عیسائی طبیب حاذق تھا۔ ایک روز اس نے علی بن حسن بن واقد سے کہا تمہاری کتاب میں علم طب کے متعلق کچھ نہیں ہے۔ حالانکہ علم دو ہی ہیں بدن کا علم اور دین کا علم۔ علی نے جواب دیا اللہ نے ساری طب کو آدھی آیت میں جمع کر دیا ہے، فرمایا ہے "کلوا واشربوا ولا تسرفوا" طبیب بولا تمہارے رسول ﷺ کا کوئی قول طب کے متعلق نہیں آیا۔ علیؒ نے کہا ہمارے رسول ﷺ نے بھی ساری طب کو چند الفاظ میں جمع کر دیا ہے، فرمایا ہے "معدہ مرض کا گھر ہے۔ پرہیز ہر علاج کا سر ہے ہر بدن کو وہی چیز دو جس کا تم نے اس کو عادی بنا دیا ہو، طبیب بولا تمہاری کتاب اور تمہارے رسول نے تو جالینوس کے لئے طب چھوڑی ہی نہیں۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ ((اے محمد ﷺ) آپ کہئے کہ جو زینت اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہے اس کو حرام کرنے والا کون)۔ یہ استفہام انکاری ہے یعنی اللہ نے لباس کا میٹر پیدا کیا۔ روئی پوست ایسی (یعنی نقلی ریشم) زمین سے پیدا کی، اون، بھیڑ، بکری کی کھال سے اور ریشم کیڑے سے پیدا کی۔ بندوں کے لئے پیدا کرنے سے مراد ہے۔ بندوں کے فائدے اور آرائش کے لئے پیدا کرنا۔

وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ (اور لذیذ چیزیں کھانے پینے کی پیدا کیں)۔

یعنی اللہ جو ان سب کا خالق اور مالک ہے اس نے تو ان چیزوں کو حرام نہیں قرار دیا، پھر اور کون ان کو حرام و حلال بنا سکتا ہے۔ پس کیا وجہ کہ کافر مشرک دوران طواف میں کپڑے پہنے رہنا اور ایام حج میں گوشت اور چربی کھانا اور سوائب وغیرہ کو کام میں لانا حرام قرار دیتے ہیں۔ اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اگر اللہ نے حرام نہ قرار دیا ہو تو ہر چیز (اصل تخلیق کے لحاظ سے) حلال ہے (اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اصل اشیاء میں حلت ہے)۔

قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ (آپ کہہ دیجئے کہ یہ چیزیں اس طور پر کہ قیامت کے دن بھی خالص رہیں دنیوی زندگی میں خاص اہل ایمان کے لئے ہیں) یعنی یہ لباس آرائش اور پاک لذیذ کھانے پینے کی چیزیں دنیا میں اہل ایمان کے لئے پیدا کی گئی ہیں کہ وہ ان سے فائدہ اندوز ہوں اور ان کو استعمال کر کے اللہ کی عبادت کے لئے جسمانی طاقت حاصل کریں اور اللہ کا شکر ادا کریں۔ براہ راست کافروں کے لئے ان کو نہیں پیدا کیا گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ کافروں کو ان نعمتوں میں اللہ نے بطور آزمائش شریک بنا دیا ہے تاکہ ان کو ڈھیل ملتی رہے۔

خالصۃ سے یہ مراد ہے کہ قیامت کے دن یہ نعمتیں ہر کدورت و آلائش (خوف انقطاع) اور غم سے پاک صاف ہوں گی۔ دنیا میں ضرور یہ کدورت آمیز اور غم آگیں ہیں یا خالصۃ کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن یہ صرف اہل ایمان کو ملیں گی

۱؎ حسن کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے آخری بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے ان کے پاس گوشت رکھا ہوا تھا، پوچھا یہ گوشت کیسا ہے عبداللہؓ نے جواب دیا یہ گوشت ہے جو مجھے پسند ہے، فرمایا جس کو تیرا دل چاہے گا (کیا) اس کو کھا لے گا۔ آدمی کی یہ بڑی قید ہے کہ جس چیز کو دل چاہے اس کو کھالے۔

۲؎ حضرت عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا پیٹ بھر کر کھانے پینے سے پرہیز رکھو، یہ جسم کا بگاڑ ہے، بیماری پیدا کرتا ہے، نماز میں سستی کا ذریعہ ہے۔ کھانے پینے میں کمی کا التزام کرو یہ جسمانی تندرستی کا ذریعہ ہے اور اسراف سے بہت دور رکھنے والا ہے۔ اللہ موٹے جسم کو پسند نہیں کرتا، آدمی جب تک اپنے دین پر خواہش کو ترجیح نہیں دے گا تباہ نہیں ہوگا۔

کافر محروم رہیں گے (اگرچہ دنیا میں دونوں مشترک ہیں)۔

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾ (ہم اسی طرح تمام آیات کو سمجھ داروں کے لئے صاف صاف بیان کرتے ہیں) جس طرح ہم نے حرام کو حلال سے جدا کر دیا۔ حلال کو اختیار کرنے کی اور حرام سے بچنے کی ہدایت کر دی، اسی طرح ہم تفصیل احکام ان لوگوں کے لئے کرتے ہیں جو اللہ کو وحدہٗ لاشریک جانتے ہیں۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ ((اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیجئے کہ البتہ میرے رب نے حرام کیا ہے تمام بے حیائی کی باتوں کو ان میں جو علانیہ ہیں ان کو بھی اور جو پوشیدہ ہیں ان کو بھی اور ہر گناہ کی بات کو، ناحق کسی پر ظلم کرنے کو بھی اور اس بات کو بھی کہ اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک بناؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نہیں نازل کی اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ذمہ کوئی ایسی بات لگا دو جس کی کوئی سند نہ ہو)۔

اَلْفَوَاحِشَ یعنی وہ باتیں جن کے اندر برائی بہت زیادہ ہے۔ ظاہر فواحش جیسے مردوں کا برہنہ ہو کر دن میں طواف کرنا۔ پوشیدہ فواحش جیسے عورتوں کا برہنہ ہو کر رات میں طواف کرنا۔ بعض لوگوں نے کہا چھپ کر اور علانیہ زنا کرنا مراد ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی مرفوع روایت ہے اللہ سے زیادہ کوئی غیرتمند نہیں، اسی لئے اس نے تمام چھپی کھلی بے حیائیوں کو حرام کر دیا ہے اور اللہ سے زیادہ کوئی اپنی تعریف کو پسند کرنے والا بھی نہیں ہے اسی لئے خود اس نے اپنی تعریف کی ہے۔

اَلْاِثْمَ سے موجب اثم مراد ہے یعنی گناہ اور اللہ کی نافرمانی۔ یہ لفظ عام ہے خواہش بھی اس میں داخل ہیں۔ خاص کے بعد (حکم کی ہمہ گیری ظاہر کرنے کے لئے) عام کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ ضحاک نے کہا اثم سے مراد ہے وہ گناہ جس کی کوئی سزا مقرر نہیں۔ حسن نے کہا اثم شراب ہے۔ ایک شاعر کا قول ہے میں نے اثم کو اتنا پیا کہ میری عقل غائب ہو گئی۔ اثم سے عقل جاتی ہی رہتی ہے۔

اَلْبَغْيَ سے مراد ہے ظلم یا غرور یا عادل بادشاہ کے خلاف بغاوت۔ بِغَيْرِ الْحَقِّ کا تعلق اَلْبَغْيَ سے ہے اس سے مفہوم بغی کی معنوی تاکید ہو رہی ہے۔ اَنْ تُشْرِكُوْا میں اَنْ مصدری ہے شریک قرار دینا۔

سُلْطٰنًا دلیل۔ اس لفظ سے مشرکوں کا مذاق اڑایا گیا ہے اور اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بے دلیل بات کا اتباع حرام ہے۔ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ یعنی کھیتی یا جانوروں کی (خود ساختہ) حرمت کو اللہ کے ذمہ باندھنا اور برہنہ طواف کو اللہ کا حکم قرار دینا۔ مقاتل نے کہا دین میں بغیر یقین کے کوئی بات کہنے کی اس لفظ نے عمومی تحریم کر دی۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ (اور ہر گروہ کے لئے ایک میعاد معین ہے)۔ یعنی کافروں کے ہر گروہ پر عذاب نازل ہونے کا اللہ کے علم میں ایک مقرر وقت اور معین مدت ہے۔ یہ اہل مکہ کو عذاب کی دھمکی ہے۔

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۴﴾ (سو جس وقت ان کی میعاد معین آجائے گی تو ذرا سی دیر نہ پیچھے ہٹ سکیں گے نہ آگے بڑھ سکیں گے)۔

یعنی قلیل ترین وقت کی بھی ان کو مہلت نہیں دی جائے گی، خواہ وہ مہلت کے طالب ہوں اور نہ وقت سے پہلے ان پر عذاب آئے گا خواہ وہ نزول عذاب کے خواستگار ہوں جیسے کافروں نے کہا تھا اے اللہ اگر یہ تیری جانب سے ہی حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی اور دکھ کا عذاب ہم پر نازل کر دے[1]۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

---

[1] سعید بن مسیب کا بیان ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے نیزہ مارا گیا اور آپ زخمی ہو گئے تو حضرت کعبؓ نے کہا اگر حضرت عمرؓ اللہ سے اپنی زندگی کے لئے دعا کریں تو اللہ دعا رد نہیں کرے گا اور آپ کا آیا ہوا وقت ٹال دے گا۔ کعب سے کہا گیا کیا اللہ نے یہ نہیں فرمایا (بقیہ اگلے صفحے پر)

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ (اے اولاد آدم جب تمہارے پاس (میرے) پیغمبر آئیں گے جو تم میں سے ہوں گے (اور) تم سے میرے احکام بیان کرینگے سو جو لوگ پرہیز رکھیں گے اور درستی کرینگے انکو کچھ اندیشہ نہ ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے)۔

اما میں ما زائد ہے جس کو تاکید شرط کے لئے زیادہ کیا گیا۔ لفظ ان جو شک کے لئے آتا ہے (باوجود یہ کہ پیغمبروں کا آنا یقینی تھا) اس لئے استعمال کیا گیا کہ پیغمبروں کو بھیجنا اللہ کے ذمہ واجب نہیں۔ اللہ پر کوئی چیز بھی واجب نہیں (کسی کا اس پر کوئی لازمی واجب الاداء حق نہیں جب ہوش و حواس عقل و فہم اور تمام علمی و عملی طاقتیں عطا فرما دیں اور انفسی، آفاقی، داخلی اور خارجی دلیلیں قائم کر دیں تو سوچ سمجھ کر افکار و اعمال کی درستی سب پر واجب ہو گئی۔ ہدایت نامے اور انبیاء کی بعثت ضروری نہیں رہی مگر اللہ نے اپنی مہربانی سے کتابیں اور پیغمبر بھیجے)۔

منکم یعنی آدمیوں میں سے۔ ایاتی یعنی اللہ کی کتابوں کی آیات۔ فمن اتقی یعنی جو شخص شرک اور تکذیب انبیاء سے بچتا رہا۔ واصلح یعنی اس نے اپنے اعمال کو درست کر لیا اور اللہ کے حکم کے مطابق خالص اللہ ہی کی خوشنودی کے لئے کام کئے۔ فلا خوف یعنی قبر میں اور قیامت کے دن جب دوسرے لوگوں کو خوف ہوگا، ان کو کوئی خوف نہ ہوگا۔ ولا ہم یحزنون یعنی جب دوزخ کے اندر دوسرے لوگ حزن میں مبتلا ہونگے (اور گزشتہ زندگی تباہ کرنے کا ان کو غم ہوگا) ان کو کوئی غم نہ ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾

(اور جو لوگ ہمارے احکام کی تکذیب کریں گے اور ان سے تکبر کریں گے وہ دوزخی ہوں گے اور دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے)۔ تکبر کریں گے یعنی ایمان لانے سے غرور کریں گے۔ فلا خوف میں فاء کو ذکر کرنا اور اولئک کو بغیر فاء کے لانا (باوجود یہ کہ دونوں جزاء شرط ہیں) وعدہ ثواب کی قوت اور وعید عذاب کی سکی کو ظاہر کر رہا ہے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ (پس اس سے زیادہ ظالم کون جو اللہ پر دروغ بندی کرتا ہے یا اللہ کی آیات کو جھوٹا قرار دیتا ہے) یعنی اللہ کے لئے شریک اور بیوی بچے قرار دیتا ہے اور سانڈھ اور دوسرے بتوں کے ناموں پر چھوڑے ہوئے جانوروں کی حرمت کا قائل ہے اور برہنہ طواف کرنے کو ضروری کہتا ہے (اور ان احکام کی نسبت اللہ کی طرف کرتا ہے) آیت کے عموم میں وہ رافضی بھی داخل ہیں جو اللہ پر اور اللہ کے پیغمبروں پر دروغ بندی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ نے تو قرآن میں کچھ آیات اور بھی اتاری تھیں مگر صحابہؓ نے ان کو قرآن سے ساقط کر دیا۔

اوکذب بایتہ میں حرف او تردید کے لئے ہے لیکن یہ تردید جمع کی نہیں بلکہ خلو کی ہے (یعنی یہ دونوں باتیں ساتھ ساتھ ہو سکتی ہیں کہ ایک شخص اللہ پر دروغ بندی بھی کرے اور جو احکام اللہ کے نہیں ہیں ان کی نسبت اللہ کی طرف کر دے اور واقعی جو اللہ کے احکام ہیں ان کو نہ مانے۔ ہاں اظلم ہونے کے لئے ان دونوں باتوں میں سے کسی ایک کا ہونا لازم ہے یعنی جو ایک کام کرے یا دوسرا وہ ضرور اظلم ہوگا۔

اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ (دنیا میں) ان کے نصیب کا جو کچھ ہے ان کو مل جائے گا یہاں تک کہ جب ان

(بقیہ پچھلے صفحے کا) ہے کہ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۔ آیا ہوا وقت موت آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ حضرت کعبؓ نے فرمایا اللہ نے یہ بھی تو فرمایا ہے وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ جس کسی کی عمر زیادہ ہو یا عمر میں کمی کر دی جائے سب کا اندراج لوح محفوظ میں ہوتا ہے اللہ جس کو چاہتا ہے پیچھے کر دیتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) کم کر دیتا ہے پھر جب معین وقت آجاتا ہے تو آگے پیچھے نہیں ہوتا۔ ابوملیکہ کی روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ نیزہ سے زخمی ہو گئے تو کعب آکر رونے لگے اور بولے کاش امیر المومنین اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے قسم کھا لیتے کہ اللہ ان کا آیا ہوا وقت ٹال دے گا تو اللہ ضرور ایسا کر دیتا (آپ کی قسم کو اللہ جھوٹا نہ ہونے دیتا) ابن عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے جا کر کہہ دیا کہ کعبؓ نے ایسی بات کہی ہے امیر المومنین نے فرمایا اس صورت میں تو بخدا میں اللہ سے (تاخیر اجل کی) دعا نہیں کروں گا۔

کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے آئیں گے (اور) ان کی جانیں قبض کریں گے تو پوچھیں گے وہ کہاں گئے جن کی پوجا تم اللہ کے علاوہ کرتے تھے)۔ فرشتوں کی طرف سے استفہام بطور سرزنش ہوگا یعنی وہ بت وغیرہ کہاں گئے جن کو تم پوجتے تھے۔

قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ﴿٣٧﴾ (وہ جواب دیں گے (آج) وہ سب غائب ہوگئے اور (معائنہ عذاب کے وقت) وہ خود اپنے کافر ہونے کا اعتراف کریں گے)۔

قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ فِي النَّارِ ۖ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَعَنَتْ أُخْتَهَا ۖ

((قیامت کے دن اللہ یا موت کے وقت فرشتہ) کہے گا تم سے پہلے جن وانس کے جو فرقے گزر چکے ہیں ان کے ساتھ شامل ہو کر تم بھی دوزخ میں چلے جاؤ جس وقت بھی (دوزخ میں) کوئی جماعت داخل ہوگی وہ اپنی جیسی دوسری جماعت پر لعنت کرے گی یعنی اس جماعت پر لعنت کرے گی جو اسی کی طرح گمراہ ہوگی اور جس کی پیروی کی وجہ سے یہ گمراہ ہوئی ہوگی۔ یہود عیسائیوں پر اور عیسائی یہودیوں پر اور تمام گمراہ پیرو گمراہ کرنے والے لیڈروں پر لعنت کریں گے۔

حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَآتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِنَ النَّارِ ۖ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِنْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٨﴾ (یہاں تک کہ جب دوزخ کے اندر (پچھلی اور پہلی) سب جماعتیں جمع ہو جائیں گی تو پچھلی جماعت پہلی جماعت کے متعلق کہے گی، اے ہمارے مالک انہوں نے ہم کو گمراہ کیا ان کو دوزخ کا دوگنا عذاب دے (گمراہ ہونے کا اور گمراہ کرنے کا) اللہ فرمائے گا تم میں سے ہر ایک کے لئے دوگنا عذاب ہے، لیکن تم (ابھی) واقف نہیں۔ یعنی جتنا بظاہر دوسروں کو عذاب نظر آرہا ہے حقیقت میں اس سے دوگنا ہے۔ ہر عذاب کی ایک ظاہری شکل و مقدار ہوگی جو دوسروں کو دکھائی دے گی ایک باطنی کیفیت و مقدار ہوگی جو دوسروں کو نہیں دکھائی دے گی اور نہ دیکھنے کی وجہ سے خیال کیا جائے گا کہ اندرونی طور پر اس پر عذاب نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ گمراہی کا تقاضا جس عذاب کا ہے اس سے دوگنا عذاب ہر فریق پر ہوگا۔ رہنماؤں پر ایک عذاب تو ان کے کفر کا ہوگا اور دوسرا عذاب گمراہ کرنے کا اور رہنماؤں کے متبعین پر ایک عذاب اپنے کفر کا ہوگا اور دوسرا اہل حق کو چھوڑ کر اہل باطل کی تقلید کرنے کا۔

وَقَالَتْ أُولَاهُمْ لِأُخْرَاهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٣٩﴾ ع ۸

(اور پہلی جماعت پچھلی جماعت سے کہے گی اب تم کو ہم پر کوئی برتری نہیں لہٰذا اپنے کیے کا مزہ چکھو)۔ پہلی جماعت اپنے کلام کو اللہ کے کلام پر مرتب کرتے ہوئے کہے گی اللہ کے کلام سے ثابت ہوگیا کہ تم کو ہم پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ سب استحقاق عذاب میں برابر ہیں لہٰذا اپنے کیے کی سزا بھگتو۔ فَذُوقُوا الْعَذَابَ رہنماؤں کے کلام کا جز ہے یا اللہ کا وہ کلام ہے، جو دونوں فریقوں سے ان کی باہمی گفتگو کے بعد اللہ فرمائے گا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ (جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان پر ایمان لانے سے سرتابی کی ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے)۔ یعنی ان کے اعمال اور روحوں کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ان کی روحوں کے لئے نہیں کھولے جائیں گے کیونکہ ان کی روحیں گندی ہوں گی ان کو اوپر نہیں چڑھایا جائے گا بلکہ نیچے سجین میں پھینک دیا جائے گا۔

امام مالکؒ، نسائی اور بیہقیؒ نے حضرت براء بن عازب کی روایت سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس میں کافر بندے کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سیاہ رو ملائکہ کافر کی روح قبض کرنے کے بعد ٹاٹ میں لپیٹ دیتے ہیں، اس سے بدترین مردار کی ایسی بدبو نکلتی ہے پھر اس کو لے کر اوپر چڑھتے ہیں اور ملائکہ کے جس گروہ کی طرف سے ان کا گزر ہوتا ہے تو وہ پوچھتے ہیں یہ گندی روح کون ہے روح کے قابض ملائکہ اس مردہ کا بدترین دنیوی نام لے کر کہتے ہیں فلاں بن فلاں کی ہے۔ آخر

ساتویں آسمان تک اس کو لے جایا جاتا ہے اور دروازہ کھلوانے کی درخواست کی جاتی ہے لیکن دروازہ نہیں کھولا جاتا۔ پھر حضور ﷺ نے آیت لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ تلاوت فرمائی۔ پھر اللہ فرماتا ہے اس کی کتاب نچلی زمین کے قید خانہ (سجین) میں درج کرلو۔ حسب الحکم اس روح کو سجین میں) پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے آیت وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ تلاوت فرمائی۔ ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث نقل کی ہے۔

حتی یلج الجمل یعنی اونٹ کی برابر کوئی چیز سوئی کے سوراخ میں داخل ہو جائے اور ایسا ہونا تو کبھی ممکن نہیں لہٰذا ان کا جنت میں داخلہ بھی کبھی ممکن نہیں۔

وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ۝۴۰ لَهُم مِّن جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِن فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ۝۴۱

اور اسی (سخت سزا اور رحمت سے محرومی) کی طرح ہم مجرموں کو سزا دیں گے ان کا بچھونا اوڑھنا جہنم کا ہوگا اور ایسی ہی ہم ظالموں کو سزا دیں گے) مہاد بستر۔ غَوَاش (عاشیہ کی جمع ہے) اوڑھنے کی چیز۔ یعنی آگ ان کو ہر طرف سے محیط ہوگی۔ دوسری آیت میں بھی اسی مضمون کو ادا کیا گیا ہے فرمایا ہے مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ۔ جنت سے محرومی کے ساتھ مجرمین کا لفظ اور عذاب نار کے ساتھ ظالمین کا لفظ ذکر کیا اس سے اس بات پر تنبیہ ہو گئی کہ ظلم کا درجہ جرم سے بڑا ہے۔

اس سے آگے حسب اسلوب قرآنی اہل ایمان کے ثواب کا ذکر کیا اور فرمایا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝۴۲

(اور جو ایمان لائے اور نیک کام کئے ایسے ہی لوگ جنتی ہیں جنت کے اندر وہ ہمیشہ رہیں گے ہم کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ مکلف نہیں کرتے)۔ الصلحت جمع ہے اور جب جمع کے صیغے پر الف لام آجائے تو صیغہ استغراق بن جاتا ہے، اس لئے عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کے کہنے سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ جنت کا وعدہ انہی مؤمنوں سے کیا گیا ہے جنہوں نے تمام زندگی نیکیاں کی ہوں کبھی گناہ نہ کیا ہو یا تمام نیکیاں کی ہوں کوئی نیکی نہ چھوڑی ہو۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے درمیان میں لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا بطور جملہ معترضہ فرمادیا (ہم نے اس جملہ کا ترجمہ جملہ کاملہ کے ترجمہ کے بعد اردو زبان کی رعایت سے کیا ہے) وسع سے مراد طاقت، بغیر تنگی اور دشواری کے برداشت۔

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ (اور جو خلش ان کے دلوں میں باہم تھی ہم اس کو نکال دیں گے)۔

نزعنا بصیغۂ ماضی یعنی ہم ضرور نکال دیں گے۔ غل وہ حسد اور دشمنی جو ان کے آپس میں دنیا میں تھی۔ یہاں تک کہ ان کے آپس میں دوستی ہی دوستی اور محبت ہی رہ جائے گی۔ اگر اللہ ایک کو کسی خصوصی نعمت سے سرفراز فرمائے گا اور دوسرے کو وہ چیز نہیں عطا کی گئی ہوگی تو اس کو اپنے بھائی سے حسد نہ ہوگا۔ (گویا جذبۂ حسد ہی ختم ہو جائے گا) سعید بن منصور، ابو نعیم ابن ابی شیبہ، طبرانی اور ابن مردویہ نے بیان کیا کہ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ مجھے امید ہے کہ میں اور عثمانؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ انہی لوگوں میں سے ہوں گے (یعنی وہ خلش جو دنیا میں باہم ہمارے دلوں میں تھی وہ آخرت میں دور ہو جائے گی اور دل صاف ہو جائیں گے)

میں کہتا ہوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یہ اس لئے فرمایا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے فتنہ میں ان بزرگوں کے درمیان کچھ غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔

بخاری اور اسماعیلی نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ کی تشریح میں فرمایا مؤمنوں کو دوزخ سے الگ کرلیا جائے گا پھر دوزخ اور جنت کے درمیانی پل پر روک لیا جائے گا اور بعض کے حقوق بعض سے دلوائے جائیں گے یہاں تک کہ جب سب صاف ستھرے ہو جائیں گے تو ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی

جان ہے دنیا میں ان کو جتنا اپنے گھر کا راستہ معلوم تھا اس سے زیادہ وہ اپنے جنتی مکان کے راستہ سے واقف ہوں گے۔ راوی حدیث قتادہؒ نے کہا ان کی حالت ان لوگوں کے مشابہ ہوگی جو جمعہ کی نماز پڑھ کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں (اور کوئی اپنے گھر کو یا گھر کے راستہ کو نہیں بھولتا)۔

ابن ابی حاتم نے حسن بصری کا قول نقل کیا ہے مجھے اطلاع ملی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صراط سے گزرنے کے بعد اہل جنت کو روک لیا جائے گا یہاں تک کہ جو حقوق ایک کے دوسرے پر ہوں گے وہ دلوائے جائیں گے پھر جنت کے اندر اس حالت میں بھیجا جائے گا کہ آپس میں ان کے دلوں میں کوئی خلش باقی نہ ہوگی۔ قرطبی نے لکھا ہے یہ ان لوگوں کے لئے ہوگا جن کو دوزخ میں داخل ہی نہیں کیا گیا ہوگا باقی جو لوگ دوزخ میں داخل ہونے کے بعد پھر رہائی پا کر آئیں گے ان کا (باہم صراط پر یا صراط کے بعد) کوئی محاسبہ نہ ہوگا بلکہ جب دوزخ سے نکلیں گے فوراً ان کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ ابن حجر نے لکھا ہے کہ (حضرت ابو سعیدؓ کی روایت کردہ حدیث میں جو آیا ہے) مؤمنوں کو دوزخ سے الگ کر لیا جائے گا اس سے مراد یہ ہے کہ دوزخ سے محفوظ رکھا جائے گا اور دوزخ میں گرنے کے بغیر وہ صراط سے گزر جائیں گے۔ حدیث میں جو لفظ قَنْطَرَہ (پل) آیا ہے اس سے مراد بعض کے نزدیک صراط کا وہ کنارہ ہے جو جنت پر ہے۔ بعض کے نزدیک یہ پل صراط سے الگ ہے۔ قرطبی نے اسی کو اختیار کیا ہے اور سیوطیؒ نے اول کو۔

میں ہوں وہاں دینار و درہم تو موجود نہ ہوگا آپس کا بدلہ نیکیوں اور بدیوں کے لین دین کی شکل میں ہوگا اگر ظالم کا کوئی نیک عمل ہوگا تو مظلوم کے حق کے بقدر وہ مظلوم کو دلوا دیا جائے گا اگر ظالم کی کوئی نیکی نہ ہوگی تو مظلوم کے گناہ بقدر حق ظالم پر ڈال دیئے جائیں گے۔ بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اسی طرح نقل کیا ہے۔ مسلم اور ترمذی کی روایت میں حدیث کے الفاظ اس طرح آئے ہیں حقوق کا پورا بدلہ لینے سے پہلے ہی اگر اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو مظلوم کے کچھ گناہ لے کر ظالم پر ڈالے جائیں گے۔ پھر اس کو دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ اور دوزخ میں پھینکا جانا پل صراط سے عبور کامل کے بعد ممکن نہیں (اس لئے قَنْطَرَہ سے مراد پل صراط کے علاوہ کوئی دوسرا پل ہے)۔

تنبیہ

سینوں سے خلش کو دور کر دینا آپس میں بدلہ دلوانے پر ہی محدود نہ ہوگا بلکہ بقول بغوی اس کے بغیر بھی ہو سکے گا۔ سدی نے اس آیت کی تشریح میں بیان کیا کہ اہل جنت جب جنت کی طرف بڑھیں گے تو جنت کے دروازہ کے پاس ان کو ایک درخت ملے گا جس کی جڑ میں دو چشمے ہوں گے وہ جب ایک چشمہ کا پانی پئیں گے تو دلوں کے اندر جو باہمی خلش ہوگی وہ نکل جائے گی یہی شراب طہور ہوگی اور دوسرے چشمہ سے غسل کریں گے تو ان پر نَضْرَةَ النَّعِيم (رونق عیش) آجائے گی اس کے بعد کبھی نہ وہ خشک رو پراگندہ مو ہوں گے نہ کبھی چہرہ کا رنگ بگڑے گا۔

تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهٰرُ ((جنت میں داخل ہونے کے بعد) ان کے (گھروں کے) نیچے نہریں بہتی ہوں گی) یہ جملہ حالیہ ہے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدٰنَا لِهٰذَا ۟ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ (اور وہ کہیں گے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہم کو یہاں تک پہنچایا اور ہم کبھی بھی یہاں تک نہ پہنچتے اگر اللہ ہم کو نہ پہنچاتا بے شک ہمارے رب کے پیغمبر سچی باتیں لے کر آئے تھے۔ هَدٰنَا لِهٰذَا یعنی اس نے ہم کو جنت تک پہنچایا یا سفیان ثوری نے کہا ایسے عمل کی اس نے ہدایت کی جس کا یہ ثواب ہے۔ لِنَهْتَدِيَ میں لام جحود ہے جو ما بعد کی نفی کو مؤکد کرنے کیلئے لایا گیا ہے اور اَن ناصبہ مصدریہ محذوف ہے۔ جیسے مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ میں ہے۔ لَوْلَا کی جزا محذوف ہے جس پر کلام سابق دلالت کر رہا ہے یعنی اگر اللہ نے ہم کو ہدایت نہ کی ہوتی تو ہم ہرگز ہدایت یاب نہ ہوتے۔ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا

بِالْحَقِّ یعنی اللہ کے پیغمبر برحق آئے تھے اور حق پیام لائے تھے انہی کی رہنمائی سے ہم ہدایت یاب ہوئے۔ پیغمبروں کے دیئے ہوئے وعدہ کے مطابق اپنی آنکھوں سے ثواب کا معائینہ کرنے کے بعد خوش ہو کر اہل جنت یہ بات کہیں گے۔

وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ (اور ان سے پکار کر کہا جائے گا کہ جنت تم کو تمہارے اعمال کے بدلہ میں دی گئی ہے۔ یعنی اہل جنت کو ندا دی جائے گی۔ کہاں سے اور کس وقت ندا دی جائے گی اس کے متعلق علماء کے دو قول ہیں۔

(۱)...... جب اہل جنت دور سے جنت کو دیکھیں گے تو اس وقت یہ ندا دی جائے گی، (۲)...... جنت کے اندر ندا دی جائے گی۔ سیوطیؒ نے بدور سافرہ میں اسی قول کو پسند کیا ہے۔ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یعنی تمہارے اعمال کے سبب سے یہ جنت تم کو عطا کر دی گئی۔ صاحب مدارک نے لکھا ہے کہ عطاء جنت کو لفظ میراث سے تعبیر کرنا بتا رہا ہے کہ جس طرح میراث بغیر کسی معاوضہ کے مفت وارث کو ملتی ہے اسی طرح جنت بھی محض اللہ کے فضل سے بغیر عملی استحقاق کے دی جائے گی (اگرچہ ظاہر میں اعمال عطاء جنت کا سبب ہوں گے مگر حقیقت میں محض اللہ کی مہربانی پر اس کا مدار ہو گا)۔

مسلم نے حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک منادی پکارے گا آئندہ تمہارے لئے تندرست رہنا ہے کبھی بیمار نہ ہو گے۔ تمہیں زندہ رہنا ہے کبھی نہیں مرو گے۔ تمہارے لئے جوان رہنا ہے کبھی بوڑھے نہ ہو گے۔ تمہارے لئے سکھ میں رہنا ہے کبھی دکھ نہیں پاؤ گے۔ یہی مطلب ہے اللہ کے فرمان کا وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ ابن ماجہ اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے دو گھر ہیں ایک گھر جنت میں ایک گھر دوزخ میں اگر مر کر دوزخ میں چلا جاتا ہے تو اہل جنت اس کے (جنتی) گھر کے وارث ہو جاتے ہیں یہی معنی ہے آیت اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ کا۔

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ (اور جنت والے دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے کہ ہمارے رب نے ہم سے جس ثواب کا وعدہ کیا تھا ہم نے تو اس کو واقعی پا لیا تو کیا تمہارے رب نے جس عذاب کی تم کو وعید دی تھی تم نے بھی اس کو واقعی پا لیا دوزخی کہیں گے ہاں)۔ مَا وَعَدَنَا سے مراد ہے ثواب اور مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ سے مراد ہے عذاب اہل جنت دوزخ والوں سے مذکورہ بالا سوال صرف اپنی مسرت کو ظاہر کرنے اور دوزخیوں کو جلانے کے لئے کریں گے۔ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ میں وَعَدَ کا مفعول یعنی کُم محذوف ہے۔

فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ (پھر ایک پکارنے والا دونوں کے درمیان پکارے گا کہ اللہ کی پھٹکار ہو ان بے جا حرکتیں کرنے والوں پر جو اللہ کی راہ سے روگرداں تھے (اور دوسروں کو روکتے تھے) اور اس میں کجی تلاش کرتے رہتے تھے اور وہ آخرت ہی کے منکر تھے)۔

يَصُدُّوْنَ (لازم بھی ہے (اعراض کرتے تھے (اور متعدی بھی) دوسروں کو روکتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا کی تشریح میں فرمایا اللہ کے سوا دوسروں کے (دکھانے کے) لئے نماز پڑھتے تھے اور جس کی تعظیم کا حکم اللہ نے نہیں دیا اس کی تعظیم کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں يَصُدُّوْنَ سے پہلے كَانُوْا محذوف ہے (اور ماضی بعید کا صیغہ ہے) کیونکہ وہ دنیا میں ایسا کرتے تھے قیامت کے دن ایسا نہیں کریں گے۔ عِوَج بکسر عین عام ہے کسی طرح کی کجی ہو معانی میں ہو یا ان خارجی موجودات میں جو کھڑے نہ ہوں جیسے دین میں کجی، زمین کجی لیکن بفتح عین صرف ان خارجی چیزوں کی کجی کو کہتے ہیں جو کھڑی ہوں جیسے دیوار یا نیزہ کی کجی۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ (اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہوگی اور اعراف کے اوپر بہت سے آدمی ہونگے وہ لوگ (اہل جنت اور اہل جہنم میں سے) ہر فریق کو علامات سے پہچان لیں گے)۔

بَيْنَهُمَا یعنی جنت و دوزخ یا اہل جنت و اہل جہنم کے درمیان حجاب یعنی وہ آڑ اور دیوار جس کا ذکر سورہ حدید کی آیت فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ میں آیا ہے اور وہاں ہم نے اس کی تشریح کر دی ہے۔ اَلْاَعْرَاف، عرف کی جمع ہے یعنی حجاب کی چوٹیاں یہ لفظ عرف الفرس (گھوڑے کے ایال) یا عرف الدیک (مرغ کی کلغی) سے ماخوذ ہے۔ بعض علماء نے کہا عرف کسی چیز کے بالائی حصہ کو کہتے ہیں کیونکہ (معرفت اور عرفان کا معنی ہے پہچاننا اور) کسی چیز کی چوٹی سب سے نمایاں اور قابل شناخت ہوتی ہے۔

اعراف پر کون لوگ ہوں گے، علماء کے اقوال اس کے متعلق مختلف ہیں۔ ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی۔ نیکیاں جہنم میں جانے سے روکیں گی لیکن اتنی بھی نہیں ہوں گی کہ جنت میں لے جائیں۔ ابن جریر اور بیہقی نے بطریق طلحہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعراف جنت اور دوزخ کے درمیان دیوار ہو گی۔ اعراف والے وہ لوگ ہوں گے جن کے بڑے بڑے گناہ ہوں گے جن کی وجہ سے اللہ ان کو اعراف پر روک دے گا چہروں کی سیاہی سے وہ دوزخیوں کو اور سفیدی سے جنتیوں کو پہچان لیں گے۔ اہل جنت کو دیکھ کر جنت میں پہنچ جانے کی ان کو طمع ہو گی لیکن دوزخ کو دیکھیں گے تو اس سے پناہ مانگیں گے۔ آخر اللہ ان کو جنت میں داخل فرما دے گا۔ یہی مراد ہیں آیت اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ۚ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ میں۔

ہناد، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے اپنی تفسیروں میں عبداللہ بن حارث کی وساطت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اعراف جنت و دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہو گی اور اصحاب اعراف وہ لوگ ہوں گے جن کو اللہ وہاں روک دے گا، پھر جب اللہ ان کو معاف کرنا چاہے گا تو سب سے پہلے ان کو ایک نہر کی طرف لے جائے گا جس کا نام نہر حیات ہو گا جس کے دونوں کنارے سونے کے موتیوں سے جڑے ہوئے ہوں گے اور اس کی مٹی مشک کی ہو گی اس نہر میں اصحاب اعراف کو ڈالا جائے گا (نہاتے ہی) ان کے رنگ درست ہو جائیں گے اور سینے پر ایک سفید چمکدار تل نمودار ہو جائے گا تو اللہ ان کو طلب فرما کر دریافت فرمائے گا کہ اب تمہاری کیا تمنا ہے جو چاہو مانگو۔ وہ لوگ اپنی تمنا ظاہر کریں گے جب ان کی ساری تمنائیں ختم ہو جائیں گی (اور کوئی تمنا کرنا باقی نہ رہے گی) تو اللہ فرمائے گا تم کو وہ چیزیں دی گئیں جن کی تم نے تمنا کی اور اتنی ہی اور بھی اور ستر ہزار گنا مزید۔ چنانچہ وہ جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے مگر ان کے سینوں پر ایک سفید تل چمکتا ہو گا اسی سے ان کی پہچان ہو گی، یہ لوگ مساکین اہل جنت (جنتیوں میں مسکین) کہلائیں گے۔

ابوالشیخ نے ابن منکدر کے طریقہ سے ایک مزنی شخص کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اعراف کے متعلق دریافت کیا گیا، فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو باپ کی اجازت کے بغیر جہاد کو گئے ہوں گے اور باپ کی نافرمانی کرنے کی حالت میں ہی جہاد میں شہید ہو گئے ہوں گے۔ چونکہ باپ کے نافرمان تھے اس لئے اس کو جنت سے روک دیا جائے گا لیکن راہ خدا میں شہید ہوئے تھے اس لئے دوزخ میں بھی نہیں بھیجا جائے گا۔

طبرانی نے ضعیف سند سے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اصحاب اعراف کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو باپ کی نافرمانی کی حالت میں راہ خدا میں مارے گئے ہوں گے شہادت ان کو دوزخ میں جانے سے روک دے گی اور باپ کی نافرمانی جنت میں نہیں جانے دے گی۔ ان کا گوشت اور چربی پگھل جائے گی یہاں تک کہ اللہ جب سب مخلوق کے حساب سے فارغ ہو جائے گا اور ان کے علاوہ اور کوئی باقی نہیں رہے گا تو اس کی رحمت ان کو بھی ڈھانک لے گی اور اپنی رحمت سے ان کو بھی جنت میں داخل فرمائے گا۔

طبرانی اور بیہقی نے نیز حارث بن اسامہ نے اپنی مسند میں اور سعید بن منصور، ابن جریر، ابن ابی حاتم ابن مردویہ اور ابوالشیخ نے اپنی تفسیروں میں حضرت عبدالرحمٰن مزنی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اصحاب اعراف کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا وہ ایسے لوگ ہوں گے جو راہ خدا میں مارے گئے ہوں گے۔ میں کہتا ہوں شاید ان شہداء سے مراد وہی شہداء ہیں جنہوں نے باپوں کی نافرمانی کی حالت میں جہاد کیا ہوگا۔ اس طرح مذکورہ بالا دونوں حدیثوں میں مطابقت ہو جائے گی۔ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ مذکورہ شہداء کا ذکر بطور تمثیل کیا گیا ہے یہ ان لوگوں کی جماعت کے کچھ افراد ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی۔ یہ مقصد نہیں ہے کہ اصحاب اعراف بس یہی لوگ ہوں گے دوسرے نہیں ہوں گے۔ اس کا ثبوت بعض ان احادیث سے ملتا ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے کہ اصحاب اعراف وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی۔ ابن ابی داؤد اور ابن جریر نے ابن عمر بن حزم بن جریر کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اصحاب اعراف کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا یہ وہ بندے ہوں گے جن کا فیصلہ سب سے آخر میں ہوگا جب رب العلمین تمام بندوں کے فیصلے سے فارغ ہو جائے گا تو ان سے فرمائے گا کہ تمہاری نیکیوں نے دوزخ سے تو تم کو نکال لیا (یعنی بچالیا) اور تم جنت میں بھی (نیکیوں کی کمی کی وجہ سے) نہیں جاسکے، اب تم آزاد ہو جنت میں جہاں چاہو سیر کرتے پھرو۔ سیوطیؒ نے کہا یہ روایت مرسل حسن ہے۔ ابن مردویہ اور ابوالشیخ نے دو طریقوں سے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ان لوگوں کا حکم پوچھا گیا جن کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی فرمایا یہی اصحاب اعراف ہوں گے جو جنت میں نہیں جاسکے ہوں گے مگر داخلۂ جنت کی طمع رکھتے ہوں گے۔

بیہقی نے حضرت حذیفہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ سب کو جمع کرے گا۔ اہل جنت کو جنت میں جانے کا اور دوزخیوں کو دوزخ کا حکم دے دیا جائے گا۔ پھر اصحاب اعراف سے فرمائے گا تم کو کس چیز کا انتظار ہے وہ عرض کریں گے ہم تیرے حکم کے منتظر ہیں۔ ارشاد ہوگا تمہاری نیکیوں نے دوزخ میں جانے سے تو تم کو بلاشبہ بچالیا (مگر) تمہارے جرائم جنت میں جانے سے بھی تمہارے لئے آڑ بن گئے اب جاؤ میری مغفرت اور رحمت سے (جنت میں) چلے جاؤ۔ سعید بن منصور، ابن جریر، ابوالشیخ، بیہقی، ہناد اور حذیفہ کا بیان ہے کہ اعراف والے وہ لوگ ہوں گے جن کی بدیاں جنت میں پہنچانے سے قاصر ہوں گی، اور نیکیاں دوزخ سے ان کو بچالیں گی، ایسے لوگوں کو ٹھہرالیا جائے گا یہاں تک کہ اللہ جب لوگوں کا فیصلہ کر چکے گا تو اچانک ان کو دیکھ کر فرمائے گا اٹھو تم بھی جنت میں چلے جاؤ میں نے تمہیں بخش دیا۔

عبدالرزاق نے حضرت حذیفہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اعراف والے وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی وہ جنت و دوزخ کی درمیانی دیوار پر فروکش ہوں گے اور جنت میں داخلہ کے آرزو مند (آخر) جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ بغوی نے اپنی سند سے بروایت سعید بن جبیر حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کا حساب ہوگا بدیوں سے جس کی ایک نیکی بھی زائد ہوگی وہ جنت میں چلا جائے گا اور جس کی بدیاں زائد ہوں گی وہ دوزخ میں پہنچ جائے گا اللہ نے فرمایا ہے فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ پھر فرمایا دانہ برابر وزن کی نیکیوں اور بدیوں سے بھی میزان میں ہلکا بھاری پن ہو جائے گا۔ پھر آپ نے فرمایا جس کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی وہ اعراف والے ہوں گے۔ صراط (کے آخری سرے) پر ان کو روک لیا جائے گا (جہاں سے) وہ اہل جنت اور اہل نار کو پہچان لیں گے۔ جب جنتیوں کو دیکھیں گے تو پکار کر کہیں گے سلام علیکم اور جب دوزخیوں کی طرف نظر پھیر کر دیکھیں گے تو کہیں گے اے ہمارے رب ہم کو ان ظالموں کے ساتھ نہ کر دینا نیکیوں والوں کو ایک نور عطا فرمایا جائے گا جو ان کے دائیں طرف اور سامنے کی جانب رواں ہوگا اس روز ہر بندہ کو نور دیا جائے گا جب لوگ پل صراط پر آئیں گے تو اللہ ہر منافق مرد و عورت کا نور سلب کرلے گا۔ منافقوں کی اس حالت کو دیکھ کر مؤمن عرض کریں گے اے ہمارے رب ہمارے نور کو کم نہ فرمانا۔ رہے اصحاب اعراف تو ان کے سامنے کا نور سلب نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ان کے گناہ ان کو چلنے سے روک دیں گے مگر

سامنے کا نور چونکہ سلب نہیں ہوگا اس لئے ان کے دل میں طمع باقی رہے گا۔ اسی کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے لَمْ یَدْخُلُوْهَا وَهُمْ یَطْمَعُوْنَ آخر ان کو بھی جنت میں داخل کر دیا جائے گا جنت کے اندر سب سے آخر میں داخل ہونے والے یہی ہوں گے۔

ہناد نے مجاہد کا قول بیان کیا ہے کہ اصحاب اعراف وہ لوگ ہوں گے جو نیکو کار فقہاء اور علماء ہوں گے اور اعراف جنت و دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہوگی شاید اس قول کی مراد یہ ہے کہ وہ مومن فقہاء اور علماء جنہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا ہوگا اور جن کی نیکیاں بدیاں برابر ہوں گی اچھے برے عمل مخلوط ہوں گے امید ہے کہ اللہ ان پر رحم فرمادے گا۔

بیہقی نے ابو مجلز کا قول نقل کیا ہے کہ اعراف ایک اونچی جگہ ہوگی جہاں ملائکہ فروکش ہوں گے اور وہاں سے اہل جنت اور اہل نار کو دیکھ کر ہر فریق کو اس کی علامات سے پہچان لیں گے۔ یہ قول غلط ہے کیونکہ اصحاب اعراف کو رجال (مرد) فرمایا اور ملائکہ مرد نہیں۔ علاوہ ازیں مذکورۂ بالا احادیث بھی اس قول کی تردید کر رہی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصحاب اعراف انبیاء یا شہداء ہوں گے جو اہل جنت و اہل نار کو دیکھ کر پہچان لیں گے۔ اس قول کی تردید بھی گزشتہ احادیث اور آئندہ آیات سے ہوتی ہے۔

بعض کے نزدیک مشرکوں کے بچے اہل اعراف ہوں گے یہ قول بھی غلط ہے۔ اللہ نے اصحاب اعراف کو رجال فرمایا ہے اور گزشتہ احادیث بھی اس قول کے خلاف ہیں۔

سیما یا سام ابلہ سے ماخوذ (اونٹوں کو چراگاہ میں نشان لگا کر چھوڑ دیا) یا وسم علی القلب سے ماخوذ ہے (دل پر نشان لگا دیا) اس آخری صورت میں مادہ مثال واوی (وسم) ہوگا جیسے جاہ، وجہ سے بنایا گیا ہے۔

وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ لَمْ یَدْخُلُوْهَا وَهُمْ یَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾

(اور اہل اعراف جنت والوں سے پکار کر کہیں گے تم پر سلامتی ہو (اس وقت تک وہ جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے مگر (داخلہ کے) آرزو مند ہونگے) حسن نے کہا اللہ ان کو امید دلائے گا کیونکہ ان پر کرم کرنا مقصود ہوگا (ورنہ کافروں کی امید تو منقطع ہی کر دے گا) لَمْ یَدْخُلُوْهَا الخ جملہ مستانفہ ہے ماقبل سے اس کا ترکیبی اختلاط نہیں ہے یا رجال کی صفت ہے یا نادوا کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ جو لوگ قائل ہیں کہ اصحاب اعراف انبیاء اور ملائکہ ہونگے ان کے نزدیک اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ سے حال ہوگا۔

وَاِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۷﴾ ۵ع۸/۱۲

(اور جب ان کی نگاہیں دوزخ والوں کی طرف موڑ دی جائیں گی تو وہ (اللہ کی پناہ مانگیں گے، رحمت کی درخواست کریں گے اور) کہیں گے اے ہمارے رب ہم کو ان ظالم لوگوں کے ساتھ شامل نہ کر دینا)۔ یعنی کافروں کے ساتھ دوزخی نہ بنا دینا۔

صرفت کا لفظ اشارہ کر رہا ہے کہ اصحاب اعراف کی نظروں کو دوزخیوں کی طرف پھیرنے والا کوئی اور ہوگا (یعنی خدا تعالیٰ) تاکہ وہ دوزخیوں کے حال کو دیکھیں اور پناہ مانگیں۔

رفتار کلام بتا رہی ہے کہ اعراف والے امید و بیم کی حالت میں ہوں گے۔ یہی ان کی نیکیوں اور بدیوں کے برابر ہونے کا تقاضا ہوگا اور یہ حالت انبیاء، شہداء اور صلحاء کی نہیں ہو سکتی ان کو تو اس روز نہ کوئی خوف ہوگا نہ رنج۔

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا یَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِیْمٰىهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

(اور اعراف والے کچھ لوگوں کو ان کی علامات سے پہچان کر پکار کر کہیں گے کہ (آج) تمہارے جتھے اور وہ چیزیں جن پر تم غرور کیا کرتے تھے تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے)۔ غرور کرنے سے مراد ہے حق کو حقیر سمجھ کر اعراض کرنا یا مخلوق کے مقابلہ میں غرور کرنا۔ اعراف والے جن لوگوں سے یہ کلام کریں گے وہ وہی کافر ہوں گے جو دنیا میں بڑے مانے جاتے تھے۔ جمع سے مراد ہے قوم برادری، اولاد اور مددگاروں کے جتھوں کی کثرت اور مال جمع کرنا۔ کلبی نے

کہ وہ دیوار اعراف پر سے پکاریں گے، اے ولید بن مغیرہ، اے ابو جہل بن ہشام، اے فلاں۔ اے فلاں پھر جنت کی طرف دیکھیں گے تو اس کے اندر وہ فقراء اور کمزور لوگ نظر آئیں گے جن سے کافر استہزاء کرتے تھے جیسے سلمان فارسیؓ، صہیب رومیؓ، بلال حبشیؓ، خبابؓ تو اس وقت دوزخی کافروں سے کہیں گے۔

اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ (کیا یہ وہی (کمزور حقیر) لوگ ہیں (جن کے متعلق) تم قسم کھا کر کہتے تھے کہ ان کو اللہ کی رحمت نہیں پہنچے گی اور وہ جنت میں داخل نہ ہوں گے) پھر اہل اعراف سے کہا جائے گا۔

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾ ((اب تم) جنت میں چلے جاؤ تمہارے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ تم رنجیدہ ہو گے)

میں کہتا ہوں ممکن ہے کہ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ الخ بھی اصحاب اعراف کے کلام کا تتمہ ہو یعنی اعراف والے کہیں گے کہ کیا یہ کمزور ضعیف لوگ وہی ہیں جن کے متعلق تم نے کہا تھا کہ اللہ کی رحمت ان کو نہیں مل سکتی حالانکہ ان کو تو (آج) حکم دے دیا گیا کہ جنت میں چلے جاؤ اور کوئی خوف و حزن نہ کرو۔

بغویؒ نے لکھا ہے کہ بعض علماء تفسیر نے ایک اور مطلب بیان کیا ہے وہ یہ کہ اصحاب اعراف جب اہل جہنم سے مذکورہ بالا بات کہیں گے تو وہ جواب دیں گے اگر وہ (ضعفاء) جنت میں چلے گئے تو تم کو کیا تم تو نہیں جا سکے اور نہ جا سکتے ہو۔ وہ قسم کھائیں گے کہ تم دوزخ میں ضرور آؤ گے یہ سن کر وہ ملائکہ جو اصحاب اعراف کو پل صراط پر روکے ہوئے ہوں گے اہل نار سے کہیں گے کیا یہ اصحاب اعراف وہی لوگ ہیں جن کے متعلق تم نے کہا تھا کہ ان کو اللہ کی رحمت نہیں ملے گی۔ پھر اصحاب اعراف کی طرف رخ کر کے کہیں گے جاؤ تم جنت میں بے خوف و رنج چلے جاؤ۔

بغویؒ نے عطاء کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اصحاب اعراف جب جنت میں چلے جائیں گے تو دوزخیوں کو بھی کچھ کشود کار کی طمع پیدا ہو جائے گی اور عرض کریں گے پروردگار ہمارے کچھ رشتہ دار جنت میں ہیں ہمیں اجازت مل جائے کہ ہم ان کو دیکھ لیں اور کچھ بات چیت کر لیں۔ چنانچہ (اجازت کے بعد) وہ اپنے جنتی قرابت داروں اور ان کی راحت و عیش کی حالت کو دیکھ لیں گے اور ان کو پہچان لیں گے مگر وہ ان دوزخیوں کے چہروں کی سیاہی کی وجہ سے ان کو نہیں پہچانیں گے۔

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ (اور دوزخ والے اہل جنت (کے نام لے کر ان) کو پکار کر (اپنی رشتہ داریاں بتا کر) کہیں گے کہ ہماری طرف کو بھی کچھ پانی بہا دو اور جو اللہ نے تم کو عطا فرمایا ہے ہم کو بھی اس میں سے کچھ دے دو) مَا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ سے مراد یا شربت ہے کیونکہ اَفِيْضُوْا (بہادو) کا لفظ اسی کو چاہتا ہے یا طعام جنت مراد ہے جیسے عربی محاورہ میں آتا ہے علفتها تبنا وماء ابارداً میں نے اونٹنی کو کھلایا بھوسہ اور ٹھنڈا پانی۔

قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (وہ کہیں گے اللہ نے قطعاً یہ دونوں چیزیں ان کافروں کے لئے حرام کر دی ہیں، جنہوں نے اپنے دین کو کھیل کود بنا رکھا تھا اور دنیوی زندگی نے ان کو فریب دے رکھا تھا)۔ بیضاوی نے لکھا ہے حرم سے مراد یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ نے کافروں سے روک دی ہیں (ممانعت فرما دی ہے) جیسے مکلف کو حرام کی ممانعت کر دی جاتی ہے۔ صاحب مدارک نے لکھا ہے یہاں تحریم بمعنی منع ہے جیسے وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ میں حَرَّمْنَا کا معنی ہے منعنا۔ میں کہتا ہوں آیت حَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ میں بھی حرام کا معنی منع ہی ہے۔

ابن ابی الدنیا اور ضیا نے زید بن رفیع کا بیان نقل کیا ہے کہ دوزخی دوزخ میں داخل ہو کر مدت تک آنسوؤں سے روئیں گے، پھر مدت تک لہو کے آنسو بہائیں گے۔ دوزخ کے کارندے ان سے کہیں گے بدبختو تم دنیا میں نہیں روئے آج تم کس

سے فریاد کررہے ہو۔ وہ چیخ کر پکاریں گے اے جنت والو! اے گروہ پدراں و مادراں !! اے اولاد! ہم قبروں سے پیاسے نکلے تھے، میدان حشر میں بھی پوری مدت پیاسے رہے اور آج بھی پیاسے ہیں، اللہ نے پانی اور جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے ہماری طرف بھی اس میں سے کچھ بہادو۔ چالیس (دن یا مہینے یا سال) تک مانگتے رہیں گے مگر کوئی جواب نہیں دے گا آخر ان کو جواب ملے گا تم کو (یوں ہی یہاں ہمیشہ) رہنا ہے یہ سن کر وہ ہر بھلائی سے ناامید ہو جائیں گے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اسی آیت کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ آدمی اپنے بھائی کو پکارے گا اور کہے گا بھائی میری فریاد رسی کر میں جل گیا وہ جواب دے گا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔

فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۵۱﴾ (پس آج ہم بھی ان کو ایسے ہی فراموش کردیں گے جیسے انہوں نے اس دن کی پیشی کو فراموش کردیا تھا اور جیسے ہماری آیات کا انکار کر دیا تھا)۔ فراموش کردینے سے مراد ہے دوزخ میں ڈال کر چھوڑ دینا اور قیامت کے دن کی پیشی کو بھولنے سے مراد ہے ایسے اعمال ترک کردینا جو قیامت کے دن فائدہ رساں ہوں

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾ (ہم نے ان کے پاس ایک ایسی کتاب پہنچادی ہے جس کو ہم نے اپنے علم کامل سے بہت ہی واضح کرکے بیان کردیا ہے ذریعہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لے آئے ہیں)۔

کتاب یعنی قرآن، فَصَّلْنٰهُ یعنی ہم نے معانی کی وضاحت کردی، حرام حلال کو الگ الگ کردیا، ہدایات اور قصے بیان کر دیئے اور صحیح غلط عقائد کی صراحت کردی۔ عَلٰى عِلْمٍ یعنی وجوہ تفصیل کا علم رکھتے ہوئے یا انسانوں کے مصالح کو جانتے ہوئے۔ دونوں صورتوں میں فَصَّلْنَا کی ضمیر فاعل سے حال ہوگا۔ یا وہ کتاب علم کو حاوی ہے اس وقت فَصَّلْنَا کی ضمیر مفعول سے حال ہوگا۔ هُدًى اور رَحْمَةً بھی حال ہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾ (ان لوگوں کو اور کسی بات کا انتظار نہیں صرف آخری نتیجہ کا انتظار ہے جس روز اس کا آخری نتیجہ (سامنے) آجائے گا اس روز جو لوگ اس کو پہلے سے بھولے ہوئے تھے یوں کہیں گے کہ ہمارے رب کے پیغمبر بے شک سچی سچی باتیں لائے تھے۔ سو اب کیا کوئی ہمارا سفارشی ہے کہ ہماری سفارش کردے یا (دنیا میں) ہم کو لوٹا دیا جائے کہ ہم پہلے کئے ہوئے اعمال کے برخلاف اعمال کرلیں (اس وقت) وہ یقیناً خود خسارہ میں پڑ چکے ہوں گے اور جو باتیں وہ تراشتے تھے سب غائب ہو جائیں گی)۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ یعنی قرآن پر ایمان لانے کے لئے ان کو اور کسی بات کا انتظار نہیں ہے۔ تَاْوِيْلَهٗ یعنی قرآن نے جو وعدہ وعید بیان کیا ہے اور جس نتیجہ اور انجام کی صراحت کی ہے اس کے سامنے آنے کے منتظر ہیں۔ مجاہد نے کہا تاویل سے مراد ہے سزا جزا۔

يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ یعنی مرنے کے دن یا قیامت کے دن جب سزا جزا یا نتیجہ سامنے آجائے گا۔ نَسُوْهُ یعنی انہوں نے ان کو ایسا چھوڑ دیا تھا جیسے کوئی بھولنے والا چھوڑ دیتا ہے اور اس پر ایمان نہیں لائے تھے۔ قَدْ جَآءَتْ یعنی ان پیغمبروں کی سچائی کھل جائے گی اس لئے پیغمبروں کی صداقت کا اقرار کریں گے مگر اس وقت یہ اقرار بے کار ہوگا۔ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ یعنی شرک و معصیت کو چھوڑ کر اللہ کی توحید کا اقرار کریں گے۔ قَدْ خَسِرُوْٓا انہوں نے اپنی عمریں کفر میں گزار دیں اس صرف عمر میں ان کو خسارہ ہوگا۔ ضَلَّ نابود ہو جائے گا، کھو جائے گا۔ مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ جو کچھ خود افترابندی کرتے تھے کہ اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے یا اللہ کا شریک قرار دیتے تھے (یہی ان کی افترا پردازی تھی)۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ (بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا)۔ دنیا کے انہی چھ دنوں کے برابر وقت میں یا آخرت کے چھ دنوں کے برابر مقدار میں۔ آخرت کا ہر دن دنیا کے ہزار برس کے برابر ہوگا۔ سعید بن جبیرؒ نے فرمایا اللہ سارے آسمان اور زمینیں ایک آن اور ایک پل میں پیدا کر سکتا تھا مگر لوگوں کو ہر کام میں آہستہ روی اور ہر عمل کو دھیرے دھیرے انجام دینے کی تعلیم کے لئے اس نے اس کائنات ارضی و سماوی کو چھ روز میں بنایا۔ حدیث میں آیا ہے آہستہ روی رحمٰن کی طرف سے ہے اور عجلت پسندی شیطان کی طرف سے۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان مرفوعاً عن انسؓ بن مالک۔

ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ (پھر عرش پر متمکن ہو گیا)۔

بغویؒ نے لکھا ہے کہ معتزلہ کے نزدیک استوٰی سے مراد ہے غلبہ پانا، تسلط جمانا۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ عرش پر استواء اللہ کی ایک صفت ہے جو بے کیف ہے (یعنی اس کی کیفیت، حالت، ہیئت و وضع نہیں سمجھی جا سکتی) اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کا علم اللہ پر چھوڑ دینا چاہئے۔

ایک شخص نے امام مالک بن انسؒ سے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کی کیفیت پوچھی۔ امام نے کچھ دیر سر جھکا لیا پھر فرمایا استواء کا معنی معلوم ہے، کیفیت مجہول نا قابل فہم ہے، اس پر ایمان واجب ہے اور اس کو پوچھنا بدعت (خلافت سنت اور اختراع نفسانی) ہے اور میرے خیال میں تو گمراہی ہے۔ پھر آپ نے حکم دے کر اس کو (اپنی مجلس سے) نکلوا دیا۔ سفیان ثوری، اوزاعی، لیث بن سعید، سفیان بن عیینہ اور عبداللہ وغیرہ تمام علماء سنت کا قول ان آیات کے متعلق جن کے اندر صفات متشابہات کا بیان ہے یہی ہے کہ ان کو اسی طرح بلا کیف ماننا چاہئے جس طرح وہ آئی ہیں۔ لغت میں عرش تخت حکومت کو کہتے ہیں اور عرش خداوندی ایک عظیم ترین مخلوق ہے جو اللہ کے نزدیک بڑی باعزت ہے۔ تجلیات الٰہیہ سے اس کا خصوصی تعلق ہے اسی لئے اس کو عرش الرحمٰن کہا جاتا ہے۔ یہ اضافت (مکانی نہیں بلکہ) صرف اعزازی ہے جیسے کعبہ کو بیت اللہ بطور احترام کہا جاتا ہے۔ عرش کے متعلق بعض احادیث کا تذکرہ ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت الکرسی کی تفسیر کے ذیل میں کر دیا ہے۔

يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا ۙ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِأَمْرِهٖ ؕ

(وہ رات سے دن کو چھپا دیتا ہے اس طور پر کہ رات دن کو جلدی سے آلیتی ہے اور سورج اور چاند اور ستاروں کو ایسے طور سے پیدا کیا کہ سب اس کے حکم کے تابع ہیں)۔

يُغْشِي رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور چونکہ یہ معلوم ہی تھا کہ دن کو بھی رات پر ڈھانک دیا جاتا ہے اس لئے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا یا یوں کہا جائے کہ جملہ میں دونوں احتمال ہو سکتے ہیں (اللیل مفعول اول اور النہار مفعول دوئم یا النہار اول مفعول اور اللیل مفعول دوئم) بغوی نے کہا یہاں دوسرا جملہ محذوف ہے اصل کلام یوں تھا۔ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ وَيُغْشِي النَّهَارَ اللَّيْلَ پہلے جملہ سے دوسرا جملہ معلوم ہو رہا تھا اس لئے اس کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ يَطْلُبُهٗ یعنی اس کے پیچھے آتا ہے جب ایک دوسرے کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہو تو ایسا ہی لگتا ہے کہ پیچھے والا آگے والے کو طلب کر رہا ہے۔ حَثِيْثًا تیز بغیر وقفہ کے۔ بامرہ یعنی اللہ کے فیصلہ اور حکم کے تابع۔

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ؕ (یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا)۔

یعنی وہی سب کا خالق ہے اس کے سوا کوئی خالق نہیں اور حکومت بھی اسی کی ہے اسی کے ہاتھ میں حکم ہے جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے کوئی اس سے پرسش نہیں کر سکتا۔ صوفیہ کا قول ہے کہ اَلْخَلْقُ سے مراد ہے عالم خلق یعنی عالم جسمانی، عرش تمام آسمان اور زمینیں اور آسمان و زمین کی تمام مادی کائنات اور سارے عناصر اور عناصر سے بنائی ہوئی نباتی، معدنی اور حیوانی مخلوق کے نفوس یعنی وہ لطیف اجسام جو کثیف اجسام میں جاری ساری ہیں۔ اور اَلْاَمْرُ سے مراد ہے عالم امر یعنی مجردات قلب، روح،

سر خفی، اخفی یہ تمام مجردات عرش سے بالاتر ہیں مگر انسانی اور ملکی اور شیطانی نفوس میں اس طرح سرایت کئے ہوئے ہیں جیسے آئینہ کے اندر سورج۔ چونکہ اللہ نے ان کو بغیر مادہ کے صرف لفظ کُنۡ سے پیدا کیا ہے اس لئے ان کو عالم امر کہا جاتا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ سفیان بن عیینہ نے فرمایا خلق اور امر میں فرق ہے جس نے دونوں کو ایک کہا وہ کافر ہوگا۔

تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (بڑی خوبیوں سے بھرا ہوا ہے اللہ جو سارے جہان کا رب ہے)۔

یعنی وحدت الوہیت میں برتر اور ربوبیت میں منفرد ہے یہ لفظ برکۃ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے بڑھوتری اور بڑھوتری کیلئے عظمت و برتری لازم ہے اس لئے برکت کا معنی ہوگا، برتری اور عظمت۔ پس تبارک کا ترجمہ ہوا (برتر ہے عظمت والا ہے)۔

بعض نے کہا تبارک کا یہ مطلب ہے کہ برکت اس کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ ہر برکت کو لایا ہے۔ حسن نے کہا برکت اس کی طرف سے ہے۔ بعض نے کہا تَبٰرَكَ یعنی وہ پاک ہے برکت کا معنی ہے قدس اور قدس کا معنی ہے پاک ہونا۔ بعض نے کہا اللہ کا نام مبارک ہے اور ہر چیز میں اس کی برکت ہے۔ اہل تحقیق نے لکھا ہے معنی یہ ہے کہ اللہ دائم الوجود لازوال ہے ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا، کیونکہ برکت کا اصل معنی ہے جمارہنا (جو پانی اکٹھا کر لیا جائے اور ہر طرف سے گھیر کر اس کو جمع کر لیا جائے یعنی حوض یا تالاب بنا لیا جائے اس کو) برکۃ اسی مناسبت سے کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تبارک اللہ کہنا تو درست ہے مگر لفظ مبارک کا اطلاق اللہ پر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اللہ کے تمام اسماء صفات سمعی شرعی ہیں اور یہ لفظ ان ناموں میں شامل نہیں ہے)۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ (اپنے رب سے دعا کیا کرو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے)۔

یعنی اس کا ذکر کرو، اس کی عبادت کرو، اس سے دعا کرو۔ تَضَرُّعًا مصدر بمعنی اسم فاعل ہے اس کا مجرد ضرع ہے۔ ضرع الرجل ضراعۃ وہ آدمی کمزور اور عاجز ہو گیا۔ ضارع اور ضرع کمزور عاجز۔ تضرع اس نے کمزوری اور عاجزی ظاہر کی (زاری کی، گڑگڑایا) قاموس میں ضرع الیہ ضرعا وضراعۃ اس کے سامنے خضوع کیا، عاجزی کی اور مسکنت کا اظہار کیا۔ خفیۃ پوشیدہ عبادت اور دعا خلوص کی دلیل ہے اور ریاکاری کے شائبہ سے پاک ہے اس لئے خفیہ دعا کا حکم دیا۔ اگر ذکر سری ہو یا جہری ہو مگر ریاکاری کی اس میں آمیزش نہ ہو تو عبادت ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اپنے کے گمان کے مطابق ہوتا ہوں اگر وہ میری یاد دل میں کرتا ہے تو میں بھی اس کا ذکر اپنے باطن میں کرتا ہوں اور اگر وہ میرا ذکر جماعت میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر ایسی جماعت میں کرتا ہوں جو اس کی جماعت سے برتر ہوتی ہے (یعنی ملائکہ کی جماعت) متفق علیہ۔

اس حدیث سے ذکر جہری و خفی دونوں کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس حدیث سے جہری ذکر کی سری ذکر سے برتری ثابت ہوتی ہے مگر یہ استدلال غلط ہے۔ اللہ کسی کا ذکر سری کرلے یا جماعت کے سامنے دونوں برابر ہیں بلکہ ذکر سری کو جہری پر فضیلت حاصل ہے۔ ایک اور آیت ہے اللہ نے فرمایا ہے فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا اس میں بھی جہری ذکر مراد نہیں ہے، بلکہ کثرت ذکر کا حکم ہے۔

علماء کا اجماع ہے کہ سری ذکر افضل ہے اور جہری ذکر بدعت ہے ہاں چند مقامات میں جہری ذکر کی ضرورت ہے جیسے اذان، اقامت، تکبیرات تشریق، امام کے لئے نماز میں تکبیرات انتقال (نیز تکبیر تحریمہ) اگر نماز کے اندر کوئی حادثہ ہو جائے۔ تو مقتدی کا سبحان اللہ کہنا، حج میں لبیک کہنا وغیرہ۔ ہدایہ کے حواشی میں ابن ہمام نے لکھا ہے کہ تکبیرات تشریق کی حد بندی میں امام ابو حنیفہؒ نے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے مسلک کو اختیار کیا ہے آپ عرفہ کے دن (یعنی نو ذی الحجہ) کی فجر سے یوم نحر کی نماز عصر تک تکبیر کہتے تھے رواہ ابن ابی شیبۃ۔ اور صاحبینؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مسلک کو اختیار کیا ہے آپ یوم عرفہ کی فجر کے بعد سے آخری ایام تشریق کی نماز عصر تک تکبیر کہتے تھے رواہ ابن ابی شیبہ وکذا روی محمد بن الحسن عن

ابی حنیفۃ بسندہ۔ اس کے بعد ابن ہمام نے لکھا ہے جو شخص صاحبین کے قول پر فتویٰ دیتا ہے وہ تقاضاء ترجیح کے خلاف کرتا ہے کیونکہ امام اور صاحبین کا اختلاف محض تکبیر کہنے میں نہیں ہے بلکہ بلند آواز سے یعنی جہری تکبیر کہنے میں بھی ہے (صاحبین جہر کے اور امام صاحب سر کے قائل ہیں) اور ذکر میں اصل اخفاء ہے جہر سے ذکر کرنا بدعت ہے اور جب جہر اور اخفاء میں تعارض پڑ جائے (دونوں کا روایتی ثبوت ملتا ہے) تو اخفاء قابل ترجیح ہے (لہٰذا صاحبین کے قول پر فتویٰ تقاضاء ترجیح کے خلاف ہے) سری ذکر افضل ہے، صحابہؓ اور تابعینؒ کا اسی پر اتفاق رہا ہے۔ حسنؒ کا قول ہے کہ سری دعا اور جہری دعا میں ستر ہزار درجہ کا فرق ہے۔ مسلمان بہت لگن سے دعائیں کرتے تھے مگر ان کی آواز قطعاً سنائی نہیں دیتی تھی صرف لبوں کی سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اور عبد صالح کے تذکرہ میں فرمایا ہے اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہترین ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو بقدر کفایت ہو۔ رواہ احمد وابن حبان فی صحیحہ والبیہقی فی شعب الایمان۔

حضرت ابو موسیٰؓ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے خیبر پر جہاد کیا تو راستہ میں مسلمان ایک وادی سے گزرے اور انہوں نے چلا کر تکبیریں کہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے لئے سکون اختیار کرو، تم کسی بہرے یا غیر حاضر کو نہیں پکار رہے ہو بلکہ اس کو پکار رہے ہو جو سننے والا اور قریب ہے، رواہ البغوی۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے اگرچہ ذکر خفی کی افضلیت ثابت ہوتی ہے مگر اپنے لئے سکون اختیار کرو کا لفظ بتا رہا ہے کہ ذکر خفی کا حکم اور ذکر جہری کی ممانعت صرف تقاضائے شفقت کے زیر اثر تھی، یہ وجہ نہ تھی کہ ذکر جہری جائز ہی نہ ہو۔

فصل

ذکر کے تین اقسام ہیں۔ ۱۔۔۔۔۔۔ بلند آواز سے چیخ کر۔ یہ عام صورتوں میں باجماع علماء مکروہ ہے ہاں خاص صورتوں میں اگر مصلحت و دانش کا تقاضا ہو تو درست (بلکہ ضروری) ہے اور اخفاء سے افضل ہے جیسے اذان کہنا اور حج میں لبیک پڑھنا، شاید چشتی صوفیہ نے مبتدی کو جہری ذکر کی تلقین مصلحت ہی کے تحت کی ہے۔ شیطان کو بھگانا، غفلت دور کرنا، نسیان کو زائل کرنا، دل میں گرمی پیدا کرنا، آتش محبت کو ریاضت کے ذریعہ سے تیز کرنا اور دوسرے فوائد اس سے وابستہ ہیں لیکن ریاکاری اور شہرت طلبی سے اجتناب ضروری ہے۔

۲۔۔۔۔۔۔ زبان سے چپکے چپکے ذکر کرنا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تیری زبان تر و تازہ رہے۔ رواہ الترمذی وابن ماجہ۔ اس حدیث میں یہی ذکر مراد ہے۔ امام احمدؒ اور ترمذیؒ کی روایت ہے کہ عرض کیا گیا سب سے بڑھیا عمل کون سا ہے فرمایا (سب سے افضل عمل) یہ ہے کہ دنیا کو چھوڑتے وقت تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر و تازہ ہو۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے کچھ فرشتے راستوں میں گھومتے اور اہل ذکر کو تلاش کرتے رہتے ہیں اگر کچھ لوگوں کو ذکر خدا میں مشغول پاتے ہیں تو باہم ایک دوسرے کو پکارتا ہے ادھر آؤ مقصد مل گیا، چنانچہ سب آ کر اہل ذکر کو اپنے پروں سے گھیر لیتے ہیں اور دنیوی آسمان تک یوں ہی سلسلہ جوڑ لیتے ہیں ان کا رب ان سے پوچھتا ہے باوجودیکہ وہ خود ان سے زیادہ واقف ہوتا ہے۔ میرے بندے کیا کہہ رہے تھے فرشتے عرض کرتے ہیں وہ تیری پاکی، تیری بڑائی، تیری حمد اور تیری بزرگی بیان کر رہے تھے (یعنی سبحان اللہ، اللہ اکبر، الحمد للہ اور المجد للہ کہہ رہے تھے) اللہ فرماتا ہے کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں بخدا انہوں نے تجھے نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتا ہے پھر اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو ان کی کیا حالت ہوتی۔ فرشتے عرض کرتے ہیں اگر وہ تجھے دیکھ پاتے تو تیری عبادت اور قوت سے کرتے، تیری بزرگی بہت زیادہ بیان کرتے اور تیری پاکی کا اظہار اور کثرت سے کرتے۔ اللہ فرماتا ہے وہ کیا مانگتے تھے فرشتے عرض کرتے ہیں وہ تجھ سے جنت کے خواستگار تھے۔ اللہ فرماتا ہے کیا انہوں نے جنت کو دیکھا ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں پروردگار انہوں نے جنت کو نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتا

ہے، پھر اگر وہ جنت کو دیکھ لیتے تو ان کی کیا حالت ہوتی۔ فرشتے عرض کرتے ہیں اگر وہ جنت کو دیکھ پاتے تو ان کو جنت کی حرص رغبت اور طلب اور زیادہ ہو جاتی۔ اللہ فرماتا ہے وہ کس چیز سے پناہ مانگتے تھے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں دوزخ سے۔ اللہ فرماتا ہے کیا انہوں نے دوزخ کو دیکھا ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں پروردگار بخدا انہوں نے دوزخ کو نہیں دیکھا۔ اللہ فرماتا ہے پھر اگر وہ دیکھ پاتے تو ان کی کیا کیفیت ہوتی۔ فرشتے عرض کرتے ہیں اگر دیکھ پاتے تو دوزخ سے فرار و خوف ان کا اور زیادہ ہو جاتا۔ اللہ فرماتا ہے تم گواہ رہو کہ میں نے ان کو بخش دیا۔ جماعت ملائکہ میں سے ایک فرشتہ عرض کرتا ہے۔ اہل ذکر میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو ذکر میں شریک نہ تھا اپنے کسی کام سے آیا تھا۔ اللہ فرماتا ہے وہ سب ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ بیٹھنے والا بد نصیب نہیں ہو سکتا۔ رواہ البخاری۔ مسلم نے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے۔

۳...... بغیر زبان کے صرف قلبی اور روحی اور نفسی ذکر کرنا۔ یہی ذکر خفی ہے جس کو اعمال نامے لکھنے والے فرشتے بھی نہیں سن پاتے۔ ابو یعلی نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ ذکر خفی جس کو اعمالناموں کے لکھنے والے فرشتے بھی نہیں سن پاتے (ذکر جلی سے) ستر ہزار درجے فضیلت رکھتا ہے۔ جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ حساب کیلئے سب لوگوں کو جمع کرے گا اور فرشتے اعمالنامے اور تمسکات لیکر حاضر ہوں گے تو اللہ ان سے فرمائے گا دیکھو (اس بندہ کی) کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔ فرشتے عرض کرینگے ہم کو جو کچھ معلوم ہوا اور ہماری نگرانی میں جو کچھ ہوا ہم نے سب کا احاطہ کرلیا اور لکھ لیا کوئی بات نہیں چھوڑی۔ اللہ فرماتا ہے اس کی ایک نیکی ایسی بھی ہے جس کا تم کو علم نہیں میں تم کو بتاتا ہوں وہ نیکی ذکر خفی ہے۔

میں کہتا ہوں اس ذکر کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا نہ اس میں کوئی سستی آتی ہے (یعنی ذکر قلبی ہمہ اوقات جاری رہ سکتا ہے۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۵۵ (اللہ ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو (دعا میں) حد (ادب سے) نکل جاتے ہیں)۔ بعض علماء کے نزدیک معتدین سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایسی بے کار دعائیں کرتے ہیں جن کا ہونا نہ عقل میں آتا ہے نہ ضابطۂ قدرت میں جیسے منازل انبیاء کی طلب، آسمان پر پہنچ جانے کی دعا، مرنے سے پہلے جنت میں پہنچ جانے کا سوال۔ بغوی نے اپنی سند سے ابو داؤد سجستانی کے سلسلہ سے حسب روایت ابو نعامہ بیان کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مغفلؓ نے اپنے بیٹے کو یوں دعا مانگتے سنا اے اللہ میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ جب میں جنت میں جاؤں تو مجھے جنت کے دائیں جانب سفید محل عطا فرمانا۔ حضرت عبد اللہؓ نے فرمایا بیٹے اللہ سے جنت کی دعا کر اور دوزخ سے اس کی پناہ طلب کر۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا آپ فرمارہے تھے اس امت میں آئندہ کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو طہارت اور دعا میں حد (سنت) سے آگے بڑھ جائیں گے۔ کذا روی ابن ماجۃ وابن حبان فی صحیحہ۔

ابو یعلی نے سند میں حضرت سعدؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عنقریب کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو دعا میں حدود (سنت) سے تجاوز کریں گے، آدمی کے لئے اتنا کہنا کافی ہے اے اللہ میں تجھ سے جنت کا اور اس قول و عمل کا جو جنت سے قریب کر دے خواستگار ہوں اور دوزخ سے اور دوزخ کے قریب لے جانے والے قول و عمل سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

ابو یعلی نے کہا آدمی کے لئے اتنا کہنا کافی ہے۔ آخر کلام تک۔ معلوم نہیں یہ حضرت سعد کا قول ہے یا فرمان نبوی کا حصہ ہے۔

عطیہ نے کہا اَلْمُعْتَدِيْنَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو ناجائز طور پر مسلمانوں کے لئے بد دعائیں کرتے ہیں۔ مثلاً یوں کہتے ہیں اے اللہ فلاں پر لعنت بھیج۔ ایسی بد دعائیں کرنے میں سب سے آگے رافضی ہیں جو صحابہ کرام اور بعض اہل بیت پر لعنت کرتے ہیں۔ ابن جریج نے کہا اعتداء سے مراد ہے چیخ چیخ کر دعا کرنا جس کی ممانعت اس فرمان رسول میں آئی، جو حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت سے منقول ہے۔ حضور نے فرمایا اپنے اوپر نرمی اختیار کرو، تم نہ کسی بہرے کو پکار رہے ہو، نہ کسی غیر حاضر کو۔

میں کہتا ہوں اعتداء سے مراد ہے حد شریعت سے تجاوز کرنا۔ اس کے اندر تمام مذکورہ بالا صورتیں بھی آجاتی ہیں اور ایسی دعا کرنا بھی اس میں شامل ہے جس میں کوئی گناہ یا قطع رحم ہو رہا ہو اور یہ الفاظ بھی اعتداء ہی کے ذیل میں آتے ہیں۔ میں نے دعا کی مگر میری دعا قبول نہ ہوئی، میں دعا کر رہا ہوں اور میری دعا ضرور قبول ہو گی یا اللہ سے ایسے نام لے کر کرے

جو شریعت (قرآن وحدیث) میں مذکور نہیں ہیں (مثلاً بھگوان، پرماتما، ایشور وغیرہ)۔

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا (اور دنیا میں درستی کر دینے کے بعد فساد (بگاڑ) نہ پیدا کرو یعنی جب اللہ نے پیغمبروں کو بھیج دیا، شریعت واضح کر دی، اللہ کی اطاعت کی دعوت دے دی اور دعا میں حدود سے تجاوز کرنے کی ممانعت کر دی اور اس طرح زمین کی اصلاح کر دی تو اس کے بعد کفر، معصیت، بغاوت اور غیر اللہ کی اطاعت کی دعوت دے کر اس میں بگاڑ نہ پیدا کرو۔ بغوی نے حسن، ضحاک، سدی اور کلبی کے قول کے یہی معنی بیان کئے ہیں۔ عطیہ نے آیت کے مطلب کی توضیح اس طرح کی کہ اللہ کی نافرمانی نہ کرو، ورنہ اللہ بارش روک لے گا اور تمہارے گناہوں کے سبب کھیتی کو تباہ کر دے گا (اور اس طرح زمین میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا) اس توضیح پر بَعْدَ إِصْلَاحِهَا کا مطلب یہ ہوگا کہ جب اللہ نے بارش اور سبزی سے زمین کی درستی کر دی تو اس کے بعد اس کی تباہی نہ کرو۔

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ إِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾ (اور بیم وامید کی حالت میں اللہ کی عبادت کرو، بے شک اللہ کی رحمت نیک کام کرنے والوں سے قریب ہے)۔

اس آیت میں امید کی بیم پر ترجیح کا اظہار ہے اور ذریعۂ اجابت دعا (یعنی حسن عمل) پر تنبیہ ہے اور اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ کریم ورحیم مالک کی طرف سے دعا کو رد کر دینا محض تمہاری بد اعمالی کی نحوست اور نیکوکاری کو ترک کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے (ورنہ وہ رحیم اور داتا ہے کسی کی دعا رد نہیں کرتا)۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک بار کسی شخص کا (بطور تمثیل) ذکر فرمایا کہ طویل سفر کرتا ہے پراگندہ مو اور غبار آلود چہرہ والا ہے، آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر دعا کرتا ہے۔ اے میرے رب اے میرے رب مگر اس کا کھانا حرام کا ہے، اس کا پینا حرام کا ہے، اس کا لباس حرام کا ہے، اس کی پرورش ہی حرام سے ہے۔ ایسے شخص کی دعا کیسے قبول ہوگی، رواہ مسلم والترمذی من حدیث ابی ہریرہؓ۔ مسلم اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ کی دعا برابر قبول ہوتی ہے بشرطیکہ وہ گناہ کی اور قطع رحم کی دعا نہ کرے اور دعا میں جلد بازی سے بھی کام نہ لے، عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ جلد بازی سے کیا مراد ہے فرمایا مثلاً کہنے لگے میرے خیال میں دعا قبول نہیں ہوگی یہ خیال کر کے تھک کر دعا کرنا چھوڑ دے۔ امام احمد نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دل ظروف ہیں بعض بعض سے زیادہ سمائی والے ہیں۔ لوگو! اللہ سے دعا کرتے وقت یقین رکھا کرو کہ تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی۔ اللہ اس بندہ کی دعا قبول نہیں کرتا جو بے توجہ دل سطحی طور پر کرتا ہے۔ ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قبول دعا کا یقین رکھتے ہوئے دعا کی جائے لیکن اَلْمُعْتَدِيْنَ کی تفسیر میں بیان کیا گیا تھا کہ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ میری دعا قبول ہو جائے گی۔ یہ ایک شبہ کیا جا سکتا ہے جس کا ازالہ یہ ہے کہ قبول دعا کا یقین رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات کا یقین رکھے کہ اللہ کریم ہے، سخی ہے، بخل نہیں کر سکتا لیکن دعا کے قبول نہ ہونے کا سبب انسان کی معصیت اور خطاکاری ہے گویا اللہ کی رحمت وجود پر نظر رکھتے ہوئے تو دعا قبول ہونے کا یقین رکھا جائے اور اپنے اعمال کی نحوست کو دیکھتے ہوئے دعا کے رد ہونے کا اندیشہ دل گیر رہے۔

قَرِيْبٌ کو بصیغۂ مذکر لانے کی وجہ یا یہ ہے کہ رَحْمَتَ بمعنی رحم ہے یا موصوف مذکر محذوف ہے۔ یعنی امر قریب۔ یا یوں کہا جائے کہ فعیل (صیغہ صفت) فَعِیل مصدری کے (وزن میں) مشابہ ہے جیسے نقیض (اور فعیل مصدری مذکر بھی ہے اور مؤنث بھی) یا یہ کہا جائے کہ قربت نسبی سے جو لفظ قریب آتا ہے وہ مذکر ہے اور قرب مسافت سے جو لفظ قریب بنتا ہے وہ مذکر بھی ہے اور مؤنث بھی (اور یہاں قرب مکانی ہی مراد ہے) ابو عمرو بن العلاء نے کہا اگر قرابت نسب مقصود

ہو تو عورت کے لئے قَرِیْبَۃٌ کہا جاتا ہے اور قرب مسافت مراد ہو تو عورت کے لئے بھی قریب بولا جاتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ (اور وہ اللہ ایسا ہے کہ باران رحمت سے پہلے خوشخبری دینے کے لئے ہواؤں کو بھیج دیتا ہے)۔

بُشْرًا یہ لفظ بشرا کا مخفف ہے اور بُشُرًا بشیر کی جمع ہے۔ رحمت سے مراد بارش، باد مشرق (پُروا ہوا) ابر کو اٹھا کر لاتی ہے باد شمالی ابر کو جمع کرتی ہے باد جنوبی ابر کو چکر دیتی ہے اور باد مغرب (پچھوا ہوا) بادل کو منتشر کر دیتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرمار ہے تھے ہوا اللہ کی بھیجی ہوئی راحت ہے یہ رحمت کو بھی لاتی ہے اور عذاب کو بھی (اس کو برا نہ کہو اور اللہ سے اس کی خیر کی طلب) کرو اور اس کی خرابی سے اللہ کی پناہ کے خواستگار ہو۔ رواہ البخاری فی الادب وابو داؤد والحاکم ورواہ البغوی من طریق الشافعی وعبدالرزاق۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ (یہاں تک کہ جب ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو کسی خشک سرزمین کی طرف ہم ان کو ہانک لے جاتے ہیں پھر اس بادل سے پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل پیدا کرتے ہیں)

أَقَلَّتْ ہوائیں اٹھا کر لاتی ہیں یہ لفظ قلت سے ماخوذ ہے کسی چیز کو اٹھانے والا اس کو قلیل (اور آسان و حقیر) سمجھتا ہی ہے ثِقَالًا پانی کی وجہ سے بوجھل۔ یہ لفظ ثقیل کی جمع ہے چونکہ سَحَاب، سحائب کے معنی میں ہے اس لئے ثقالاً بصیغہ جمع ذکر کیا۔ سُقْنَاہ چونکہ لفظ سَحَاب مفرد ہے اس لئے واحد مذکر کی ضمیر ذکر کی لبلد سرزمین کے لئے یا اس کو سرسبز کرنے کے لئے یا سیراب کرنے کے لئے۔ بعض کے نزدیک لِبَلَدٍ میں لام بمعنی الیٰ ہے یعنی خشک زمین کی طرف۔ مَيِّتٍ وہ زمین جس میں سبزی نہ ہو فَأَنزَلْنَا بِهِ یعنی بالبلد اس وقت باسبیت کے لئے ہوگی۔ یا بِہٖ کی ضمیر سَحَاب یا روانگی سحاب یا ریح کی طرف راجع ہے اس وقت باء الصاق کی ہوگی یعنی بادل یا ہوا کے ساتھ ہم نے پانی اتارا۔ فَأَخْرَجْنَا بِهِ یہ ضمیر اگر بلد کی طرف راجع قرار دی جائے تو باء ظرفیت کے لئے ہوگی یعنی خشک زمین میں اور اگر سَحَاب یا ریح یا روانگی سحاب کی طرف راجع ہو تو باء سببیت کے لئے ہوگی۔

كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٥٧﴾ (یوں ہی ہم مردوں کو نکال کھڑا کر دیں گے (یہ بیان اس لئے کیا) تاکہ تم سمجھو)۔

كَذَٰلِكَ یعنی پھلوں کو پیدا کرنے یا خشک زمین کو سرسبز بنانے کی طرح۔ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ یعنی قبروں سے مردوں کو نکالیں گے۔ تَذَكَّرُونَ تاکہ تم سمجھو اور اس امر پر استدلال کرو کہ اللہ کو جب اس کائنات کو پیدا کرنے کی قدرت ہے تو آخرت میں دوبارہ پیدا کرنے کی قدرت بھی ہونی ہی چاہئے (ثانوی تخلیق، اول تخلیق سے مشکل نہیں) بغویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب سب لوگ اول صور پھونکنے سے مر جائیں گے تو اللہ زیرین عرش سے پانی برسائے گا جس کا نام آب حیات ہوگا۔ جیسے مردوں کی منی۔ اس بارش سے لوگ قبروں کے اندر کھیتی کی طرح اگیں گے جب اجسام کی تکمیل ہو جائے گی تو ان کے اندر روح پھونک دے گا پھر ان پر ایک نیند طاری کر دی جائے گی جس کی وجہ سے وہ قبروں سے اٹھیں گے اس وقت سروں اور آنکھوں میں ان کو نیند کا اثر محسوس ہو رہا ہوگا اور کہیں گے ہائے افسوس ہم کو خواب گاہ سے (یا خواب سے) کس نے اٹھا دیا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں مرتبہ صور پھونکنے کی درمیانی مدت چالیس ہوگی لوگوں نے پوچھا ابوہریرہؓ کیا چالیس دن کی مدت ہوگی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا مجھے اس سے انکار ہے لوگوں نے کہا تو کیا چالیس مہینے کی فرمایا مجھے اس سے بھی انکار ہے لوگوں نے کہا تو کیا چالیس سال کی فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا (یعنی رسول اللہ نے چالیس کا لفظ فرمایا دن مہینہ یا برس کی صراحت نہیں فرمائی) پھر اللہ آسمان سے پانی برسائے گا جس سے انسان سبزی کی طرح اگیں گے۔ انسان کی ہر چیز فنا ہو جاتی ہے صرف ایک ہڈی رہ جاتی ہے دم گزے کی ہڈی اسی سے

قیامت کے دن تمام (اعضاء اور اجزاء) جوڑے جائیں گے۔ ابن ابی داؤد نے بھی البعث میں یہ حدیث نقل کی ہے انسؓ کی روایت میں اتنی صراحت ہے کہ دونوں مرتبہ صور پھونکنے کی درمیانی مدت چالیس سال کی ہوگی اسی چلہ میں اللہ بارش کرے گا۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ دونوں مرتبہ پھونکنے کی درمیانی مدت میں جو چالیس کی ہوگی زیر عرش سے پانی کا ایک نالہ جاری ہو جائے گا (یعنی بارش ہوگی) جس سے انسان چوپایہ اور پرندے کا ہر فنا شدہ حصہ جسم اگ آئے گا اگر پہلے کسی نے ان کو دیکھا ہوگا تو اگنے کے بعد دیکھ کر پہچان لے گا۔ پھر روحوں کو چھوڑ کر اجسام سے ان کا جوڑ لگایا جائے گا آیت وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ کا یہی معنی ہے۔ ابن جریر نے سعید بن جبیرؒ کی روایت سے بھی یہ اثر نقل کیا ہے حلیمی نے کہا تمام روایات کا اتفاق ہے کہ دونوں مرتبہ صور پھونکے جانے کی درمیانی مدت چالیس سال ہوگی۔ ابن مبارک نے مرسلاً حسن کی روایت سے بھی ایسا ہی نقل کیا ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۭ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ۝۵۸ ع ۱۴

(اور جو سرزمین ستھری ہوتی ہے اس کی پیداوار اس کے رب کے حکم سے (خوب) نکلتی ہے اور جو (زمین) خراب ہے اس کی سبزی نہیں نکلتی (اگر نکلی بھی) تو تھوڑی سی، اسی طرح ہم دلائل کو طرح طرح سے ان لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں جو قدر کرتے ہیں)۔

اَلْبَلَدُ الطَّيِّبُ اچھی مٹی والی زمین۔ بِاِذْنِ رَبِّهٖ اللہ کی مشیت اور توفیق سے۔ اس لفظ سے یہ بتانا ہے کہ اس زمین کی پیداوار زیادہ اچھی اور فائدہ بخش ہوتی ہے اس کے مقابل جو اَلَّذِيْ خَبُثَ فرمایا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہو رہا ہے کہ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ سے پیداوار کی کثرت اور خوبی بیان کرنا مقصود ہے۔ اَلَّذِيْ خَبُثَ یعنی بری شور کلر زمین۔ نَكِدًا قلیل غیر مفید۔ قاموس میں ہے نَكِدًا بالضم، قلت عطاء بالفتح بھی آیا ہے۔ عطاء منکود قلیل عطاء، نکد عیشہم ان کی زندگی سخت اور تنگ ہوگئی۔ نکدا البئر کنویں کا پانی کم ہوگیا۔ نکدزید حاجتہ زید نے اس کی حاجت پوری نہیں کی اس کو منع کر دیا نکد زید فلانا زید نے اس کا سوال پورا نہیں کیا کچھ تھوڑا دیا۔ رجل نکد بدنصیب منحوس تنگدست۔ يَشْكُرُوْنَ جو اللہ کی نعمت کا شکر کرتے ہیں۔

سابقہ آیات میں اللہ کی قدرت کاملہ اور رحمت شاملہ کا اظہار کیا گیا تھا اس آیت میں یہ بتایا کہ رب فیاض کی رحمت اگرچہ عمومی ہے لیکن قبول کرنے والوں میں قابلیت کا تفاوت ہے۔ قبول فیض کی کمی قابلیت کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے بارش کا فیضان ایک جیسا ہے لیکن زمین کی صلاحیت و قابلیت کی تفاوت کی وجہ سے پیداوار میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

اسی طرح اظہار آیات، بیان دلائل اور بعثت انبیاء اگرچہ سب انسانوں میں عمومی رحمت ہے مگر اس رحمت سے بہرہ اندوز ہونا صرف ان مومنوں کی خصوصیت ہے جو ان نعمتوں کے قدرداں ہیں جن کی فطری صلاحیتیں اللہ کی اسم ہادی کے پرتو سے مستفاد ہیں اور انہی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے ذریعہ سے وہ ہدایت یاب ہوتے، دلائل پر غور کرتے اور آیات سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے جو ہدایت و علم عطا فرما کر مجھے بھیجا ہے اس کی مثال کثیر بارش کی طرح ہے جو زمین کے کسی اچھے ٹکڑے پر برستی ہے تو وہ خطہ اس کو قبول کر لیتا ہے جس سے سبزہ اور چارہ خوب پیدا ہوتا ہے اور کسی خشک بنجر خطے پر برستی ہے تو وہ بھی (اپنے احاطہ میں) پانی کو روک لیتا ہے (مگر پی نہیں سکتا اس لئے اس میں سبزہ نہیں پیدا ہوتا بلکہ) آدمی اس کو پیتے جانوروں کو پلاتے اور کھیتوں کو سینچتے اور ایک تیسرے ٹکڑے پر برستی ہے جو چٹیل سخت ہموار میدان ہوتا ہے وہ نہ تو اپنے احاطہ میں پانی کو روکتا ہے (کہ دوسروں کو ہی فائدہ ہو) نہ خود پیتا ہے کہ سبزہ پیدا ہو جائے۔ پس یہ مثال ہے ان لوگوں کی جو دینی سمجھ رکھتے ہیں۔ میری لائی ہوئی ہدایت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خود سمجھتے ہیں دوسروں کو سکھاتے ہیں اور ان لوگوں کی جو میرے پیام کی طرف قطعاً التفات نہیں کرتے اور خدا کی عطا کی ہوئی ہدایت کو قبول نہیں کرتے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ (بلا شبہ ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا)۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا محذوف قسم کا جواب ہے۔ یہ لام تقریباً بغیر قَدْ کے مستعمل نہیں کیونکہ اس قسم کا جملہ سننے کے بعد مخاطب کو مضمون جملہ کے وقوع کی توقع ہو جاتی ہے لہٰذا قَدْ کا آنا ضروری قرار پایا۔ حضرت نوحؑ کا نسب نامہ حسب ذیل ہے۔ نوحؑ بن لامک یا لمک بن متشوشلخ یا متوشخ بن خنوخ یا اخنوخ۔ ماں کا نام عوفہ یا فینوس بنت براٰلیک بن قتشولخ تھا۔ اخنوخ کا اسلامی نام ہی حضرت ادریس تھا۔ آپ ہی سب سے پہلے نبی ہیں، جنہوں نے قلم سے لکھنے کی ایجاد کی۔ اخنوخ بن مہلیل یا مہلائیل تھے۔ مہلیل کا باپ قینن یا قینان یا قانن، قانن کا باپ انوش یا انیش تھا اور انیش کے باپ حضرت شیثؑ بن حضرت آدمؑ تھے۔

مستدرک میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ نوح سے آدم تک دس پشتیں تھیں۔ طبرانی نے حضرت ابوذر کی روایت سے مرفوعاً بھی یہی لکھا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ حضرت ادریس حضرت نوح سے پہلے تھے۔ اکثر صحابہؓ کا یہی مسلمہ ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت نوح کا نام سکن یا شاکر یا شکر تھا۔ حضرت آدمؑ کے بعد آپ ہی کی ذات کی طرف لوگوں کا رجوع ہوا آپ سب کے ماوی اور مسکن تھے اس لئے سکن نام ہو گیا۔ سیوطی نے اتقان میں مستدرک کے حوالہ سے لکھا ہے کہ نوحؑ کا نام عبدالغفار تھا۔ چونکہ آپ نے اپنے اور اپنی قوم کے لئے کثرت سے گریہ کیا اس لئے نوح لقب ہو گیا یا قیامت کے خوف سے آپ پر گریہ کی کیفیت بہت طاری رہتی تھی اس لئے نوحؑ کہا گیا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ نے ایک بدصورت کتے کو دیکھ کر فرمایا زم اقلیما یعنی برا کتا ہے۔ اللہ نے کتے کو گویا کر دیا اور کتے نے کہا یہ عیب میرا خود ساختہ ہے یا خالق کی طرف سے ہے۔ یہ کلام سنتے ہی حضرت نوح بیہوش ہو گئے اور پھر ہوش آنے کے بعد خوب روئے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ آپ نے کوئی جذامی کتا دیکھا اور فرمایا خبیث دور ہو اس پر وحی آئی کہ تو نے کتے پر عیب لگایا یا مجھ پر۔ بعض نے کہا چونکہ آپ نے اپنی قوم کے لئے بددعا کی تھی (اور سب کو غرق کرا دیا تھا) اس لئے خوب روئے۔ یا اس بات پر گریہ کرتے تھے کہ میں نے اپنے بیٹے کنعان کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے اللہ سے گفتگو میں لوٹ بدل کیوں کی۔

چالیس سال کی عمر میں آپ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ مستدرک میں حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ چالیس سال کی عمر میں اللہ نے نوح کو نبی بنایا اور نو سو پچاس برس تک آپ اپنی قوم میں رہے اور اس کے لئے بددعا کرتے رہے اور طوفان کے بعد ساٹھ برس زندہ رہے۔

خلاصۃ السیر کی بعض روایات میں آیا ہے کہ پچاس برس کی عمر میں آپ کو نبوت ملی اور طوفان کے بعد ۳۵۰ برس زندہ رہے کل عمر ۱۴۵۰ برس ہوئی۔ بعض کا قول ہے چار سو پچاس یا ساٹھ برس کی عمر میں نبی ہوئے یا نبوت کے وقت ۲۵۰ برس کے تھا اور طوفان کے بعد ۲۵۰ برس رہے کل عمر ۱۴۵۰ برس کی ہوئی۔ مقاتل کا قول ہے کہ سو سال کی عمر میں نبوت ملی۔ ابن جریر کا بیان ہے کہ حضرت نوحؑ کی وفات حضرت آدمؑ کی پیدائش سے ۲۸۵۶ برس بعد ہوئی کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت آدمؑ کی عمر ۹۶۰ برس ہوئی کیونکہ آپ نے اپنی ہزار سالہ عمر میں سے ۴۰ برس حضرت داؤدؑ کو دے دیئے تھے۔ نووی نے تہذیب میں ذکر کیا ہے کہ تمام انبیاء سے آپ کی عمر زیادہ ہوئی۔

فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾

(پس نوحؑ نے کہا اے میری قوم اللہ واحد کی عبادت کرو تمہارا اس کے سوا کوئی معبود نہیں (اگر اللہ واحد کی بلا شرکت پوجا نہ کرو گے تو) مجھے ایک بڑے سخت دن (یعنی روز قیامت یا روز طوفان) کا تمہارے متعلق خوف ہے)۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾ (قوم کے سرداروں نے کہا ہم جانتے ہیں کہ تم صریح گمراہی میں پڑ گئے ہو)۔ الملأ سرداران جماعت۔ جب ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو لوگوں کی آنکھوں میں ان کی ہیبت بھر جاتی ہے اسی لئے ان کو ملأ کہا جاتا ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ

اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ (نوح نے کہا اے میری قوم مجھے کوئی بہکاوا نہیں بلکہ میں پروردگار عالم کا پیامبر ہوں تم کو اپنے رب کے احکام پہنچارہا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور خدا کی طرف سے ان امور کی خبر رکھتا ہوں جن کی تم کو خبر نہیں کیا (تم مجھے جھوٹا کہتے ہو اور) اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے رب کی طرف سے تم میں سے ہی ایک آدمی کی معرفت تمہارے پاس ایک یادداشت آگئی تاکہ وہ تم کو (اللہ کی نافرمانی سے) ڈرائے اور تم پرہیزگار بن جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے)۔

ضَلٰلَةٌ کوئی ادنیٰ گمراہی۔ ضلال گمراہی، چونکہ قوم والوں نے زوردار الفاظ میں حضرت نوحؑ کو گمراہ قرار دیا تھا اس لئے آپ نے بھی پرزور لہجہ میں گمراہی کی بالکل نفی کردی اور فرمایا مجھ میں ذرا سی بھی گمراہی نہیں گویا قوم والوں پر تعریض کی کہ گمراہ تم ہو۔ وَلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ یہ نفی گمراہی کی پرزور تاکید ہے۔ اللہ کا رسول جو اللہ کے احکام کا پیام بر ہو لامحالہ ہدایت یافتہ اور صراط مستقیم پر گامزن ہوگا (اس کا گمراہ ہونا ناممکن ہے)۔

رِسٰلٰتِ یہ رسالۃ کی جمع ہے۔ رِسٰلٰت کو بصیغۂ جمع ذکر کرنے کی وجوہ یہ ہیں۔ (۱) اوقات رسالت مختلف تھے۔ (۲) معانی رسالت میں تنوع تھا۔ کسی کا عقیدہ سے تعلق تھا کسی کا عمل سے کوئی وعظ تھا کوئی حکم۔ (۳) یا مراد وہ تمام پیامات و ہدایات ہیں جو گزشتہ انبیاء کو دیئے گئے تھے مثلاً حضرت شیثؑ اور حضرت ادریسؑ کے صحیفے وَاَنْصَحُ، نصح کا معنی ہے کسی کی خیر خواہی خواہ فعلی ہو یا قولی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ بہتری اور خیر ہوتی ہے جو آدمی اپنے لئے پسند کرتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی اسی کا طلب گار ہوتا ہے۔

باب بغیر لام کے بھی متعدی ہوتا ہے مگر لام کا اضافہ خلوص خیر خواہی پر دلالت کررہا ہے۔ مِنَ اللّٰهِ سے مراد یا تو مِنْ جِهَةِ اللّٰهِ ہے یعنی اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ سے یا یہ مراد ہے کہ میں اللہ کی ذات کو اور ثواب و عذاب پر اس کی قدرت کو اور ناقابل رہائی گرفت کو اتنا جانتا ہوں کہ تم نہیں جانتے۔ اَوَعَجِبْتُمْ میں ہمزہ استفہام انکار کے لئے ہے اور واؤ عاطفہ ہے اور معطوف علیہ محذوف ہے یعنی کیا تم مجھے جھوٹا قرار دیتے ہو اور تعجب کرتے ہو۔

ذِكْرٌ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یعنی نصیحت۔ بعض نے کہا بیان۔ بعض نے کہا رسالت، پیام۔ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ تمہاری جماعت میں سے یا تمہاری نوع میں سے یعنی ایک آدمی پر۔ کفار کو آدمی کے پیغمبر ہونے سے تعجب ہوتا تھا وہ کہتے تھے اگر اللہ چاہتا تو فرشتوں کو بھیجتا ایسی بات تو ہم نے پچھلے باپ دادا میں ہوتی نہیں سنی۔ لِيُنْذِرَكُمْ تاکہ تم کو کفر و معصیت کے برے انجام سے ڈرائے۔ وَلِتَتَّقُوْا اور تاکہ تم اس عذاب سے ڈرو جو کفر و معصیت کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے جب کہ تم تقویٰ اختیار کرو۔ لَعَلَّ حرف امید اس لئے ذکر کیا کہ تقویٰ موجب رحمت نہیں۔ رحمت تو اللہ کی ایک مہربانی ہے (جس کے حصول کا ذریعہ اللہ نے تقویٰ کو بنادیا ہے ورنہ تقویٰ سے قطعی طور پر مستحق رحمت ہو جانا اور رحمت کا واجب ہو جانا ضروری نہیں) متقی کو اپنے تقویٰ پر کامل اعتماد کر کے بے غم نہ ہونا چاہئے، بلکہ تقوے کے باوجود اللہ کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہئے۔

ابو نعیم نے حضرت علیؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر کی پاس وحی بھیجی کہ تمہاری امت میں جو طاعت گزار لوگ ہوں ان سے کہہ دو کہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کرلیں۔ قیامت کے دن حساب کے وقت میں جس کو عذاب دینا چاہوں گا عذاب دوں گا اور تمہاری امت میں جو گناہ گار ہیں ان سے کہہ دو کہ اپنے کو خود ہلاکت میں نہ ڈالو (یعنی ہلاکت کا یقین کر کے رحمت سے مایوس نہ ہو) کیونکہ میں بڑے بڑے گناہ بخش دوں گا اور مجھے پروانہ ہوگی۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ ع ۸/۱۵
(پھر انہوں نے نوح کی تکذیب کی (تو ہم نے طوفان بھیج دیا) پس نوح کو اور ان کے ساتھیوں کو کشتی میں

بچالیا اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھوٹا قرار دیا تھا ان کو غرق کردیا بے شبہ وہ اندھے لوگ تھے)۔
فَاَنْجَیْنٰهُ ہم نے نوح کو طوفان سے بچالیا۔ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ یہ چالیس مرد اور چالیس عورتیں تھیں یا آٹھ مرد یا دس مرد یا بہتر آدمی یا صرف تین بیٹے سام، حام، یافث اور ان کی تین بیویاں یا تین بیٹے اور چھ دوسرے مؤمن۔ یہ مختلف اقوال آچکے ہیں۔
فِی الْفُلْكِ اس کا تعلق مَعَهٗ سے ہے یعنی نوح کے ساتھ جو لوگ کشتی میں تھے یا اَنْجَیْنَا سے تعلق ہے یعنی ہم نے کشتی میں نوح کو اور ان کے ساتھیوں کو بچالیا۔ قَوْمًا عَمِیْنَ یعنی کافر کے دل اللہ کی معرفت اور حق و باطل میں امتیاز کرنے سے اندھے تھے عَمِیْنَ اَعْمٰی کی جمع ہے) اصل میں عمیین تھا تحقیقاً ایک یاء کو حذف کردیا۔
وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (اور ہم نے بھیجا (قوم) عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو)۔
عاد سے مراد قبیلۂ عاد ہے۔ عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوحؑ کی ذریت عاد اولیٰ کہلاتی ہے۔ اَخَاهُمْ هُوْدًا یعنی نسب (اور قومیت) کے اعتبار سے بھائی، دین کے لحاظ سے بھائی ہونا مراد نہیں ہے۔
حضرت ہود کا باپ عبداللہ بن ریاح بن خلود بن عاد بن عوص تھا۔ ابن اسحاق نے ہود کو شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح کا بیٹا کہا ہے۔ شیخ ابوبکر نے شرح خلاصۃ السیر میں لکھا ہے کہ ہود کا نام عابر یا عابر یا عیبر یا غیبر تھا اور آپ شالخ بن قینان بن ارفخشذ بن ہشام بن نوح کے بیٹے تھے۔ تمام کتب الانساب میں اسی طرح آیا ہے، لیکن ایک شاذ روایت یہ بھی آئی ہے کہ ہود بن خالد بن خلود بن عیص بن عملیق بن عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوحؑ تھے۔ ہود کی ماں کا نام مکعبہ بنت عویلم بن سام بن نوح تھا۔ حضرت ہود کی پیشانی میں رسول اللہ ﷺ کا نور چمکتا تھا جس کو دیکھ کر لوگ کہتے تھے یہ شخص اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرے گا، بتوں کو توڑے گا، اس خیال کے زیر اثر لوگ آپ کی تعظیم کرتے تھے۔ آپ کے بعد سو برس تک کوئی پیغمبر مبعوث نہیں ہوا، سو برس کے بعد حضرت صالح کی بعثت ہوئی۔ اس درمیانی زمانہ میں راجا اور پرجا سب بت اور سورج کی پوجا کرتے تھے اور کچھ لوگ آتش پرست بھی تھے۔ آخر اللہ نے حضرت صالح کو ثمود کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ حضرت ہود، حضرت نوحؑ کی شریعت پر تھے۔ آپ کی عمر ۴۰۰ برس یا ۴۶۰ برس ہوئی۔ تاریخ شامی میں ابن حبیب کا قول نقل کیا ہے کہ ہودؑ کی عمر ۴۱۳ سال ہوئی۔ ابن کلبی نے ۴۶۴ برس کی عمر بتائی ہے اور ماں کا نام مرجانہ لکھا ہے آپ کی قبر حضر موت میں اور بعض کے نزدیک مکہ میں ہے، انتہی کلام الشیخ ابی بکر۔
بغویؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت سے لکھا ہے کہ ہود کی قبر حضر موت میں سرخ ٹیلے پر واقع ہے۔ عبدالرحمن بن سابط کا بیان ہے کہ رکن اور مقام اور زمزم کے درمیان ننانوے پیغمبروں کی قبریں ہیں انہی میں ہودؑ، صالحؑ اور شعیبؑ کی بھی قبریں ہیں۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ جب کسی پیغمبر کی امت (عذاب سے) تباہ ہوجاتی تو وہ پیغمبر مؤمنوں کی جماعت لے کر مکہ میں چلا آتا تھا اور اس جگہ مرتے دم تک سب لوگ اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے تھے اور یہیں مر کر دفن ہوجاتے تھے۔ بھائی ہونے سے مراد ابن اسحاق کے نزدیک تو نسبی بھائی ہے اور شیخ ابوبکر کے نزدیک قوم عاد کا ہم جنس ہونا۔ عاد میں سے ہی ایک شخص کو پیغمبر بنانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اپنے آدمی کی بات کو خوب سمجھ سکتے تھے اس کے حال کو خوب جانتے تھے اور اسی کی پیروی کرنے کی ان کو رغبت ہوسکتی تھی (غیر کی بات نہ کوئی سمجھتا ہے، نہ اس کے حال کو جانتا ہے، نہ حمیت جاہلی کسی غیر کی پیروی کرنے دیتی ہے)۔

قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۶۶﴾ (ہودؑ نے کہا اے میری قوم (تنہا) اللہ کی پوجا کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی واقعی معبود نہیں کیا تم (دوسروں کی پوجا کرتے ہو اور اس کے عذاب سے) نہیں ڈرتے۔ قوم ہود کے کافروں میں سے زور دار لوگوں نے جواب دیا کوئی شک نہیں کہ ہم تم کو حماقت میں مبتلا پاتے ہیں اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ تم جھوٹوں کے گروہ میں سے ہو)۔

قَالَ یٰقَوْمِ جملہ استینافیہ ہے اسی لئے فَقَالَ نہیں فرمایا تَتَّقُوْنَ کا مفعول محذوف ہے یعنی کیا تم اللہ کے عذاب سے نہیں ڈرتے۔ حضرت ہودؑ کی قوم حضرت نوحؑ کی قوم سے ملتی جلتی تھی۔ الذین کفروا الملاء کی صفت تقییدی ہے۔ اس شرط کو بڑھانے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ہودؑ کی قوم کے کچھ سردار ایمان لے آئے تھے جیسے مرثد بن سعد اور حضرت نوح کی قوم کا کوئی سردار ایمان نہیں لایا تھا (اس لئے حضرت نوحؑ کے قصہ میں الملأ کے بعد کفروا کی شرط لگانے کی ضرورت نہیں تھی) فِیْ سَفَاهَةٍ سفاہت، سبک سری، حماقت یعنی سرداروں نے کہا تم احمق ہو۔ اپنی قوم کے دین کو تم نے چھوڑ دیا اور ایک ناممکن امر یعنی رسالت کا دعویٰ کر بیٹھے یہ سبک سری ہے فِیْ سَفَاهَةٍ کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ سفاہت پر تم جم گئے یہ سبک سری تم سے کبھی دور نہیں ہوگی۔ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ یعنی رسالت کا دعویٰ کرنے میں تم جھوٹے ہو۔

قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۷﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ﴿۶۸﴾ (ہودؑ نے کہا اے میری قوم مجھ میں کوئی حماقت نہیں ہے بلکہ میں تو رب العلمین کا پیغامبر ہوں اپنے رب کے احکام تم کو پہنچا رہا ہوں اور تمہارا خیر خواہ ہوں اور (پیام رسالت کا) امین ہوں)۔

وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ یعنی میں جس امر کی تم کو دعوت دے رہا ہوں اس میں تمہارا مخلص، خیر خواہ ہوں۔ کافروں نے جملہ اسمیہ بولا تھا اور کہا تھا اِنَّا لَنَظُنُّكَ اس کے مقابلہ میں حضرت ہودؑ نے بھی نَاصِحٌ بصیغۂ اسم فاعل فرمایا۔ کلبی نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں آج تک تمہارے اندر رہا اور امین رہا لہٰذا اب مجھ پر جھوٹے ہونے کی بدگمانی کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ حضرت انبیاء واقف تھے کہ کافر انتہائی گمراہ اور احمق ہیں لیکن انہوں نے تہذیب اور حلم سے کام لے کر مقابلہ سے پہلو تہی کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء اپنی امتوں کے کتنے بہی خواہ، کافروں پر کتنے مہربان، قوت برداشت میں کتنے کامل اور حسن خطاب کے ذریعہ دلوں کو ہدایت کی طرف کس قدر کھینچنے والے تھے۔ اس گفتگو کو نقل کر کے اللہ نے بندوں کو تعلیم دی ہے کہ بے وقوفوں سے کس طرح خطاب کیا جائے۔

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِیُنْذِرَكُمْ ؕ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِی الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

(کیا (تم نے تکذیب کی اور) اس بات سے تمہیں تعجب ہوا کہ تم میں سے ایک آدمی پر تمہارے رب کی طرف سے ایک یاد داشت آگئی تاکہ وہ تم کو (کفر و معصیت کے عذاب سے) ڈرائے، یاد کرو کہ قوم نوح (کو ہلاک کرنے) کے بعد اس نے تم کو اس کا جانشین بنایا اور ڈیل ڈول میں تم کو لمبائی چوڑائی زیادہ عطا کی۔ اللہ کے ان احسانات کو یاد کرو تاکہ تم کو فلاح حاصل ہو)۔

بَصْطَةً لمبائی اور قوت۔ کلبی اور سدی نے کہا قوم ثمود میں سب سے لمبا آدمی سو ہاتھ کا اور سب سے چھوٹا ستر ہاتھ کا ہوتا تھا۔ ابو حمزہ یمنی نے صرف ستر ہاتھ کہا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے قول میں اسی ۸۰ ہاتھ مروی ہے۔ مقاتل نے بارہ ہاتھ کی لمبائی بتائی ہے۔ وہب نے کہا بعض آدمیوں کے سر گنبد معلوم ہوتے تھے اور آنکھیں اور ناک کان کے سوراخ اتنے بڑے تھے کہ بجو اس میں بچے دیں۔ اٰلَآءَ کا واحد اِلًی ہے۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یعنی نعمت کو یاد کرو۔ نعمت کی یاد موجب شکر ہوگی اور شکر موجب فلاح۔

قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۷۰﴾

(قوم والوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس (کہیں باہر سے یا آسمان سے) اس لئے آیا ہے کہ ہم صرف اللہ ہی کی پوجا کریں اور جن (بتوں وغیرہ) کی ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے ان کی پوجا چھوڑ دیں اگر تو سچا ہے تو جس (عذاب) کی تو ہم کو دھمکی دے رہا ہے اس کو ہم پر لے آ) مَا كَانَ سے مراد ہیں بت اور آنے سے مراد ہے کہیں دوسری جگہ سے آنا یا آسمان سے آنا۔ موخر الذکر معنی اس وقت مراد ہوگا جب یہ لفظ کافروں نے بطور استہزاء کہا ہو۔ یا قصد کرنا بطور مجاز ہو یعنی تیرا ارادہ یہ ہے کہ ہم بتوں کو چھوڑ کر صرف اللہ کی پوجا کریں۔ مَا تَعِدُنَا سے عذاب کی وہ دھمکی مراد ہے جو اَفَلَا تَتَّقُوْنَ سے

مستنبط ہورہی ہے، یہ ممکن ہے حضرت ہودؑ نے ان کو دھمکی صراحۃً دی ہو۔

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ۭ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَاۗءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾

(ہودؑ نے کہا بس اب تم پر تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غضب آیا ہی چاہتا ہے کیا تم مجھ سے ایسے (فرضی معبودوں کے) ناموں کے باب میں جھگڑ رہے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے (خود ہی) رکھ لئے ہیں اللہ نے ان کی (صداقت و حقانیت کی) کوئی دلیل نہیں اتاری سو تم منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کررہا ہوں)۔ قَدْ وَقَعَ یعنی عذاب واجب ہو چکایا استحقاق عذاب ہو چکایا عنقریب آنے والا ہے گویا آ ہی گیا۔ مستقبل میں یقینی ہونے والے فعل کی تعبیر ماضی سے کرلی جاتی ہے۔

رِجْسٌ عذاب یہ لفظ ارتجاس سے نکلا ہے جس کا معنی ہے اضطراب۔ بعض اہل لغت کے نزدیک رِجْسٌ کا سین بجائے ز کے آیا ہے اصل لفظ رجز ہے صحاح میں ہے، رِجْسٌ اور رجز کا معنی ہے دھماکہ، چیخ، غضب یعنی انتقال کا ارادہ۔ اسماء یعنی وہ بت جن کے نام رکھ لئے ہیں گویا اسم سے مراد مسمی ہے۔ اسماء سے مراد ایسے نام ہیں جن کے مسمی محض فرضی اور بے حقیقت ہیں جیسے یونانی فلاسفہ نے عقول عشرہ (دس عقلیں) یا ہندوؤں نے دیبی اور بھوانی جیسے نام خود گڑھ لئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہ فرضی حقیقتیں ان بتوں کے اندر حلول کئے ہوئے ہیں۔

سُلْطٰنٍ دلیل اور برہان جو ان کا معبود ہونا یا مستحق عبادت ہونا ثابت کررہی ہو۔ اس قول کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اللہ کو آسمان وزمین کا خالق تو مانتے تھے مگر الوہیت اور خالقیت یا استحقاق عبادت میں دوسروں کو بھی شریک سمجھتے تھے، کیونکہ ان کے خیال میں بعض مخلوق اللہ سے ان کی سفارش کرنے والی تھی لہٰذا پوجا کی بھی مستحق قرار پاتی تھی۔ حضرت ہودؑ نے اس پر فرمایا تمہارے اس دعوے کی کوئی عقلی نقلی دلیل اللہ کی طرف سے نہیں، یہ سب تمہاری اور تمہارے باپ دادا کی من گھڑت ہے۔ پس جس عذاب کی میں نے تم کو دھمکی دی ہے اور جس کے آنے کی تم درخواست کررہے ہو اس کے منتظر رہو۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾

(غرض (عذاب آیا) اور ہم نے ہودؑ کو اور ہود کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے (عذاب سے) بچالیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور ایمان دار نہ تھے)۔

دَابِرَ جڑ یا پیچھے آنے والی (نسل) جڑ کاٹ دینے سے مراد ہے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا اور سب کو ہلاک کردینا کہ کوئی بھی باقی نہ رہا۔ وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ اس سے درپردہ ان لوگوں کی حالت کا بیان ہو گیا جو ایمان لے آئے تھے اور اس بات پر تنبیہ بھی ہوگئی کہ ایمان ہی نجات و ہلاکت کے درمیان فارق تھا (مومن کو بچالیا گیا اور غیر مؤمن کو ہلاک کردیا گیا)۔

قوم عاد کا قصہ

محمد بن اسحاق وغیرہ نے لکھا ہے کہ احقاف یعنی عمان و حضرموت کے درمیان ریگستان میں قوم عاد رہتی تھی، اللہ نے اس کو ڈیل ڈول اور جسمانی طاقت بہت زیادہ عطا فرمائی تھی لیکن انہوں نے خداداد طاقت سے ملک میں تباہی مچار کھی تھی اور چاروں طرف کے لوگوں کو روند ڈالا تھا۔ یہ لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے ان کے تین بت تھے صدا، سمود، ہبا۔ اللہ نے ان کے ایک درمیانی خاندان کے ایک شخص ہودؑ کو ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا۔ حضرت ہودؑ اگرچہ متوسط النسب تھے مگر اخلاق و فضائل ذاتی میں سب سے برتر تھے۔ حضرت ہودؑ نے قوم کو توحید کی دعوت دی اور حکم دیا کہ کسی پر ظلم نہ کرو اس سے زیادہ اور کسی بات کا حکم نہیں دیا۔ قوم نے آپ کی تکذیب کی اور بولے ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے۔ ان لوگوں نے عظیم الشان عمارتیں اور کارخانے بنائے تھے اور جابرانہ اقتدار پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اس سرکشی کی پاداش میں اللہ نے تین برس تک ان سے بارش روک لی جس کی وجہ سے لوگ سخت دکھ اور بے چینی میں مبتلا ہو گئے۔ اس زمانہ کا دستور تھا کہ جب کوئی لاینحل مصیبت آتی تو (مشرک بھی) اللہ کی

طرف رجوع کرتے تھے اور کعبہ کو جاکر مسلم اور مشرک سب مختلف المذاہب لوگ حرم میں جمع ہو کر دعا کرتے تھے۔ مکہ میں اس زمانہ میں عمالقہ یعنی عملیق بن لاادر بن سام بن نوح کی اولاد رہتی تھی جن کا سردار معاویہ بن بکر تھا۔ معاویہ کی ماں کلہدہ بنت الخیبر تھی۔ الخیبر قوم عاد ہی کا ایک فرد تھا۔ گویا معاویہ بن بکر کی ننھیال قوم عاد میں کی تھی اسی ناطہ سے قیل بن عنز اور یقیم بن ہزال بن ہزیل اور عتیل بن ضد بن عاد اکبر اور مرثد بن سعد بن عفیر (یہ شخص در پردہ مؤمن تھا) اور معاویہ بن بکر کا ماموں جیثمہ بن جیثر ہر ایک اپنے اپنے قبیلہ کے کچھ لوگوں کو لے کر مکہ کو چل دیا۔ پھر لقمان بن عاد اصغر بن عاد اکبر کو عاد والوں نے بھیج دیا، غرض مجموعی تعداد ستر ہو گئی سب لوگ مکہ پہنچ کر معاویہ بن بکر کے پاس ٹھہرے اور ایک مہینہ تک ٹھہرے رہے روز شرابیں پیتے اور معاویہ بن بکر کی دو خوش آواز گانے والی باندیاں جن کو جرادتین کہا جاتا تھا ان کو گانا سناتی تھیں۔ اس طرح دو مہینے گزر گئے۔ ایک مہینہ میں تو پہنچے ہی تھے اور ایک مہینہ قیام میں گزرا۔ معاویہ بن بکر نے کہا یہ لوگ آئے تو فریاد اور دعا کرتے مگر غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہاں میرے ننھیال والے تباہ ہو رہے ہیں لیکن کیا کیا جائے یہ مہمان ہیں ان کو نکالتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے اگر میں ان سے کہتا ہوں کہ جس کام کے لئے آئے تھے اس کی تکمیل کے لئے جاؤ تو یہ خیال کریں گے کہ میں ان کی مہمانی سے تنگ آگیا ہوں، ادھر لوگ بھوکے پیاسے مر رہے ہوں گے۔ اسی شش و پنج میں تھا کہ اپنی باندیوں سے مشورہ طلب کیا باندیوں نے کہا آپ کچھ شعر کہہ دیں۔ ہم وہ شعر یاد کر کے ان کے سامنے گائیں گی۔ گانا سن کر ضرور ان میں حرکت پیدا ہو گی اور معلوم بھی نہ ہو کہ ان شعروں کا تصنیف کرنے والا کون ہے۔ معاویہ نے اس رائے کو پسند کیا اور حسب ذیل شعر کہے۔

”اے قیل اور ہیثم اٹھ شاید اللہ بارش سے ہم کو سیراب فرمادے جس سے قوم عاد سیراب ہو ان لوگوں کی تو ایسی حالت ہو گئی ہے کہ سخت پیاس کی وجہ سے بات بھی نہیں کر سکتے، نہ بوڑھے کی امید ہے، نہ بچے کی۔ پہلے عورتیں عافیت سے تھیں مگر اب عورتیں بھی سخت پیاسی ہو گئیں۔ قوم عاد کو کھانے کے لئے علی الاعلان درندے گشت کر رہے ہیں اور کسی عاد والے کے تیروں کا ان کو اندیشہ نہیں اور تم لوگ یہاں مزے میں سارے دن رات گزار رہے ہو۔ اے وفد والو تمہارا برا ہو تم کو سلامتی اور خوش آمدید نصیب نہ ہو۔“

باندیوں نے یہ اشعار گائے تو وفد والے آپس میں کہنے لگے تم کو قوم نے آئی ہوئی مصیبت کو ٹالنے کی دعا کرنے بھیجا تھا اور تم نے یہاں تاخیر کر دی، اب حرم میں چلو اور قوم کے لئے بارش کی دعا کرو۔ مرثد بن مسعود بن عفیر جو در پردہ مؤمن ہو گیا تھا بولا خدا کی قسم تمہاری دعاؤں سے بارش نہیں ہو گی ہاں اگر اپنے نبی کا حکم مانو گے اور اپنے رب سے توبہ کرو گے تو بارش ہو گی۔ اس وقت مرثد نے اپنا اسلام ظاہر کر دیا اور مندرجہ ذیل شعر کہے۔

”عاد نے اپنے پیغمبر کی نافرمانی کی جس کی وجہ سے پیاسے ہو گئے آسمان ان پر ایک قطرہ نہیں برساتا ان کا ایک بت ہے جس کو صمود کہا جاتا ہے اور اس کے سامنے صداء اور ہبا بھی ہیں۔ اللہ نے رسول کے ذریعہ سے ہم کو راہ ہدایت دکھائی ہم نے سیدھا راستہ دیکھ لیا اور نابینائی جاتی رہی جو معبود ہود کا ہے وہی میرا معبود ہے اللہ ہی پر بھروسہ ہے اور اسی سے آس ہے۔“

اہل وفد نے معاویہ بن بکر سے کہا مرثد کو روک لو یہ ہمارے ساتھ مکہ کو نہ جائے لیکن مرثد بن سعد معاویہ کے گھر سے نکل گیا اور وفد والوں کو دعا کرنے سے پہلے ہی جا پکڑا جس مصیبت کو دور کرنے کی دعا کرنے کے لئے نکلے تھے اگر دعا کر چکتے تو اس سے سنگین مصیبت میں سب گرفتار ہو جاتے۔ مگر دعا کرنے سے پہلے ہی مرثد آپہنچا۔ ادھر اہل وفد دعا کرنے کھڑے ہوئے اور ادھر مرثد نے علیحدہ دعا کرنی شروع کی۔ اے اللہ تنہا میرا سوال میرے لئے پورا کردے اور وفد والے جو دعا کر رہے ہیں اس میں مجھے شامل نہ فرما۔ قیل بن عنز وفد کا سردار تھا اس لئے وفد والوں نے دعا کی اے اللہ قیل کی دعا قبول فرما اور ہماری درخواست کو اس کی دعا کے ساتھ شامل کر دے۔ اس دعا کے وقت لقمان بن عاد جو قوم عاد کا ایک سردار تھا الگ رہا۔ جب وفد والے دعا کر چکے

تو لقمان نے دعا کی الٰہی میں تیرے سامنے تنہا اپنی گزارش لے کر آیا ہوں میری دعا قبول فرما۔ یہ کہہ کر لقمان نے اپنے لئے درازی عمر کی دعا کی چنانچہ اس کی عمر سات گِدوں کی برابر ہوئی۔ قیل بن عنز نے دعا کی تھی الٰہی اگر ہودؑ سچے ہیں تو ہم کو سیراب فرما ہم مرے جا رہے ہیں۔ دعا کے نتیجہ میں اللہ نے تین رنگ کے بادل نمودار فرمائے سفید، سرخ، سیاہ اور ابر میں سے ایک منادی نے ندا دی اے قیل اپنے اور اپنی قوم کے لئے ان بادلوں میں سے ایک کا انتخاب کر لے۔ قیل نے کہا میں کالے بادل کا انتخاب کرتا ہوں، کالی گھٹا سے خوب بارش ہوتی ہے۔

منادی نے ندا دی تو نے راکھ پسندکی، قوم عاد میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا۔ اس کے بعد وہ کالا بادل جس کا انتخاب قیل نے کیا تھا۔ اپنے سارے عذاب کو لے کر عاد کی طرف روانہ ہو گیا اور قوم کی بستیوں پر پہنچ کر کالی گھٹا بن گیا لوگ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے اس ابر سے ہم پر ضرور بارش ہو گی۔ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا نہیں بلکہ یہ وہ عذاب ہے جس کے جلد آ جانے کے تم خواستگار تھے، یہ ایک آندھی ہے جس کے اندر دردناک عذاب ہے۔ یہ آندھی اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر دے گی۔ بادل کے اندر سب سے پہلے ایک عورت کو جس کا نام مہدر تھا تباہ کن طوفان دکھائی دیا اور طوفان کو دیکھ کر وہ بیہوش ہو گئی کچھ دیر کے بعد ہوش میں آئی اور لوگوں نے پوچھا تجھے کیا نظر آیا تو کہنے لگی میں نے آگ کے شعلوں کی طرح ایک آندھی دیکھی جس کو کچھ لوگ (جانور کی طرح) کھینچ کر لا رہے تھے اللہ نے یہ طوفان قوم عاد پر سات رات اور آٹھ دن مسلط رکھا جس نے ہر چیز کو تباہ کر دیا۔ قوم عاد میں سے کوئی زندہ نہ بچا، البتہ حضرت ہود اور آپ کے مؤمن ساتھی ایک باڑہ بنا کر اس کے اندر بیٹھ کر امن سے رہے۔ طوفانی ہوا اندر آتی تو نرم ہوا بن کر بدن پر لگتی اور پر نشاط تنفس کا سبب بن جاتی تھی اور لدی ہوئی اونٹنیوں کو لگتی تو اٹھا کر اوپر لے جاتی اور کہیں پتھروں سے جا پٹکتی تھی۔ دعا کرنے کے بعد مکہ سے لوٹ کر عاد کا وفد پھر معاویہ بکر کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔ عاد کی مصیبت کو تیسرا روز تھا کہ ایک اونٹنی سوار چاندنی رات میں وفد کے پاس آ پہنچا اور واقعہ کی اطلاع دی۔ اہل وفد نے پوچھا جب تم روانہ ہوئے تھے تو ہود اور ان کے ساتھی کہاں تھے مخبر نے کہا میں نے ان کو سمندر کے ساحل پر چھوڑا تھا لوگوں کو اس کے بیان میں شک ہوا لیکن ہرملہ بنت بکر نے کہا رب مکہ کی قسم اس نے سچ کہا ہے۔

اہل روایت نے لکھا ہے کہ مرثد بن سعد لقمان بن عاد اور قیل بن عنز کی دعائیں مکہ میں قبول ہو گئی تھیں اور ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ تمہاری درخواستیں منظور ہیں تم اپنے لئے سوال کا انتخاب کر لو ہاں موت ضرور آئے گی دوامی زندگی حاصل ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔ چنانچہ مرثد نے دعا کی الٰہی مجھے سچائی اور نیکی عطا کر، اس کی دعا قبول ہو گئی۔ لقمان نے دعا کی الٰہی مجھے عمر عطا کر دریافت کیا گیا جتنی پسند کرو۔ لقمان نے سات گِدوں کی عمر پسند کی، دعا قبول ہوئی۔ لقمان نے یہ دستور بنا لیا کہ گِد کا نر بچہ انڈے سے نکلا ہوا پکڑ لیتا تھا اور اس کو اپنے پاس رکھتا تھا جب اپنی عمر پر وہ مر جاتا تو دوسرا بچہ پکڑ لیتا تھا اس طرح سات بچے اس نے ایک کے بعد ایک پکڑ کر پالے، ہر گِد کی عمر اسی سال ہوئی آخری گِد لبد تھا جب لبد بھی مر گیا تو لقمان کا بھی اس کے ساتھ انتقال ہو گیا۔ قیل نے کہا جو حال میری قوم کا ہو وہی میرا ہو۔ ندا آئی ان کے لئے تو ہلاکت مقدر ہے قیل نے کہا مجھے پروا نہیں ان کے بعد زندہ رہنے کی ضرورت نہیں چنانچہ جو عذاب قوم پر آیا تھا وہی اس پر آیا اور یہ بھی ہلاک ہو گیا۔

سدی کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بغیر بارش کا ایک طوفان مسلط کیا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اونٹنیوں کو ان کے بار سمیت طوفان اٹھا کر آسمان اور زمین کے درمیان لے جا رہا ہے تو بھاگ کر گھروں میں گھس گئے اور دروازے بند کر لئے مگر طوفان نے وہاں بھی نہ چھوڑا دروازے اکھاڑ کر اندر گھس کر سب کو ہلاک کر دیا اور لاشوں کو باہر لا کر پھینک دیا اس کے بعد اللہ نے سیاہ رنگ کے کچھ پرندے بھیج دیئے اور پرندوں نے لاشوں کو اٹھا کر سمندر میں جا پھینکا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ طوفان نے ان پر ریت پاٹ دیا۔ سات رات اور آٹھ دن وہ ریت میں دبے رہے ریت کے اندر سے ان کے کراہنے کی آواز آتی تھی۔ پھر ہوا نے ان کے اوپر سے ریت اڑا دیا اور اٹھا کر ان کو سمندر میں جا گرایا۔ ہمیشہ ہوا ایک خاص اندازہ سے چلتی ہے مگر اس روز اس کی رفتار کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا اندازہ کرنے والے بھی اندازہ کرنے سے عاجز ہو گئے۔

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًاۘ (اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے (نسبی) برادر صالح کو بھیجا)۔ دینی بھائی مراد نہیں ہے۔ ثمود بن عاثر بن ارم بن سام کی اولاد قبائل ثمود کے نام سے موسوم ہے۔ پانی کی کمی کی وجہ سے اس قبیلہ کا نام ثمود ہوا کیونکہ ثمد الماء کا معنی ہے پانی کم ہو گیا۔ ثمود کی بستیاں حجاز اور شام کے درمیان حجر میں وادی قریٰ تک تھیں۔ حضرت صالح عبید بن آسف بن ماسح یار باح بن عبید بن حاذر بن ثمود کے بیٹے تھے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ (صالح نے کہا اے میری قوم (تنہا) اللہ کو پوجو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے)۔

قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل آچکی ہے۔ یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل ہے سو اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرا کرے اس کو برائی کے ساتھ ہاتھ بھی نہ لگانا کبھی تم کو دردناک عذاب آپکڑے۔ بینۃ واضح دلیل جو معجزہ ہونے کی وجہ سے سچائی پر دلالت کر رہی ہے۔ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ جملہ استینافیہ ہے۔ نَاقَةُ اللّٰهِ میں اضافت اونٹنی کی عظمت کو ظاہر کر رہی ہے یا اللہ کی اونٹنی ہونے کا یہ معنی ہے کہ بغیر معمولی اسباب اور مقررہ ذرائع کے براہ راست اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے۔ اسی بناء پر وہ اللہ کی قدرت کی خالص نشانی ہے۔ اٰيَةً حال ہے۔ تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ (مفعول محذوف ہے) یعنی اللہ کی زمین میں چارہ کھاتی رہے۔ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ کسی قسم کا دکھ پہنچانے سے پہلے ہاتھ لگانا ضروری ہے اور جب برائی کے ساتھ چھونے کی ممانعت کر دی تو ہر قسم کا دکھ دینے کی پرزور کامل ممانعت ہو گئی۔ فَيَاْخُذَكُمْ یہ نہی کا جواب ہے (ورنہ تم کو آپکڑے گا)۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾ (اور تم یہ حالت یاد رکھو کہ اللہ نے تم کو عاد کے بعد آباد کیا اور تم کو زمین پر رہنے کو ٹھکانا دیا کہ نرم زمین پر محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں گھر بناتے ہو، سو اللہ کے ان احسانوں کو یاد کرو اور زمین میں تباہی پھیلاتے مت پھرو)۔

بَوَّاَكُمْ تم کو جگہ دی، تم کو بسایا، فِي الْاَرْضِ یعنی حجر کی سرزمین میں، تَتَّخِذُوْنَ تم بناتے ہو تعمیر کرتے ہو۔ مِنْ سُهُوْلِهَا یعنی میدانی زمین میں (مِنْ بمعنی فِيْ ہے) یا نرم زمین سے یعنی نرم زمین کی اینٹیں کچی یا پکی بنا کر تَنْحِتُوْنَ پہاڑوں کے اندر سوراخ اور غار بناتے ہو۔ بُيُوْتًا مفعول بہ ہو جائے گا یا بُيُوْتًا حال مقدرہ ہے جیسے خطت هذا الثوب قميصا۔ قوم ثمود والے گرمی کے زمانہ میں مٹی (کچی پکی اینٹوں) کے مکانوں میں رہتے تھے اور سردی میں پہاڑوں کے اندر غار کھود کر ان کو کمروں کی طرح بنا کر رہتے تھے۔ وَلَا تَعْثَوْا، عثو (مصدر) سخت ترین فساد۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾ (صالح کی قوم میں جو متکبر سردار تھے انہوں نے غریب لوگوں میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے کہا کیا تم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالح اپنے رب کے فرستادہ ہیں۔ غریب مؤمنوں نے کہا بے شک ہم تو اس پر پورا یقین رکھتے ہیں جو ان کو دے کر بھیجا گیا ہے۔ متکبر لوگ کہنے لگے تم کو جس بات کا یقین ہو گیا ہے ہم اس کے منکر ہیں)۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا سے بڑے سردار اور لیڈر مراد ہیں جو حضرت صالح پر ایمان لانے کو اپنی ذلت سمجھتے تھے اور اس سے ناک منہ چڑھاتے تھے۔ اَلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا سے کمزور غریب طبقہ مراد ہے جن کو مغرور لوگ حقیر اور ضعیف سمجھتے تھے۔ لِمَنْ اٰمَنَ یا اَلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا سے بدل کل ہے یعنی اَلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا وہی مؤمن لوگ تھے یا بدل بعض ہے یا کمزور اور

غریبوں میں سے صرف مومنوں سے کہتے تھے۔ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا یہ بات انہوں نے صرف استہزاء کے طور پر کہی تھی۔
قَالُوْٓا اِنَّا اس تفصیلی جواب کی ضرورت نہ تھی صرف ہاں کہہ دینا کافی تھا لیکن تفصیلی جواب دے کر اہل ایمان یہ بتادینا چاہتے تھے کہ صالح کی نبوت تو ایسی یقینی چیز ہے کہ کسی سمجھدار آدمی کو اس میں شک کرنا ہی نہ چاہئے۔ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا یہ بطور مقابلہ مؤمنوں کے قول کی تردید ہے اُرْسِلَ بِهٖ کی جگہ اٰمَنْتُمْ بِهٖ کہنے سے اس بات پر تنبیہ تھی کہ جو تمہارا مسلمہ ہے وہ محض مفروضہ ہے جو واقع کے خلاف ہے۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۷۷

(غرض انہوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے اے صالح جس (عذاب) کی تو ہم کو دھمکی دیتا تھا اس کو ہم پر لے آ اگر تو پیغمبر ہے)۔

عَقَرُوْا یعنی انہوں نے قتل کر دیا۔ زہری نے کہا عقر کا معنی ہے اونٹ کی کونچیں کاٹ دینا پھر اونٹ کو ذبح کرنے کو بھی کہا جانے لگا کیونکہ جو اونٹ بھاگ جاتا تھا اول اس کی کونچیں کاٹی جاتی تھیں پھر اس کو قتل کیا جاتا تھا (بغیر کونچ کاٹے وہ قابو میں نہ آتا تھا) قاموس میں ہے عقر زخمی کر دینا اور اونٹ یا گھوڑے کی ٹانگ کو مجروح کر دینا۔ صحاح میں ہے عقر الدار اصل مکان عقر الحوض حوض کی جڑ۔ اسی سے ہے عقرت النخل میں نے کھجور کا درخت جڑ سے کاٹ دیا۔ عقرت البعیر میں نے اونٹ کو نحر کر دیا۔

قتل کرنے والا اگرچہ صرف قذار بن سالف تھا لیکن چونکہ سب کی رضامندی سے یہ فعل ہوا تھا اس لئے قتل کی نسبت سب کی طرف کر دی۔ قذار ایک ٹھگنا نیلی آنکھوں والا سرخ رنگ کا آدمی تھا جیسے فرعون تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا تھا گزشتہ لوگوں میں سب سے بڑا شقی صالح کی اونٹنی کو قتل کرنے والا تھا اور آنے والے لوگوں میں سب سے بڑا شقی تیرا قاتل ہوگا۔

عَتَوْا عتو کا معنی ہے باطل میں غلو کرنا۔ حد سے زیادہ باطل میں گھس جانا۔ عَتٰى يَعْتُوْ عُتُوًّا مغرور ہو گیا۔ قاموس میں ہے عتوا عتوا عتیا (تینوں مصدر ہیں) غرور کرنا حد سے آگے بڑھ جانا۔ عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ یعنی اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرنے سے۔ حکم وہی تھا جو حضرت صالحؑ نے ان کو پہنچایا تھا اور فرمایا تھا۔ فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ الخ۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۷۸ (پس زلزلہ نے ان کو آپکڑا جس کی وجہ سے وہ اپنے گھر (بستی) میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے)۔

اَلرَّجْفَةُ زلزلہ بھونچال۔ قوم ثمود کی ہلاکت ایک سخت چیخ (کڑک) اور زلزلہ سے ہوئی تھی۔ دَارِهِمْ دار سے مراد ہے دنیا۔ بعض کے نزدیک ان کی سرزمین اور ان کی بستی مراد ہے (یعنی مکان مراد نہیں ہے) اسی لئے دار بصیغۂ مفرد ذکر کیا ہے (اگر مکان اور گھر مراد ہوتا تو دیار یا دور بصیغۂ جمع ذکر کیا جاتا) جٰثِمِيْنَ بے جان مردے۔ قاموس میں ہے جثم الطائر و الانسان پرندہ اور انسان اپنی جگہ چمٹ کے رہ گیا اپنی جگہ سے ہٹ نہ سکا۔ بعض کے نزدیک جٰثِمِيْنَ سے مراد یہ ہے کہ بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی مرے رہ گئے۔ الناس جثم کا معنی یہ ہے کہ لوگ سن بیٹھے ہیں جن میں کوئی حرکت نہیں، نہ کوئی بات کرتا ہے۔ بعض نے کہا سب کے سب مردہ ہو کر منہ کے بل گر پڑے۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝۷۹

(اس وقت صالح ان سے منہ موڑ کر چلے اور کہا اے میری قوم میں نے تو تم کو اپنے رب کا حکم پہنچا دیا تھا اور تمہاری خیر خواہی کی تھی لیکن تم خیر خواہوں کو ہی پسند نہیں کرتے تھے۔)

......ایک شبہ......

زلزلہ سے ساری قوم ہلاک ہو چکی تو پھر ان مردوں کو حضرت صالح نے کس طرح مخاطب بنایا اور لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ الخ کس سے فرمایا۔

ازالہ

مردوں سے خطاب رسول اللہ ﷺ نے بھی کیا تھا۔ بدر کے مقتولین کو جب ایک گڑھے میں ڈال دیا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے (نام لے لے کر) ان کو مخاطب بنایا۔ صحیحین میں حضرت ابو طلحہؓ کی روایت سے آیا ہے کہ بدر سے تیسرے دن رسول اللہ نے اونٹنی کسوانے کا حکم دیا، اونٹنی پر پالان باندھ دیا گیا۔ پھر آپؐ صحابہؓ کو لے کر پیدل چل دیئے۔ صحابہؓ کو خیال ہوا کہ کسی ضروری کام سے کہیں تشریف لئے جا رہے ہیں لیکن آپ جا کر اس کنویں کے کنارے کھڑے ہو گئے (جس کے اندر مقتولین کی لاشیں پھینک دی گئی تھیں) اور پکارنے لگے اے ابو جہل بن ہشام، اے امیہ بن خلف، اے عتبہ بن ربیعہ، اے شیبہ بن ربیعہ کیا تمہارے لئے اس وقت یہ امر باعث مسرت ہوتا کہ کاش تم نے اللہ اور اس کے رسول کا حکم مان لیا ہوتا، اللہ اور اس کے رسول نے جس چیز کی تم کو وعید کی تھی کیا تم نے اس کو صحیح پالیا میں نے تو اس وعدہ کو حق پالیا جو اللہ نے مجھ سے کیا تھا، تم اپنے نبی کے لئے بدترین قبیلہ ہو تم نے میری تکذیب کی اور دوسرے لوگوں نے مجھے سچا جانا تم مجھ سے لڑے اور دوسرے لوگوں نے میری مدد کی۔ اے گروہ شر تم کو اللہ نے میری طرف سے سزا دے دی۔ میں امین تھا تم نے مجھے خائن قرار دیا، میں سچا تھا تم نے مجھے جھوٹا کہا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا تین روز کے بعد آپ ان کو پکار رہے ہیں بے جان لاشوں سے آپ کس طرح کلام فرما رہے ہیں۔ فرمایا تم میری بات کو ان سے زیادہ نہیں سن رہے ہو جو کچھ میں ان سے کہہ رہا ہوں اس وقت وہ سن رہے ہیں لیکن لوٹا کر جواب نہیں دے سکتے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ حضرت صالحؑ نے مردوں کو خطاب اس لئے کیا کہ آنے والے لوگوں کو عبرت ہو۔ بعض کا قول ہے کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے (جو واقعہ پہلے ہوا ترتیب عبارت میں اس کو پیچھے ذکر کیا ہے اور جو واقعہ پیچھے ہوا ترتیب عبارت میں اس کو پہلے ذکر کر دیا) اصل کلام اس طرح تھا فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ۔

قصہ ثمود

محمد بن اسحاق، وہب بن منبہ، ابن جریر اور حاکم نے اسناد کے ساتھ حضرت عمرو بن خارجہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قوم عاد تباہ کر دی گئی تو ثمود ان کی بستیوں میں بس گئے اور ان کے جانشین ہو گئے یہ خوب پھلے پھولے، انہوں نے لمبی لمبی عمریں پائیں۔ لوگ مٹی (کچی پکی اینٹوں) کے مکان بناتے تھے مکان گر جاتے تھے مگر بنانے والا زندہ رہتا تھا مجبور ہو کر انہوں نے پہاڑوں کو تراش تراش کر غاروں کے اندر مکان بنا لئے، معاش کی طرف سے یہ لوگ بڑی کشائش میں تھے آخر ملک میں انہوں نے تباہی پھیلائی اور اللہ کے سوا دوسروں کو پوجنے لگے۔ اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے صالح کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ یہ لوگ خالص عرب تھے اور صالح نسبی لحاظ سے متوسط درجہ کے تھے، مگر اخلاق فاضلہ کے لحاظ سے سب سے برتر تھے۔ صالح ابتداء رسالت کے وقت نوجوان تھے اور قوم کو اللہ کی طرف بلاتے بلاتے سفید مو ہو گئے مگر سوائے قلیل آدمیوں کے کسی نے آپ کی پیروی نہیں کی اور قلیل بھی وہ تھے جن کو کمزور سمجھا جاتا تھا (یعنی غریب تھے) صالح برابر جمے رہے اور تبلیغ کرتے رہے اور اللہ کے عذاب سے بہت زیادہ ڈراتے اور خوف دلاتے رہے۔ آخر قوم والوں نے کہا کوئی ایسی نشانی دکھاؤ جس سے تمہارے قول کی سچائی ثابت ہو۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا کونسی نشانی چاہتے ہو۔ قوم والوں نے کہا کل تم ہمارے ساتھ ہمارے تہوار کے میلے میں چلو یہ تہواری میلہ سال میں ایک معین دن ہوتا تھا جہاں لوگ اپنے بتوں کو لے کر جاتے تھے۔ پھر تم اپنے معبود سے دعا کرو اور ہم اپنے معبودوں سے دعائیں کریں اگر تمہاری دعا قبول ہو گئی تو ہم تمہارے ساتھ ہو جائیں گے اور اگر

ہماری دعا قبول ہو گئی تو تم ہمارے ساتھ ہو جانا۔ حضرت صالح ؑ نے فرمایا بہت اچھا۔ چنانچہ قوم والے میلہ کو بت لے کر گئے اور صالح بھی ان کے ساتھ گئے قوم والوں نے بتوں سے دعائیں کیں کہ صالح ؑ کی دعا قبول نہ ہو۔ پھر جندع بن عمو بن جواس نے جو ثمود کا سردار تھا، حضرت صالح سے کہا یہ پتھر جو حجر کے ایک گوشہ میں الگ تھلگ پڑا ہے جس کو کاثبہ کہا جاتا ہے اس کے اندر سے اونٹ کی شکل کی ایک بڑے پیٹ والی دس ماہہ گابھن خوب بالوں سے بھرپور اونٹنی برآمد کر دو اگر ایسا کر دو گے تو ہم تم کو سچا مان لیں گے اور تم پر ایمان لے آئیں گے۔ حضرت صالح ؑ نے ان سے ایمان کا پختہ وعدہ لے لیا تو کھڑے ہو کر دو رکعت نماز پڑھی اور اپنے مالک سے دعا کی۔ یکایک پتھر میں سے ایک ایسی آواز نکلنے لگی جیسی پیدائش کے وقت بیاہنے والی اونٹنی کی نکلتی ہے پھر اس ٹیلہ سے وہی آواز نکلنے لگے یکدم پتھر شق ہو گیا اور اس کے اندر سے فرمائش کے مطابق اونٹنی برآمد ہو گئی اس کے دونوں پہلوؤں کی درمیانی چوڑائی بہت زیادہ تھی پھر اس کے پیٹ سے اسی کی طرح ایک بچہ پیدا ہوا۔ یہ دیکھ کر جندع بن عمرو اور اس کے قبیلہ کے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے اور سرداران ثمود نے بھی ایمان لانے کا ارادہ کر لیا، لیکن ذواب بن عمرو بن لبید اور حباب مجاور اصنام اور دباب بن صحر کاہن نے ان کو منع کر دیا، یہ تینوں شخص ثمود کے سردار تھے۔ حضرت صالح ؑ نے قوم والوں سے کہا ایک دن یہ اونٹنی پانی پیئے گی اور ایک دن تمہارے جانوروں کو پانی کا کوٹہ ملے گا، اس کے بعد کچھ مدت تک اونٹنی اپنے بچہ کے ساتھ آزاد پھرتی درختوں کی پتیاں چرتی اور پانی پیتی رہی، مگر ایک دن ناغہ کر کے پانی پیتی تھی اور اس طرح پیتی تھی کہ کنویں میں سر ڈال کر سب پانی پی جاتی، ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑتی تھی اور اس دوران میں ٹانگیں چیر کر کھڑی ہو جاتی تھی اور لوگ جتنا چاہتے اس کا دودھ دوہ لیتے، جتنا پیا جاتا پیتے اور جتنے برتن تھے سب بھر کر رکھ لیتے تھے پھر اونٹنی بغیر ٹانگیں چیرے سے باہر نکل آتی۔ معاملہ یوں ہی چلتا رہا۔ گرمی کے زمانے میں اونٹنی وادی کے اوپر آجاتی اور اس کے خوف سے تمام مویشی، بکریاں، گائے اور اونٹ بھاگ کر وادی کے اندر چلے جاتے اور سردی کے زمانہ میں اونٹنی وادی کے اندر اتر جاتی تو تمام جانور اوپر آجاتے (اس طرح اونٹنی تو گرمی سردی کی تکلیف سے بچ جاتی اور) تمام جانور گرمی اور سردی کی طرف سے دکھی رہتے۔ اس سے مویشیوں کو نقصان پہنچا اور لوگوں کو یہ بات اتنی کھلی کہ وہ اللہ کے حکم سے سرکشی کرنے لگے اور اونٹنی کو قتل کر ڈالنے کے درپے ہو گئے، یہاں تک کہ اونٹنی کو مار ڈالنے پر متفق الرائے ہو گئے۔ قبائل ثمود میں دو عورتیں تھیں ایک کا نام صدوف اور دوسری کا نام غنیزہ تھا، غنیزہ کی کنیت ام غنم تھی یہ غنم بن مجاز کی بیٹی اور ذواب بن عمرو کی بیوی تھی اور بڑھیا سال خوردہ ہو گئی تھی اس کی متعدد خوبصورت بیٹیاں تھیں اس کے پاس اونٹ گائے اور بکریاں بھی بہت تھیں بڑی مالدار تھی۔ صدوف مختار کی بیٹی تھی اور خوبصورت جوان تھی اس کے پاس بھی اونٹ گائے اور بکریاں بہت تھیں بڑی مالدار تھی۔ دونوں کو حضرت صالح سے سخت عداوت تھی اور چونکہ اونٹنی سے ان کے جانوروں کو سخت ضرر پہنچتا تھا اس لئے اونٹنی کو قتل کرا دینے کی دونوں خواستگار تھیں۔ صدوف نے ایک ثمودی شخص کو جس کا نام حباب تھا آمادہ کیا اور کہا تو اگر اونٹنی کو قتل کر دے تو میں تیری ہو جاؤں گی حباب نے انکار کر دیا صدوف نے اپنے چچا کے بیٹے سے جس کا نام مصدع بن مہرج بن مختار تھا یہی کہا اور چونکہ صدوف بہت حسین اور بڑی مالدار تھی اس لئے مصدع نے صدوف کی درخواست مان لی۔ ادھر غنیزہ بنت غنم نے قذار بن سالف سے کہا اگر تو اونٹنی کو قتل کر دے تو پھر میری جس بیٹی کو چاہے لے لینا۔ قذار سرخ رنگ، نیلگوں چشم، پستہ قد آدمی تھا۔ اہل روایت کا خیال ہے کہ وہ حرامی تھا، سالف کے بستر پر پیدا ہوا تھا اس لئے اس کو قذار بن سالف کہا جاتا تھا۔ یہ شخص قوم میں باعزت اور طاقتور تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے آیت اذا انبعث اشقاھا کی تفسیر کے ذیل میں فرمایا تھا وہ ابوزمعہ کی طرح اپنی قوم میں باعزت صاحب عزم اور طاقتور تھا۔ رواہ البخاری من حدیث عبداللہ بن زمعہ۔ غرض مصدع اور قذار تیار ہو گئے قبیلہ ثمود میں سے اپنی مدد کے لئے سات آدمی انہوں نے اور اپنے ساتھ لئے اور چل دیئے۔ قذار اونٹنی کی واپسی کی راہ میں ایک پتھر کی آڑ لے کر گھات لگا کر بیٹھ گیا اور مصدع دوسرے راستہ میں جا چھپا، اونٹنی مصدع کی طرف سے گزری مصدع نے تیر مارا جس سے اونٹنی کی ٹانگ کا عضلہ چھد گیا ادھر ام غنم غنیزہ اپنی حسین ترین بیٹی کو لے کر قذار کے پاس آ پہنچی اور قذار کو بھڑکایا اور گھات کی جگہ سے اس کو اٹھا کر لے آئی، قذار نے آتے ہی

اونٹنی پر تلوار کا وار کیا جس سے اس کو کونچ کھل گئی، اونٹنی بھاگی اور اپنے بچہ کو تنبیہ کرنے کے لئے اس نے ایک چیخ ماری۔ قذار نے اس کے سینہ پر برچھا مارا اور اونٹنی کو قتل کر دیا پھر بستی والوں نے آخر اس کا گوشت بانٹ لیا اور پکایا، بچہ نے ماں کی یہ حالت دیکھی تو بھاگ کر ایک محفوظ پہاڑ پر چلا گیا اس پہاڑ کا نام کسی نے صور لکھا ہے اور کسی نے فازہ۔ حضرت صالح تشریف لائے تو بستی والوں نے کہا یا نبی اللہ ہمارا کوئی قصور نہیں فلاں شخص نے اونٹنی کو قتل کیا ہے۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا بچہ کو تلاش کرو اگر وہ تم کو مل جائے تو ممکن ہے تم سے عذاب ٹل جائے، لوگ بچہ کی تلاس میں نکلے اور پہاڑ کے اوپر دیکھ کر پکڑنے کے لئے گئے مگر اللہ نے پہاڑ کو اتنا اونچا کر دیا کہ پرندے بھی اس کی چوٹی تک نہ پہنچ سکیں۔

روایت میں آیا ہے کہ بچہ نے حضرت صالحؑ کو دیکھا تو آنسوؤں سے رو دیا اور تین چیخیں ماریں پھر ایک پتھر پھٹا اور بچہ اس میں گھس گیا۔ حضرت نے فرمایا بچہ کی ہر چیخ تمہارے لئے ایک دن کی مہلت (کی طرف اشارہ) ہے صرف تین دن تک گھروں میں رہ سکتے ہو، یہ وعدۂ عذاب غلط نہیں ہو سکتا۔

ابن اسحاق کی روایت میں آیا (ہے کہ جو نو آدمی اونٹنی کو قتل کرنے کے لئے نکلے تھے ان میں سے چار شخص بچہ کو قتل کرنے نکلے ان میں مصدع بن مہرج اور اس کا بھائی ذاب بن مہرج بھی تھا۔ مصدع نے اس کے تیر مارا جس سے اس کا دل چھد گیا مصدع نے اس کو ٹانگ پکڑ کر کھینچا اور سب نے نیچے لا کر ماں کی طرح اس کا گوشت بھی آپس میں بانٹ لیا۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا تم لوگوں نے حرمت خداوندی کو توڑا اب اللہ کے عذاب اور انتقام کے لئے تیار ہو جاؤ۔ لوگوں نے آپ کے بات کا مذاق بنایا اور استہزاء کے طور پر کہنے لگے صالحؑ عذاب کب آئے گا، اس کی علامت کیا ہو گی۔ ثمودیوں کی زبان میں اتوار کو اول، پیر کو عون، منگل کو دبار، بدھ کو جبار، جمعرات کو مونس، جمعہ کو عروبہ اور سنیچر کو شیار کہتے تھے۔ بدھ کے روز انہوں نے اونٹنی کو قتل کیا تھا۔ حضرت صالح نے جواب میں فرمایا جب مونس کی صبح ہو گی تو تمہارے چہرے زرد ہوں گے، عروبہ کی صبح کو اٹھو گے تو تمہارے چہرے سرخ ہوں گے اور شیار کی صبح کو تمہارے منہ کالے ہو جائیں گے پھر اول (اتوار) کے دن صبح کو تم پر عذاب آجائے گا۔ یہ بات سن کر وہ نو آدمی جنہوں نے اونٹنی کو قتل کیا تھا آپس میں کہنے لگے آؤ صالح کو ہی ختم کر دیں اگر یہ سچا ہے تو (عذاب آنے سے) پہلے ہی ہم اس کو قتل کر چکیں گے اور جھوٹا ہے تو اونٹنی کے پاس اس کو بھیج دیں گے۔ اس مشورہ کے بعد رات کو شب خون مارنے کے لئے حضرت صالحؑ کے مسکن پر پہنچے لیکن فرشتوں نے پتھر مار مار کر ان کو دفع کر دیا۔ جب ان کے ساتھ والوں نے دیکھا کہ دیر ہو گئی اور وہ واپس نہیں لوٹے تو صالحؑ کے گھر پہنچے، دیکھا کہ ان کے آدمی پتھروں سے کچلے پڑے ہیں۔ کہنے لگے صالح تو نے ان کو قتل کیا ہے یہ کہہ کر حضرت صالح کو قتل کرنے کا ارادہ کیا لیکن دوسرے ساتھ والوں نے جو مسلح تھے ان سے کہا تم صالح کو کبھی قتل نہیں کر سکتے صالح نے وعدہ کیا ہے کہ تین روز کے بعد تم پر عذاب آئے گا اگر یہ سچے ہیں تو ان کو قتل کرنے کا ارادہ کر کے تم اپنے رب کے غضب کو اور بھڑکا رہے ہو اور اگر یہ جھوٹے ہیں تو جو کچھ تم ارادہ کر رہے ہو وہ اس کے بعد ہو جائے گا۔ یہ تقریر سن کر لوگ اسی رات کو منتشر ہو گئے۔ پھر جمعرات کی صبح ہوئی تو ان کے چہرے زرد ہو گئے معلوم ہوتا تھا کہ چھوٹے بڑے عورت مرد ہر ایک کے چہرہ پر خلوف (ایک زرد خوشبو) ملی ہوئی ہے۔ یہ علامت دیکھ کر ان کو عذاب کا یقین ہو گیا اور سمجھ گئے کہ صالح نے صحیح بات کہی تھی (پھر توبہ کرنے کے بجائے) حضرت صالح کو قتل کرنے کے تلاش کرنے لگے لیکن آپ بھاگ کر ثمود کے قبیلہ بنی غنم میں پہنچ کر قبیلہ کے سردار کے پاس جس کا نام تقبل تھا اور کنیت ابو ہرب جا ٹھہرے تھے۔ یہ شخص مشرک ضرور تھا مگر اس نے آپ کو چھپا لیا اس لئے تلاش کرنے والوں کی دست رس سے آپ باہر رہے اور صبح کو حضرت صالح کے مؤمن ساتھیوں کے پاس جا کر ان کو طرح طرح سے اذیتیں دے کر صالح کا پتہ پوچھنے لگے ایک شخص نے جس کا نام صدع بن ہرم تھا حضرت سے دریافت کیا یا نبی اللہ یہ لوگ آپ کا پتہ بتانے کے لئے ہم کو اذیتیں دے رہے ہیں کیا ہم ان کو آپ کا پتہ نشان بتا دیں۔ آپنے فرمایا ہاں تم کہہ دو کہ میرے پاس صالح ہے مگر تم اس پر دست رس نہیں پا سکتے (اس شخص نے حسب اجازت کہہ دیا مگر) وہ لوگ اس کو چھوڑ کر چل دیئے اور جس عذاب میں مبتلا تھے اس نے ان کو آگے

کچھ کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا بلکہ ایک دوسرے کو دیکھ کر اس کے چہرے کی زردی بتاتا تھا اسی میں شام ہو گئی تو سب چیخ پڑے، میعاد مقرر کا ایک دن گزر گیا جب دوسرے دن کی صبح ہوئی تو ان کے چہرے سرخ ہو گئے معلوم ہوتا تھا خون سے رنگے ہوئے ہیں یہ دیکھ کر چیخنے چلانے اور رونے لگے شام ہوئی تو چیخ کی میعاد کے دو دن گزر گئے اب عذاب آہی پہنچا تیسرے دن کی صبح ہوئی تو سب کے منہ کالے ہو گئے جیسے تار کول مل دیا گیا ہو، یہ دیکھ کر (مزید) روئے پیٹے شام ہوئی تو حضرت صالح مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے کر شام کی طرف چل دیئے اور فلسطین کے ایک ریگستان میں جاکر فروکش ہو گئے اتوار کی صبح ہوئی تو لوگوں نے کفن پہن لئے، مردہ کی خوشبو مل لی اور زمین پر پڑ گئے کبھی آسمان کی طرف دیکھتے تھے کبھی زمین کی طرف سمجھ نہ سکے کہ عذاب کدھر سے آئے گا جب خوب دن چڑھ گیا تو زلزلہ نے آدبوچا اور سب گھروں کے اندر پڑے کے پڑے رہ گئے۔ اور ایک ایسی زور کی چیخ آسمان کی طرف سے آئی جس میں ابر کی ہر کڑک اور زمین کی ہر تڑک سے زیادہ قوت تھی جس سے سب کے دل سینوں کے اندر پھٹ گئے اور ہر بچہ بڑا ہلاک ہو گیا صرف ایک اپاہج لڑکی بچ گئی جس کا نام ذریعۃ بنت سلف تھا یہ کافر تھی اور حضرت صالح سے اس کو سخت دشمنی تھی عذاب کو دیکھنے سے اس کے پانوؤں یک دم کھل گئے اور تیزی سے بھاگ کر یہ قرح یعنی وادی القریٰ میں پہنچ گئی اور عذاب کی جو کیفیت اس نے دیکھی تھی وادی القریٰ کے باشندوں سے بیان کردی پھر پانی مانگا اور پانی پیتے ہی مر گئی۔

سدی نے قتل ناقہ کے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ اللہ نے حضرت صالحؑ کے پاس وحی بھیجی تیری قوم عنقریب اونٹنی کو قتل کردے گی۔ حضرت نے قوم سے یہی بات کہہ دی قوم والوں نے کہا ہم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔ حضرت صالح نے فرمایا اس مہینہ میں ایک لڑکا پیدا ہوگا اور آئندہ وہ قتل کرے گا اور اسی کے سبب تمہاری ہلاکت ہوگی۔ کہنے لگے اس مہینہ میں ہمارا جو بچہ پیدا ہوگا ہم اس کو قتل کردیں گے چنانچہ اس مہینہ میں دس لڑکے پیدا ہوئے نو کو تو انہوں نے قتل کردیا ایک نیل گوں چشم سرخ رنگ والا بچہ بچ گیا اور اس کا بڑھاؤ بہت تیزی سے ہوا۔ مقتول بچوں کے باپ جب اس کو دیکھتے تو کہتے ہمارے بچے بھی اگر زندہ ہوتے تو ایسے ہی ہوتے یہ سوچ سوچ کر ان کو حضرت صالحؑ پر غصہ آیا کہ یہ ہی شخص ہمارے بچوں کے قتل کا سبب ہے۔ پھر انہوں نے قسم کھا کر باہم معاہدہ کرلیا کہ ہم رات کو جاکر اس کو اور اس کے گھر والوں کو ضرور مار ڈالیں گے پھر مشورہ ہوا کہ ہم کو بستی سے نکل جانا چاہئے لوگ ہم کو جاتے دیکھ کر خیال کریں گے کہ ہم سفر کو جا رہے ہیں ہم باہر جاکر کہیں غار میں چھپ جائیں گے اور صالح جس وقت (رات کو) مسجد کو جائیں گے ہم آکر ان کو قتل کردیں گے پھر لوٹ کر غار میں چلے جائیں گے پھر صبح کو گھروں کو واپس آجائیں گے اور کہیں گے ہم تو قتل کے وقت موجود بھی نہ تھے لوگ ہم کو سچا سمجھیں گے کیونکہ ان کا تو یہی خیال ہوگا کہ ہم سفر کو گئے ہوئے تھے۔

حضرت صالحؑ قوم کے ساتھ بستی میں نہیں سوتے تھے بلکہ اپنی مسجد میں جس کو مسجد صالح کہا جاتا تھا جاکر رات گزارتے تھے اور صبح کو آکر لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے تھے شام ہوتی تو پھر مسجد کو جاکر رات کو وہیں رہتے۔ غرض وہ لوگ جن کے بچے قتل ہوئے تھے بستی سے باہر جاکر ایک غار میں گھس گئے اور اللہ کے حکم سے غار ان پر گر پڑا اور سب مر گئے اسی کو اللہ نے فرمایا ہے فَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔

کچھ لوگ جو اس بات سے واقف تھے نکل کر گئے جاکر دیکھا کہ سب لوگ کچلے پڑے ہیں تو انہوں نے بستی میں آکر شور مچادیا اللہ کے بندو! صالح نے بچوں کے قتل پر ہی بس نہیں کیا بلکہ ان لوگوں کو بھی مار ڈالا۔ یہ سن کر بستی والے اونٹنی کو قتل کرنے پر متفق ہو گئے۔ ابن اسحاق نے کہا اونٹنی کو قتل کرنے کے بعد ان نو آدمیوں نے شبخون مار کر حضرت صالح کو قتل کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔ یعنی قتل ناقہ کا واقعہ حضرت صالح کو قتل کرنے کے معاہدہ سے پہلے ہو چکا تھا۔

سدی وغیرہ کا بیان ہے دسواں بچہ قدار جب قتل ہونے سے بچ گیا تو تیزی سے بڑھنے لگا ایک دن میں اتنا بڑھ جاتا جتنا دوسرے بچے ایک ہفتہ میں بڑھتے ہیں اور ایک ماہ میں اتنا بڑھ جاتا جتنا دوسرے بچے ایک سال میں بڑھتے ہیں جب بڑا ہو گیا تو لوگوں کے ساتھ ایک روز شراب پینے بیٹھا اور شراب بنانے کے لئے پانی کی ضرورت ہوئی اور چونکہ وہ دن اونٹنی کے پانی پینے کا تھا

اس لئے پانی نہیں ملا، یہ بات ان لوگوں کو بہت کھلی اور کہنے لگے ہم دودھ کا کیا کریں ہمیں تو اس پانی کی ضرورت ہے جو یہ اونٹنی پی جاتی ہے تاکہ مویشیوں کو پلائیں اور کھیتیاں سینچیں۔ قذار بولا کیا میں تمہارے لئے اس اونٹنی کو قتل کردوں۔ اہل مجلس نے کہا ہاں! چنانچہ سب نے اونٹنی کو قتل کر دیا۔

عبداللہ بن دینار کے چچا کے بیٹے کی روایت سے بخاری نے صحیح میں بیان کیا ہے کہ غزوۂ تبوک میں جب رسول اللہ ﷺ حجر میں فروکش ہوئے تو حکم دیا لوگ یہاں کے کنویں کا پانی نہ پئیں نہ جانوروں کو پلائیں۔ لوگوں نے عرض کیا ہم نے تو اس پانی سے آٹا گوندھ لیا ہے اور پانی لے بھی لیا ہے فرمایا گوندھے ہوئے آٹے کو پھینک دو اور پانی کو بہادو۔

بغویؒ نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ حجر کے کنویں سے لیا ہوا پانی بہادیں اور گوندھا ہوا آٹا اونٹوں کو کھلادیں اور اس کنویں کا پانی لیں جس کا پانی اونٹنی پیتی تھی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ ابوالزبیر نے حضرت جابرؓ کا قول نقل کیا کہ جب غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ کا گزر حجر سے ہوا تو صحابہ کو حکم دیا تم میں سے کوئی اس (ویران) بستی میں نہ جائے، نہ ان کا پانی پیو، ان عذاب یافتہ لوگوں کی طرف سے گزرو تو روتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہیں تم پر بھی وہی عذاب نہ آجائے جو ان پر آیا تھا۔ پھر فرمایا تم اپنے رسول سے معجزات نہ طلب کرو۔ یہ صالح کی قوم تھی جس نے اپنے رسول سے معجزہ طلب کیا تھا تو اللہ نے ایک اونٹنی برآمد کردی جو اس پہاڑی راستہ سے پانی پر جاتی اور (پانی پی کر) اس راستہ سے واپس آتی تھی اور اپنی باری کے دن ان کا (سارا) پانی پی جاتی تھی۔ ان لوگوں نے اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی اور اونٹنی کو قتل کر دیا۔ نتیجہ میں اللہ نے ان سب لوگوں کو ہلاک کر دیا جو اس سرزمین میں مشرق سے لے کر مغرب تک آسمان کے خیمہ کے نیچے رہتے تھے صرف ایک آدمی بچا جس کو ابورغال کہا جاتا تھا یہ ہی قبیلہ ثقیف کا مورث اعلیٰ تھا یہ اس وقت حرم کے اندر تھا اور حرم میں ہونے کی وجہ سے اللہ کے عذاب سے بچ گیا لیکن جب حرم سے باہر نکلا تو اس پر بھی وہی عذاب آیا جو دوسروں پر آیا تھا اور وہیں دفن ہو گیا دفن ہونے کے وقت اس کے پاس سونے کی ایک سلاخ بھی تھی جو اسی کے ساتھ زمین میں دب گئی۔ حضور ﷺ نے صحابہ کو ابورغال کی قبر بھی دکھائی اور لوگوں نے تلواروں سے (کرید کر) زمین کھود کر سونے کی وہ ڈنڈی برآمد کرلی۔ قوم ثمود میں سے جو لوگ حضرت صالح پر ایمان لائے تھے ان کی تعداد چار ہزار تھی۔ حضرت صالح ان لوگوں کو لے کر حضرموت چلے گئے۔ حضرموت میں پہنچ کر آپ کی وفات ہو گئی اسی لئے اس بستی کا نام حضرموت ہو گیا، پھر ان لوگوں نے ایک بستی بسائی جس کا نام حاصورا ہوا۔ بعض علماء روایت کا قول ہے کہ حضرت صالح کی وفات مکہ میں ہوئی، وفات کے وقت آپ کی عمر ۵۸ سال کی تھی آپ صرف بیس سال اپنی قوم میں رہے تھے۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۞۸۰ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۞۸۱ (اور ہم نے لوطؑ کو بھیجا جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو جس کو تم سے پہلے سارے جہاں میں کسی نے نہیں کیا، تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو۔ حقیقۃً تم حد (انسانیت) ہی سے گزر گئے ہو)۔ لوط بن ہارس (یا ہاران) بن تارخ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔ قوم لوط سے مراد سدوم والے ہیں۔

لُوْطًا، اَرْسَلْنَا محذوف کا مفعول ہے اور اِذْ قَالَ اس کا ظرف ہے یا اُذْكُرْ محذوف ہے (یاد کرو) اور اِذْ قَالَ اس سے بدل ہے۔ اَتَاْتُوْنَ میں زجر آمیز انکار استفہامی ہے۔ اَلْفَاحِشَةَ یعنی مردوں سے لواطت۔ بِهَا میں ب تعدیہ کی ہے مِنْ اَحَدٍ میں مِنْ زائد ہے مگر نفی میں تاکید اور عموم پیدا کر رہا ہے۔ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ میں مِنْ تبعیضیہ ہے عمر بن دینار کا قول ہے کہ دنیا میں کوئی نر کسی نر پر نہیں دیکھا گیا۔ قوم لوط سے ہی اس فعل کی ابتداء ہوئی۔ اِنَّكُمْ سے اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ کے انکار وزجر کی مزید کامل تاکید ہو رہی ہے۔ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ یعنی مردوں سے جماع کرتے ہو۔ اتی المرءۃ اس عورت سے جماع کیا، یہ عرب کا محاورہ ہے۔ شھوۃ مفعول لہ ہے یعنی محض شہوت رانی کے لئے بغیر کسی مصلحت و خوبی کے یا مفعول مطلق ہے جو بجائے حال

کے واقعہ ہوا ہے یعنی ناکارہ بے سود شہوت رانی کے طور پر۔ مِنْ دُوْنِ النِّسَاءِ، دُوْنَ بمعنی غَیْرَ ہے یعنی عورتوں کو چھوڑ کر دوسروں سے۔ مراد یہ ہے کہ عورتوں سے قربت میں تو حکمت ہے اولاد کی پیدائش اور نسل کا بقاء وغیرہ اور مردوں سے قربت میں کچھ فائدہ نہیں اس ٹکڑے میں قوم لوط کی انتہائی مذمت ہے کہ تم (انسانی فکر و دانش سے بالکل خالی) محض (بے عقل) جانور ہو۔ اس آیت سے بطور دلالت نص ثابت ہو رہا ہے کہ عورتوں سے لواطت بھی حرام ہے کیونکہ گندہ اور بے سود ہونا دونوں کا ایک ہی طرح ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل سورۂ بقرہ کی آیت فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ یعنی تمہاری عادت ہی ہے کہ شریعت و دانش کی حدود سے نکل جاتے ہو کہ حدود نکاح سے تجاوز کر کے تم نے ایسے فعل کی طرف توجہ کی جو انسانی عادت کے خلاف اور فائدہ سے خالی ہے۔ اس آیت میں انکار سے اعراض اور اخبار کی طرف کلام کا رخ پھیر دیا گیا ہے اور یا انکار سے مذمت کی طرف اعراض ہے یا اصل کلام اس طرح تھا کہ اس قبیح فعل کا تمہارے پاس کوئی عذر نہیں صرف یہی نہیں بلکہ تمہاری عادت ہی حد انسانیت سے تجاوز کرنے کی ہے۔

۱۰ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ
ع ۱۲ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۸۴﴾
۱۷

(اور ان کی قوم سے کوئی جواب بن نہ پڑا سوائے اس کے کہ آپس میں کہنے لگے ان لوگوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کر دو، یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں، سو (اول) ہم نے لوط کو اور ان کے متعلقین کو بچا لیا سوائے لوط کی بیوی کے وہ انہی لوگ میں رہی جو عذاب میں رہ گئے تھے اور ہم نے ان پر ایک نئی طرح کا مینہ برسایا۔ سو دیکھ لو مجرموں کا کیسا انجام ہوا)۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ یعنی کوئی ایسی بات پیش نہ کر سکے جو صحیح جواب بن سکتی اِلَّآ اَنْ قَالُوْا اس میں اِلَّا کا معنی ہے لیکن اَخْرِجُوْهُمْ یعنی لوط کو اور اس کے مؤمن ساتھیوں کو۔ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ یعنی یہ فحش کاموں سے پاک بنتے ہیں۔ یہ کلام انہوں نے استہزاءً کہا تھا۔ وَاَهْلَهٗ، اَهْل سے مراد مؤمن ساتھی۔ بعض نے کہا حضرت لوط کی دو بیٹیاں مراد ہیں۔ اِلَّا امْرَاَتَهٗ یہ اَهْلَه سے استثناء ہے۔ حضرت لوط کی یہ بیوی منافق تھی، دل میں کفر چھپائے ہوئے تھی۔ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ یعنی ان لوگوں میں سے تھی جو اپنے گھروں میں رہ گئے تھے اور عذاب سے ہلاک کر دیئے گئے تھے۔ یا ان لوگوں میں سے تھی جو عذاب میں رہ گئے تھے یا ان بوڑھے معمر لوگوں میں سے تھی جو مدت دراز سے زندہ تھے پھر ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ہلاک ہو گئی۔ مَطَرًا (مفعول مطلق ہے) یعنی عجیب طرح کی بارش۔ کنکریلے پتھروں کی بارش جن میں سے ہر پتھر ہر مجرم کے لئے نشان زدہ تھا۔ وہب نے کہا گندھک اور آگ کی بارش ابو عبیدہ کی تحقیق ہے کہ عذاب کے لئے اَمْطَرَ (باب افعال سے) اور رحمت کے لئے مطر (ثلاثی مجرد سے) بولا جاتا ہے۔ اَلْمُجْرِمِيْنَ مجرموں سے مراد ہیں کافر۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت لوطؑ اپنے چچا حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بابل سے ہجرت کر کے شام کی طرف جاتے ہوئے اردن میں اتر گئے اللہ نے ان کو پیغمبر بنا کر سدوم کو بھیجا تاکہ اہل سدوم کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیں اور ان کی ایجاد کردہ بے حیائی سے باز داشت کریں۔ آپ نے تبلیغ کی مگر وہ باز نہ آئے آخر اللہ نے ان پر پتھروں کی بارش کی اور سب ہلاک ہو گئے۔

اسحٰق بن بشیر اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کا یہی بیان نقل کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو لوگ اپنے وطن میں مقیم تھے ان کو تو زمین کے اندر دھنسا دیا گیا یعنی زمین ان کو لے کر دھنس گئی اور جو کہیں سفر میں تھے ان پر پتھروں کی بارش ہوئی۔

محمد بن اسحٰق کا بیان ہے کہ اہل سدوم کے پھلدار باغات اور (سرسبز) بستیاں ایسی تھیں جو اس سرزمین میں کہیں نہیں تھیں، لوگ ان کو آکر دکھ پہنچاتے (اور ان کے باغوں سے پھل لوٹتے اور چراتے تھے) آخر ابلیس آدمی کی شکل میں ان کے

پاس آیا اور مشورہ دیا کہ اگر ان لوگوں کے ساتھ تم ایسی حرکت کرو گے تو پھر تمہاری حفاظت ہو جائے گی۔ اہل سدوم نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب (چور ڈاکو) اپنی حرکتوں پر جمے رہے تو اہل سدوم نے بھی ان کے لڑکوں کو پکڑ کر ان کے ساتھ یہ حرکت کی اور اس طرح یہ خباثت ان میں جم گئی۔ حسن نے کہا وہ صرف عورت سے نکاح کرتے تھے۔ کلبی کا قول ہے کہ سب سے پہلے قوم لوط کی حرکت ابلیس نے کی۔ بات یہ ہوئی کہ اہل سدوم کا ملک بڑا سرسبز تھا، دوسری بستیوں والے وہاں جانور چرانے (اور غلہ، پھل لینے) آجاتے تھے (سدوم والے ان سے تنگ تھے) ابلیس ایک نوجوان کی شکل میں ان کے سامنے آیا اور دبر کی طرف اشارہ کیا اس طرح لواطت ہونے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کے حکم سے آسمان نے ان پر پتھر برسائے اور زمین نے ان کو اپنے اندر دھنسا لیا۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ط (اور ہم نے مدین کی طرف ان کے (نسبی) برادر شعیبؑ کو بھیجا)۔ مدین حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے کا نام تھا۔ یہاں مدین کی نسل مراد ہے۔ بغویؒ نے لکھا یہ ہی اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ (بن والے) تھے۔ عطاء کا قول ہے کہ حضرت شعیبؑ توبہ بن حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ محمد ابن اسحاق نے کہا میکیل کے بیٹے تھے اور میکیل یشجر کے اور یشجر مدین کے اور مدین حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ ابن اسحاق کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ میکیل حضرت لوطؑ کی بیٹی کا نام تھا۔ بعض کے نزدیک حضرت شعیبؑ یژون بن نوس بن مدین کے بیٹے تھے۔ حضرت شعیبؑ نابینا (ہوگئے) تھے چونکہ اپنی قوم سے خطاب کرنے میں آپ کو کمال تھا اس لئے آپ کا لقب خطیب الانبیاء ہوا۔ آپ کی قوم کافر بھی تھی اور ناپ تول میں بھی کمی کرتی تھی۔ ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب حضرت شعیبؑ کا ذکر کرتے تھے تو فرماتے تھے وہ خطیب الانبیاء تھے اس لئے کہ اپنی قوم سے خطاب اچھے اسلوب سے کرتے تھے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸۵﴾

(شعیبؑ نے کہا اے میری قوم! اللہ کو پوجو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آچکی، سو تم ناپ تول پوری پوری کیا کرو اور لوگوں کا ان کی چیزوں (کو تول ناپ کر دینے) میں نقصان نہ کیا کرو اور روئے زمین پر درستی کے بعد بگاڑ نہ پیدا کرو یہ ہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر مؤمن ہو (تو اس ہدایت کو مانو)۔)

اُعْبُدُوا اللّٰهَ یعنی تنہا اللہ کی پوجا کرو۔ بَيِّنَةٌ یعنی معجزہ (یا واضح دلیل) قرآن مجید میں حضرت شعیبؑ کے کسی معجزہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بعض کے نزدیک بَيِّنَةٌ سے مراد ہے حکمت نصیحت اور حضرت شعیبؑ کا کلام حق باسلوب بلیغ۔ اَلْمِيْزَانَ مِيْعَاد کی طرح میزان بھی مصدر ہے بمعنی وزن۔ یا میزان سے مراد ہے ترازو اور وزن محذوف ہے یعنی وزن المیزان۔ یا کیل سے مراد ہے پیانہ۔ کیل (مصدر) محذوف ہے، کیل کا اطلاق مکیال پر ایسا ہی ہے جیسے عیش کا اطلاق معاش پر ہوتا ہے۔ بخس کے دو مفعول آتے ہیں یہاں اَلنَّاسَ پہلا مفعول اور اَشْيَآءَهُمْ دوسرا مفعول ہے، محاورہ میں بولا جاتا ہے بخست زیدا حقہ میں نے زید کا پورا حق دینے میں کمی کر دی، اشیاء کا لفظ عموم پر دلالت کر رہا ہے اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ لوگ بڑی چھوٹی اور تھوڑی بہت سب چیزوں کے ناپ تول میں کمی کرتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ لوگ ذخیرہ اندوز تھے ہر چیز کی ذخیرہ اندوزی کرتے تھے۔

وَلَا تُفْسِدُوْا اور بگاڑ نہ پیدا کرو یعنی کفر اور ظلم بَعْدَ اِصْلَاحِهَا درستی کے بعد یعنی جب اللہ نے پیغمبر کو مبعوث فرما دیا جو تم کو بھلائی کا حکم دیتا اور برائی سے روکتا ہے۔ ذٰلِكُمْ یعنی یہ بات جو بات میں نے تم سے کہی اور جس بات کا تم کو حکم دیا، خَيْرٌ لَّكُمْ تمہارے لئے ظلم کرنے اور ناپ تول میں کمی کرنے سے بہتر ہے، اگرچہ ناپ تول میں کمی کرنے سے بظاہر کچھ مالی فائدہ ہو جاتا ہے مگر حقیقت میں دنیا اور آخرت دونوں میں یہ نقصان کا سبب ہے اور حضرت شعیبؑ نے جو ان کو حکم دیا اس میں دنیا

اور آخرت دونوں کا فائدہ تھا اس لئے وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ فرمایا، اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یعنی اگر تم مجھے سچا جانتے ہو تو جو حکم میں دے رہا ہوں اس کی تعمیل کرو۔ اور وہ لوگ واقف ہیں کہ شعیبؑ جھوٹ کبھی نہیں بولتے (ان کا یہ خیال حضرت شعیبؑ کی نبوت سے پہلے تھا۔ نبوت کے دعوے میں وہ جھوٹا ہی سمجھتے تھے)۔

روایت میں آیا ہے کہ اہل مدین سر راہ بیٹھ جاتے اور جو شخص مسلمان ہونے کے لئے حضرت شعیبؑ کے پاس جانا چاہتا اس کو روکتے اور کہتے شعیب بڑا جھوٹا ہے کہیں تجھے دین کی طرف سے بگاڑ نہ دے۔ یہ لوگ مسلمانوں کو بھی ڈراتے اور قتل کر ڈالنے کی دھمکیاں دیتے تھے، کذا اخرج ابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم عن ابن عباس (رضی اللہ عنہما)۔

وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۠ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ (اور تم راستوں پر اس غرض سے نہ بیٹھا کرو کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو دھمکیاں دو اور اللہ کی راہ سے روکو اور اس میں کجی کی تلاش کرو اور یاد کرو کہ جب تم کم تھے تو اللہ نے تمہاری تعداد بڑھا دی اور دیکھ لو کہ تخریب کاروں کا انجام کیسا ہوا)۔

تُوْعِدُوْنَ اور تَصُدُّوْنَ دونوں جملے تَقْعُدُوْا کی ضمیر فاعل سے حال ہیں۔

تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا یعنی اللہ کی راہ میں کجی کی تلاش کرتے ہو، مطلب یہ ہے کہ اس میں شبہے ڈالتے ہو یا لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے ہو کہ یہ راستہ ٹیڑھا ہے (بہر حال لوگوں کو بہکاتے ہو)۔

بعض علماء کے نزدیک صِرَاط سے مراد ہے دین کا راستہ۔ دین کا راستہ اگرچہ ایک ہی ہے لیکن اس کی شاخیں متعدد ہیں۔ عقائد و معارف کی شاخ، احکام کی شاخ، حدود و تعزیرات کی شاخ (گویا راہ دین کی ہر شاخ ایک راستہ ہے) قوم شعیب والے جب کسی کو دین کی کسی شاخ میں کوشش کرتے دیکھتے تو مار ڈالنے اور دکھ دینے کی دھمکی دیتے تھے۔ اس صورت میں تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، كُلِّ صِرَاطٍ کا بیان ہوگا اس سے ان کی حرکت شنیعہ کی انتہائی خرابی اور اپنی راہ پر قائم رہنے کی مذمت مستفاد ہوگی قلیلاً تعداد میں کم یا سامان میں کم۔ فَكَثَّرَكُمْ اللہ نے تم کو بڑھا دیا یعنی اولاد و مال میں برکت عطا فرمادی۔ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ یعنی گزشتہ سرکش قوموں کا انجام جیسے حضرت لوط کی قوم کا اور دوسری تخریب کار قوموں کا انجام کیسا ہوا۔

وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ (اور اگر تم میں سے بعض لوگ اس حکم پر جس کو دے کر مجھے بھیجا گیا ہے ایمان لے آئے ہیں اور بعض لوگ ایمان نہیں لائے ذرا تو ٹھہرے رہو اللہ ہمارے درمیان (عنقریب) فیصلہ کئے دے رہا ہے وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

فَاصْبِرُوْا تو تم ٹھہرے رہو یعنی انتظار کرو۔ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا کہ اللہ فیصلہ کردے جو اہل حق ہیں ان کو فتحیاب کردے گا جو باطل پرست ہیں ان کو تباہ کردے گا۔ اس میں اہل ایمان کے لئے (کامیابی کی) بشارت اور کافروں کے لئے (تباہی کی) دھمکی ہے۔ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ۔

وہ سب سے اچھا حاکم ہے اس کے حکم کو کوئی پلٹ نہیں سکتا

آٹھواں پارہ بعونہ ختم ہوا۔ اس سے
آگے نواں پارہ شروع ہے
بتوفیقہ تعالیٰ

نواں پارہ شروع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَ لَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ ﴿۸۸﴾ (شعیبؑ کی قوم کے متکبر سرداروں نے کہا اے شعیبؑ ہم تم کو اور تمہارے ساتھ جو ایمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے ضرور نکال دیں گے ورنہ تم سب ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ۔ شعیبؑ نے جواب دیا کیا تم ہم کو اپنے مذہب میں لوٹا لو گے خواہ ہم دل سے چاہیں یا گوارا نہ کریں) یعنی دو کاموں میں سے ایک کام ضرور ہونا ہے یا بستی سے تمہارا نکالا جانا یا دوبارہ کفر میں لوٹ آنا۔

حضرت شعیبؑ اگرچہ کبھی مذہب کفر پر نہ تھے (اس لئے ان کا کفر کی طرف واپس آجانا کوئی معنی نہیں رکھتا) انبیاء کا کبھی کافر ہونا (خواہ نبوت سے پہلے ہی ہو) درست نہیں، لیکن حضرت شعیبؑ پر ایمان لانے والے اکثر اشخاص چونکہ کفر چھوڑ کر ایمان لائے تھے اس لئے خطاب میں انہی کی حالت کو ترجیح دی گئی اور آئندہ جواب میں بھی حضرت شعیبؑ نے اسی کو پیش نظر رکھا۔ بعض کے نزدیک لَتَعُوْدُنَّ کا معنی ہے لَتَدْخُلُنَّ۔ عَادَ بمعنی صَارَ کے آتا ہے یعنی یا ہم تم کو نکال دیں گے یا تم ہمارے مذہب میں آجاؤ۔ اَوَلَوْ كُنَّا میں ہمزہ انکار کے لئے ہے اور واؤ حال بلکہ عطف کے لئے ہے اور پورا جملہ حالیہ ہے۔ اصل کلام اس طرح تھا کیا تم ہم کو اپنے مذہب میں لوٹا لو گے خواہ ہم پسند کریں یا ناپسند کریں۔ اول ٹکڑے کو حذف کر دیا گیا اور استفہام کا تعلق دوسرے جملہ سے کر دیا گیا تاکہ نفی حکم کامل طور پر ہو جائے۔

قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَ مَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ﴿۸۹﴾ (ہم اللہ پر بڑی جھوٹی تہمت لگانے والے ہو جائیں گے اگر خدا نہ کرے ہم تمہارے مذہب میں آجائیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہم کو اس سے نجات دے دی ہے اور ہم سے ممکن نہیں کہ تمہارے مذہب میں آجائیں ہاں اگر اللہ ہی کی مشیت ہو جو ہمارا مالک ہے (تو دوسری بات ہے) ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے ہم اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اے ہمارے مالک ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے موافق فیصلہ کر دے تو سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے)۔

قَدِ افْتَرَیْنَا ہم گھڑ لیں گے، دروغ بندی کریں گے۔ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا کہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک قرار دیں گے۔ اِذْ نَجّٰىنَا یہ شرط ہے جس کے جواب پر سابق جملہ (یعنی قَدِ افْتَرَیْنَا) دلالت کر رہا ہے۔ اِفْتَرَیْنَا ماضی کا صیغہ ہے مگر مستقبل کے معنی میں ہے تحقق وقوع کی وجہ سے مستقبل کی تعبیر ماضی کے صیغے سے کر لی گئی ہے اور چونکہ ماضی قریب مراد ہے جو حال سے متصل ہے اس لئے قَدْ کا لفظ استعمال کیا یعنی جب اللہ نے کفر سے ہم کو نجات دے دی اور ظاہر فرما دیا کہ جس مذہب پر ہم پہلے تھے وہ باطل ہے اور جو مذہب ہم نے اختیار کیا ہے وہ حق ہے تو اب اگر سابق مذہب کی طرف ہم نے لوٹنے کا

ارادہ کیا تو ہم دروغ گو اور اللہ پر تہمت تراشنے والے ہوں گے۔ مایکون لنا یعنی ہمارے لئے کبھی ممکن نہیں ایسا ہم سے کبھی نہیں ہو سکتا یہ اظہار ہے اسلام پر قائم رہنے اور کفر سے اجتناب رکھنے کے عزم کا اور چونکہ اس جملہ سے کسی قدر اپنے آپ کو پاک سمجھنے کی بو آرہی تھی اور مآل کی طرف سے لاپرواہی کا ترشح ہو رہا تھا اس لئے آگے استثناء کر دیا اور کہہ دیا الا ان یشاء اللہ مگر ہمارے مقدر میں ہی اگر اللہ نے کفر کو لکھ دیا ہو اور ہمارے مرتد ہو جانے کی اسی کی مشیت ہو اور وہی ہماری مدد نہ کرے تو بات دوسری ہے۔ یہ استثناء بتا رہا ہے کہ کفر بھی اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے (پس معتزلہ کا قول غلط ہے جو امر اور مشیت میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ کفر اور گناہ اللہ کی مشیت سے نہیں ہوتا کیونکہ اس نے کفر و گناہ کو ترک کرنے کا حکم دیا ہے) بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ جملہ استثنائیہ بول کر کافروں کو ناامید بنا دینا مقصود ہے کیونکہ حضرت شعیبؑ نے اپنی جماعت کے ارتداد کو ایسی چیز سے وابستہ کیا جو کبھی ہونے والی نہ تھی (اور شرط اگر مستحیل الوقوع ہو تو مشروط کا وقوع بھی ناممکن ہوتا ہے) وَسِعَ رَبُّنَا یعنی اللہ کا علم ہمہ گیر ہے وہی جانتا ہے کہ آخر کار کون بندہ کفر کی طرف جاتا ہے اور کون اسلام کی طرف آتا ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ (ساری عمر) دوزخیوں کے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے اور دوزخ کے درمیان صرف ہاتھ بھر فاصلہ رہ جاتا ہے (آخر میں) کتاب کا لکھا غالب آتا ہے اور وہ اہل جنت کے عمل کرنے لگتے ہیں اور جنت میں چلے جاتے ہیں۔ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا اللہ ہی پر ہمارا اعتماد ہے کہ وہ ہم کو ایمان پر قائم رکھے گا اور یقین میں زیادتی کی توفیق دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمام بنی آدم کے دل ایک دل کی طرح رحمٰن کی چٹکی میں ہیں جس طرف کو چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ پھر آپ نے دعا کی اے اللہ! اے دلوں کو موڑنے والے ہمارے دلوں کو اپنی طاعت پر موڑ دے، رواہ مسلم۔

حضرت شعیبؑ جب کافروں کی طرف سے مایوس ہو گئے تو بددعا کی اور کہا رَبَّنَا افْتَحْ اے ہمارے رب ہمارا فیصلہ کر دے افتح فتاحۃ سے مشتق ہے فتاحۃ فیصلہ کر دینا، حکم دے دینا۔ فَتَّاحٌ وہ حاکم جو لاینحل امر کا فیصلہ کرتا ہے یا اِفْتَحْ سے مراد ہے اپنے امر کو ظاہر کر دے کہ حق کا ظہور ہو جائے دودھ پانی سے جدا ہو جائے اس وقت لفظ افتح فتح المشکل (مشکل کو کھول دیا) سے ماخوذ ہو گا۔

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾

(شعیبؑ کی قوم کے کافروں نے (نچلے اور زبردست طبقہ سے) کہا اگر تم شعیب کے پیچھے چلو گے (اور اپنے مذہب کو چھوڑ کر اس کا دین اختیار کرو گے) تو بلاشبہ اس صورت میں گھاٹے میں رہو گے)۔ اپنی سیدھی چال کو چھوڑ کر اس کی لائی ہوئی گمراہی اختیار کر لو گے یا یہ مطلب کہ جو دنیاوی فائدے تم کو حاصل ہوتے ہیں ناپ تول میں کمی کر کے جو نفع مل جاتا ہے وہ جاتا رہے گا۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ مع

(نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو زلزلہ نے آپکڑا اور اپنے گھر میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے، جنہوں نے شعیب کو جھوٹا کہا تھا ان کی ایسی حالت ہو گئی گویا ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے یہ تکذیب کرنے والے ہی سراسر خسارہ میں رہے)۔

اَلرَّجْفَةُ کلبی نے کہا اس سے مراد ہے زلزلہ۔ فِيْ دَارِهِمْ یعنی اپنی بستی میں۔ جٰثِمِيْنَ مردہ مرے رہ گئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے ان پر جہنم کا دروازہ کھول دیا اور ایسی سخت گرمی میں مبتلا کر دیا کہ دم گھٹنے لگے۔ نہ سایہ سے فائدہ ہوتا تھا نہ پانی سے۔ ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے تہ خانوں میں گھستے تھے اور وہاں اوپر سے زیادہ گرمی پا کر پھر باہر نکل آتے تھے اور بھاگ کر میدانوں میں چلے جاتے تھے ایک بار باہر میدان میں بھاگ کر پہنچے تو اللہ نے ایک بادل بھیج دیا جس کے اندر بڑی خوشگوار ہوا تھی ابر نے ان پر سایہ کر لیا۔ اَلظُّلَّة (جس کا ذکر دوسری آیت میں آیا ہے) یہی ابر تھا۔ ابر کے نیچے کچھ خنکی اور ہوا

محسوس ہوئی تو ایک نے دوسرے کو پکار کر سب کو ابر کے نیچے جمع کر لیا جب سب عورتیں مرد بچے بڑے جمع ہو گئے تو (بادل کے اندر سے اللہ نے آگ کے شعلے پیدا کر دیئے۔ نیچے زمین تپ رہی تھی اور اوپر سے آگ تھی۔ سب بھنی ہوئی ٹڈی کی طرح جل بھن کر رہ گئے۔

یزید جریری کا قول ہے کہ (اول) سات روز تک اللہ نے ان پر ہوا کے طوفان کو مسلط رکھا پھر گرمی چھا گئی سامنے دور سے ایک پہاڑ نظر آیا ایک آدمی نے جا کر دیکھا تو وہاں نہریں اور چشمے جاری تھے سب پہاڑ کے نیچے جمع ہو گئے پھر پہاڑ ان پر گر پڑا اسی کو یَوْمُ الظُّلَّةِ کہا گیا ہے (یعنی الظُّلَّه سے مراد ہے پہاڑ کا سایہ) قتادہؒ کا قول ہے اللہ نے شعیبؑ کو اصحاب الایکہ کی ہدایت کے لئے بھی بھیجا تھا اور اصحاب مدین کی طرف بھی ایکہ (بن میں رہنے) والے تو (ابر یا پہاڑ کے) سایہ (میں جمع ہو کر اس) سے ہلاک کئے گئے اور مدین والوں کو زلزلہ نے آپکڑا جبرئیلؑ نے ایک چیخ ماری جس سے سب ہلاک ہو گئے۔

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا یعنی بیخ و بن سے ان کی بربادی ہو گئی، ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہاں رہتے ہی نہ تھے وہاں کوئی آبادی ہی نہ تھی۔ غنیت بالمکان میں نے اس جگہ قیام کیا۔ مغانی مکانات، قیامگاہیں اس کا واحد مغنے ہے۔ هُمُ الْخٰسِرِيْنَ یعنی دنیا اور آخرت میں خاسر ہو گئے۔ ہاں جن لوگوں نے حضرت شعیبؑ کی تصدیق کی اور آپ کے پیچھے چلے وہ دونوں جہان میں فائدے میں رہے۔ قوم شعیبؑ کے خاسر ہونے کی علت اور تخصیص خسران کے سبب پر متنبہ کرنے کے لئے اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا دوبار فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ شعیب کی تکذیب ہی خسران کی علت تھی۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع ۱۱

((جب عذاب آ گیا تو حضرت شعیبؑ نے عالم تحیر میں) ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا اے میری قوم میں نے تم کو اپنے رب کے پیام پہنچا دیئے تھے اور تمہاری خیر خواہی کی تھی اب کس طرح میں کافر قوم (کے ہلاک ہو جانے کا رنج کروں۔ کیونکہ جو عذاب ان پر آیا وہ اسی کے مستحق تھے کوئی حق نہیں رکھتا کہ اس کے ہلاک ہونے کا رنج کیا جائے) حضرت شعیبؑ نے نَصَحْتُ لَكُمْ تک جو کچھ فرمایا وہ انتہائی رنج اور افسوس کے ماتحت تھا لیکن پھر سنبھل گئے اور خود اپنے خلاف فیصلہ کیا اور آخری جملہ فرمایا یہ آخری فقرہ اپنی شدت حزن کی معذرت کے طور پر فرمایا، مطلب یہ کہ میں نے اللہ کے احکام پہنچانے اور تمہاری خیر خواہی کرنے کی حد کر دی مگر تم نے میرا کہا نہ مانا اور عذاب کو خود پسند کیا اب میں ایسے لوگوں کے مرنے کا کیا افسوس کروں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾

(اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا کہ وہاں کے رہنے والوں کو ہم نے محتاجی اور بیماری میں نہ پکڑا ہو، تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں پھر ہم اس بدحالی کی جگہ خوش حالی لے آئے کہ ان کو خوب ترقی ہوئی اور اس وقت وہ کہنے لگے ہمارے باپ دادا کو بھی دکھ سکھ پیش آیا تھا اب ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور ان کو خبر بھی نہ تھی)۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اس جگہ ایک جملہ محذوف ہے یعنی کسی بستی میں ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا (پھر بستی والوں نے اس کی تکذیب کی) مگر اہل قریہ کی ہم نے گرفت کی۔ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ بغویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کے نزدیک بَاْسَآءِ سے مراد فقیری اور ضَرَّآءِ سے مراد بیماری ہے۔ بعض کے نزدیک بَاْسَآءِ سے جنگ اور ضَرَّآءِ سے قحط مراد ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ تاکہ (وہ گڑگڑائیں، توبہ کریں، اللہ کی طرف رجوع کریں۔ اس جگہ لفظ لعل کا استعمال بتا رہا ہے کہ ان لوگوں کا قول غلط ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ کے کلام میں عَسٰى، كَادَ اور لَعَلَّ کا استعمال جس جگہ ہوا ہے اس کا وقوع ضروری ہے اللہ کے لئے لفظ امید، شاید، عنقریب کا استعمال درست نہیں اللہ کی قدرت اور ارادہ اور علم ہمہ گیر ہے۔ امید یا شک

یا ظن تو اس کو ہوتا ہے جو ناقص القدرۃ، ضعیف الارادہ اور ناقص العلم ہو۔ لہٰذا اللہ نے جس جملہ کو لفظ عَسٰی یا کَادَ یا لَعَلَّ سے بیان کیا ہے اس سے مراد مفہوم جملہ کا وقوع ہوتا ہے جو وقوع پذیر نہیں ہوا (اکثر لوگوں نے مالی اور جسمانی دکھ میں مبتلا ہو کر بھی توبہ نہیں کی)۔

اَلسَّیِّئَۃُ مالی اور جسمانی دکھ اَلْحَسَنَۃُ مال کی کثرت اور سرسبزی۔ یعنی ان کو ڈھیل دی گئی اور دکھ سکھ دونوں طرح سے ان کی جانچ کی گئی۔ حَتّٰی عَفَوْا یہاں تک کہ ان کی تعداد خوب بڑھ گئی اور مال کی بھی فراوانی ہو گئی۔ عفت النبات سبزہ خوب ہو گیا۔ اعفاء اللحیة داڑھی خوب بڑھانا۔ قَالُوْا قَدْ مَسَّ یعنی انہوں نے کہا کہ یہ دکھ سکھ کا دور ہمارے باپ دادا پر بھی آتا رہا ہے، زمانہ کا دستور ہی یہی ہے کبھی دکھ کبھی سکھ باری باری سے آتا رہتا ہے وہ لوگ خالق کو بھول گئے اور راحت و مصیبت کو پیدا کرنے والے کا انہوں نے تصور بھی نہ کیا۔ وَھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ اور ان کو عذاب آنے کا (پتہ بھی نہ تھا) احساس بھی نہ تھا۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾ (اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور ڈرتے رہتے تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے تو پیغمبروں کی تکذیب کی اس لئے ہم نے بھی ان کے کرتوت کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا)۔

اَلْقُرٰی میں الف لام عہد خارجی کا ہے یعنی انہی بستیوں والے جن کی ہدایت کے لئے پیغمبروں کو بھیجا گیا تھا۔ وَاتَّقَوْا اور اللہ کے عذاب سے ڈرتے جس کی صورت یہ تھی کہ اس کے حکم پر چلتے اور نافرمانی کو ترک کر دیتے۔

مِنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ یعنی ہر طرف سے ہم خیر کے دروازے ان پر کھول دیتے اور اس خیر کو قائم رکھتے۔ بعض علماء کے نزدیک آسمان کی برکتوں سے مراد ہے بارش اور زمین کی برکتوں سے مراد ہے سبزی، پھل، غلہ۔ برکت کا لغوی معنی ہے زیادتی اور کسی چیز کا زوال نہ ہونا۔ وَلٰکِنْ کَذَّبُوا الرُّسُلَ مگر انہوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی۔ فَاَخَذْنٰھُمْ تو ہم نے ان کو سزا میں گرفتار کیا۔ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ اس کفر و معصیت کی سزا میں جو وہ کرتے تھے۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا بَیَاتًا وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ ﴿۹۷﴾ اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ یَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾ (کیا پھر بھی ان بستیوں میں رہنے والے اس بات سے بے فکر ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب جب کہ یہ رات میں غافل پڑے سوتے ہوں آجائے اور کیا ان (موجودہ) بستیوں کے رہنے والے اس بات سے بے فکر ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب دن دوپہر ہی میں آپڑے جب کہ وہ کھیل کود میں ہوں۔

اَفَاَمِنَ اس کا عطف فَاَخَذْنٰھُمْ بَغْتَةً پر ہے دونوں کے درمیان کی عبارت معترضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گزشتہ انبیاء کی تکذیب کرنے والی بستیوں کی تباہی اور عذاب میں گرفتاری کے بعد بھی کیا ان کافروں کو ڈر نہیں لگتا جو محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں کہ رات کو سوتے میں یا دن کو کھیل کود میں غافل ہونے کے اوقات میں ان پر اللہ کا عذاب ناگہانی آجائے۔ اس جگہ اَھْلُ الْقُرٰی سے مراد ہیں مکہ اور اطراف مکہ کے رہنے والے۔

بیاتًا یا تبییت (مصدر تفعیل) کے معنی میں ہے یا وقت بیات مراد ہے یعنی رات یا اسم فاعل کے معنی میں ہے اور بَأْسُنَا سے حال ہے یا اسم مفعول کے معنی میں ہے اور ھُمْ سے حال ہے (مطلب بہر طور قریب قریب ہے اصل میں لفظ بَیَات (مصدر لازم) بیتوتت کے معنی میں ہے لیکن جس طرح لفظ سَلَام (لازم) بمعنی تسلیم (مصدر متعدی) کے آجاتا ہے اسی طرح لفظ بَیَات بمعنی تبییت (متعدی) بھی آتا ہے۔ وَھُمْ نَآئِمُوْنَ سونے سے مراد ہے غفلت کی حالت میں ہونا، عذاب کی طرف سے غافل ہونا۔

اَفَاَمِنَ اور اَوَاَمِنَ میں استفہام زجری ہے۔ ضُحٰی سے مراد دن ہے اس کا لغوی معنی ہے دھوپ چڑھنے کا وقت۔

وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ یعنی جب کہ وہ غفلت کی حالت میں بے ہودہ کاموں میں مشغول ہوں۔

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾ (تو کیا یہ لوگ اللہ کی ناگہانی پکڑ سے بے فکر ہو گئے سو (یادر کھو کہ) اللہ کی نا معلوم پکڑ سے صرف وہی لوگ بے فکر ہوتے ہیں جن کی شامت آگئی ہو)۔

مَكْرَ اللّٰهِ اللہ کی دی ہوئی ڈھیل کہ ایک وقت تک راحت و نعمت میں رکھتا ہے، پھر اچانک نا معلوم راستہ سے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے جس طرح کہ پہلی قوموں سے اس نے کیا۔ اَلْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ یعنی جنہوں نے کفر و معصیت کا ارتکاب کیا اور نظر و بصیرت سے کام لے کر اپنے حال کا گزشتہ اقوام کے حال سے توازن نہیں کیا۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ (اور کیا ان لوگوں کو جو اس زمین پر سابق باشندوں کی جگہ رہتے ہیں ان واقعات نے یہ بات ہنوز نہیں بتائی کہ اگر ہم چاہتے تو ان کے جرائم کی پاداش میں ان کو تباہ کر ڈالتے۔ ہم ان کے دلوں پر بند لگائے ہوئے ہیں اسی لئے وہ (حق کی آواز) نہیں سنتے)۔

يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ زمین کے وارث ہوتے ہیں یعنی سکونت کے اعتبار سے (ملک مراد نہیں ہے) مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَا یعنی پچھلے باشندوں کی ہلاکت کے بعد۔ چونکہ اس جگہ ہدایت کا معنی ہے بیان کرنا اس لئے يَهْدِ کے بعد لام آیا ہے اَنْ لَّوْ اَنْ مخففہ ہے اور اس کے بعد والا جملہ (بتاویل مفرد ہو کر) يَهْدِ کا فاعل ہے۔ اَصَبْنٰهُمْ یعنی عذاب اور سزا میں ان کو پکڑ لیتے بِذُنُوْبِهِمْ ان کے گناہوں کے بدلے میں۔ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اس جملہ کا عطف اس مفہوم پر ہے جو اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ سے مستفاد ہو رہا ہے یعنی وہ غفلت کرتے ہیں اور ہم ان کے دلوں پر بند لگا دیتے ہیں۔ زجاج نے کہا یہ جملہ بالکل علیحدہ ہے (سابق پر عطف نہیں ہے واو استینافیہ ہے۔ عاطفہ نہیں ہے) فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ پس وہ ڈرانے کو نہیں سنتے اور نصیحت کو نہیں قبول کرتے۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ (ان بستیوں کے کچھ کچھ واقعات ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں ان سب کے پاس ان کے پیغمبر معجزات لے کر آئے تھے پھر جس بات کو پہلی بار انہوں نے جھوٹا کہہ دیا (پیغمبروں کے بعد بھی) اس پر ایمان لانے والے نہ ہوئے اللہ اسی طرح کافروں کے دلوں پر بند لگا دیتا ہے اور اکثر لوگوں میں ہم نے وفاء عہد نہ دیکھا اور اکثر لوگوں کو ہم نے بے حکم ہی پایا)۔

تِلْكَ الْقُرٰى یعنی گزشتہ اقوام کی بستیاں قوم نوحؑ، قوم عادؑ، قوم ثمودؑ، قوم لوطؑ اور قوم شعیبؑ کی بستیاں مِنْ اَنْۢبَآئِهَا، مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی کچھ واقعات بعض خبریں۔ اَلْبَيِّنٰتِ معجزات اور وہ دلائل جو ان کی رسالت کو ثابت کرتی ہیں۔ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا، لِاَنْ يُّؤْمِنُوْا تھا اَنْ مصدری کو حذف کر دیا گیا۔ لام جحود تاکید نفی ایمان کے لئے اور مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہے یعنی وہ ایماندار نہ تھے۔ بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ یعنی پیغمبروں کی بعثت سے پہلے جو توحید کی تکذیب کرتے تھے اس پر برابر قائم رہے ایمان نہ لائے یا یہ مطلب کہ پیغمبر جس شریعت اور رسالت کو لے کر ان کے پاس پہنچے۔ انہوں نے اس کی تکذیب کی اور پھر اس تکذیب پر ساری عمر قائم رہے پیغمبروں کی دعوت نے ان پر کوئی اثر نہ پیدا کیا نہ پیہم معجزات سے ان کی انکاری حالت بدلی۔

بغویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور سدی نے آیت کے مطلب کی توضیح اس طرح کی ہے کہ بروز میثاق جو ان سے ایمان کا عہد لیا گیا تھا اور زبانوں سے انہوں نے اقرار کیا تھا مگر دلوں میں تکذیب پوشیدہ رکھی تھی تو پیغمبروں کی بعثت کے بعد بھی وہ ایمان لانے والے نہ تھے نہ ایمان لائے۔ پس اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا۔ مجاہد نے کہا آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہلاک

کئے جانے سے پہلے جس طرح انہوں نے تکذیب کی تھی اگر ہم ہلاکت کے بعد ان کو پھر زندہ کر دیتے تب بھی وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ تقریباً ایسا ہی مضمون دوسری آیت میں آیا ہے فرمایا ہے وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ۔

یمان بن ذیاب نے توضیح مطلب اس طرح کی ہر نبی نے اپنی قوم کو عذاب سے ڈرایا لیکن انہوں نے پیغمبر کی تصدیق نہیں کی۔ نتیجہ میں اللہ نے ان کو ہلاک کر دیا۔ پھر ان کے بعد دوسری قومیں آئیں اور ان کے پیغمبروں نے عذاب سے ڈرایا لیکن انہوں نے بھی گزشتہ اقوام کی طرح اس چیز کی تکذیب کی جس کی تکذیب گزشتہ قومیں کرتی چلی آئی تھیں۔ اسی کی مثل دوسری آیت آئی ہے فرمایا ہے مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ۔

كَذٰلِكَ اسی طرح یعنی جس طرح گزشتہ کافروں کے دلوں پر ہم نے بند لگا دیئے تھے اسی طرح آپ کی قوم کے کافروں کے متعلق ہم نے لکھ دیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ لہٰذا تمام نشانیاں اور ڈراوے دیکھنے کے بعد بھی ان کے دل نرم نہیں پڑیں گے۔ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ یعنی اکثر لوگوں کا یا ہلاک کردہ قوموں میں سے اکثر کا۔ اول صورت میں یہ جملہ مستقل اور اعتراضیہ ہو جائے گا۔ مِّنْ عَهْدٍ (مضاف محذوف ہے) یعنی ایفاء عہد، عہد سے مراد ہے، عہد میثاق، جو حضرت آدمؑ کی پشت سے تمام ذریات کو نکال کر لیا گیا تھا یا وہ عہد مراد ہے کہ مصیبت اور دشمنوں کے خوف سے گھر کر جب ان لوگوں نے کہا تھا لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ اگر تو ہم کو اس سے بچالے گا تو ہم شکر ادا کرنے والوں میں سے (یعنی مؤمنوں اور اطاعت گزاروں میں سے) ہو جائیں گے۔ وَاِنْ وَّجَدْنَا اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ علماء کوفہ کا قول ہے کہ اِنْ اس جگہ نافیہ ہے اور لَ بمعنی الا (یعنی استثنائیہ) ہے۔ علمائے بصرہ کے نزدیک یہ اِنْ مخففہ ہے اس صورت میں وَجَدْنَا کا معنی ہوگا علمنا کیونکہ اِن مخففہ صرف ان افعال پر داخل ہوتا ہے جو مبتدا خبر پر داخل ہوئے ہوں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ۱۰۳

(پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس بھیجا لیکن انہوں نے ہماری نشانیوں کا بالکل حق ادا نہ کیا سو دیکھو ان تخریب کاروں کا کیسا انجام ہوا)۔ مِنْ بَعْدِهِمْ، هُمْ ضمیر پیغمبروں کی طرف راجع ہے یعنی نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ، شعیبؑ کی طرف راجع ہے ان کا ذکر آیت وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ الخ آچکا ہے۔ موسیٰؑ کے والد کا نام عمران تھا۔

بِاٰيٰتِنَا آیات سے مراد معجزات ہیں جن کا ذکر آئندہ آیات میں کیا گیا ہے۔ فرعون شاہ مصر کا لقب فرعون تھا جیسے شاہ فارس کا لقب کسریٰ تھا اس فرعون کا نام قابوس یا ولید بن مصعب بن ریان تھا۔ مَلَا۟ شرفاء قوم، سرداران، امراء، فَظَلَمُوْا بِهَا ظلم کا لغوی معنی ہے کسی چیز کو بے محل رکھ دینا۔ آیات واضح کا تقاضا تھا کہ ان پر ایمان لایا جاتا لیکن فرعونیوں نے ان کو نہ مانا اور بجائے ایمان کے کفر کیا اس لئے یہ ظلم ہو گیا۔ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ۔ مفسدوں کا انجام کیسا ہوا دیکھ لو سب کو دریا میں غرق کر دیا گیا

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۱۰۴ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۱۰۵ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۱۰۶

(اور موسیٰؑ نے (فرعون سے) کہا اے فرعون میں رب العلمین کا رسول (فرستادہ) ہوں (اللہ نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہی میرے لئے یہی زیبا ہے کہ بجز سچ کے اللہ کی طرف کوئی بات منسوب نہ کروں میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑی دلیل بھی لے کر آیا ہوں لہٰذا بنی اسرائیل کو (چھوڑ دے اور) میرے ساتھ (ارض مقدسہ کو) چلے جانے کے لئے آزاد کر دے۔ (فرعون نے) کہا اگر تو کوئی معجزہ لے کر آیا ہے تو پیش کر اگر سچا ہے (تو ثبوت سامنے لا) وَقَالَ مُوْسٰى یعنی جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس پہنچے تو کہا حَقِيْقٌ عَلٰٓى۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ عَلٰى اس جگہ عَلَيَّ تھا چونکہ خلاف مقصود کلام میں وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا اس لئے یاء متکلم کو حذف کر دیا گیا یا عَلٰى حرف جر ہے حَقِيْقٌ کے بعد اگرچہ ب آنا چاہئے تھی اور حَقِيْقٌ بِيْ کہنا چاہئے تھا لیکن شدت تمکن اور پورے جماؤ کے مفہوم کو ظاہر کرنے

کے لئے عَلٰی کو ذکر کیا جیسے رَمَیْتُ بِالْقَوْسِ (میں نے کمان سے تیر پھینکا) کی جگہ رَمَیْتُ عَلَی الْقَوْسِ (میں نے کمان کو مضبوط پکڑ کے تیر پھینکا) بولا جاتا ہے یا یوں کہا جائے کہ چونکہ اس جگہ حَقِیْقٌ کے اندر حَرِیْصٌ کا معنی بھی ہے (میں حریص ہوں اور مجھ پر لازم ہے اس لئے حَقِیْقٌ کے بعد عَلٰی ذکر کردیا گیا کیونکہ حریص کے بعد عَلٰی آتا ہے۔ بِبَیِّنَةٍ یعنی ایسا ثبوت جو میرے رسول ہونے کی شہادت دے رہا ہے۔ فَاَرْسِلْ مَعِیَ یعنی بنی اسرائیل کو چھوڑ دے، ارض مقدسہ کو چلے جانے کی ممانعت اٹھالے وہ ان کے اسلاف کا اصلی وطن ہے۔ فرعون نے بنی اسرائیل کو گویا قید بنا رکھا تھا اینٹیں بنانے، اٹھانے اور مٹی ڈھونے اور اسی طرح کے سخت محنت کرنے کے کام ان سے لیتا تھا (اور یہ سب خدمتیں جبریہ تھیں گویا سب کو غلام یا قیدی سمجھتا تھا) قَالَ فرعون نے موسیٰ کو جواب دیا۔ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ اگر تو اپنے دعوئے رسالت میں سچا ہے۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۰۷﴾ وَّنَزَعَ یَدَهٗ فَاِذَا هِیَ بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ ﴿۱۰۸﴾ ع ۹ ۱۳ ۳

(پس موسیٰؑ نے اپنا عصا (زمین پر) ڈال دیا تو وہ دفعتہً ایک کھلا ہوا اژدہا بن گیا اور (جیب کے اندر سے) اپنا ہاتھ نکالا تو دیکھنے والوں کو وہ سفید گورا (بہت ہی خیرہ کن روشنی والا) دکھائی دینے لگا)۔

ثُعْبَانٌ نر اژدہا، چھوٹے سانپ کی طرح لہراتا اور حرکت کرتا تھا اسی لئے دوسری آیت میں آیا ہے كَاَنَّهَا جَآنٌّ گویا وہ حرکت کرتا ہوا چھوٹا سانپ تھا۔ حضرت ابن عباسؓ اور سدی کی طرف اس قول کی نسبت کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی لاٹھی اژدہا بن گئی۔ یہ اژدہا زرد رنگ کا تھا اس کے اوپر بال تھے سر پر کلغی تھی اتنا منہ کھولے تھا کہ دونوں جبڑوں کے درمیان اسّی ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ ایک میل زمین سے اونچا تھا۔ نچلا جبڑا زمین پر اور بالا جبڑا قصر کی دیوار کے اوپر رکھے تھا اور اوپر کھڑا ہو کر فرعون کی طرف بڑھتا تھا۔ روایت میں آیا ہے کہ اژدہے نے فرعون کا قبہ منہ میں بھر لیا اور فرعون دم دبا کر بھاگا (اور ڈر کے مارے) اس کو چار سو بار اسہال ہوئے۔ سانپ نے لوگوں پر حملہ کردیا لوگ چیخیں مار کر بھاگے۔ پچیس آدمی آپس میں کچل کر مر بھی گئے۔ فرعون گھر میں گھس گیا اور چیخا۔ موسیٰؑ میں تجھے اسی کا واسطہ دیتا ہوں جس نے تجھے بھیجا ہے کہ اس کو پکڑ لے میں تجھ پر ایمان لے آؤں گا اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھی بھیج دوں گا۔ حضرت موسیٰ نے سانپ کو پکڑ لیا تو وہ پھر سابق کی طرح لاٹھی بن گیا معمر کے طریق سے قتادہ کا بیان عبدالرزاق، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اسی طرح نقل کیا ہے۔ پھر فرعون نے کہا کیا تیرے پاس کوئی اور معجزہ بھی ہے حضرت موسیٰ نے فرمایا ہاں۔ وَنَزَعَ یَدَهٗ اور گریبان کی اندر ہاتھ ڈال کر باہر نکالا۔ فَاِذَا هِیَ بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ وہ ہاتھ بالکل گورا تھا جس کی سفیدی غیر معمولی تھی اس کی شعاعیں چکاچوند پیدا کر رہی تھیں اور سورج کی کرنوں سے تیز تھیں لیکن ناگوار نہ تھیں، دیکھنے والوں کے لئے جاذب نظر تھیں۔ پھر حضرت موسیٰؑ نے گریبان کے اندر ہاتھ ڈال لیا تو ہاتھ جیسا تھا ویسا ہی ہو گیا۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۰۹﴾ یُّرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ﴿۱۱۱﴾ یَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِیْمٍ ﴿۱۱۲﴾

(قوم فرعون کے سرداروں نے (آپس میں) کہا کوئی شک نہیں کہ یہ بڑا ماہر جادوگر ہے جو تم کو تمہارے ملک سے نکال باہر کردینا چاہتا ہے اب تم لوگوں کو (اس کے متعلق) کیا مشورہ ہے انہوں نے کہا اس کو اس کے بھائی کو ابھی مہلت دو اور شہروں میں (جادوگروں کو) جمع کرنے والے آدمیوں کو بھیج دو تاکہ وہ تمہارے پاس بڑے سے بڑے ماہر جادوگر کو لے آئیں)۔

عَلِیْمٌ سے مراد ہے ماہر جادوگر جو نظر بندی کر کے لوگوں کو لاٹھی کا سانپ اور ہاتھ کی معمولی جلد کو چمکدار شعاع ریز بنا کر دکھاتا ہے اور غیر واقعی چیز کو دیکھنے میں واقعی بنا دیتا ہے۔ اس جگہ اس قول کا قائل سرداروں کو قرار دیا اور سورۃ الشعراء میں اس قول کی نسبت فرعون کی طرف کی گئی ہے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول بر طریق مشورہ سب کا تھا فرعون کا بھی اور سرداروں کا بھی یا فرعون نے شروع میں کہا تھا اور سرداروں نے یہی بات آپس میں مشورہ میں طے کردی اور اپنے ماتحتوں سے بھی کہہ دی۔ یُرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَكُمْ یہ چاہتا ہے کہ اے قبطیو! تم کو یہاں سے نکال دے۔ اَرْضِكُمْ یعنی مصر۔ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ یہ کلام یا تو اسی

قول کا حصہ ہے جو سرداروں نے فرعون سے اور خاص خاص امراء سے کہا تھا اس صورت میں امر بمعنی حکم حقیقۃً ہوگا (کیونکہ حقیقت میں فرعون اور اس کے خاص امراء کے ہاتھوں میں قوت آمرہ تھی) یا یہ آخری فقرہ انہوں نے آپس میں اور اپنے ماتحتوں سے کہا تھا تو اس وقت امر کا معنی ہوگا مشورہ دینا کیونکہ مشورہ دینے والا راستہ بتاتا ہے مشورہ طلب بات کی تعلیم دیتا ہے گویا حکم دیتا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فَمَاذَا تَأْمُرُوْنَ ان لوگوں کا قول ہو جن سے سرداروں نے کہا تھا اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ۔ یعنی سرداروں نے کہا یہ بڑا جادوگر ہے تو انہوں نے جواب دیا پھر آپ لوگوں کا کیا مشورہ یا کیا حکم ہے (کیا تدبیر کی جائے) اس صورت میں یہ فرعون کا یا اس کے دوسرے سرداروں کا قول ہوگا یا اول فرعون کا پھر دوسرے لوگوں کا کلام ہوگا اور آخر میں بالاتفاق سب کا مشورہ ہو گیا اور سب نے فرعون سے کہا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ اس کو اور اس کے بھائی کو مہلت دیدو (اَرْجِهْ اصل میں اَرْجِئْهُ تھا) صاحب قاموس نے لکھا ہے اَرْجَأَ الْاَمْرَ اس کام کو مؤخر کر دیا یعنی موسیٰؑ پر نہ ایمان لانے میں جلدی کرو نہ اس کو قتل کرنے میں عجلت سے کام لو (ابھی کچھ مدت یونہی رہنے دو) تاکہ حقیقت امر ظاہر ہو جائے۔ فِی الْمَدَآئِنِ یعنی صعید علاقہ مصر کی بستیوں میں کچھ سپاہیوں اور سرکاری آدمیوں کو بھیج دو۔ اس علاقہ میں بڑے بڑے جادوگر رہتے تھے۔ حٰشِرِیْنَ یعنی پولیس اور دوسرے کارندوں کو جو جادوگروں کو جمع کریں۔

یَاْتُوْكَ یہ جواب امر ہے یعنی اگر آپ بھیج دیں گے تو وہ بڑے سے بڑے جادوگروں کو جمع کرلائیں گے۔ ان کے مقابلہ میں اگر موسیٰؑ غالب ہو گیا تو ہم اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اگر جادوگروں کو غلبہ حاصل ہو گیا تو ہم سمجھ لیں گے موسیٰ جادوگر ہے۔ بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ سدی اور ابن اسحٰق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جب فرعون نے موسیٰ کی لاٹھی میں اللہ کی قوت دیکھ لی تو کہنے لگا ہم موسیٰؑ کی قوم کے آدمیوں کے بغیر اس پر غالب نہیں آسکتے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے کچھ لڑکوں کو غرباء نامی بستی میں جادو سیکھنے بھیج دیا۔ جادوگروں نے ان کو خوب جادو سکھایا ادھر موسیٰؑ سے کچھ مدت ٹھہرے رہنے کا معاہدہ کرلیا جب وہ لوگ جادو سیکھ گئے تو ان کو استاذ سمیت طلب کیا اور پوچھا تم نے کیا کیا انہوں نے جواب دیا ہم نے جو جادو سکھا ہے روئے زمین کے سارے جادوگر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہاں اگر کوئی آسمان سے آئی ہوئی چیز ہو تو ہم میں مقابلہ کی طاقت نہیں۔ اس کے بعد فرعون نے اپنی قلمرو کے تمام جادوگروں کو جمع کیا۔ مقاتل نے ان کی تعداد ۷۲ بتائی ہے جن میں ستر اسرائیلی اور دو قبطی تھے قبطیوں میں سے ایک شمعون تھا جو سب کا سرگروہ تھا۔ کلبی نے کہا یہ جادوگر ستر تھے اور ایک ان کا سرگروہ تھا انہوں نے ان دو آدمیوں سے جادو سیکھا تھا جو نینوا کے باشندے تھے مگر فرعون کے جیل خانہ میں بند تھے۔ کعب نے بارہ ہزار، سدی نے کچھ اوپر تیس ہزار، عکرمہ نے ستر ہزار اور محمد بن منکدر نے اسی ہزار تعداد بیان کی ہے۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ قَالَ اَلْقُوْا

(اور وہ جادوگر فرعون کے پاس آئے اور کہنے لگے اگر غالب آگئے تو ہمارا بہت بڑا صلہ ہوگا، فرعون نے کہا ہاں (بہت بڑا انعام ملے گا) اور (مزید یہ کہ) تم مقرب لوگوں میں سے ہو جائیں گے پھر جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا یا آپ (پہلے) ڈالنے اور یا ابتداء میں ڈالنے والے ہم ہی ہوں، موسیٰؑ نے کہا تم ہی ڈالو) وَجَآءَ السَّحَرَةُ یعنی سپاہیوں اور کارندوں کے ساتھ جادوگر فرعون کے پاس آگئے۔ قَالُوْا یہ جملہ استینافیہ ہے، ایک محذوف سوال کا جواب ہے گویا کسی نے پوچھا، پھر جادوگروں نے کیا کہا تو جواب دیا کہ جادوگروں نے یہ بات کہی۔ اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا یہ کلام خبری ہے یعنی اگر ہم غالب آجائیں تو ہمارا حق الخدمت بہت بڑا ہے۔ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ اس جملہ کا عطف محذوف جملہ پر ہے یعنی فرعون نے کہا تمہارا حق الخدمت بہت بڑا ہوگا اور تم میرے مقربوں میں سے ہو جاؤ گے تمہارا مرتبہ اونچا ہو جائے گا۔ فرعون نے جواب میں اضافہ کو مقابلہ کی ترغیب دینے کے لئے کیا (ورنہ نَعَمْ کہہ دینا کافی تھا)۔

مقاتل کا بیان ہے کہ فرعون کی موجودگی میں حضرت موسیٰؑ نے ان کے بڑے جادوگر سے کہا اگر میں غالب آجاؤں گا

تو کیا تو ایمان لے آئے گا جادوگر نے جواب دیا میں ایسا جادو پیش کروں گا کہ کوئی جادوگر اس پر غالب نہیں آسکتا۔ لیکن اگر آپ غالب آگئے تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گے۔ قَالُوْا جادوگروں نے کہا۔ اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ یا آپ پہلے اپنی لاٹھی پھینکیں۔ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ یا ہم ہو جائیں اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکنے والے۔ جادوگروں کے دلوں میں تو یہ حرص تھی کہ انہی کو جادو پھینکنے کا موقع پہلے مل جائے مگر جرأت کا مظاہرہ کرنے کے لئے انہوں نے حضرت موسیٰؑ کو اختیار دیا۔ طرز کلام کا بدل دینا خبر کو معرف باللام لانا اور ضمیر فصل کو تاکید کے لئے درمیان میں لانا ان کی اس اندرونی خواہش کی غمازی کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے لئے انہوں نے صرف جملہ فعلیہ بولا اور اپنے لئے مذکورہ شان کے ساتھ جملہ اسمیہ استعمال کیا۔ قَالَ اَلْقُوْا حضرت موسیٰؑ کو اپنے اوپر کامل اعتماد تھا اور جادوگروں کو وہ اپنے سامنے حقیر سمجھتے تھے اس لئے فرمایا (میں نہیں بلکہ) تم پھینکو۔

فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

(پس جب انہوں نے (اپنی لاٹھیاں اور رسیاں زمین پر) ڈالیں تو لوگوں کی آنکھوں کو جادوزدہ کر دیا اور ڈرایا اور بظاہر ایک بڑا جادو دکھلا دیا اور ہم نے موسیٰ کو وحی کے ذریعہ سے حکم دیا کہ تم اپنی لاٹھی (زمین پر) ڈالو عصا کا ڈالنا تھا کہ اس نے (اژدہا بن کر) ان کے سارے جھوٹے بنے بنائے کھیل کو نگلنا شروع کر دیا اور حق غالب آگیا اور جو کچھ انہوں نے بنایا تھا وہ سب بے کار ہو کر رہ گیا۔ پس وہ لوگ اس موقعہ پر ہار گئے اور ذلیل ہو کر واپس چلے گئے)۔ فَلَمَّآ اَلْقَوْا یعنی جب جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں زمین پر پھینکیں سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ تو لوگوں کی نظر پر جادو کر دیا یعنی اصل حقیقت کو دیکھنے اور جاننے سے پھیر دیا لوگوں کے خیال میں رسیاں اور لاٹھیاں اژدہے محسوس ہونے لگے ان کو نظر آیا کہ دور دور تک پہاڑوں کی طرح اونچے سانپ ہی سانپ ہیں۔ اِسْتَرْهَبُوْهُمْ اور لوگوں کو انہوں نے خوف زدہ کر دیا۔ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ یعنی فن کے لحاظ سے انہوں نے بڑا جادو پیش کیا وَاَوْحَيْنَآ اور جب موسیٰؑ کو اپنے دل میں کچھ خوف محسوس ہوا تو ہم نے اس کو وحی کی کہ تم بھی اپنی لاٹھی زمین پر ڈال دو اور کچھ خوف نہ کرو۔ تم ہی غالب رہو گے انہوں نے جو کچھ بنایا ہے وہ جادو کی شعبدہ بازی ہے۔ اور شعبدہ باز کو کہیں بھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ موسیٰؑ نے فوراً اپنی لاٹھی زمین پر ڈال دی۔ فَاِذَا هِيَ تو وہ دفعتہً ایک بہت بڑا اژدہا بن گئی جس نے افق کو گھیر لیا اور ہر طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ ابن زید نے کہا یہ اجتماع اسکندریہ میں ہوا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اژدھے کی دم جھیل (بحیرہ) کے پار پہنچی تھی۔ پھر اس نے اسی ۸۰ ہاتھ منہ کھول دیا مَا يَاْفِكُوْنَ اور ان کے جھوٹے بنائے ہوئے کھیل کو یہ اژدہا نگلنے لگا۔

يَاْفِكُوْنَ اِفْكٌ سے ماخوذ ہے افک کا معنی ہے کسی چیز کو الٹ دینا موڑ دینا۔ روایت میں آیا ہے کہ اژدہا سب رسیوں اور لاٹھیوں کو نگل گیا پھر اہل اجتماع کی طرف اس نے رخ کیا لوگ سرپٹ گرتے پڑتے بھاگے کہ بہت سے لوگ مر گئے پھر موسیٰؑ نے اس کو پکڑ لیا تو وہ حسب سابق لاٹھی بن گیا جادوگروں نے کہا اگر موسیٰ کی لاٹھی جادو کی لاٹھی ہوتی تو ہماری لاٹھیاں اور رسیاں تو اصلی حالت پر باقی رہتیں لاٹھیوں اور رسیوں کا معدوم ہونا بتا رہا ہے کہ موسیٰؑ کی لاٹھی اللہ کی طرف سے معجزہ ہے۔

فَوَقَعَ الْحَقُّ پس حق ثابت اور ظاہر ہو گیا۔ فَغُلِبُوْا یعنی فرعون اور اس کے گروہ والے ہار گئے وَانْقَلَبُوْا اور شہر کو لوٹ گئے، صٰغِرِيْنَ ذلیل و مغلوب ہو کر۔

وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

(اور ساحر سجدہ میں بے اختیار گر پڑے، کہنے لگے ہم رب العالمین پر یعنی موسیٰؑ اور ہارون کے رب پر ایمان لائے۔ فرعون بولا میری اجازت کے بغیر تم موسیٰؑ پر ایمان لے آئے، حقیقت میں یہ تم سب کی سازش تھی جو تم نے شہر میں اس لئے کی تھی کہ یہاں کے رہنے والوں کو باہر نکال دو۔ اب تم کو (اپنے اس جرم کی) حقیقت معلوم

ہو جائے گی)۔
اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِيْنَ گرا دیئے گئے یعنی اللہ نے ان کو سجدہ میں گرا دیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ وہ سجدہ میں گر گئے بلکہ فعل مجہول استعمال کیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ظہور حق نے ان کو بے اختیار سجدہ میں گرا دیا اور وہ بے قابو ہو گئے۔ بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں سجدہ میں گر پڑنے کا ارادہ پیدا کر دیا جس کی وجہ سے وہ سجدہ میں گر پڑے۔ اخفش نے کہا وہ فوراً ہی سجدہ میں گر پڑے معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے ان کو سجدہ میں گرا دیا۔
رَبِّ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ رب العٰلمین کے بعد رب موسیٰؑ وہارونؑ کہنے سے اس خیال کو دور کرنا مقصود ہے کہ شاید رب العٰلمین سے ان کی مراد فرعون ہو۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب جادوگر ایمان لے آئے تو حضرت موسیٰؑ کے پیرو چھ لاکھ بنی اسرائیل ہو گئے اٰمَنْتُمْ بِهٖ یعنی اللہ پر یا موسیٰؑ پر تم ایمان لے آئے۔ اِنَّ هٰذَا حقیقت میں یہ فعل ایک سازش تھی جو تم نے اور موسیٰؑ نے مل کر تیار کی تھی فِي الْمَدِيْنَةِ یعنی تاریخ مقررہ پر یہاں آنے سے پہلے مصر کے اندر تم نے یہ سازش کی تھی۔
لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا کہ مصر سے اہل مصر یعنی قبطیوں کو نکال دو اور ملک مصر تمہارا اور بنی اسرائیل کا ہو جائے۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ تم نے جو حرکت کی اس کا نتیجہ تم کو ابھی معلوم ہو جائے گا اس جملہ میں فرعون نے مبہم دھمکی دی جس کی توضیح آگے کلام میں کر دی۔

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ ع ۱۴
وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ ۱۸

(میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹ دوں گا پھر تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا انہوں نے جواب دیا (کچھ پروا نہیں) ہم اپنے رب کے پاس ہی ضرور لوٹ کر جائیں گے اور تو نے ہم میں کونسا عیب دیکھا بجز اس کے کہ ہم نے اپنے رب کے احکام کو مان لیا جب وہ احکام ہمارے پاس آگئے۔ اے ہمارے رب ہم پر صبر کا فیضان فرما اور ہماری جانیں حالت اسلام پر نکال)۔
مِّنْ خِلَافٍ یعنی ایک طرف کا ہاتھ دوسری طرف کا پاؤں لَاُصَلِّبَنَّكُمْ یعنی دریاء مصر کے کنارے درختوں کے تنوں میں تم کو صلیب پر لٹکا دوں گا تاکہ تمہاری رسوائی اور دوسروں کو عبرت ہو۔
حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے سولی چڑھانے کا طریقہ فرعون نے ہی ایجاد کیا۔ قَالُوْا یعنی جادوگروں نے فرعون سے کہا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ہم کو تیری دھمکی کی پروا نہیں مرنے کے بعد آخر ہمیں اپنے رب کے پاس ہی لوٹ کر جانا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہم کو تم کو سب کو رب کے پاس لوٹ کر جانا ہے وہی ہمارا آپس کا فیصلہ کرے گا۔ وَمَا تَنْقِمُ یعنی تجھے ہمارے اندر اور کوئی بات بری نظر نہیں آئی صرف اتنی بات ہوئی کہ ہم ایمان لے آئے اور ایمان بہترین عمل ہے اس کو عیب قرار دینا جائز نہیں۔ لہٰذا تیری خوشنودی حاصل کرنے اور تیری دھمکی سے مرعوب ہونے کی وجہ سے ہم ایمان سے منہ نہیں موڑ سکتے۔ پھر اللہ کی طرف انہوں نے کلام کا رخ موڑا اور دعا کی۔ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا ہم پر صبر بہا دے، صبر کا فیضان کر دے، تاکہ فرعون کی دھمکی ہم کو ایمان سے نہ روک سکے، وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ اور مرنے کے وقت ہم کو ایمان پر ثابت قدم رکھ۔ کلبی کا بیان ہے کہ دھمکی کے مطابق فرعون نے مؤمن جادوگروں کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے اور صلیب پر لٹکوا دیا، لیکن دوسرے علماء کا قول ہے کہ فرعون ایسا نہ کر سکا۔ کیونکہ اللہ نے فرما دیا تھا لَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ان کی دسترس تم دونوں تک نہ ہوگی تم دونوں اور تمہاری پیروی کرنے والے ہی غالب رہیں گے۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾ (قوم فرعون کے سرداروں نے (فرعون

سے) کہا کیا آپ موسیٰؑ کو اور اس کی قوم کو (یونہی آزاد) چھوڑے رکھیں گے کہ وہ ملک میں فساد کرتے رہیں اور آپ سے اور آپ کے معبودوں سے بیزار رہیں فرعون نے کہا آئندہ ہم ان کے (نوزائیدہ) لڑکوں کو قتل کرادیں گے اور ان کی (نوزائیدہ) لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دیں گے ہم ان پر پورا قابو رکھتے ہیں)۔ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ یعنی تیرے خلاف لوگوں کو آمادہ کرتے اور بگاڑتے رہیں۔ وَآلِهَتَكَ یعنی تیری دیویوں کو مقصد یہ کہ نہ تیری پوجا کریں نہ تیری دیویوں کی۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ فرعون کے پاس ایک گائے تھی جس کی وہ پوجا کرتا تھا اور اسے حکم دے رکھا تھا کہ جو خوبصورت گائے ملے تو اس کی پوجا کی جائے (گویا تمام قبطی ہندوؤں کی طرح گائے کے پجاری تھے) اسی لئے سامری نے بچھڑا بنا کر بنی اسرائیل کو اس کی پوجا کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ حسن کا بیان ہے فرعون نے اپنے گلے میں ایک صلیب لٹکا رکھی تھی جس کی پوجا کرتا تھا۔ سدی نے کہا فرعون نے کچھ بت بنوا کر رکھوا دیئے تھے اور اپنی قوم کو ان کی پوجا کرنے کا حکم دیدیا تھا اور کہہ دیا تھا یہ تمہارے معبود ہیں مگر تمہارا اور ان سب کا رب میں ہوں اسی لئے اس نے قوم سے کہا تھا أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قبطی ستارہ پرست یا سورج پرست تھے۔

سَنُقَتِّلُ باب تفعیل تکثیر کے لئے ہے یعنی ہم ان کے بہت بچوں کو قتل کردیں گے۔ وَنَسْتَحْيِي اور ان کی لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیں گے جیسے (موسیٰؑ کی پیدائش سے) پہلے کرتے تھے۔ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ہم ان پر غالب ہیں وہ ہمارے زیر دست ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ موسیٰؑ کی پیدائش کے سال فرعون بچوں کو قتل کراتا تھا اب فرعون نے پھر قتل اطفال کا حکم دے دیا تاکہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں فرعون کی حکومت تباہ ہوگی اگر موسیٰؑ وہی شخص ہوتا تو اب جب کہ (موسیٰؑ موجود ہے) قبطی بنی اسرائیل پر کیوں غالب رہتے۔

فرعون نے جب قتل بنی اسرائیل کا دوسرا دور شروع کردیا تو بنی اسرائیل نے اپنا یہ دکھ حضرت موسیٰؑ سے بیان کیا۔

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۖ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿١٢٨﴾ (موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد کی دعا کرو اور صبر رکھو، بلاشبہ ساری زمین اللہ کی ہے وہی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے لیکن اچھا انجام پرہیزگاروں کا ہوتا ہے)۔

اسْتَعِينُوا یعنی اللہ سے گڑگڑا کر مدد کی دعا کرو اور اس پر بھروسہ رکھو۔ وَاصْبِرُوا یعنی فرعون اور اس کی قوم کی طرف سے جو دکھ اور اذیت تم کو پہنچ رہی ہے اس پر صبر کرو یہ سب کچھ اللہ کے ارادے، مشیت اور امتحان کے زیر اثر ہو رہا ہے۔ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ یعنی سارا ملک اللہ کا ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے کوئی کافر ہو یا مسلم سب کو وہی دیتا ہے۔ اس پر اعتراض کرنا درست نہیں۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ یعنی نیکیوں کا لازوال ثواب اور دوامی سعادت اور جنت متقیوں کے لئے ہے۔ لہٰذا دار آخرت کی طلب کرو جو لازوال ہے اور دنیوی مصائب پر صبر کرو جو فناپذیر ہیں۔

عُقْبَىٰ اور عَاقِبَتْ پیچھے آنے والی چیز۔ فعل کے بعد اس کا بدلہ آتا ہے اس لئے اس کو عقبی یا عاقبت کہا جاتا ہے مگر عرف عام میں عقبی عاقبت اور عقب کے الفاظ صرف اچھے بدلے اور ثواب کے لئے مستعمل ہیں اور عقوبت، معاقبت اور عقاب کا استعمال صرف عذابت، سزا اور برے عوض کے لئے ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۔ وَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۔ وَخَيْرٌ عُقْبًا (یعنی ثواب و جزاء) فَحَقَّ عِقَابِ ، شَدِيدُ الْعِقَابِ ، وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ (یعنی دکھ اور تکلیف) یہ بھی ہوسکتا ہے کہ الْأَرْضَ سے مراد ملک مصر ہو یعنی فرعون کے بعد ملک مصر کا وارث اللہ تم کو کردے گا اور آخر میں تم کو کامیابی اور فتح حاصل ہوگی۔

قَالُوا أُوذِينَا مِن قَبْلِ أَن تَأْتِيَنَا وَمِن بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿١٢٩﴾ ع ۱۵ ۵ (انہوں نے کہا ہم تو ہمیشہ مصیبت میں ہی رہے آپ کے آنے سے پہلے بھی اور آپ کے آنے کے بعد بھی موسیٰ نے کہا بہت جلد اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کردے گا اور بجائے

ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنادے گا پھر تمہارا طرز عمل دیکھے گا)۔
مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا یعنی آپ کے پیغمبر ہو کر آنے سے پہلے ہم کو دکھ پہنچایا گیا۔ ہمارے (نوزائیدہ) لڑکوں کو قتل کیا گیا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا اب آپ کی بعثت کے بعد پورے دن بیگار لی جاتی ہے۔ کلبی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی بعثت سے پہلے فرعون بنی اسرائیل سے اینٹیں پاتھنے کی خدمت لیتا تھا مگر مٹی گارا فراہم کرنے کا انتظام خود کرتا تھا اور حضرت کی بعثت کے بعد حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل خود اپنے پاس سے مٹی گارے کا بھی انتظام کریں اور اینٹیں بھی پاتھیں۔
وَيَسْتَخْلِفَكُمْ یعنی فرعون کو ہلاک کر کے ملک میں ان کی جگہ تم کو قائم کردے، فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ اور پھر دیکھے کہ تم شکر اور طاعت کرتے ہو یا ناشکری اور معصیت۔ اللہ نے بنی اسرائیل کو فتحیاب بنانے اور ان کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا لیکن اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ ان کی آزمائش دونوں طرح سے کی جائے گی راحت سے بھی اور تکلیف سے بھی حصول خیر کے وقت شکر واجب ہے اور مصیبت آنے پر صبر ضروری ہے یہ وعدہ اللہ نے پورا کر دیا فرعون کو غرق کر دیا قبطیوں کے ملک اور مال و جائداد کا مالک بنی اسرائیل کو کر دیا لیکن انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی۔ روایت میں آیا ہے کہ حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں مصر پر بنی اسرائیل کا قبضہ ہوا۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۱﴾
(اور ہم نے فرعون والوں کو قحط سالیوں میں اور پھلوں کی پیداوار کی کمی میں مبتلا کر دیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں، لیکن جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے یہ تو ہمارے لئے ہونا ہی چاہئے اور اگر کوئی بدحالی پیش آتی تو موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کو نحوست بتاتے یاد رکھو ان کی نحوست کا سبب اللہ کے علم میں تھا مگر ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے تھے)

بِالسِّنِيْنَ قحط سالی، کال اَلسَّنَةُ سال تغلیب استعمال میں اس کا معنی ہو گیا قحط سالی خشک سالی کیونکہ قحط سالی ہی آئندہ کے لئے یادگاری سال اور تاریخی وقت ہو جاتا ہے پھر اَلسَّنَةُ سے مشتقات استعمال کئے جانے لگے مثلاً کہا جاتا ہے سَنَتَ الْقَوْمُ وہ لوگ قحط میں مبتلا ہو گئے مَسَّتْهُمُ السَّنَةُ ان پر کال پڑ گیا بعض اہل تفسیر نے اَلسِّنِيْنَ کو بصیغۂ جمع ذکر کرنے سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ آیت میں پیہم کال مراد ہے یعنی سال در سال مسلسل قحط۔ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ پھلوں کی کمی یعنی مختلف (ارضی و سماوی) آفات و مہلکات کے ذریعہ پھلوں کی بربادی۔ قتادہ نے کہا قحط سالی (یعنی غلہ کی پیداوار میں کمی) تو دیہاتیوں کے لئے ہوئی اور پھلوں کی پیداوار میں کمی شہریوں کے لئے۔ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ تاکہ وہ متنبہ ہو جائیں اور سمجھ جائیں کہ یہ قحط سالیاں اور پھلوں کی بربادیاں ان کے کفر و معصیت کی نحوست کی وجہ سے آئی ہے یا یہ مطلب ہے کہ ان کے دلوں میں نرمی پیدا ہو جائے اور وہ اللہ سے توبہ کریں۔ اَلْحَسَنَةُ سرسبزی، خوش حالی، عافیت، قَالُوْا یعنی فرعون والوں نے کہا، لَنَا هٰذِهٖ یہ ہماری وجہ سے ہے ہم اس کے مستحق ہیں ہم یوں ہی فراخ حال چلے آئے ہیں ہماری یہ معمولی حالت ہے مطلب یہ کہ انہوں نے فراغ حالی کو اللہ کی دین اور نعمت نہ سمجھا نہ شکر گزار ہوئے۔ سَيِّئَةٌ کوئی ناگوار مصیبت، کال، بدحالی۔ بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ یعنی جب تک یہ لوگ نہ تھے ہم پر کبھی یہ مصیبت نہیں آئی معلوم ہوا کہ موسیٰؑ اور اس کی قوم کی نحوست ہی کی وجہ سے ہم پر یہ بلا آئی۔
سعید بن جبیر اور محمد بن منکدر کا بیان ہے کہ فرعون کی بادشاہت چار سو برس رہی اور چھ سو چھبیس برس کی عمر میں اس کو کبھی کوئی دکھ نہیں ہوا اگر کسی دن اس کو بھوک یا بخار یا گھڑی بھر کے لئے بھی درد کی تکلیف پہنچ جاتی تو وہ رب ہونے کا دعویٰ نہ کر سکتا مگر اس کا یہ دعویٰ اور فرعون والوں کا مندرجۂ آیت قول اس بات کی علامت تھی کہ وہ انتہائی حماقت میں مبتلا تھے اور ان کے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے تھے کہ پیہم مشاہدۂ آیات بھی ان پر کوئی اثر نہ ڈالتا تھا وہ نہ سمجھے کہ حالات کا فروغ اور خوش معاشی تو اللہ کی مہربانی اور امتحان ہے جب اللہ کی اس نعمت کا شکر انہوں نے ادا نہیں کیا اور اللہ کے رسول نے شکر و طاعت کی ان

کو دعوت دی اور معجزات بھی پیش کئے مگر انہوں نے اس دعوت کو بھی ٹھکرا دیا اور برابر عصیان کوشیوں میں غرق رہے تو اللہ نے بطور سزا ان کے اعمال کی نحوست کی وجہ سے ان پر قحط کو مسلط کر دیا۔

اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ یعنی ان کی نحوست ان کے کفر اور گناہ کی وجہ سے (بصورت قحط) اللہ کی طرف سے آئی ہے کذا قال ابن عباسؓ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ لیکن ان میں سے اکثر لوگ اپنی انتہائی حماقت کے سبب نہیں جانتے کہ جو قحط وغیرہ ان پر مسلط کیا گیا وہ اللہ کی طرف سے عذاب ہے۔ یا طائر سے مراد ہے نصیب خیر وشر جو من عند اللہ ہے۔ قاموس میں ہے کہ طائر کا معنی ہے اچھا برا شگون نصیب، آدمی کا عمل آدمی کا رزق۔ یا سبب خیر وشر مراد ہے یعنی اللہ کا حکم۔ یا سبب نحوست مراد ہے یعنی ان کی وہ بد اعمالیاں جو اللہ کے پاس لکھی ہوئی ہیں اور جو ان بدحالیوں کا سبب ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان کی بڑی بدبختی تو وہ ہے جو اللہ کے پاس ہے یعنی دوزخ کا عذاب۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ اَلۡحَسَنَةُ کو لام تعریف کے ساتھ ذکر کیا اور سَيِّئَةٌ کو بصورت نکرہ پھر اَلۡحَسَنَة کے ساتھ اِذَا ذکر کیا جو فعل کے تحقق وقوع پر دلالت کرتا ہے اور سَيِّئَة کے ساتھ اِنۡ ذکر کیا جو شک کو ظاہر کرتا ہے اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بھلائی کا وقوع تو بکثرت ہوتا رہتا تھا اور اللہ نے اپنی وسیع رحمت کے سبب بالارادہ ان کو بھلائی عطا فرمائی تھی اور برائی کا وقوع نادر تھا اور بلا واسطہ ارادۂ الٰہیہ کا تعلق بھی اس سے نہ تھا، اس لئے اول کو لام تعریف اور اِذَا کے ساتھ اور ثانی کو بصورت نکرہ اور اِنۡ کے ساتھ ذکر کیا۔

وَقَالُوۡا مَهۡمَا تَاۡتِنَا بِهٖ مِنۡ اٰيَةٍ لِّتَسۡحَرَنَا بِهَا فَمَا نَحۡنُ لَكَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳۲﴾ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمُ الطُّوۡفَانَ وَالۡجَرَادَ وَالۡقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۟ (انہوں نے کہا تم جو عجیب بات بھی ہم پر جادو کرنے کے لئے پیش کرتے ہو ہم اس کی سچائی کا یقین کرنے والے نہیں پھر ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈیاں اور گھن کے کیڑے اور مینڈکیں اور خون کہ یہ سب کھلے کھلے معجزے تھے)۔

قَالُوۡا یعنی فرعون اور اس کے گروہ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا۔ مِنۡ اٰيَةٍ یعنی معجزہ اور دعوئے رسالت کی سچائی کی نشانی۔ حضرت موسیٰؑ کے پیش کئے ہوئے معجزہ کو انہوں نے آیت (علامت صداقت) یا تو اس لئے کہا کہ حضرت موسیٰؑ کا یہی دعویٰ تھا یا بطور استہزاء کہا، اسی لئے آئندہ فقرہ میں اس کو سحر قرار دیا۔ تَسۡحَرَنَا بِهَا تاکہ تم ہماری نظر بندی کر دو اور ہم کو ہمارے مذہب سے پھیر دو، بِمُؤۡمِنِيۡنَ ہم ہرگز تصدیق نہیں کریں گے۔ بِهٖ (ضمیر مذکر) بِهَا (ضمیر مؤنث) مَهۡمَا کے اندر جو مَا ہے اس کی طرف راجع ہے لفظ مَا مذکر ہے۔ لہٰذا مذکر کی ضمیر راجع کی اور معنوی اعتبار سے ما سے مراد آیت ہے اس لئے مؤنث کی ضمیر راجع کی۔ مُفَصَّلٰت واضح نشانیاں جن کے عذاب الٰہی ہونے میں کسی عقل مند کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا یا مُفَصَّلٰت سے مراد ہے الگ الگ کچھ کچھ فصل سے۔ ابن ابی حاتم اور سعید بن جبیر نے کہا ہر دو معجزات کے درمیان ایک ماہ کی مدت ہوتی تھی۔ ابن المنذر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ہر نوع کا عذاب سنیچر سے سنیچر تک ایک ہفتہ رہتا تھا پھر ایک مہینہ کے لئے اٹھا لیا جاتا (پھر دوسرا عذاب آتا تھا) یہ بھی روایت ہے کہ جادوگروں کے مغلوب ہونے کے بعد حضرت موسیٰؑ ان کے اندر بیس برس تک رہے اور کچھ کچھ وقفہ کے بعد معجزہ دکھاتے رہے۔

حضرت ابن عباسؓ، قتادہؒ، سعید بن جبیر اور محمد ابن اسحاق کا بیان بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ جب جادوگر ایمان لے آئے اور فرعون اور اس کے ساتھی سب شکست کھا کر واپس چلے گئے اور کفر وشر سے کسی طرح باز نہ آئے تو اللہ نے پے در پے قحط سالیوں میں مبتلا کر دیا اور پھلوں کی پیداوار گھٹ گئی اس طرح چار آیات قدرت یعنی عصاء موسیٰؑ، ید بیضا، قحط سالیاں اور پیداوار کی کمی دیکھنے کے بعد بھی ان کو عبرت نہ ہوئی اور کفر پر بدستور اڑے رہے، تو حضرت موسیٰؑ نے بددعا کی اے اللہ زمین پر تیرا بندہ فرعون مغرور اور سرکش ہو گیا اور حد سے آگے بڑھ چکا اور اس کی قوم نے بھی تیرے عہد کو توڑ دیا اب تو ان کو عذاب میں گرفتار کر دے جو ان کے لئے سزا اور میری قوم کے لئے نصیحت اور آنے والے لوگوں کے لئے ایک نشان اور عبرت ہو (حضرت موسیٰؑ

کی بد دعا قبول ہوئی اور) اللہ نے طوفان بھیج دیا۔ طوفان آبی تھا ایسی بارش ہوئی کہ قبطیوں کے گھروں میں پانی بھر گیا (نہ لیٹنے کی جگہ رہی نہ بیٹھنے کی) سب گھروں کے اندر پانی میں کھڑے ہو گئے بنی اسرائیل اور قبطیوں کے مکان باہم متصل اور مخلوط تھے مگر (بنی اسرائیل کے مکان محفوظ رہے اور) قبطیوں کے گھروں کے اندر پانی رک کر کھڑا ہو گیا اور کھیتوں میں بھی پانی ٹھہر گیا کہ نہ زمین جوت سکتے تھے نہ کچھ بو سکتے تھے۔ یہ طوفان سنیچر سے سنیچر تک سات روز رہا۔ مجاہد اور عطاء نے کہا طوفان سے مراد موت ہے۔ ابن جریر نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے یہی قول مرفوعاً نقل کیا ہے۔ وہب نے کہا یمنی زبان میں طوفان طاعون کو کہتے ہیں۔ ابو قلابہ نے کہا طوفان سے مراد ہے چیچک۔ سب سے پہلے چیچک کے عذاب میں قبطی ہی مبتلا ہوئے پھر چیچک کا مرض اس زمین پر رہ گیا (اور سب لوگ مبتلا ہونے لگے) مقاتل نے کہا ایک آبی طوفان تھا جو ان کے کھیتوں پر چڑھ گیا تھا۔ ابو ظبیان نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ طوفان اللہ کا ایک حکم تھا جس کو طائف کہا گیا ہے فرمایا ہے فَطَافَ عَلَيْهِمْ طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ۔

علمائے کوفہ نے صراحت کی ہے کہ رُجْحَان اور نُقْصَان کی طرح طُوْفَان بھی مصدر ہے جس کی جمع نہیں آتی۔ علماء بصرہ کے نزدیک طُوْفَان جمع ہے اس کا واحد طُوْفَانَة ہے۔

آخر قبطیوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا آپ اپنے رب سے بارش بند ہو جانے کی دعا کیجئے اگر ہمارے سروں سے بارش کی یہ مصیبت ہٹ گئی تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ چھوڑ دیں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے دعا کی اللہ نے طوفان دور کر دیا اور اس سال ایسی کھیتی پھل اور گھاس اللہ نے پیدا کی کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی تمام ملک سر سبز ہو گیا۔ قبطی یہ حالت دیکھ کر کہنے لگے یہ پانی تو ہمارے لئے نعمت ثابت ہوا تمام ملک سر سبز ہو گیا (ہرگز یہ عذاب اور موسیٰ کو نہ ماننے کا نتیجہ نہ تھا) غرض ایمان نہ لائے اور ایک ماہ چین میں رہے۔ اس کے بعد اللہ نے ان پر ٹڈی دل بھیجا۔ ٹڈیوں نے قبطیوں کی تمام کھیتیاں، پھل، درختوں، کے پتے، ترکاریاں، گھاس اور سبزی کھالی، یہاں تک کہ لکڑی کے کیواڑ، مکانوں کی چھتیں، کڑیاں، تختے، گھر کا سامان اور کیواڑوں میں لگی ہوئی لوہے کی کیلیں بھی چٹ کر گئیں اور پھر بھی ان کو سیری نہ ہوئی، یہ مصیبت صرف قبطیوں پر پڑی۔ بنی اسرائیل امن سے رہے، قبطی چیخ پڑے اور اللہ کا واسطہ دے کر مضبوط عہد و پیمانہ کر کے حضرت موسیٰؑ سے درخواست کی کہ اپنے رب سے دعا کر کے اس مصیبت کو دور کرا دیجئے اگر یہ عذاب ٹل گیا تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ قبطیوں پر ٹڈی دل کا عذاب سنیچر سے سنیچر تک سات دن رہا۔ آخر حضرت نے دعا کی اور اللہ نے وہ عذاب دور فرما دیا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ ہر ٹڈی کے سینہ پر لکھا ہوا تھا۔ "اللہ کا بڑا لشکر"۔ یہ بھی منقول ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے شہر کے باہر میدان میں نکل کر مشرق و مغرب کی طرف اپنی لاٹھی سے اشارہ کیا فوراً ٹڈی دل جس طرف سے آیا تھا اسی طرف واپس ہو گیا اس عذاب سے کچھ کھیتیاں، غلہ اور پیداوار بچ بھی رہا تھا (کیونکہ تکمیل عذاب سے پہلے حضرت موسیٰؑ کی دعا سے عذاب ٹل گیا تھا) قبطی کہنے لگے خیر اتنا تو رہ گیا جو ہماری گزر بسر کے لئے کافی ہے، ہم اپنے مذہب کو نہیں چھوڑیں گے، چنانچہ انہوں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور بد اعمالی پر بدستور قائم رہے اور اس طرح چین سے ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک ماہ کے بعد اللہ نے قمل کا عذاب مسلط کیا۔ سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قمل سے مراد گیہوں کا گھن ہے۔ مجاہد، سدی، قتادہؒ اور کلبیؒ نے کہا قمل چھوٹی ٹڈیاں تھیں جن کے پر نہ تھے اور ٹڈی دل بڑی پر دار ٹڈیوں کا تھا۔ عکرمہ نے قمل کو ٹڈیوں کے مادین بچے کہا ہے۔ ابو عبید نے کہا قمل حمنان کو کہتے ہیں اور حمنان ایک قسم کی چچڑی ہوتی ہے۔ عطاء خراسانی نے کہا قمل کا معنی ہے جوں۔

روایت میں آیا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ قریۂ عین الشمس علاقہ مصر میں (فلاں) ریتیلے خاکستری رنگ کے ٹیلہ کی طرف جاؤ۔ حضرت موسیٰؑ نے حکم کی تعمیل کی وہ ٹیلہ ریگ رواں کا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے اس پر لاٹھی ماری فوراً قمل اس کے اندر سے نکل کر پھیل گئیں اور قبطیوں کی جو کچھ کھیتیاں درخت اور سبزیاں رہ گئی تھیں سب کو چٹ کر گئیں کپڑوں

کے اندر گھس کر بدن کو کاٹتی تھیں اور کھانا کھاتے میں کھانے میں بھر جاتی تھیں۔ سعیدؒ بن میسب کا قول ہے کہ قمل سے مراد غلہ کا گھن ہے اگر کوئی شخص دس قفیز گیہوں چکی کو لے جاتا تھا تو تین قفیز آٹا واپس نہ لاتا تھا ایسی مصیبت قبطیوں پر کبھی نہیں آئی تھی بدن کے بال گر گئے، پلکوں اور ابرو کے بال جھڑ گئے، بدن کی کھال پر قمل چیچک کی طرح بھر گئی اور سونا، آرام کرنا حرام کر دیا۔ قبطی چیخ پڑے اور فریاد لے کر موسیٰؑ کے پاس گئے اور درخواست کی ہم توبہ کرتے ہیں آپ اپنے رب سے دعا کر دیجئے کہ وہ یہ مصیبت دور کر دے۔ حضرت موسیٰؑ نے دعا کر دی اور اللہ نے ایک ہفتہ تک عذاب قمل میں مبتلا رکھنے کے بعد عذاب سے نجات دے دی، یہ عذاب بھی سنیچر سے سنیچر تک رہا۔ قبطیوں نے پھر بھی عہد شکنی کی اور بدترین اعمال میں منہمک ہو گئے اور کہنے لگے موسیٰؑ کے جادوگر ہونے کا یقین ہم کو اتنا پہلے نہیں ہوا تھا جتنا اس مرتبہ ریت کو کیڑوں کی شکل میں بدل دینے سے پیدا ہو گیا ایک مہینہ تک سکھ سے رہے۔ حضرت موسیٰؑ نے پھر بددعا کی اور اللہ نے مینڈکیوں کا عذاب بھیجا تمام گھر آنگن میدان، کھانے، برتن، مینڈکوں سے بھر گئے، ہر کھانے اور ہر برتن میں مینڈک ہی مینڈک نظر آنے لگے آدمی ٹھوڑی تک مینڈکوں میں بیٹھتا تھا بولنے کے لئے لب کھولے اور مینڈک کود کر منہ میں پہنچا، کود کود کر ہانڈیوں اور چولھوں میں جا پڑتے، کھانوں کو برباد کر دیتے اور آگ کو بجھا دیتے۔ آدمی سونے کو لیٹتا تو مینڈکیاں اس پر چڑھ جاتیں اور مینڈکوں کا ایک تودہ چن جاتا کہ وہ کروٹ بھی نہ لے سکتا۔ کھانا کھانے کے لئے منہ کھولتا تو لقمہ سے پہلے مینڈکی منہ میں کود کر گھس جاتی آٹا گوندھا جاتا تو بکثرت مینڈکیاں اس میں کچل جاتیں۔ غرض ایک عظیم دکھ تھا جو کسی طرح دور نہ ہوتا تھا۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مینڈک پہلے خشکی کا جانور تھا لیکن جب فرعون کی قوم پر اللہ نے ان کو مسلط کیا اور انہوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل اس حد تک کی کہ بلتی ہانڈیوں اور بھڑکتے تنوروں میں گرنے سے بھی تامل نہ کیا، تو اللہ نے اس حسن اطاعت کے عوض ان کو پانی کا جانور بنا دیا (اور وہ آرام سے پانی میں رہنے لگے)۔

قبطیوں نے مینڈکوں کے عذاب کا دکھڑا حضرت موسیٰؑ سے رویا اور کہنے لگے ہم اس مرتبہ (پکی) توبہ کرتے ہیں دوبارہ ایسی حرکتیں نہیں کریں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے پختہ عہد و پیمان لے کر بارگاہ الٰہی میں دعا کی اور سات روز کے بعد اللہ نے اس عذاب کو بھی دور کر دیا یہ عذاب بھی سنیچر سے سنیچر تک رہا۔ مصیبت دور ہونے کے بعد وہ لوگ ایک مہینہ تک چین سے رہے لیکن پھر عہد توڑ دیا اور کفر کی طرف لوٹ گئے۔ آخر حضرت موسیٰؑ کی بددعا سے اللہ نے خون کا عذاب مسلط کر دیا۔ ان کے لئے دریائے نیل خون ہو گیا کنویں اور نہریں خون بن گئیں کنوؤں اور نہروں سے جو پانی لیتے تھے وہ خالص تازہ خون ہوتا تھا۔ فرعون سے شکایت کی تو اس نے کہا موسیٰؑ نے تم پر جادو کر دیا ہے (یعنی تمہاری نظر بندی کر دی ہے) لوگوں نے کہا جادو کہاں کر دیا ہم تو اپنی آنکھوں سے بجائے پانی کے خون ہی خون دیکھتے ہیں (یہ نظر بندی نہیں) یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ اسرائیلی اور قبطی ایک برتن میں پانی (آمنے سامنے ہو کر) پیتے تھے قبطی کی طرف کا پانی خون ہو جاتا تھا اور اسرائیلی کی طرف کا پانی پانی ہی رہتا تھا۔ ایک کنویں پر (ایک ساتھ) کھڑے ہو کر اسرائیلی اور قبطی پانی کھینچتے تھے اسرائیلی کا نکالا ہوا پانی پانی ہوتا تھا اور قبطی کا نکالا ہوا پانی خون۔ پیاس سے بیتاب ہو کر قبطی عورت اسرائیلی عورت کے پاس آتی تھی اور پینے کے لئے پانی مانگتی، اسرائیلی عورت قبطی عورت کے برتن میں پانی انڈیل دیتی تھی مگر اس کے برتن میں پہنچ کر پانی خون ہو جاتا تھا قبطی عورت اسرائیلی عورت سے کہتی تھی پانی اپنے منہ میں لے کر میرے منہ میں کلی ڈال دے، اسرائیلی عورت ایسا کر دیتی تھی مگر قبطی عورت کے منہ میں پہنچ کر کلی کا پانی خون ہو جاتا تھا۔ فرعون بھی پیاس سے اتنا بے تاب ہوا کہ درختوں کی تر پتیاں چبانے لگا لیکن چباتے ہی پتیوں کا عرق بالکل نمکین پانی ہو جاتا تھا خون پینے کی یہ کیفیت ان کی سات روز رہی۔ زید بن اسلم کے نزدیک خون سے مراد ہے نکسیر پھوٹنا۔ اللہ کی طرف سے نکسیر کا مرض قبطیوں پر مسلط ہو گیا تھا، آخر کار مجبور ہو کر پھر حضرت موسیٰؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر عذاب دور ہونے کی دعا کی درخواست کی اور کہا آپ اپنے رب سے دعا کریں، یہ مصیبت دور ہو جائے گی تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کے ساتھ بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے۔ حضرت موسیٰؑ کی دعا سے یہ عذاب بھی اللہ نے دور کر دیا لیکن

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ (پھر بھی (موسیٰ پر ایمان لانے سے) انہوں نے غرور کیا اور وہ تھے ہی مجرم لوگ)
وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ
وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۳۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۱۳۵﴾
(اور جب ان پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو کہتے موسیٰ ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کر دو جس کا اس نے آپ سے وعدہ کر رکھا ہے اگر آپ ہم سے اس عذاب کو اٹھا دیں گے تو ہم ضرور ضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی آپ کے ساتھ جانے دیں گے، پھر جب ہم ان سے اس عذاب کو ایک وقت خاص تک کہ اس تک ان کو پہنچنا تھا ہٹا دیتے تو وہ فوراً ہی وعدہ کے خلاف کرنے لگتے)۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ اور جب ان پر عذاب مذکور یعنی طوفان وغیرہ نازل ہو گیا۔ سعید بن جبیر کے نزدیک رجز سے مراد طاعون ہے پانچ آیات کے ظہور کے بعد یہ چھٹی آیت عذاب تھی، جس سے ایک دن میں ستر ہزار آدمی مر گئے اور باہم دفن کرتے کرتے ان کو شام ہو گئی۔ بخاری و مسلم نے صحیحین میں اور ترمذی و بغویؒ نے حضرت اسامہؓ بن زید کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طاعون ایک عذاب ہے جو اللہ نے بنی اسرائیل پر اور تم سے پہلی قوموں پر بھیجا تھا اس لئے اگر کسی جگہ طاعون ہو تو خود وہاں نہ جاؤ اور اگر وہاں پیدا ہو جائے جہاں تم ہو تو وہاں سے مت بھاگو۔ امام احمد اور بخاری نے حضرت عائشہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طاعون ایک عذاب ہے جس پر چاہتا ہے اللہ بھیج دیتا ہے، مگر مؤمنوں کے لئے اللہ نے اس کو رحمت بنا دیا ہے اگر کسی بستی میں طاعون پڑا ہو اور کوئی (مسلمان) وہاں بامید ثواب صبر کے ساتھ رہے اور یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہی اس کو پہنچے گا (اور طاعون میں مبتلا ہو کر مر جائے) تو اس کو شہید کی طرح ثواب ملے گا۔

میں کہتا ہوں یہ دونوں حدیثیں بتا رہی ہیں کہ طاعون بنی اسرائیل پر بھیجا گیا تھا۔ قبطیوں پر بصورت عذاب آنا ان حدیثوں سے نہیں معلوم ہوتا۔ شاید فرعون کے بعد بنی اسرائیل پر طاعون کا عذاب آیا ہے۔

اگر سعید بن جبیر کا قول صحیح مان لیا جائے تو عصا اور ید بیضاء کے بعد تیسرا معجزہ کال اور پھلوں کی بربادی قرار پائے گا، کال دیہات والوں کے لئے اور پھلوں کی تباہی شہریوں کے لئے، اس کے بعد طوفان سے رجز تک چھ معجزات ہوں گے آیت وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ میں یہی نو نشانیاں مراد ہیں۔

قَالُوْا یعنی فرعون اور اس کے ساتھیوں نے کہا۔ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ یعنی اس وعدہ کے مطابق جو اللہ نے آپ سے کیا ہے کہ اگر ہم ایمان لے آئیں گے تو اللہ عذاب دور کر دے گا۔ عطاء کے نزدیک بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ سے مراد ہے نبوت۔ بعض کے نزدیک۔ مَا عَهِدَ عِنْدَكَ سے مراد ہے موسیٰؑ کی دعا کے قبول ہونے کا وعدہ۔ بہر حال بما کا تعلق ادع سے ہے یا ادع کی ضمیر سے حال ہے یعنی اپنی نبوت یا قبول دعا کے وعدہ کا سہارا لے کر دعا کر دو یا فعل محذوف سے تعلق ہے یعنی ہماری درخواست بحق نبوت قبول کیجئے یا بِمَا عَهِدَ میں ب قسمیہ ہے جس کا جواب لَئِنْ كَشَفْتَ ہے یعنی ہم اس عہد کی قسم کھاتے ہیں جو اللہ نے آپ سے کیا ہے کہ اگر آپ عذاب دور کروا دیں گے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ وَلَنُرْسِلَنَّ اور ہم ملک شام کو آپ کے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دیں گے۔ فَلَمَّا كَشَفْنَا یعنی جب موسیٰؑ کی دعا سے ہم نے دور کر دیا۔ اِلٰٓى اَجَلٍ یعنی اس وقت تک کے لئے جس میں ان پر عذاب کا آنا یا ہلاک ہونا یقینی تھا یعنی غرق ہونے یا مرنے کے وقت تک کے لئے۔ بعض کے نزدیک اِلٰٓى اَجَلٍ سے وہ وقت مراد ہے جو انہوں نے اپنے ایمان کے لئے مقرر کر رکھا تھا۔ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ یہ لما کا جواب ہے یعنی جب ہم نے عذاب دور کر دیا تو وہ فوراً بلا توقف عہد سے پھر گئے اور کفر پر جمے رہے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾
(پھر ہم نے ان سے بدلہ لے لیا یعنی دریا میں ان کو غرق کر دیا کیونکہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی بے توجہی

کرتے تھے)۔
فانتقمنا یعنی ہم نے ان کو عذاب میں پکڑا نقمۃ عذاب۔ فی الیم اتھاہ سمندر میں ہم نے ان کو ڈبو دیا۔ یم سے مراد ہے بحر شور کا کنڈ اور وسطی گہرا حصہ۔ یم کا لفظ تمیم سے ماخوذ ہے تمیم کا معنی ہے قصہ کرنا۔ سمندر سے فائدہ اٹھانے والے سمندر کا سفر بالارادہ کرتے ہیں۔ بانہم میں باء سببیہ ہے اور عنہا کی ضمیر آیات کی طرف راجع ہے، وہ ہماری آیات سے غافل تھے یعنی آیات پر انہوں نے کبھی غور نہیں کیا تو گویا غافلوں کی طرح تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عنہا کی ضمیر نقمۃ کی طرف راجع ہے جس پر فانتقمنا کا لفظ دلالت کر رہا ہے۔

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ؁

(اور ہم نے ان لوگوں کو جو بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے اس سرزمین کا پورب سے لے کر پچھم تک وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی تھی اور آپ کے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہو گیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں کو اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بناتے تھے سب کو درہم برہم کر دیا)۔

القوم یعنی بنی اسرائیل۔ الذین کانوا یستضعفون جن کو غلام بنایا جاتا تھا، ان کی عورتوں سے خدمت لے جاتی تھی اور لڑکوں کو قتل کیا جاتا تھا۔ الارض یعنی مصر و شام کی سرزمین۔ التی بارکنا فیہا جس کے اندر ہم نے برکت پیدا کی تھی یعنی دریا تھے درخت اور پھل تھے، سرسبزی اور راحت زندگی تھی، ارزانی تھی۔ فرعونیوں کے بعد مصر میں اور عمالقہ کے بعد شام میں بنی اسرائیل کو اقتدار حاصل ہوا اور ان ملکوں کا سارا علاقہ ان کے قبضہ میں آ گیا۔

الحسنی یہ کلمۃ کی صفت ہے اس کا مذکر احسن ہے۔ تمت یعنی اللہ کی بات پوری ہو گئی، محاورہ میں کہا جاتا ہے تم الامر فلاں کام پورا ہو گیا، کامیابی سے ہم کنار ہو گیا۔ یہاں کلمۂ حسنی سے مراد ہے بنی اسرائیل کو فتحیاب اور کامران کرنے کا وعدہ جس کا ذکر سورۃ القصص کی آیت ونرید ان نمن ...... ماکانوا یحذرون میں اور آیت عسی ربکم ان یہلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض میں کیا گیا ہے۔ بما صبروا یعنی چونکہ بنی اسرائیل اپنے دین پر جمے رہے اور فرعون و قوم فرعون کے شدائد و مصائب پر صبر کیا اس لئے اللہ کی طرف سے نصرت و کامیابی کا وعدہ پورا ہو کر رہا۔ ماکانوا یصنعون یعنی محلات اور اونچی اونچی عمارتیں۔ ماکانوا یعرشون حسن نے کہا وہ بیلیں جن کو باغوں میں وہ ٹٹیوں پر چڑھاتے تھے جیسے انگور کی بیلیں۔ مجاہد نے کہا اونچی عمارتیں مراد ہیں جیسے ہامان کی بنائی ہوئی عمارت اور دوسرے قصور و محلات۔

فرعون اور اس کی قوم کا قصہ اس آیت پر ختم ہو گیا اس سے آگے بنی اسرائیل کی بدترین حرکات اور اعمال شنیعہ کا بیان ہے جب کہ اللہ نے ان کو اپنی آیات قدرت دکھادیں اور عظیم الشان نعمتیں عطا فرمادی تھیں، پھر بھی انہوں نے نافرمانی کی اس سے غرض یہ ہے کہ قوم کی طرف سے لائے ہوئے شدائد پر رسول اللہ ﷺ کو تسکین خاطر حاصل ہو جائے اور مسلمان ہر وقت بیدار رہیں اپنے اعمال کا جائزہ لینے اور نفس کی نگرانی رکھنے سے غفلت نہ کریں۔ بما صبروا کا لفظ صبر کی ترغیب دے رہا ہے اور یہ بات بتا رہا ہے کہ جو شخص شدائد کا مقابلہ صبر سے کرتا ہے اللہ مصائب کو دور کر دیتا ہے اس کے دشمن کو تباہ کر دیتا ہے اور جو گھبرا کر بے صبر ہو جاتا ہے اللہ اس کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے اور اس کو اسی کے حوالے کر دیتا ہے۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي اَصْنَامٍ لَّهُمْ (اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا کے پار کر دیا پھر ان کا گزر ایسے لوگوں کی طرف سے ہوا جو اپنے بتوں کی عبادت پر جمے ہوئے تھے)۔ کلبی کا بیان ہے کہ فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کے بعد حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو عاشورہ کے دن دریا کے پار لے کر پہنچے تھے اور آپ نے عاشورہ کا روزہ اس کے شکریہ میں رکھا تھا۔

یَعْکُفُوْنَ قائم تھے، جمے ہوئے تھے۔ اَصْنَامٍ لَّھُمْ ابن جریج نے کہا یہ گائے کی مورتیاں تھیں۔ گوسالہ پرستی کی اول بنیاد اسی سے پڑی۔ ابن جریر اور ابن المنذر نے ابن جبیرؓ کا قول بھی یہی نقل کیا ہے اس روایت میں نہاس کا لفظ مزید آیا ہے یعنی وہ مورتیاں تانبے، پیتل کی تھیں۔ جس قوم کو بنی اسرائیل نے بت پرستی میں مشغول دیکھا تھا۔ بعض علماء کے نزدیک وہ عمالقہ تھی اور ابن ابی حاتم نیز ابوالشیخ نے ابن عمران جونی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ لخم و جذام کے قبائل تھے۔ بغویؒ نے قتادہؒ کا قول لکھا ہے کہ وہ لخم کا قبیلہ تھا۔

قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ ؕ قَالَ اِنَّکُمْ قَوْمٌ تَجْھَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا ھُمْ فِیْہِ وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ (کہنے لگے موسیٰؑ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود مقرر کر دو جیسے ان کے معبود ہیں موسیٰؑ نے جواب دیا یقیناً تم لوگ جاہل ہو، یہ لوگ جس (مذہب) میں ہیں وہ تباہ ہونے والا ہے اور جو کچھ کر رہے ہیں وہ بے حقیقت اور بے کار ہے)۔

یعنی اللہ کا قرب اس سے نہیں ملے گا۔ اِلٰھًا یعنی مورتی جس کی ہم پوجا کریں۔ بغویؒ نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل کی یہ درخواست اس بناء پر نہ تھی کہ ان کو اللہ کی وحدانیت میں کوئی شک تھا بلکہ وہ اپنی عقل کی کمزوری اور انتہائی جہالت سے یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اس عمل سے دینداری میں کوئی خرابی نہیں آئے گی اور ہم مقرر کردہ مورتی کی تعظیم کر کے اللہ کے مقرب ہو جائیں گے۔ اتنی آیات قدرت دیکھنے کے بعد جب بنی اسرائیل نے ایسی جاہلانہ درخواست کی تو حضرت موسیٰؑ نے بطور تعجب، قَالَ کہا کہ حقیقت میں تم جاہل ہو، مُتَبَّرٌ تباہ و برباد یعنی اللہ ان کے دین کو تباہ کر دیگا اور ان کی مورتیوں کو ڈھا دیگا اور ریزہ ریزہ کرے گا۔

مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ یعنی یہ جو مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں بے حقیقت اور باطل ہے۔ مُتَبَّرٌ اور بَاطِلٌ دونوں خبروں کو مبتدا سے پہلے ذکر کرنا یہ بتانے کے لئے ہے کہ ان کی بربادی ضرور ہوگی اور ان کی گزشتہ عبادت گزاریاں نابود اور ناقابل اعتبار ہوں گی در حقیقت یہ بات بنی اسرائیل کو ان کی درخواست سے باز داشت کرنے اور روکنے کے لئے حضرت موسیٰؑ نے فرمائی۔

قَالَ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْکُمْ اِلٰھًا وَّھُوَ فَضَّلَکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾ (موسیٰؑ نے (بطور زجر و تعجب) کہا کیا میں تمہارے لئے کوئی دوسرا معبود طلب کروں حالانکہ اللہ ہی نے تم کو (اس زمانہ کے) سب لوگوں پر برتری عطا فرمائی ہے) یعنی تم کو ایسی نعمتوں سے نوازا ہے کہ اس زمانہ میں کسی کو ایسا نہیں نوازا۔ حضرت موسیٰؑ کے اس قول میں تنبیہ ہے کہ تم نے اللہ کی ان نعمتوں کا جو اس نے صرف تم کو عطا فرمائیں اور بغیر استحقاق کے محض اپنے کرم سے عطا فرمائیں، بر ابدلہ دیا کہ اللہ کی ذلیل مخلوق کو استحقاق معبودیت میں اللہ سے جا ملایا حالانکہ اس کی کوئی مثل نہیں۔ حضرت واقد لیثیؓ کا بیان ہے کہ ایک بار حنین کی جانب ہم رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب جا رہے تھے راستہ میں ہمارا گزر سدرہ کی طرف سے ہوا جاہلیت کے زمانہ میں کفار اپنے اسلحہ سدرہ (درخت بیر) سے لٹکا کر گرداگرد طواف کرتے تھے ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جیسی کافروں کے لئے انواط والی (بیری) معبود ہے ہمارے لئے بھی آپ کوئی ذات انواط (درخت بیر جس پر اسلحہ لٹکائے جاتی ہوں) مقرر فرما دیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا "اللہ اکبر" یہ قول تو ایسا ہی ہے جیسا بنی اسرائیل نے موسیٰؑ سے کہا تھا اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰھًا کَمَا لَھُمْ اٰلِھَۃٌ تم لوگ یقیناً پہلوں کے راستہ پر چلو گے، رواہ البغوی۔

وَاِذْ اَنْجَیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ ؕ وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ﴿۱۴۱﴾ (اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں کے ظلم سے بچالیا جو تم کو بڑی سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے تمہارے بیٹوں کو بکثرت مار ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (اپنی بے گار اور خدمت کے لئے) زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی)۔

وَاِذْ اور اس احسان کو یاد کرو جو اللہ نے تمہارے ساتھ کیا تھا (یعنی اس وقت کے واقعات کو یاد کرو)۔

یُقَتِّلُوْنَ باب تفعیل سے ہے اور باب تفعیل بھی تکثیر کے لئے آتا ہے یعنی بکثرت قتل کرتے تھے۔ یُقَتِّلُوْنَ کا پورا جملہ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کا بیان ہے۔ وَفِيْ ذٰلِكُمْ اور اس میں یعنی دکھ اور اذیت میں یا تمہاری نجات میں۔ بَلَآءٌ آزمائش تھی اول صورت میں بصورت دکھ آزمائش تھی۔ اور دوسری صورت میں بصورت نعمت۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ (اور ہم نے موسیٰؑ سے تیس شب کا وعدہ کر لیا اور مزید دس راتوں کو تیس کا تتمہ کر دیا اس طرح اللہ کا مقرر کردہ وقت چالیس شب ہو گیا)

ابن ابی حاتم نے ابوالعالیہ کا قول لکھا ہے کہ ایک چلہ ہو گیا یعنی ذیقعدہ کا ایک مہینہ اور ذی الحجہ کے دس دن۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ اللہ نے موسیٰؑ سے ایک ماہ پورا ہونے کے بعد کلام کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ بغویؒ نے لکھا ہے جب بنی اسرائیل مصر میں تھے تو حضرت موسیٰؑ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ جب اللہ تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا تو تم کو ایک کتاب عطا فرمائے گا جس میں تمام اوامر و نواہی کا بیان ہو گا۔ پھر جب اللہ نے دشمن کو ہلاک کر دیا تو حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے کتاب نازل فرمانے کی درخواست کی اللہ نے تیس روزے رکھنے کا حکم دیا جب تیس دن ہو گئے تو حضرت موسیٰؑ کو منہ میں کچھ بدبو محسوس ہوئی تو آپ نے کسی نرم لکڑی سے مسواک کر لی۔ ابوالعالیہ نے کہا کسی درخت کی چھال کو چبایا تھا۔ فرشتوں نے حضرت موسیٰؑ سے کہا پہلے ہم کو آپ کے منہ سے مشک کی خوشبو آتی تھی آپ نے مسواک کر کے اس کو خراب کر دیا اس پر اللہ نے ذی الحجہ کے دس دن کی روزے رکھنے کا حکم دیا اور فرمایا کیا تم کو نہیں معلوم کہ روزہ دار کے منہ کی بو میرے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ بنی اسرائیل کا فتنہ اسی عشرہ میں اٹھا تھا۔ دیلمی نے اسی کی ہم معنی روایت حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی منسوب کی ہے۔ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ یعنی کلام کرنے اور کتاب عطا کرنے کے وعدہ کا وقت۔

وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ (اور موسیٰؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہہ دیا تھا کہ میرے بعد میری جگہ ان لوگوں کا انتظام رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا اور بد عمل لوگوں کی رائے پر عمل مت کرنا اور جب موسیٰؑ ہمارے مقرر کردہ وقت پر آئے اور ان کے رب نے ان سے باتیں کیں تو موسیٰؑ نے عرض کیا اے میرے رب مجھے اپنا دیدار کرا دے کہ میں ایک نظر تجھے دیکھ لوں، اللہ نے فرمایا تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے لیکن اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو سو اگر یہ اپنی جگہ پر برقرار رہا تو تم بھی دیکھ سکو گے)۔

وَقَالَ مُوْسٰى یعنی مناجات کے لئے پہاڑ کی طرف جاتے وقت موسیٰؑ نے کہا۔ اُخْلُفْنِيْ یعنی میرا قائم مقام ہو جا۔ وَاَصْلِحْ اور جن امور کی اصلاح کی ضرورت پڑے ان کی درستی کرنا یا مصلح بن جایا بنی اسرائیل کی اصلاح کرتے رہنا اور ان کو اللہ کی اطاعت کی ترغیب دیتا رہنا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اَصْلِحْ فرمانے سے حضرت موسیٰؑ کی مراد یہ تھی کہ بنی اسرائیل سے نرمی کرنا اور ان سے حسن سلوک رکھنا۔ وَلَا تَتَّبِعْ یعنی نافرمانوں کی راہ پر نہ چلنا اور جو لوگ معصیت کی راہ پر لے جانا چاہیں ان کی بات نہ ماننا۔ وَلَمَّا جَآءَ یعنی جب موسیٰؑ طور سینا پر آئے لِمِيْقَاتِنَا اس میں لام تخصیص کا ہے یعنی ہمارے مقرر کردہ وقت پر۔ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ موسیٰؑ طہارت کر کے پاک کپڑے پہن کر اللہ کے وعدہ کے مطابق تیار ہو گئے۔ وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ اس واقعہ کی تفصیل میں آیا ہے کہ اللہ نے سات فرسخ تک تاریکی ہی تاریکی کر دی اس حصہ سے شیاطین کو باہر نکال دیا۔ زمین کے کیڑوں کو بھی ہٹا دیا اور دونوں فرشتوں کو بھی الگ کر دیا اور آسمان تک فضا کو صاف کر دیا۔ اس وقت حضرت موسیٰؑ نے تو سن لیا مگر موسیٰؑ کے ساتھ جو اس وقت جبرئیل موجود تھے ان کو کچھ سنائی نہیں دیا یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ نے قلم چلنے کی آواز بھی سنی۔

بیضاویؒ نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ ہر طرف سے کلام سن رہے تھے۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد یہ ہے کہ کسی جہت سے نہیں سن رہے تھے (یعنی وہ کلام کسی جہت کا محتاج نہیں تھا تمام جہات و اطراف کی قیود سے آزاد تھا)

جس طرف رخ کرتے تھے وہی کلام بے جہت سنتے تھے اس طرح موسیٰؑ پر کلام رب کا انکشاف ہو گیا۔ اور اس سے آگے دیدار کے مشاہدہ کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ اَرِنِیْ یعنی مجھے اپنا دیدار دکھا۔ (اَرِ کا مفعول محذوف ہے) اَنْظُرْ اِلَیْکَ حسن نے کہا موسیٰؑ کا شوق دیدار اتنا جوش میں آیا کہ انہوں نے رویت آخرت پر قیاس کرتے ہوئے اس دنیا میں بھی دیدار ہونے کا گمان کر لیا۔ (یعنی جذبہ شوق سے مجبور ہو کر حضرت موسیٰؑ نے اَنْظُرْ اِلَیْکَ کہا تھا)۔

قَالَ لَنْ تَرٰنِیْ اللہ نے فرمایا تو ہرگز مجھے نہیں دیکھ پائے گا، نہ کوئی انسان دنیا میں میری طرف نگاہ کر سکتا ہے جو شخص میری طرف دیکھے گا، مر جائے گا۔ موسیٰؑ نے کہا الٰہی میں تیرا کلام سن کر تیرے دیدار کا مشتاق ہوا اگر میں تیری طرف دیکھ لوں اور مر جاؤں تو بغیر دیدار زندہ رہنے سے مجھے زیادہ پسند ہے۔ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ لَنْ تَرٰنِیْ (تو مجھے نہیں دیکھ پائے گا) فرمایا لَا اُرٰی (میں نہیں دیکھا جا سکتا) نہیں فرمایا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کا دیدار فی نفسہٖ محال نہیں ہے (اگرچہ اس عالم میں اس کو کوئی نہیں دیکھ سکتا)۔

اِلَی الْجَبَلِ مدین میں یہ سب سے بڑا پہاڑ تھا جس کو زبیر کہا جاتا تھا۔ سدیؒ کا بیان ہے کہ جس وقت اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا تھا اس وقت ابلیس نے زمین کے اندر گھس کر اور پھر موسیٰؑ کے دونوں قدموں کے درمیان سے زمین چیر کر اوپر کو سر نکال کر موسیٰؑ کے دل میں وسوسہ ڈالا تھا کہ یہ کلام کرنے والا اللہ نہیں شیطان ہے۔ اس وقت حضرت موسیٰؑ نے دیدار کی درخواست کی۔

اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ دنیا میں اللہ کا دیدار (فی نفسہٖ) ممکن ہے انبیاء ناممکن چیز کی طلب نہیں کر سکتے، خصوصاً ایسی ناممکن چیز کی طلب جس سے معرفت خداوندی میں جہالت لازم آتی ہو۔ ہاں لَنْ تَرٰنِیْ کا لفظ یہ ضرور بتا رہا ہے کہ موسیٰؑ کو اس دنیا میں دیدار ملا نہیں لیکن کبھی نہیں ملے گا اس کا کوئی ثبوت آیت میں نہیں دوامی عدم وقوع ہی آیت سے ثابت نہیں۔ عدم امکان کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

ایک شبہ

کیا موسیٰؑ اللہ کے معاملہ میں اتنے نادان تھے کہ ان کو معلوم ہی نہ تھا کہ اللہ کا دیدار ہو سکتا ہے یا نہیں اور اس نادانی ہی کی وجہ سے وہ دیکھنے کی درخواست کر بیٹھے۔

ازالہ

لَنْ تَرٰنِیْ کے نزول سے پہلے حضرت موسیٰؑ کا بعض احکام سے ناواقف ہونا لازم آتا ہے اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کی نجات کی دعا کی تھی اور ان کو معلوم نہ تھا کہ وہ ڈوبنے سے بچایا جائے گا نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کی مغفرت کی دعا کی تھی اور آپ کو معلوم نہ تھا کہ مشرک کی مغفرت نہیں ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ نے ابو طالب کی مغفرت کی درخواست کی تھی جس پر آیت مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِکِیْنَ وَلَوْ کَانُوْٓا اُولِیْ قُرْبٰی نازل ہوئی۔ بعض منافقوں کی بخشش کی دعا بھی حضور ﷺ نے کی تھی جس پر آیت اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ اور آیت وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ نازل ہوئی۔ یہ تمام دعائیں اس وقت کی گئیں جب کہ یہ معلوم نہ تھا کہ کافروں کے لئے مغفرت کی دعا نا قابل قبول ہے۔

(معتزلہ کی نزدیک) دیدار الٰہی ناممکن ہے (نہ دنیا میں ممکن ہے نہ آخرت میں) دلیل یہ ہے کہ لَنْ تَرٰنِیْ فرمادیا اور لَنْ کا لفظ تابید کے لئے نہیں بلکہ دنیا میں رویت کی نفی کی تاکید کے لئے ہے (تو ہرگز مجھے نہیں دیکھے گا۔ ہرگز سے تاکید نفی ہوتی ہے اور کبھی سے نفی رویت کا دوام) دیکھو یہودیوں کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا (یہ ہرگز موت کی تمنا نہیں

کریں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے کیونکہ) آخرت میں کافروں کو موت کی تمنا ہوگی۔ اللہ نے خود فرمادیا ہے وَنَادَوْا یٰمَالِكُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّكَ (وہ پکاریں گی اے مالک کاش تیرا رب ہم کو تمام ہی کردیتا۔ ہماری موت کا حکم ہی دے دیتا) اور فرمایا یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ (کاش پہلی موت ہی تمام کردینے والی ہوتی) وَیَقُولُ الْكٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا (اور کافر کہے گا کاش میں خاک ہو گیا ہوتا)۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ موسیٰؑ نے دیدار الٰہی کی درخواست قوم کی زبان بندی کے لئے کی تھی کیونکہ انہوں نے اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً کہا تھا مگر یہ خیال قطعاً غلط ہے یہ واقعہ ہی دوسرا ہے اس گستاخانہ سوال کی پاداش میں تو ان پر عذاب آگیا تھا اور ان پر بجلی گرپڑی تھی فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ وہ ایسی بات کہنے کا حق نہیں رکھتے تھے اسی لئے پکڑے گئے۔

جس وقت حضرت موسیٰؑ نے رب سے کلام کیا اور اللہ نے توریت عطا فرمائی اور موسیٰؑ نے دیدار کی درخواست کی اس وقت تو وہاں کوئی بھی نہ تھا اور چونکہ موسیٰؑ غیر مستحق نہ تھے (اور درخواست گستاخانہ نہ تھی) اس لئے اللہ کی طرف سے اس درخواست پر کوئی عتاب بھی نہیں ہوا، صرف رؤیت سے انکار کردیا گیا کیونکہ موسیٰؑ میں رویت کو برداشت کرنے کی طاقت نہ تھی اور استقرار جبل سے رؤیت کو مشروط کردیا گیا۔

اگر رؤیت واقع میں محال ہوتی تو جب قوم نے دیدار رب کی خواہش کی تھی موسیٰؑ پر لازم تھا کہ ان کو جاہل قرار دیتے اور سرزنش کرتے، جس طرح کہ قوم والوں نے جب اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا کہا تھا تو حضرت موسیٰؑ نے ان کو توبیخ کی اور جاہل قرار دیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے تو حضرت ہارونؑ کو بھی مفسدوں کے راستہ پر چلنے کی ممانعت کردی تھی پھر خود کس طرح مفسدوں کے راستہ پر چل کر ان کی زبان بندی کے لئے خود دیدار کی درخواست کرنے لگتے۔ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ پہاڑ بھی برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تم کو رؤیت کی برداشت کیسے ہوگی۔ استقرار جبل سے رویت کو مشروط کرنا بتا رہا ہے کہ رؤیت فی نفسہ محال نہیں کیونکہ استقرار جبل بجائے خود محال نہیں اور شرط کا امکان مشروط کے امکان کو ثابت کرتا ہے (استقرار جبل ممکن ہے لہٰذا وہ رؤیت جو استقرار جبل کی شرط سے مشروط ہے وہ بھی ممکن ہے)۔

وہب بن منبہ اور ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ جب موسیٰؑ نے دیدار کا سوال کیا تو کہر اور تاریکی چار چار فرسخ تک پہاڑ پر چھاگئی، بجلیاں کڑکنے لگیں، بادل گرجنے اور کڑکنے لگے اور اللہ نے آسمانوں کے فرشتوں کو حکم دے دیا کہ موسیٰؑ کے سامنے آجائیں۔ حسب الحکم اس نچلے آسمان کے ملائکہ بیلوں کی شکل میں بادل کی طرف گرجدار آواز میں اللہ کی تسبیح و تقدیس کرتے سامنے سے گزرے پھر دوسرے آسمان کے ملائکہ بشکل شیر سامنے آئے، ان کے منہ سے بھی اللہ کی تسبیح و تقدیس کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ ضعیف بندہ (موسیٰؑ بن عمران) اس منظر کو دیکھ کر اور ان آوازوں کو سن کر خوف زدہ ہو گیا، لرز گیا، بدن کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا اب مجھے اپنی درخواست پر پشیمانی ہے کاش کوئی چیز مجھے اس مقام سے الگ کردیتی (کہ میں یہ منظر نہ دیکھتا) اس پر ملائکہ کے سرگروہ نے جو سب کا بزرگ تھا کہا موسیٰ ابھی اپنے سوال پر قائم رہو ابھی تو بہت میں سے تھوڑا تم نے دیکھا ہے۔ پھر تیسرے آسمان کے فرشتے اتر کر موسیٰؑ کے سامنے آئے ان کی شکلیں بھی شیروں جیسی تھیں گرجیلی آوازوں سے متواتر تسبیح و تقدیس کا شور کر رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی لشکر کا مخلوط شور ہے۔ آگ کے شعلے کی طرح ان کا رنگ تھا۔ موسیٰؑ خوف زدہ ہو گئے اور زندگی کی آس نہ رہی۔ سرگروہ ملائکہ نے کہا ابن عمران ابھی اپنی جگہ ٹھہرو تمہارے سامنے تو ایسا منظر آئے گا کہ برداشت نہ کرسکو گے پھر چوتھے آسمان کے ملائکہ موسیٰؑ کے سامنے آئے پچھلے ملائکہ کی شکلوں سے الگ ان کی صورتیں تھیں رنگ تو شعلہ کی طرح تھا اور جسم برف کی طرف سفید تھا ان کی تسبیح و تقدیس کی اونچی آوازیں ایسی تھیں کہ سابق فرشتوں کی آوازیں ان جیسی نہ تھیں۔ حضرت موسیٰؑ کا جوڑ جوڑ چٹکنے اور دل دھڑکنے لگا اور شدت کے ساتھ گریہ طاری ہو گیا۔ سید الملائکہ نے کہا ابن عمران ابھی اپنے سوال پر ٹھہرو کم دیکھا ہے زیادہ دیکھنا ہے۔ پھر پانچویں آسمان کے ملائکہ اتر کر موسیٰؑ کے سامنے آئے جن کے سات رنگ تھے موسیٰؑ کو دیکھتے رہنے کی تاب نہ رہی ایسی شکلیں تو انہوں نے پہلے نہیں دیکھی

تھیں نہ ایسی آوازیں سنی تھیں۔ دل بھر آیا غم نے گھیر لیا اور خوب رونے لگے۔ سر گروہ ملائکہ نے کہا ابن عمران ابھی اپنی جگہ (یعنی اپنے سوال پر) صبر کئے رہو ایسی چیزیں سامنے آئیں گی کہ صبر نہ کر سکو گے۔ پھر حسب الحکم چھٹے آسمان کے فرشتے اتر کر موسیٰؑ کے سامنے آئے ہر فرشتے کے ہاتھ میں سورج سے زیادہ روشن درخت کھجور کی طرح لمبا آگ کا ایک ڈنڈا تھا سب کا لباس آگ کے شعلوں کی طرح تھا ہر فرشتے کے ایک سر میں چار منہ تھے گزشتہ فرشتوں کی مجموعی آواز کی طرح اونچی آواز سے تسبیح و تقدیس کر رہے تھے انتہائی بلند آواز سے کہہ رہے تھے۔ سُبُّوحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوْحِ رَبُّ الْعِزَّةِ اَبَدًا لَا يَمُوْتُ۔ موسیٰ ان کی تسبیح کی آواز سن کر خود بھی تسبیح پڑھنے لگے اور رونے لگے اور عرض کرنے لگے اے میرے رب مجھے یاد رکھنا اپنے بندہ کو نظر انداز نہ کرنا معلوم نہیں اس منظر سے میرا چھٹکارا ہو گا یا نہیں اگر میں (یہاں سے) ہٹتا ہوں تو جل جاؤں گا اور رکتا ہوں تو مر جاؤں گا۔

فرشتوں کے سردار نے کہا اے ابن عمران تیرا خوف تو حد سے بڑھ گیا اور تیرا دل نکلا پڑتا ہے مگر جس چیز کا تو نے سوال کیا ہے اس کے لئے صبر کر اس کے بعد ساتویں آسمان کے ملائکہ کو عرش الٰہی اٹھانے کا حکم ہوا جوں ہی نور عرش نمودار ہوا پہاڑ کھل گیا اور تمام فرشتوں نے سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ رَبِّ الْعِزَّةِ اَبَدًا لَا يَمُوْتُ کی آوازیں بلند کیں پہاڑ میں لرزہ آیا اور جو درخت بھی وہاں تھا پھٹ گیا اور بندہ ضعیف موسیٰؑ منہ کے بل بے ہوش ہو کر گر پڑا پھر اللہ نے اپنی رحمت سے اس کے پاس روح کو بھیجا روح موسیٰؑ پر سایہ فگن ہو گیا اور چھا گیا اور جس پتھر پر موسیٰؑ کھڑے ہوئے تھے اسی پتھر کو موسیٰؑ پر الٹ کر قبہ کی طرح بنا دیا تاکہ موسیٰؑ جل نہ جائیں کچھ دیر کے بعد روح نے ان کو کھڑا کیا موسیٰؑ تسبیح پڑھتے اٹھ کھڑے ہوئے اور مناجات کرنے لگے میرے مالک میں تجھ پر ایمان لایا اور تصدیق کرتا ہوں کہ جو شخص بھی تجھے دیکھے گا زندہ نہ رہے گا جو شخص تیرے فرشتوں کو بھی دیکھے گا اس کا دل (خوف سے) باہر نکلنے لگے گا، تیری عظمت بہت بڑی ہے تو سب کا رب اور معبود کل اور شاہنشاہ ہے۔ تیرے مساوی اور مقابل کوئی شئے نہیں، اے میرے رب میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔ حمد تیرے ہی لئے ہے تیرا کوئی شریک نہیں تو بڑی بزرگی والا ہے تو بڑی عظمت رکھتا ہے تو رب العلمین ہے۔

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ (پس جونہی رب نے پہاڑ پر جلوہ ڈالا اس کے پرخچے اڑا دیئے اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر جب ہوش آیا تو عرض کیا بے شک تیری ذات پاک ہے میں تیری بارگاہ میں معذرت کرتا ہوں اور سب سے پہلے یقین رکھتا ہوں) کہ میں تجھے براہ راست نہیں دیکھ سکتا۔

تجلّی ظاہر ہوا، نمودار ہوا یعنی اس کا کچھ نور چمکا۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ چھنگلی کے آدھے پورے کے برابر نور خداوندی کا ظہور ہوا۔ حاکم کی صحیح حدیث میں یہی آیا ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کا دوسرے درجہ پر ظہور (یعنی عکس اور پرتو کا ظہور) تجلی کہلاتا ہے، جیسے آئینہ کے اندر کسی کی صورت کا ظہور حقیقت میں یہ جلوہ اندازی اور جلوہ بینی رؤیت ذات نہ تھی کیونکہ ظاہر ہے کہ موسیٰؑ کی استعداد و قوت پہاڑ سے زائد تھی اور موسیٰؑ کو دیدار ذات سے تاکید کے ساتھ روک دیا گیا تو پہاڑ میں نور ذات کو برداشت کرنے کی صلاحیت کہاں سے آسکتی ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نور خداوندی پہاڑ پر نمودار ہوا تھا۔ ضحاک کا قول ہے اللہ نے اپنے نور سے پردے ہٹالئے تھے اور بیل کی ناک کے سوراخ برابر (نور کو) ظاہر کر دیا تھا۔ حضرت عبد اللہ بن سلام اور کعب احبار نے فرمایا عظمت خداوندی کی جلوہ پاشی صرف سوئی کے ناکہ کی برابر ہوئی تھی کہ پہاڑ شق ہو گیا۔ سدیؒ نے کہا چھنگلی کے برابر تجلی ہوئی تھی اس کی تائید حضرت انسؓ کی روایت سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چھنگلی کے آخری جوڑ پر انگوٹھا رکھتے ہوئے یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا بس اتنی تجلی ہوئی تھی کہ پہاڑ آہستہ آہستہ چلا (یعنی لرزا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے)۔

ابوالشیخ کی روایت میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے چھنگلی سے اشارہ کیا (اور فرمایا) اس کے ہی نور سے پہاڑ کے پرخچے اڑا دیئے۔ حضرت سہل بن سعد ساعدی کی روایت میں آیا ہے کہ اللہ نے نور کے ستر ہزار حجابوں میں سے درہم کی برابر ہٹایا تھا کہ پہاڑ کے پرخچے اڑ گئے۔ جَعَلَهٗ دَكًّا یعنی ریزہ ریزہ۔ دک اور دق ہم معنی ہیں۔ قاموس میں ہے دک، دق اور ھدم کا معنی ہے ہموار ریت۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا پہاڑ کو خاک کر دیا پہاڑ آہستہ آہستہ چلا یہاں تک کہ سمندر میں جا گرا اور سمندر کے اندر (برابر اب بھی) چلا جا رہا ہے۔ عطیہ نے کہا پہاڑ ریگ رواں ہو گیا۔ کلبی نے کہا دَكًّا کا معنی ہے کِسْرًا پارہ پارہ یعنی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں بٹ گیا۔ بغویؒ نے لکھا ہے اس آیت کی تفسیروں میں آیا ہے کہ عظمت نور کی وجہ سے وہ پہاڑ چھ پہاڑوں میں منقسم ہو گیا، تین مدینہ میں آپڑے احد، ورقان، رضوی اور تین مکہ میں ثور، ثبیر، حراء۔ سعاف نے تخریج بیضاویؒ میں لکھا ہے کہ ابن مردویہ نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے موسیٰؑ کو سنایا اور فرمایا اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ یہ واقعہ عرفہ کی شام کو ہوا وہ پہاڑ جس پر تجلی ہوئی موقف (حج) میں تھا تجلی پڑتے ہی اس کے سات ٹکڑے ہو گئے ایک ٹکڑا سامنے گر گیا یہ ٹکڑا تو وہی ہے جس کے قریب امام موقف میں کھڑا ہوتا ہے، تین ٹکڑے مدینہ میں جا پڑے، طیبہ، احد، رضوی اور طور سینا شام میں چلا گیا اس کو طور کہنے کی وجہ ہی یہ ہے کہ یہ اڑ کر شام میں جا پہنچا تھا۔

میں کہتا ہوں اس روایت میں انتہائی غرابت ہے اللہ نے موسیٰ سے کلام تو طور سیناء علاقہ شام میں کیا تھا وہیں توریت عطا فرمائی تھی مکہ میں نہ کلام کیا نہ کتاب عطا فرمائی۔

صَعِقًا حضرت ابن عباسؓ اور حسن نے ترجمہ کیا بے ہوش اور قتادہ نے کہا مردہ۔ کلبی نے کہا عرفہ کے دن پنج شنبہ کو موسیٰؑ بے ہوش ہوئے تھے اور جمعہ کو قربانی کے دن اللہ نے توریت عطا فرمائی۔ واقدی نے کہا موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر گئے تو آسمانی ملائکہ نے کہا ابن عمران کا اور دیدار کی درخواست کا کیا ہوا۔ فَلَمَّآ اَفَاقَ یعنی جب بے ہوشی سے افاقہ پایا۔ قَالَ تو نظارہ کی عظمت کے زیر اثر کہا، تُبْتُ اِلَیْكَ یعنی بغیر اجازت کے سوال کرنے کی جرأت سے توبہ کرتا ہوں۔ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی (اس امت میں) میں سب سے پہلا مؤمن ہوں ہر نبی کا ایمان اپنی امت سے پہلے ہوتا ہی ہے۔

قَالَ یٰمُوْسٰٓی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَبِكَلَامِیْ ۖ فَخُذْ مَآ اٰتَیْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۱۴۴﴾

(اللہ نے فرمایا میں نے پیغمبری اور اپنی ہم کلامی سے اور لوگوں پر تم کو امتیاز دیا ہے، سو جو کچھ میں نے تم کو دیا ہے اس کو لو اور شکر گزار بنو)۔

اِصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ یعنی تمہارے زمانہ کے لوگوں پر تم کو امتیاز عطا کیا اور برتری دی۔ بِكَلَامِیْ کلام سے مراد کلام کرنا، مَآ اٰتَیْتُكَ یعنی جو پیغام میں نے تجھے دیا ہے اس کو لے۔

روایت میں آیا ہے کہ جب موسیٰؑ سے اللہ نے کلام کیا تو اس وقت آپ کے چہرہ پر ایسی چمک آگئی تھی کہ کوئی بھی آپ کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا اور مرتے دم تک آپ کے چہرہ پر تابانی قائم رہی۔ بیوی نے ایک بار آپ سے کہا جب سے اللہ نے آپ سے کلام کیا میں تو آپ سے غیر متعلق ہو کر رہ گئی۔ حضرت موسیٰؑ نے چہرہ سے نقاب اٹھا دیا تو بیوی کے چہرہ پر سورج کی کرنوں کی طرح شعاعیں پڑنے لگیں اس نے فوراً اپنا چہرہ اپنے ہاتھ سے چھپا لیا اور اللہ کے سامنے سجدہ میں گر پڑی اور حضرت موسیٰؑ سے کہا آپ اللہ سے دعا کریں کہ جنت کے اندر اللہ مجھے آپ کی بیوی بنائے حضرت موسیٰؑ نے فرمایا یہ بات تجھے مل جائے گی بشرطیکہ میرے بعد کسی اور سے تو نکاح نہ کرے کیونکہ عورت آخری شوہر ہی کی بیوی ہو گی۔

بغویؒ نے حضرت کعب احبار کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے توریت کا مطالعہ کیا اور عرض کیا اے میرے رب میں (توریت میں) ایک امت کا ذکر پاتا ہوں جو خیر الامم ہو گی اس کو لوگوں کی ہدایت کے لئے پیدا کیا گیا ہو گا وہ لوگوں کو بھلائی کا حکم دے گی اور بری باتوں کی ممانعت کرے گی اس کا ایمان اللہ پر اور پہلی کتاب پر اور پچھلی کتاب پر ہو گا وہ گمراہوں سے جہاد کرے گی یہاں تک کہ کانے دجال سے لڑے گی۔ اے میرے رب اس کو میری امت بنا دے اللہ نے فرمایا موسیٰؑ وہ محمد

کی امت ہوگی۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا میرے رب مجھے (توریت میں) ایک امت کا تذکرہ ملتا ہے جو بکثرت حمد کرنے والے ہوں گے اور سورج کی نگرانی رکھیں گے (یعنی اوقات صلوۃ کی تعیین سورج کے طلوع غروب سے کریں گے اور نمازوں کے منتظر رہیں گے) جب وہ کسی کام کا ارادہ کریں گے تو کہیں گے انشاء اللہ تعالیٰ ہم یہ کام کریں گے۔ ان لوگوں کو میری امت بنادے۔ اللہ نے فرمایا یہ محمد ﷺ کی امت ہوگی۔ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا میں (توریت میں) ایک امت (کا ذکر) پاتا ہوں جو اپنے کفارات اور صدقات کو باہم کھائیں گے (یعنی آگ میں نہیں جلائیں گے گزشتہ شریعتوں والے نذر اور صدقہ کی چیز آگ میں جلادیتے تھے۔ وہ دعائیں کریں گے اور ان کی دعائیں قبول ہوں گی، وہ شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول ہوگی، ان لوگوں کو میری امت بنادے۔ اللہ نے فرمایا یہ محمد ﷺ کی امت ہوگی۔ موسیٰؑ نے عرض کیا مجھے ایسی امت کا بھی تذکرہ ملتا ہے کہ جب وہ لوگ کسی ٹیلہ پر چڑھیں گے تو اللہ اکبر کہیں گے اور نشیب میں اتریں تو حمد کریں گے (یعنی حاجی ہوں گے) ساری مٹی ان کے لئے طہور (پاک اور پاک کن) ہوگی ساری زمین ان کے لئے مسجد ہوگی جہاں ہوں گے جنابت سے طہارت کریں گے مٹی سے بھی ان کی طہارت ایسی ہوگی جیسی پانی سے بشرطیکہ پانی دستیاب نہ ہو، ان کے چہرے اور ہاتھ پاؤں وضو کے اثر سے گورے ہوں گے (یعنی قیامت کے دن) اے رب ان کو میری امت بنادے۔ اللہ نے فرمایا یہ محمد ﷺ کی امت ہوگی۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا اے رب مجھے ایسے لوگوں کا تذکرہ ملتا ہے کہ اگر وہ نیکی کا صرف ارادہ کریں گے، عمل نہ کرپائیں گے تب بھی ان کے ایک نیکی لکھی جائے گی اور اگر نیکی کرلیں گے تو دس گنے سے سات سو گنے تک ان کو ثواب ملے گا اور اگر گناہ کا صرف ارادہ کریں گے تو گناہ نہیں لکھا جائے گا اور اگر گناہ کرلیں گے تو اتنا ہی لکھا جائے گا جتنا انہوں نے کیا ہوگا۔ ان کو میری امت بنادے۔ اللہ نے فرمایا، یہ احمد کی امت ہوگی۔ موسیٰؑ نے عرض کیا میں ایک مرحوم امت کا تذکرہ پاتا ہوں جو کمزور ہوگی وہ ان لوگوں سے کتاب میراث میں پائیں گے جن کو (عطاء کتاب کا) تو نے امتیاز دیا ہوگا ان لوگوں میں سے کچھ تو اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہوں گے (یعنی گناہ گار ہوں گے) اور کچھ متوسط الحال ہوں گے (ان کی نیکیاں بدیاں مخلوط ہوں گی) اور کچھ نیکیوں کی طرف پیش قدمی کرنے والے ہوں گے اور ان میں سے ہر ایک (گروہ) مرحوم ہوگا کوئی بھی ایسا نہ ہوگا کہ مرحوم نہ ہو۔ اے رب ان لوگوں کو میری امت بنادے۔ اللہ نے فرمایا، یہ احمد کی امت ہوگی۔ موسیٰؑ نے عرض کیا میں ایسے لوگ بھی (توریت میں) پاتا ہوں جن کے مصحف ان کے سینوں میں ہوں گے (یعنی حافظ قرآن ہوں گے) وہ اہل جنت کے لباس کے رنگ کے کپڑے پہنیں گے۔ نمازوں کے اندر ان کی صفیں ملائکہ کی صفوں کی طرح ہوں گی، مسجدوں کے اندر ان کی (تلاوت و قرأت کی) آوازیں شہد کی مکھیوں کی گونج کی طرح ہوں گی ان میں سے کوئی بھی آگ میں نہیں داخل ہوگا، سوائے اس شخص کے جو نیکیوں سے اس طرح الگ ہو جائے جیسے پتھر درختوں کے پتوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اے رب ان لوگوں کو میری امت بنادے۔ اللہ نے فرمایا، یہ احمد کی امت ہوگی۔ موسیٰؑ کو جب اس بات پر تعجب ہوا کہ محمد ﷺ کو اور آپ کی امت کو اللہ نے یہ بھلائیاں عطا فرمائی ہیں، تو عرض کیا کاش میں محمد کے ساتھیوں میں سے ہوتا۔ اس پر موسیٰؑ کو خوش کرنے کے لئے اللہ نے تین چیزوں کی وحی بھیجی اور فرمایا یٰمُوْسٰۤى اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَ بِكَلَامِیْ ...... سے ...... سَاُورِیْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ ○ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ۔ موسیٰؑ اس سے کامل طور پر خوش ہو گئے۔

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّ اْمُرْ قَوْمَكَ یَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِیْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۱۴۵﴾ (اور ہم نے چند تختیوں پر ہر قسم کی (ضروری) نصیحت اور (احکام ضروریہ کے متعلق) ہر چیز کی تفصیل ان کو لکھ کر دے دی سو تم خود بھی کوشش کے ساتھ ان پر عمل کرو اور اپنی قوم کو بھی حکم دو کہ ان کے اچھے اچھے احکام پر عمل کریں۔ میں اب بہت جلد تم لوگوں کو ان بے حکم لوگوں کا مقام دکھاؤں گا)۔

لَهٗ یعنی موسیٰ کے لئے۔ فِی الْاَلْوَاحِ یہ تختیاں سات یا دس تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اَلْوَاح سے مراد ہیں

توریت کی تختیاں۔ حدیث میں آیا ہے کہ وہ تختیاں جنت کے بیری کے درخت کی تھیں۔ ایک تختی کی لمبائی بارہ ہاتھ تھی۔ یہ روایت ابوالشیخ کی ہے۔ جس کی نسبت حضرت جعفر کی وساطت سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف کی گئی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو اپنے ہاتھ سے بنایا اور تورات اپنے ہاتھ سے لکھی اور طوبیٰ کا درخت اپنے ہاتھ سے بویا۔ حسن نے کہا وہ تختیاں لکڑی کے تختے کی تھیں۔ کلبی نے کہا زبرجد سبز کی تھیں۔ سعید بن جبیر نے کہا یاقوت سرخ کی تھیں۔ آخری قول کعب کا بھی ہے جو طبرانی اور ابوالشیخ نے بیان کیا ہے۔ ربیع بن انس نے کہا زبرجد کی تھیں۔ ابن جریج کا قول ہے زمرد کی تھیں جو جبرئیل بحکم خداوندی عدن سے لائے تھے جن کو اسی قلم سے لکھا تھا جس سے ذکر کو لکھا تھا اور نہر نور کی روشنائی سے لکھا تھا۔ ابوالشیخ کی روایت میں ابن جریج کا قول آیا ہے کہ وہ زمرد یا زبرجد کی تھیں۔ وہب کا بیان ہے ٹھوس پتھر سے اللہ نے ان تختیوں کو اکھاڑنے کا حکم دیا پھر ان کو نرم بنا دیا کہ موسیٰؑ نے ان کو تراش لیا پھر ان کو چیر لیا اور ان پر دس نصائح لکھنے کی قلم کی آواز موسیٰ نے خود سنی، یہ واقعہ یکم ذیقعدہ کو ہوا۔ تختیوں کی لمبائی حضرت موسیٰؑ کے قد کے موافق دس ہاتھ کی تھی۔ مقاتل اور وہب نے کہا انگوٹھی کے نقش کی طرح تختیوں پر حروف لکھے گئے تھے۔ ربیع بن انس نے کہا توریت نازل ہوئی تو ستر اونٹوں کا بوجھ تھی اس کا ایک جز ایک سال سے کم میں نہیں پڑھا جا سکتا تھا حضرت یوشعؑ، حضرت عزیرؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے علاوہ اور کسی نے پوری توریت نہیں پڑھی۔

مِنْ كُلِّ شَيْءٍ یعنی دینی ضرورت کی ہر چیز۔ مَوْعِظَةً یعنی نصیحت اور ان اعمال سے بازداشت جن کا نتیجہ خوفناک ہے۔ قاموس میں وَعْظُه مَوْعِظَةً سزا جزا کا ذکر اس طرح کیا کہ دل نرم پڑ جائے۔ وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ یعنی امر، نہی، حلال، حرام، حدود و احکام میں سے ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔ تَفْصِيلًا کا عطف مَوْعِظَةً پر ہے۔ بِقُوَّةٍ یعنی کوشش کے ساتھ یا قوت قلب اور صحت عزیمت کے ساتھ کیونکہ ارادہ کے ضعف کے ساتھ لینے کا نتیجہ اعمال میں سستی لازمی ہے۔ بِاَحْسَنِهَا، احسن اس جگہ اسم تفضیل کے معنی میں مستعمل نہیں ہے کیونکہ اللہ کی کتاب میں جو حکم ہے وہ بہترین ہی ہے کم وبیش کا احتمال ہی نہیں ہے۔ کتاب میں کوئی برا حکم موجود ہی نہیں ہے جیسے محاورہ میں کہا جاتا ہے اَلصَّيْفُ اَحَرُّ مِنَ الشِّتَاءِ موسم گرما موسم سرما سے زیادہ گرم یعنی گرم ہوتا ہے (موسم سرما میں تو گرمی ہوتی ہی نہیں ہے پھر موسم گرما کا سرما سے زیادہ گرم ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا) کذا قال قطربؒ۔

عطاء نے حضرت ابن عباسؓ کا تفسیری قول يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا کی تشریح میں نقل کیا ہے کہ اس کے حلال کو حلال حرام کو حرام سمجھیں، احکام پر غور کریں، اشیاء و امثال سے نصیحت حاصل کریں، اس کے احکام پر عمل کریں اور متشابہات میں غور و خوض نہ کریں۔ بعض علماء نے کہا بِاَحْسَنِهَا سے مراد ہیں فرائض اور مستحبات جن پر ثواب مرتب ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ مباحات ہیں جن پر نہ ثواب مرتب ہوتا ہے نہ عذاب۔

بعض نے کہا عزیمت مراد ہے یعنی رخصت سے کام نہ لو۔ عزیمت کو اختیار کرو اور ہر چیز میں جو دو حکم ہوں ان میں سے اعلیٰ پر عمل کرو مثلاً عفو، قصاص سے اعلیٰ ہے۔ صبر، انتقام سے اعلیٰ پس اعلیٰ کو اختیار کرو۔ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ اس جملہ میں تخویف ہے کہ کتاب کو ترک نہ کرو۔ ورنہ فاسقوں کی طرح ہو جاؤ گے اور جو مقام ان کا ہے وہی تمہارا ہو جائے گا۔ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ سے مراد ہیں مصر کے اندر فرعون اور اس کی قوم کے ٹوٹے پھوٹے ویران کھنڈر۔ عطیہ عوفی کا یہی قول ہے۔ سدیؒ نے کہا کافروں کی ہلاکت گاہیں (مرنے کے مقامات) مراد ہیں۔ کلبی اور قتادہ نے کہا عاد و ثمود اور دوسری گزشتہ تباہ شدہ قوموں کی ویران بستیاں مراد ہیں، جن کو سفر کی حالت میں بنی اسرائیل سر راہ دیکھتے گزرے تھے۔ مجاہد، حسن اور عطا نے کہا جہنم مراد ہے جہاں آخرت میں ان کا مقام ہو گا۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا

وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

(میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق نہیں، اگر تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی ان کو نہ مانیں اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو اپنا طریقہ نہ بنائیں اور گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو اپنا طریقہ بنالیں اور یہ اس سبب سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھوٹا بتلایا اور ان سے غافل رہے اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو اور قیامت کے پیش آنے کو جھوٹا قرار دیا ان کے سب کام اکارت گئے ان کو ان کے کیے ہوئے اعمال کی ہی سزا دی جائے گی)۔

سَاَصْرِفُ یعنی اندرونی و بیرونی اور انفسی و آفاقی آیات پر غور کرنے اور ان سے عبرت اندوز ہونے سے پھیر دوں گا۔ یا اپنی نازل کردہ آیات اور معجزات کو باطل کرنے اور نور الٰہی کو پھونکیں مار کر بجھانے سے روک دوں گا۔ مطلب یہ کہ اپنی آیات کا بول بالا کروں گا اور ان تکذیب کرنے والوں کو ہلاک کردوں گا جیسے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کر دیا۔ اللہ اپنا نور پورے طور پر پھیلا کے رہے گا خواہ کافروں کو گوارا نہ ہو یا یہ مطلب ہے کہ چونکہ ان کو حق سے عناد ہے اس لئے ان کو ہدایت سے محروم رکھوں گا اور قرآنی آیات کو قبول کرنے اور ان پر ایمان لانے سے پھیر دوں گا۔ دوسری آیت میں بھی اسی طرح کا مضمون آیا ہے فرمایا ہے فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ، کذا قال ابن عباس۔ سفیان نے سَاَصْرِفُ کی تشریح اس طرح کی کہ میں قرآن کو سمجھنے اور اس کے عجائب کو جاننے سے روک دوں گا۔

اَلَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ ان لوگوں کو جو ملک میں تکبر کرتے ہیں، میرے بندوں پر جبر کرتے ہیں اور میرے دوستوں سے لڑتے ہیں۔ بِغَيْرِ الْحَقِّ اس کا تعلق يَتَكَبَّرُوْنَ سے یعنی باطل دین کی وجہ سے تکبر کرتے ہیں، غَيْرُ الْحَقِّ سے مراد ہے باطل دین۔ یا بِغَيْرِ الْحَقِّ، يَتَكَبَّرُوْنَ کی ضمیر فاعلی سے حال ہے۔ بہر حال آیت کا حکم تمام کافروں کے لئے عام ہے۔ بعض علماء کے نزدیک اٰيٰتِيْ سے مراد ہیں وہ نو آیات جو اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو عطا فرمائی تھیں اور اَلَّذِيْنَ سے مراد ہیں خاص کفار (یعنی قبطی) اس وقت آیت کا حکم خاص ہوگا۔

وَاِنْ يَّرَوْا یعنی یہ متکبر اگر دیکھ لیں۔ كُلَّ اٰيَةٍ یعنی ہر نازل شدہ آیت کو یا ہر معجزہ کو۔ لَا يُؤْمِنُوْا بِهَا تو اس کو نہیں مانیں گے کیونکہ ان کے دلوں میں عناد ہے یا اس وجہ سے کہ اندھی تقلید اور خواہش پرستی میں غرق ہونے کے سبب ان کی عقلیں بگڑ گئی ہیں یا عدم ایمان کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں پر گمراہی کا ٹھپہ لگا دیا ہے۔ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ اور اگر انبیاء اور علماء کی رہنمائی کی وجہ سے ہدایت کا راستہ ان کے سامنے آ بھی جائے۔ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا تو چونکہ شیطنت ان پر غالب ہے اس لئے اپنے لئے اس کو اختیار نہیں کرتے۔ رَشَد، رُشْد، رَشَاد سب ہم معنی ہیں جیسے سَقَم، سُقْم، سَقَام۔ ابو عمرو نے کہا رشد کسی کام کی درستی کو کہتے ہیں اور رشد دین کی استقامت کو۔

وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ اور اگر نفس یا شیطان کے دکھانے سے گمراہی کا راستہ دیکھ لیں۔ ذٰلِكَ یہ آیات سے پھیر دینا۔ بِاَنَّهُمْ اس سبب سے ہے۔ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا کہ انہوں نے ہماری نازل کردہ آیات اور معجزات کو نہ مانا اور کائنات سماوی و ارضی کو نظر غور سے نہیں دیکھا۔ غٰفِلِيْنَ اور ان آیات سے غافل رہے یعنی ان کو بھول گئے اور لہو سمجھ کر ان کو ترک کر دیا یا عناد کی وجہ سے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ مفعول ہے یعنی دار آخرت کو پانا یعنی دار آخرت میں اللہ نے جس ثواب و عذاب کا وعدہ کیا ہے اس کو پانا جن لوگوں کو تسلیم نہیں۔ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ تو جو نیکیاں انہوں نے کی ہوں گی سب اکارت جائیں گی، غریبوں کو مال دینا کنبہ والوں کے ساتھ سلوک کرنا، رشتہ داروں سے قطع تعلق نہ کرنا وغیرہ بہر حال یہ سب نیکیاں اس میدانی سراب کی طرح ثابت ہوں گی جو دور سے پیاسے کو پانی دکھائی دیتی ہیں اور قریب پہنچتا ہے تو (ہلاکت کے سوا) کچھ نہیں ملتا۔ هَلْ يُجْزَوْنَ استفہام انکاری ہے یعنی ان کو بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ مگر انہی اعمال کا جو وہ دنیا میں

کرتے تھے اور اللہ کے نزدیک بھی وہ اعمال قابل اعتبار تھے یعنی خالص نیت کے ساتھ محض اللہ کے لئے (بغیر کسی شہرت وریاء کے جذبہ کے) اعمال کئے تھے صرف انہی کی جزا ملے گی۔ یا یہ مطلب ہے کہ جو بد اعمالیاں وہ دنیا میں کرتے تھے انہی کی سزا دی جائے گی (ظلم نہیں کیا جائے گا) اور ان کے تمام اعمال برے ہی ہوں گے کوئی بھی اچھا ثابت نہ ہوگا۔ اللہ کے ساتھ دوسروں کی پوجا بدترین گناہ ہے۔ اگر اللہ کے دشمنی میں یا نفسانی خواہش کی تسکین کے لئے مال خرچ کیا یا کنبہ جوڑا جائے تو یہ بھی بہت برا عمل ہے اس سے کفر کی مدد ہوتی ہے (اور کافروں کی یہی عملی خصوصیات ہیں اس لئے ان کے تمام اعمال برے ہی ہیں۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِن بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ (اور موسیٰؑ کے بعد ان کی قوم (بنی اسرائیل) نے (اپنے مقبوضہ) زیور کا ایک بچھڑا (پوجا کے لئے بنا لیا جو ایک مجسمہ تھا اور اس کی ایک آواز تھی)۔

قَوْمُ مُوسَىٰ یعنی بنی اسرائیل نے۔ مِن بَعْدِهِ یعنی جب موسیٰؑ طور کی طرف مقرر کردہ وقت پر (مناجات کرنے اور کتاب لینے کے لئے) چلے گئے اور تیس دن گزرنے کے بعد چلہ کا چوتھا عشرہ شروع ہو گیا۔ مِنْ حُلِيِّهِمْ یعنی اس زیور کا جو بنی اسرائیل نے شادی کے بہانہ سے مصر سے نکلتے وقت قبطیوں سے بطور عاریت لے لیا تھا اور نکلنے کے بعد انہی کے پاس رہ گیا تھا۔ مِنْ حُلِيِّهِمْ میں اضافت قبضہ پر دلالت کر رہی ہے یعنی وہ زیور جو ان کے قبضہ میں تھا یا ملکیت کو ظاہر کر رہی ہے کیونکہ قوم فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل اس زیور کے مالک ہو گئے تھے۔ حُلِي بضم حاء وکسر لام حَلْي کی جمع ہے جیسے ثَدی کی جمع ثُدِی۔ عِجْلًا یہ پہلا مفعول ہے دوسرا مفعول محذوف ہے یعنی بنا لیا بچھڑے کو معبود۔ جَسَدًا، یہ عِجْلًا سے بدل ہے۔

حضرت ابن عباسؓ، قتادہ اور اہل تفسیر کی ایک جماعت کا قول ہے کہ یہ بچھڑا سامری نے بنایا تھا اور حضرت جبرئیل کی نشان قدم کی خاک اس کے منہ میں ڈال دی تھی جس کی وجہ سے وہ گوشت اور خون والا جسم بن گیا تھا۔ سامری کے قول کو نقل کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ہے بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا الخ سورۂ طٰہٰ میں ہم سامری کا قصہ نقل کریں گے۔ خُوَار گائے کی آواز۔ روایت میں آیا ہے کہ بچھڑے نے صرف ایک بار آواز نکالی تھی۔ بعض کا قول ہے کہ وہ برابر آوازیں نکالتا ہی تھا جب آواز نکالتا تھا بنی اسرائیل اس کے سامنے سجدے میں گر پڑتے تھے اور خاموش ہو جاتا تھا تو سجدہ سے سر اٹھا لیتے تھے۔

وہب کا قول ہے اس کی آواز ضرور تھی مگر وہ حرکت نہیں کرتا تھا۔ سدیؒ نے کہا وہ چلتا بھی تھا۔ بعض اہل دانش نے لکھا ہے وہ سونے کا ایک مجسمہ تھا جس میں جان نہ تھی جب ہوا اس کے پیٹ کے اندر داخل ہوتی تھی (اور پھر دوسری طرف سے نکلتی تھی) تو گائے کی آواز کی طرح اس کی آواز سنائی دیتی تھی، اس کی بناوٹ ہی اسی تدبیر سے کی گئی تھی۔ اس تشریح کی تردید آیت فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ سے ہو رہی ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۘ اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ ﴿١٤٨﴾ ((جب ان احمقوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا تو) کیا انہوں نے اتنا نہیں دیکھا کہ وہ (کیسا معبود ہے کہ) ان سے بات بھی نہیں کر سکتا اور نہ ان کو راہ ہدایت بتا سکتا ہے۔ (یعنی انسانوں کی طرح بھی اس میں قدرت نہیں ہے کہ بات کر سکے یا راستہ بتا سکے پھر کیسے انہوں نے اس کو آسمان وزمین اور ساری طاقتوں کا خالق مان لیا) ایسے کو معبود بنا لیا اور وہ بڑا بے ڈھنگا کام کرنے والے تھے)۔ یعنی ایک ذلیل چیز کو معبود بنا لیا یہ ظلم تھا ایک چیز کا بے محل استعمال تھا۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِي أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا قَالُوا لَئِن لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿١٤٩﴾ (اور جب وہ نادم ہو گئے اور جان گئے کہ واقعی ہم گمراہی میں پڑ گئے، تو کہنے لگے اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے اور ہم کو معاف نہ کرے تو ہم بالکل گئے گزرے ہو گئے)۔

سُقِطَ فِي أَيْدِيهِمْ، سُقِطَ فعل مجہول کی اسناد فِي أَيْدِيهِمْ کی طرف ہے، بطور کنایہ یہ سخت پشیمانی مراد ہے، پشیمان

وقف لازم

آدمی افسوس سے ہاتھ کاٹتا ہے گویا اس کا ہاتھ اس کے اندر گرا دیا جاتا ہے۔ عرب لوگ ہر پشیمان کو سُقِطَ فِیْ یَدِهٖ کہتے ہیں۔ زجاج نے کہا اَیْدِیْهِمْ سے مراد ہے دل اور نفوس یعنی ندامت ان کے دلوں میں پیدا ہو گئی۔ حَصَلَ فِیْ یَدِهٖ مَكْرُوْهٌ اس کے ہاتھ میں یعنی دل میں بری بات پیدا ہو گئی اگرچہ ہاتھ میں مکروہ کا پیدا ہونا ناممکن ہے (برا خیال دل میں ہی پیدا ہوتا ہے) مگر دل اور نفس کے اندر پیدا ہونے والی چیز پکڑی اور دیکھی ہوئی چیز کی طرح مان کر حَصَلَ فِیْ یَدِهٖ مَكْرُوْهٌ کہا جاتا ہے (گویا بطور تشبیہ غیر محسوس کو محسوس خارجی قرار دے دیا جاتا ہے) حاصل مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے واپس آکر جب ان پر عتاب کیا تو ان کو پشیمانی ہو گئی اور جان گئے کہ بچھڑے کو معبود بنا کر ہم گمراہ ہو گئے اور توبہ کی اور کہا کہ ہمارا رب اگر ہماری توبہ قبول کر کے ہم پر رحم نہ فرمائے گا اور ہمارے قصور سے درگزر کر کے معافی نہ دے گا تو ہم بڑے گھاٹے میں ہوں گے۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ (اور جب موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف غضب و رنج کی حالت میں لوٹے تو کہا تم نے میرے بعد یہ بڑی نامعقول حرکت کی کیا اپنے رب کے حکم (آنے) سے پہلے ہی جلد بازی کر لی اور تختیاں ایک طرف رکھ دیں)۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰى یعنی میقاتی چلہ پورا کرنے کے بعد جب موسیٰؑ لوٹے۔ اَسِفًا، حضرت ابو درداءؓ نے اَسِفًا کا ترجمہ کیا ہے سخت غضب ناک۔ حضرت ابن عباسؓ اور سدیؒ نے فرمایا سخت غمگین۔ قاموس میں ہے، اسف سخت ترین غم، اسف علیہ اس پر غصہ ہوا۔ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ میرے بعد تم نے بری حرکت کی گوسالہ کو پوجنے لگے۔ یہ خطاب صرف گوسالہ پرستوں سے ہے یا یہ مطلب ہے کہ تم نے میری بری قائم مقامی کی کہ بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کو نہ روکا اس وقت خطاب حضرت ہارون اور دوسرے صحیح الایمان مؤمنوں کو ہو گا۔

مِنْۢ بَعْدِیْ یعنی میرے میقات پر جانے کے بعد یا یہ مطلب ہے کہ باوجودیکہ تم نے میری طرف سے تعلیم توحید و تنزیہہ کو دیکھ لیا اور یہ بات بھی دیکھ لی کہ میں شرک سے روکتا ہوں اس کے بعد بھی تم نے یہ بری حرکت کی۔

اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ یعنی تم نے اپنے رب کے کام کو نا تمام چھوڑ دیا۔ چونکہ عجل کے اندر سبق کا معنی مضمر ہے اس لئے بغیر حرف جر کے مفعول کو ذکر کیا گیا یا یہ معنی ہے کہ تم نے اللہ کے مقرر کردہ چلہ کے پورے ہونے سے پہلے ہی یہ حرکت شروع کر دی مجھے مردہ مان لیا اور اسی طرح دین کو بگاڑ دیا جیسے گزشتہ انبیاء کے بعد ان کی امتوں نے اپنا دین بگاڑا تھا۔ عجلة کا لغوی معنی ہے کسی چیز کو وقت سے پہلے طلب کرنا۔ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ یعنی وہ تختیاں جن میں توریت لکھی ہوئی تھی سخت غضب کی حالت میں زمین پر ڈال دیں مگر (یہ فعل توریت سے نفرت اور بے ادبی کے طور پر نہ تھا بلکہ) یہ مغلوب الغضبی محض اللہ کی ہدایت کی حمایت و اطاعت کے لئے تھی۔

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر کے طریق سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو زبرجد کی سات تختیوں پر (لکھی ہوئی) توریت دی گئی تھی، جس کے اندر ہر چیز کا بیان بھی تھا اور ہدایت بھی تھیں۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے پہاڑ سے آکر بنی اسرائیل کو بچھڑے کی پوجا میں منہمک پایا تو اپنے ہاتھ سے توریت کو پھینک دیا جس کی وجہ سے تختیوں کے سات ٹکڑے ہو گئے، ٹوٹنے کے بعد چھ حصے تو توریت کے اللہ نے اٹھا لئے اور صرف ساتواں حصہ رہ گیا۔ بغویؒ نے لکھا ہے کہ غیب (ماضی و مستقبل) کی خبروں سے تعلق رکھنے والے حصے تو اٹھا لئے گئے اور جس حصہ کے اندر ہدایات، احکام اور حلال و حرام کا بیان تھا وہ رہ گیا۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (کانوں سے سنی ہوئی) آنکھوں سے دیکھنے کی طرح نہیں ہوتی (اللہ نے (طور پر ہی) موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی اطلاع دے دی تھی لیکن موسیٰؑ نے تختیاں نہیں پھینکیں اور جب ان کی حرکت خود دیکھ لی تو تختیاں پھینک دیں اور وہ ٹوٹ گئیں۔ رواہ احمد و الطبرانی فی الاوسط و الحاکم بسند صحیح۔

وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗٓ اِلَیْهِ ۭ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَكَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ڮ فَلَا تُشْمِتْ

بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ
اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ (اور اپنے بھائی کے سر کے بالوں کو پکڑ کر اپنے طرف گھسیٹنے لگے، ہارون
نے کہا اے میرے ماں جائے ان لوگوں نے مجھے بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر ڈالیں، سو آپ (مجھ کو ذلیل کر
کے) مجھ پر دشمنوں کو نہ ہنسوائیں اور مجھ کو ان ظالم لوگوں کے ذیل میں نہ شمار کریں، موسیٰ نے کہا اے میرے رب میری اور
میرے بھائی کی خطا معاف فرمادے اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل فرمادے، تو سب سے بڑا رحیم ہے)۔

وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ موسیٰ اپنے بھائی ہارون کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنے لگے آپ کو گمان ہوا کہ ہارون
کے قصور سے قوم گمراہی میں مبتلا ہوئی۔ بغویؒ نے بِرَاْسِهٖ کی تشریح میں لکھا ہے کہ گیسو اور داڑھی پکڑ کر کھینچی۔ حضرت ہارونؑ،
حضرت موسیٰ سے تین سال بڑے تھے اور چونکہ غصہ آور نہ تھے اس لئے بنی اسرائیل آپ سے حضرت موسیٰؑ کی بنسبت زیادہ
محبت کرتے تھے۔ اِبْنَ اُمَّ حضرت ہارونؑ، حضرت موسیٰ کے حقیقی بھائی تھے لیکن موسیٰ کے دل میں نرمی پیدا کرنے اور اپنی
محبت قلبی کا مظاہرہ کرنے کے لئے ماں جایا کہا۔ ابن عامر، حمزہ اور کسائی وغیرہ نے تو ابن اُمِّ پڑھا ہے اور ہونا بھی یہی چاہئے
کیونکہ اصل میں یا ابنَ اُمِّی تھا حرف ندا اور یاء متکلم کو حذف کر دیا گیا میم کا کسرہ باقی رہ گیا لیکن فتحہ چونکہ خفیف ہے۔ زیادتی
تخفیف کے لئے اِبْنَ اُمَّ اکثر قاریوں کی قرائت میں آیا ہے یا جیسے خَمْسَةَ عَشَرَ میں تا ہمیشہ مفتوح آتی ہے (کیونکہ دونوں لفظ
مل کر ایک کلمہ بن گئے اور اعراب ایک کلمہ کے درمیان جاری نہیں ہوتا جیسے بعلبک میں لام پر ہمیشہ فتحہ آتا ہے) اسی کی
مشابہت سے ابن ام کہا گیا۔

اِنَّ الْقَوْمَ، القوم یہ لوگ یعنی بچھڑے کے پجاریوں نے کادوا قریب تھا انہوں نے ارادہ کر ہی لیا تھا مطلب یہ کہ میں
نے ان کو روکنے میں اپنی کوشش کرلی مگر یہ مجھ پر غالب آگئے اور انہوں نے مجھے بے حقیقت سمجھ لیا قریب تھا کہ مجھے قتل کر
دیں میں نے روکنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی آپ اس میں میری کوشش کا قصور نہ سمجھیں۔

فَلَا تُشْمِتْ بِيَ یعنی مجھ سے ایسا سلوک نہ کیجئے کہ دشمن خوش ہوں۔ دشمن کی مصیبت پر خوش ہونے کو شَمَاتَتْ
کہتے ہیں کذا فی القاموس۔ وَلَا تَجْعَلْنِيْ اور غصہ اور غضب میں مجھے ان ظالموں کا شریک نہ بنائیے۔ ظالموں سے مراد ہیں
گوسالہ پرست (کیونکہ گوسالہ پرستی جیسی غیر موزوں نالائق حرکت کا صدور ان سے ہوا تھا) رَبِّ اغْفِرْ لِيْ یعنی جو حرکت میں
نے اپنے بھائی کے ساتھ کی اس کو معاف فرمادے۔ وَلِاَخِيْ اور اگر میرے بھائی سے بنی اسرائیل کو روکنے میں کوئی قصور ہوا ہو تو
اس کو بھی معاف فرمادے۔ کلام کا سیاق بتا رہا ہے کہ اصل مقصود اپنے بھائی کے قصور کی معافی کی طلب تھی، بھائی کو خوش کرنے
اور دشمنوں کی شماتت دفع کرنے کے لئے دعاء مغفرت میں حضرت موسیٰ نے اپنی ذات کو بھی شریک کر لیا، پھر ایک بات یہ
بھی ہے کہ دوسروں کے لئے استغفار کا طریقہ بھی یہی ہے کہ اپنی ذات کے لئے اول استغفار کیا جائے تاکہ اپنے نفس کو پاک
سمجھنے کا شبہ بھی باقی نہ رہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ گناہ دعا کو قبول ہونے سے روکتے ہیں اس لئے سب سے پہلے اپنے گناہوں
کی معافی کی درخواست کی جائے اس کے بعد کوئی دعا کی جائے، یہی وجہ ہے کہ جنازہ کی (نماز کی) دعا میں اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَ
مَيِّتِنَا آتا ہے، زندوں کا ذکر مردوں سے پہلے آتا ہے کیونکہ دعا کرنے والا زندہ ہی ہوتا ہے۔ اور اہل قبور کی دعا میں بھی يَغْفِرُ
اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ آتا ہے۔ مخاطب سے پہلے متکلم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اگرچہ معصوم تھے آپ سے کسی گناہ کا صدور
ہی نہ ہوتا تھا لیکن امت کی تعلیم کے لئے اللہ نے اپنے نبی کو خطاب کر کے فرمایا وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ
الْمُؤْمِنٰتِ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ یعنی دنیا میں ہم کو معصوم رکھ اور آخرت میں ہم پر رحم فرما اور دونوں جہان میں ہم کو ترقی
درجات عنایت کر وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ یعنی تو سب سے زیادہ ہم پر مہربان ہے یہاں تک کہ جتنے مہربان ہم اپنے اوپر ہیں
اس سے بھی زیادہ تو ہم پر مہربان ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾

(بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کی پوجا کی بہت جلد اس دنیوی زندگی میں ان پر ان کے رب کا غضب آئے گا اور ذلت پڑے گی۔ ہم افتراپردازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں اور جن لوگوں نے برے کام کرنے کے بعد توبہ کرلی اور (سچے دل سے) ایمان لے آئے تو آپ کا رب اس توبہ کے بعد گناہ کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے)۔

اِتَّخَذُوا الْعِجْلَ یعنی جنہوں نے گوسالہ کو معبود بنایا۔ غَضَبٌ یعنی عذاب اس سے مراد ہے وہ حکم جو ان کو دیا گیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کردے۔ وَذِلَّةٌ ذلت سے مراد ہے گھروں سے نکل جانا، جلاوطن ہوجانا، اس مطلب پر سَيَنَالُهُمْ میں سین استقبال کے لئے ہوگی اور حضرت موسیٰؑ کے غضب ناک ہونے کے بعد ہی کا زمانہ جس میں بنی اسرائیل کو سزا دی گئی مراد ہوگا۔ لیکن عطیہ عوفی کا قول ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے یہودی۔ باپ دادا کے ناشائستہ افعال کا ذکر کر کے ان کو عار دلائی گئی ہے اور انہی یہودیوں سے فرمایا گیا ہے کہ تم کو آخرت میں اللہ کی طرف سے عذاب ہوگا اور دنیا میں ذلت پڑے گی چنانچہ بنی قریظہ اور بنی نضیر پر یہ ذلت پڑی کہ ایک قبیلہ کو قتل کیا گیا اور دوسرے قبیلہ کو جلاوطن کیا گیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ذلت سے مراد ہے جزیہ۔

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ یعنی حضرت موسیٰؑ کی قوم میں سے جنہوں نے گوسالہ پرستی کی پھر توبہ کی اور مومن ہوگئے اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے حکم کے موافق آپس میں ایک نے دوسرے کو قتل کیا۔ مِنْۢ بَعْدِهَا یعنی توبہ کے بعد۔ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ بلاشبہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے خواہ گناہ کتنے ہی بڑے اور زیادہ ہوں (سب معاف فرمادے گا)۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۚۖ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ (اور جب موسیٰؑ کا غصہ فرو ہوا تو ان تختیوں کو اٹھالیا اور ان کے مضامین میں ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ہدایت اور رحمت تھی)۔

سَكَتَ بمعنی سکن یعنی فرو ہوا۔ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ حضرت ہارون کی معذرت اور قوم کی ندامت وتوبہ کے بعد جب حضرت موسیٰؑ کا غصہ فرو ہوا، سکون کو لفظ سکوت سے تعبیر کرنے میں کلام کی رفتار میں زور آگیا وہ غضب جس میں گزشتہ حرکت حضرت موسیٰؑ سے صادر ہوئی تھی اس کو آمر وحاکم کی صورت میں پیش کیا گیا ہے (گویا پہلے غضب نے حکم دیا تھا کہ تختیاں پھینک دو موسیٰؑ نے تختیاں پھینک دیں، پھر غصہ خاموش ہوگیا تو موسیٰؑ نے تختیاں اٹھالیں)۔

اَخَذَ الْاَلْوَاحَ تختیاں لے لیں جن کا ۱/۶ حصہ ٹوٹ چکا تھا۔ فِيْ نُسْخَتِهَا بعض علماء کے نزدیک نسخہ سے مراد ہے ایک لوح (کیونکہ نسخہ کا لغوی معنی ہے کاپی، نقل اور) وہ لوح محفوظ کی نقل تھی۔ بعض کا قول ہے کہ پھینکنے سے اصل تختیاں تو ٹوٹ گئی (ناکارہ اور ناقابل قرأت ہوگئیں) پھر حضرت موسیٰؑ نے چالیس دن روزے رکھے تو دو تختیوں پر لکھی ہوئی توریت دوبارہ عطا کی گئی۔ هُدًى گمراہی سے ہدایت اور حق کا بیان۔ ورحمة اور عذاب کی جگہ رحمت۔ لِرَبِّهِمْ اس میں لام زائد ہے (کیونکہ يَرْهَبُوْنَ کا مفعول بغیر لام کے عربی کلام میں آتا ہے) جیسے رَدِفَ لکم میں لام زائد ہے۔ کسائی نے کہا فعل کے موخر ہونے کی وجہ سے اس کے عمل میں کمزوری آگئی ہے اس لئے مفعول پر لام زیادہ کیا گیا جیسے لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ میں۔ قطرب کے نزدیک یہ لام من کے معنی میں ہے اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ بعض نے کہا يَرْهَبُوْنَ بمعنی رَاهِبُوْنَ (اسم فاعل) کے ہے۔ بعض کے نزدیک لام تعلیل کا ہے یعنی اللہ کی وجہ سے گناہوں سے ڈرتے ہیں۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ (اور موسیٰؑ نے ہمارے مقرر کردہ وقت (پر کوہ طور کو جانے) کے لئے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چنے)۔

قَوْمَهٗ یعنی مِنْ قَوْمِهٖ اپنی قوم میں سے۔ سَبْعِيْنَ رَجُلًا یعنی ان لوگوں میں سے ستر آدمی جنہوں نے بچھڑے کی پوجا

نہیں کی تھی۔ لمیقاتنا یعنی ہم نے ان کی حاضری کا جو وقت مقرر کیا تھا اس وقت کے لئے۔
روایت میں آیا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو لے کر آؤ اور بچھڑے کی پوجا کی معذرت پیش کرو (یعنی قصور معاف ہونے کی دعا کرو) آپ نے ہر سبط میں سے چھ آدمی چھانٹ لئے، اس طرح دو آدمی بڑھ گئے کیونکہ کل اسباط بارہ تھے آپ نے فرمایا دو آدمی کم کرلو اس پر کوئی راضی نہ ہوا آخر آپ نے فرمایا جو آدمی ساتھ نہ جائے گا اس کو بھی ساتھ جانے والے کے برابر ثواب ملے گا اس پر کالب اور یوشع بیٹھ گئے اور باقی کو ساتھ لے کر آپ چل دیئے۔ پہاڑ کے قریب پہنچے تو موسیٰ اور ساتھیوں کو ایک باریک ابر نے اپنی آغوش میں لے لیا، سب لوگ سجدہ میں گر پڑے اور سب نے سنا کہ اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، بعض اوامر و نواہی کی ہدایت کی۔ کچھ دیر کے بعد ابر پھٹ گیا تو ساتھی حضرت موسیٰ سے کہنے لگے جب تک کھلم کھلا ہم اللہ کو دیکھ نہ لیں یوں ہم کو آپ کی باتوں کا یقین نہیں آئے گا معلوم نہیں کس کی آواز تھی) اس گستاخی کی وجہ سے ان کو بجلی نے آپکڑا۔ بعض نے کہا پہاڑ میں زلزلہ آ گیا اور سب بے ہوش ہو گئے یعنی مر گئے۔ سدی کا یہی قول ہے۔
حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جن ستر لوگوں پر بجلی گری تھی ان کا واقعہ بعد کا ہے اور جن لوگوں نے بغیر رو در رو خدا کو دیکھے، صرف آواز سن کر ماننے سے انکار کر دیا تھا، ان کا واقعہ پہلے ہو چکا تھا۔ اللہ نے موسیٰ کو حکم دیا تھا کہ ستر آدمیوں کو چن کر اپنے ساتھ باہر لاؤ۔ حضرت موسیٰ نے ستر افراد چن لئے اور سب کو لے کر بستی سے باہر آ کر سب نے مل کر دعا کی۔ من جملہ دعا کے انہوں نے یہ الفاظ بھی کہے تھے کہ اے اللہ ہم کو وہ چیز عطا فرما جو تو نے ہم سے پہلے کسی کو نہ دی ہو نہ ہمارے بعد کسی کو دے۔ یہ (ٹھیکیداری کی) دعا اللہ نے رد کر دی اور ان کو بجلی نے آپکڑا۔ وہب نے کہا وہ رَجْفَة موت نہ تھا (یعنی مرے نہیں) بلکہ منظر دیکھ کر ان پر لرزہ طاری ہو گیا، کپکپانے لگے، بے چین ہو گئے، بند بند ٹوٹنے لگا۔

فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۚ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۚ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ۚ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۚ (سو جب ان کو زلزلہ یا بجلی نے آپکڑا تو موسیٰ نے عرض کیا اے میرے مالک اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی ان کو ہلاک کر دیتا اور مجھ کو بھی، کیا تو ہم میں سے ان بے وقوفوں کی حرکت پر سب کو ہلاک کر دے گا، یہ واقعہ تو تیری طرف سے محض ایک امتحان ہے (یعنی ہلاک کرنے کے لئے تو نے ایسا نہیں کیا) ایسے امتحانات سے تو جس کو چاہتا ہے گمراہی میں ڈال دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ پر چلاتا ہے۔ تو ہمارا کارساز ہے ہم کو معاف فرما دے اور ہم پر رحم فرما تو سب سے زیادہ معاف کرنے والا ہے اور ہم لوگوں کے نام دنیا میں بھی نیک حالی لکھ دے اور آخرت میں بھی ہمارا رجوع تیری ہی طرف ہے)۔

فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ سیوطی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا الرَّجْفَةُ یعنی سخت زلزلہ۔ چونکہ گوسالہ پرستوں سے وہ لوگ گوسالہ پرستی کے وقت الگ اور کنارہ کش نہیں ہوئے اس لئے سخت بھونچال میں گرفتار ہو گئے۔ حضرت موسیٰ کو ان کی حالت دیکھ کر رحم آیا اور اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ مر نہ جائیں اور حضرت موسیٰ کے ہاتھ سے نکل نہ جائیں یہ لوگ تمام نیک کاموں میں حضرت موسیٰ کے مددگار تھے، اطاعت گزار اور فرماں بردار تھے، ان کی یہ حالت دیکھ کر حضرت موسیٰ رونے لگے اور عرض کیا رَبِّ لَوْ شِئْتَ اے مالک اس منظر کو دیکھنے سے پہلے ہی اگر تو چاہتا تو ان سب کو اور مجھے مار ڈالتا یعنی فرعون کے ہاتھ سے ان کو مروا دیتا یا دریا میں غرق کر دیتا یا کسی اور طرح سے مار ڈالتا مگر تو نے رحم کیا ان کو بچالیا۔ فرعون سے بھی اور دریا سے بھی ہر مصیبت سے رہائی دی اب اگر ایک بار اور تو ان پر رحم فرمائے تو تیری عمومی رحمت سے بعید نہیں۔ بعض علماء نے کہا لَوْ شِئْتَ کا یہ مطلب ہے کہ اگر تو چاہتا تو یہاں آنے سے پہلے ہی قوم کے سامنے ان کو ہلاک کر دیتا سب لوگ دیکھ لیتے اور مجھ پر تہمت تراشی نہ کرپاتے۔
بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ان بے وقوفوں نے جو طلب دیدار کی جرأت کی یا بچھڑے کی پوجا کی ان کی اس حرکت سے تو

کیا سب کو ہلاک کر دے گا۔ مبرد نے کہا کلام استفہامی ہے مگر استفہام کی غرض طلب رحم ہے کیونکہ موسیٰؑ واقف تھے کہ اللہ بڑا منصف ہے، بعض کے جرم سے سب کو ہلاک نہیں کرتا (اور جس چیز سے واقف تھے اس کو دریافت کرنے کا کوئی معنی نہیں اس لئے استفہام سے مراد ہے مہربانی کی طلب) یعنی ہلاک نہ کر۔ اِنْ هِيَ نہیں ہے وہ یعنی رؤیت کی طلب یا گوسالہ پرستی۔
اِلَّا فِتْنَتُكَ مگر تیری طرف سے امتحان کہ ان کو کلام سنایا جس سے ان کو تیرے دیدار کا لالچ ہوا یا تو نے ایک بچھڑا چنخناڈکار تا بنوا دیا جس سے یہ گمراہ ہو گئے اور پھر تو نے ان کو یونہی بے مدد چھوڑ دیا۔
اِلَّا فِتْنَتُكَ کے لفظ میں اللہ کے قول اِنَّا فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ کی طرف اشارہ ہے گویا حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا یہ تیرا ہی امتحان ہے جس کی تو نے مجھے اطلاع پہلے ہی دی تھی کہ کچھ لوگوں کو تو نے گمراہی میں ڈال دیا اور وہ فتنہ میں پڑ گئے اور کچھ کو ہدایت پر قائم رکھا اور محفوظ رکھا کہ وہ دین پر جمے رہے۔ تُضِلُّ مَنْ تَشَاءُ تو جس کو گمراہی میں ڈالنا چاہتا ہے اس کو گمراہی میں ڈال دیتا ہے کہ اس کی مدد نہیں کرتا بے مدد چھوڑ دیتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے حد سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ اور جس کی ہدایت چاہتا ہے اس کو ہدایت پر کر دیتا ہے (اور اس کی مدد کرتا ہے) جس کی وجہ سے اس کا ایمان مضبوط ہو جاتا ہے۔ اَنْتَ وَلِيُّنَا تو ہمارا مددگار اور محافظ ہے۔ وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ یعنی برائی کو معاف کر دیتا ہے اور اس کی جگہ بھلائی عطا کرتا ہے۔ وَاكْتُبْ لَنَا اور ہمارے لئے لکھ دے یعنی واجب کر دے۔
حَسَنَةً نیک حالی یعنی طاعت کی توفیق اور نعمت اور عافیت۔ وَفِي الْاٰخِرَةِ اور آخرت میں بھی نیک حالی یعنی مغفرت اور رحمت اور جنت۔ اِنَّا هُدْنَا ہم نے تیری طرف رجوع کیا توبہ کی یہ لفظ هَادَ، يَهُوْدُ سے (جمع متکلم ماضی کا صیغہ) ہے۔ قتادہ اور ابن جریج کا قول ہے اور محمد بن کعب نے بھی یہی کہا ہے کہ ان لوگوں کا قصور اتنا تھا کہ گوسالہ پرستی کے وقت یہ لوگ گوسالہ پرستوں سے کنارہ کش نہ ہوئے تھے (انہی کی معاشرت میں گھلے ملے رہتے تھے) نہ بھلائی کا حکم دیا نہ برائی سے روکا تھا اسی جرم کی وجہ سے عذاب رجفہ میں پکڑے گئے۔

قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۱۵۶ (اللہ نے فرمایا میں اپنا عذاب تو اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے تو وہ میں ان لوگوں کے لئے تو ضرور ہی لکھوں گا جو (اللہ کی نافرمانی سے) ڈرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہمارے آیات پر ایمان رکھتے ہیں)۔

قَالَ یعنی موسیٰؑ کی دعا کے جواب میں اللہ نے فرمایا۔ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ یعنی میری رحمت ہر شئے کے لئے عام ہے (کوئی میری رحمت سے محروم نہیں) دنیا میں کوئی مؤمن ہو کافر ہو مکلف ہو غیر مکلف ہو، البتہ آخرت میں کافروں پر رحمت نہ ہو گی کیونکہ دوسروں کی پوجا کر کے اللہ کی رحمت میں داخل ہونے سے خود انکار کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری ساری امت جنت میں جائے گی سوائے اس کے جس نے انکار کیا۔ عرض کیا گیا، انکار کس نے کیا (امت میں منکر کون ہو سکتا ہے) فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں جائے اور جس نے نافرمانی کی اس نے انکار کیا، رواہ البخاری۔
عطیہ عوفی نے آیت کی تشریح میں فرمایا اللہ کی رحمت سموئے ہوئے تو ہر چیز کو ہے لیکن رحمت کا وجوب صرف متقیوں کے لئے ہے، اللہ کی رحمت اہل ایمان کے لئے وسیع ہے ان کی وجہ سے کافروں کو بھی رزق ملتا اور بلائیں دفع ہوتی ہیں اور یہ بھی اللہ کی رحمت سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں پھر جب مؤمن آخرت کو سدھاریں گے تو رحمت خداوندی خصوصیت کے ساتھ انہی پر ہو گی (کافر بلا رحمت رہ جائیں گے) جیسے دوسرے کے چراغ کی روشنی سے کوئی شخص فائدہ اندوز ہوتا ہو اور جب چراغ والا اپنا چراغ لے جائے تو یہ نور چیں محروم رہ جائے۔
فَسَاَكْتُبُهَا یعنی اے بنی اسرائیل میں آخرت میں تم لوگوں میں سے انہی کے لئے رحمت واجب کروں گا۔ لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ جو کفر و معصیت سے بچتے ہیں۔ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (يَتَّقُوْنَ میں اداء قرض بھی داخل تھی مگر) زکوٰۃ کا ذکر خصوصیت

سے اس لئے کیا کہ نفس پر ادائے زکوٰۃ بہت شاق ہوتی ہے (دل پر بڑا پتھر رکھ کر اپنا مال بلا احسان دوسرے کو دینا ہوتا ہے) یعنی میری تمام کتابوں پر۔ یُؤْمِنُوْنَ ایمان رکھتے ہیں کسی کا بھی انکار نہیں کرتے۔

چونکہ اللہ کے علم میں تھا کہ حضرت موسیٰ کی شریعت کو ایک وقت پر منسوخ کیا جائے گا اس لئے آئندہ آیت میں اس پر تنبیہ فرمائی اور بنی اسرائیل کو رسول امی خاتم الانبیاء ﷺ کی اتباع پر برانگیختہ کیا۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ

(جو لوگ اتباع کرتے ہیں اس رسول نبی امی کا جس (کے صفات و احوال) کو وہ اپنے پاس انجیل و توریت میں لکھا ہوا پاتے ہیں جو ان کو نیک باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں کی ممانعت کرتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتاتا ہے اور گندی چیزوں کو (بدستور) ان پر حرام قرار دیتا ہے)۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ مبتداء ہے یَاْمُرُهُمْ خبر ہے یا مبتدا محذوف ہے اور اَلَّذِيْنَ خبر ہے یعنی وہ وہی لوگ ہیں جو اتباع کرتے ہیں۔ اَلرَّسُوْلَ النَّبِيَّ یعنی اللہ کا پیغمبر اور بندوں کے لحاظ سے نبی۔ اَلْاُمِّيَّ مراد رسول اللہ ﷺ۔ اُمّی، ام (ماں) کی طرف منسوب ہے یعنی اسی حالت پر جس حالت پر پیدائش کے وقت تھا مطلب یہ کہ نہ لکھا ہے نہ پڑھا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم امی گروہ ہیں نہ لکھتے ہیں نہ حساب داں ہیں۔ رواہ البخاری و مسلم عن ابن عمر۔ امی کا وصف ذکر کرنے سے اس بات پر تنبیہ فرمائی کہ باوجودیہ کہ محمد ﷺ لکھے پڑھے نہیں اس حالت میں ان کا علمی کمال اعلیٰ ترین معجزہ ہے۔ بعض علماء نے کہا امی، امت کی طرف منسوب ہے آپ کی امت کثیر ہونے والی تھی اس لئے آپ کو امی فرمایا۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میرے تابع تمام انبیاء سے زائد ہوں گے اور میں ہی سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھٹ کھٹاؤں گا، رواہ مسلم۔

امی اصل میں امتی تھا نسبت کی وجہ سے تاء کو حذف کر دیا جیسے مکی اور مدنی میں تاء کو حذف کر دیا گیا ہے (مکی، مکتی تھا اور مدنی مدینتی) بعض کے نزدیک امی، ام القری کی طرف منسوب ہے یعنی مکہ کے رہنے والے۔ اس آیت کی وجہ سے وہ بنی اسرائیل حکم آیت سے خارج ہو گئے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کا دور نبوت پایا اور ایمان نہ لائے، مگر وہ بنی اسرائیل حکم میں داخل رہے جنہوں نے حضور ﷺ کا عہد رسالت پایا ہی نہیں اور آپ کی نبوت سے پہلے گزر گئے کیونکہ آیت میں صاف صراحت ہے کہ مَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ۔

ابن حبان نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن ہر نبی کے لئے نور کا ایک ممبر ہو گا اور میں سب سے اونچے اور سب سے زیادہ نور والے ممبر پر متمکن ہوں گا کہ ایک منادی ندا دے گا نبی ﷺ امی کہاں ہے۔ انبیاء کہیں گی ہم میں سے ہر ایک نبی ﷺ امی ہے (یعنی امت والا ہے) پھر کس کے پاس پیام آیا ہے۔ منادی دوبارہ لوٹ کر آئے گا اور کہے گا نبی امی عربی کہاں ہے اس پر محمد ﷺ (ممبر سے) اتر کر آئے گا اور جنت کے دروازہ پر پہنچ کر دروازہ کھٹ کھٹائے گا دریافت کیا جائے گا کون ہے جواب ملے گا محمد ﷺ اور احمد ﷺ دریافت کیا جائے گا کیا بلایا گیا تھا جواب ملے گا ہاں۔ دروازہ کھول دیا جائے گا اور رب جلوہ انداز ہو گا اس سے پہلے جلوہ انداز نہ ہو گا، تجلی پڑتے ہی محمد ﷺ سجدہ میں گر پڑے گا اور اس طرح سے اللہ کی حمد کرے گا کہ کسی نے نہ کی ہو گی، حکم ہو گا سر اٹھا بات کر اور شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امی کا لفظ امت کی طرف منسوب ہے۔ اسی لئے ہر پیغمبر اپنے کو امی کہے گا۔ رسول اللہ ﷺ کے لئے لفظ امی کی خصوصیت اس لئے ہو گی کہ آپ کی امت ہر پیغمبر کی امت سے زیادہ ہے (بڑی امت والا)۔

یَجِدُوْنَهٗ جس کو بنی اسرائیل پاتے ہیں۔ مَكْتُوْبًا لکھا ہوا نام بھی اور خصوصی اوصاف بھی۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا رسول اللہ ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا وہ بیمار ہو گیا رسول اللہ ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے ان کا باپ اس کے سرہانے توریت پڑھ رہا تھا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہودی میں تجھے اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ پر توریت

اتاری تھی اور پوچھتا ہوں کیا تجھے توریت میں میرے اوصاف، حالات اور مقام خروج (بعثت) کا ذکر ملتا ہے۔ یہودی نے کہا نہیں، لیکن اس لڑکے نے کہا کیوں نہیں (ضرور موجود ہے) خدا کی قسم! یارسول اللہ ﷺ ہم آپ کے اوصاف، خصوصیات اور مقام خروج کا ذکر توریت میں پاتے ہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بلاشبہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا اس یہودی کو اس کے سرہانے سے اٹھادو اور اپنے بھائی کی خود کفالت کرو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت ہے کہ فلاں یہودی کی رسول اللہ ﷺ پر کچھ اشرفیاں قرض تھیں، اس نے حضور ﷺ پر تقاضا کیا، حضور ﷺ نے فرمایا میرے پاس اس وقت کچھ نہیں ہے کہ میں دے سکوں۔ یہودی بولا محمد ﷺ جب تک دے نہ دو گے میں تم کو نہیں چھوڑوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو تمہارے پاس بیٹھا رہوں گا چنانچہ آپ اس کے پاس بیٹھ گئے اور وہیں حضور ﷺ نے ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں پڑھیں۔ صحابہؓ کرام یہودی کو دھمکانے لگے اور کچھ وعدے کرنے لگے۔ صحابہؓ کی حرکت کو رسول اللہ ﷺ سمجھ گئے، صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ ایک یہودی آپ کو روکے ہوئے ہے (ہم سے یہ بات برداشت نہیں ہوتی) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے میرے رب نے حق تلفی کرنے سے منع فرمادیا ہے۔ کسی معاہد کی ہو یا غیر معاہد کی، جب دن چڑھ گیا تو اچانک یہودی بولا میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ ﷺ بلاشبہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں اور میرا آدھا مال اللہ کے لئے وقف ہے۔ خدا کی قسم میں نے جو معاملہ آپ کے ساتھ کیا وہ صرف اس وجہ سے کیا کہ میں نے توریت میں دیکھا تھا محمد بن عبداللہ ﷺ کی پیدائش مکہ میں ہوگی اور طیبہ اس کا مقام ہجرت ہوگا، اس کی حکومت شام میں ہوگی، وہ بدخو درشت مزاج نہ ہوگا، بازاروں میں چیخ و پکار نہ کرے گا، فحش کلام اور بے حیائی کی باتیں نہیں کرے گا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بلاشبہ آپ اللہ کے رسول ﷺ ہیں، یہ میرا مال موجود ہے آپ جیسا مناسب ہو اس میں تصرف کریں۔ یہ یہودی بڑا مالدار تھا۔ مذکورہ بالا دونوں حدیثیں بیہقی نے دلائل النبوۃ میں بیان کریں۔

عطاء بن یسار کا بیان ہے میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا مجھے رسول اللہ ﷺ کے وہ اوصاف بتائیے جن کا ذکر توریت میں آیا ہے، فرمایا اچھا خدا کی قسم رسول اللہ ﷺ کی جو صفات قرآن مجید میں بیان کی گئی ہیں ان کا کچھ حصہ توریت میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ توریت میں آیا ہے اے نبی ہم نے تجھ کو (حق و باطل کی) شہادت دینے والا (نیکوں کو جنت کی) خوشخبری دینے والا (نافرمان کافروں کو دوزخ سے) ڈرانے والا اور امیوں (یعنی عربوں) کا محافظ بنا کر بھیجا ہے تو میرا بندہ میرا رسول ہے۔ میں نے تیرا نام متوکل رکھا ہے، جو بدخو درشت مزاج نہ ہوگا، بازاروں میں پکار تا غل مچاتا نہ پھرے گا، برائی کو برائی سے دفع نہیں کرے گا بلکہ عفو اور مغفرت سے کام لے گا، ہم اس کی روح اس وقت تک قبض نہ کریں گے جب تک اس کے ذریعہ سے ٹیڑھی امت کو سیدھا نہ کردیں گے یعنی جب تک لوگ لا الہ الا اللہ کے قائل نہ ہو جائیں گے، ہم اس کے ذریعہ سے اندھی آنکھوں کو بہرے کانوں کو اور بند دلوں کو کھول دیں گے، رواہ البخاری۔ دارمی نے حضرت عبداللہ بن سلام کی روایت بھی اسی جیسی نقل کی ہے۔

حضرت کعب احبار نے توریت سے نقل کرتے ہوئے بیان کیا ہم (توریت میں) لکھا ہوا پاتے ہیں محمد رسول اللہ ﷺ میرا منتخب بندہ ہوگا، درشت خو بدمزاج نہ ہوگا، بازاروں میں شور و غل نہیں کرے گا، برائی کا بدلہ برائی سے نہ دے گا بلکہ معاف کردے گا اور بخش دے گا، اس کی پیدائش مکہ میں ہجرت طیبہ میں اور حکومت شام میں ہوگی، اس کی امت بکثرت حمد کرنے والی ہوگی دکھ سکھ ہر حال میں اللہ کی حمد کرے گی ہر فرودگاہ میں حمد کرے گی اور ہر ٹیلہ پر تکبیر کہے گی وہ لوگ سورج (کے طلوع غروب اور چڑھاؤ اتار) کو تکتے رہیں گے جب نماز کا وقت آئے گا تو نمازیں پڑھیں گے، وہ وضو میں ہاتھ پاؤں دھوئیں گے، ان کا موذن خلاء سماوی میں (یعنی منارہ پر چڑھ کر) اذان دے گا، ان کے میدان قتال کی صف بندی اور نماز کی صف بندی ایک ہی طرح کی ہوگی، رات میں ان کی (نمازوں کی) گونج ایسی ہوگی جیسی شہد کی مکھیوں کی بھن بھناہٹ۔ رواہ البغوی فی معالم التنزیل۔

وذکرہ فی المصابیح۔ دارمی نے بھی یہ حدیث کسی قدر تغیر کے ساتھ نقل کی ہے۔
حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا توریت میں محمد ﷺ کے اوصاف لکھے ہوئے ہیں اور (یہ بھی لکھا ہے کہ) عیسیٰؑ بن مریم کو ان کے ساتھ دفن کیا جائے گا، رواہ الترمذی۔ ابوداؤد نے کہا حجرہ میں ایک قبر کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔
یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی ان باتوں کا حکم دیتا ہے جو شریعت الٰہیہ میں اچھی بتائی گئی ہیں۔ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی ان باتوں کی ممانعت کرتا ہے جو شرع، عقل سلیم اور سنجیدہ غیر جذباتی ہوش رکھنے والوں کے نزدیک بری ہیں جیسے شرک، محسن کی ناشکری اور نافرمانی، قرابت داروں سے رشتۂ قرابت کو توڑلینا۔ وَیُحِلُّ لَهُمُ اور بنی اسرائیل کے لئے حلال کرتا ہے۔ الطَّیِّبٰتِ وہ پاکیزہ چیزیں جو نافرمانی کی سزا میں توریت کے اندر ان کے لئے حرام کردی گئی تھیں جیسے چربی اور اونٹ کا گوشت اور ان چیزوں کو بھی حلال کرتا ہے جو اہل جاہلیت نے خود اپنے لئے حرام قرار دے رکھی تھیں جیسے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام (ان چاروں اقسام کے اونٹوں کی تفصیل کئی جگہ گزر چکی ہے)
وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ اور گندی چیزوں کو ان کیلئے حرام کرتا ہے جیسے خون، شراب، خنزیر، مردار، سود، رشوت۔
وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ اور ان پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتا ہے (یعنی اتار پھینکتا ہے)۔
اِصْر لغت میں اس بوجھ کو کہتے ہیں جو حرکت کرنے سے روک دے۔ حضرت ابن عباسؓ حسن، ضحاک، سدی اور مجاہد کے نزدیک اِصْر سے مراد وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل سے توریت کے کل احکام کی پابندی رکھنے کا لیا گیا تھا۔ قتادہ کے نزدیک وہ دینی تشدد مراد ہے جس کے بنی اسرائیل مکلّف تھے۔ وَالْاَغْلٰلَ یعنی وزنی بار جو حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں تھے جیسے توبہ قبول ہونے کے لئے قتل کئے جانے کا ضروری حکم، گناہ کرنے والے عضو کو کاٹ ڈالنے کا حکم، کپڑے پر نجاست لگ جائے تو اس کو قینچی سے قطع کردینے کا حکم، قتل عمداً ہو یا خطاءً بہرحال قصاص کا وجوبی حکم اور خون بہا لینے دینے کی ممانعت، سنیچر کے دن کوئی دنیوی کام نہ کرنے کا حکم، گرجا کے علاوہ کہیں اور کسی جگہ نماز کی ادائیگی نہ ہونے کا حکم یہ اور اسی طرح کے دوسرے سخت احکام تھے جو طوق کی طرح یہودیوں کی گردنوں میں پڑے ہوئے تھے۔
فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ ع ۱۹
(سو جو لوگ اس (نبی امی) پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی حمایت کرتے ہیں اور اس کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو اس کے ساتھ بھیجا گیا ہے ایسے ہی لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں)۔
عَزَّرُوْهُ اس کی تعظیم کی یعنی قوت پہنچا کر (اس کی عملی) تعظیم کی۔ وَنَصَرُوْهُ اور دشمنوں کے خلاف اس کی مدد کی۔
اَلنُّوْر یعنی قرآن مجید۔ مَعَهٗ یعنی اس کی نبوت کے ساتھ جو قرآن بھیجا گیا ہے اس پر ایمان لاتے ہیں۔ قرآن کو نور کہنے کی وجہ یہ ہی کہ (نور اس چیز کو کہتے ہیں جو خود بالکل ظاہر ہو اور دوسری چیزوں کو بھی ظاہر کردینے والی ہو) قرآن اپنے معجزہ ہونے کی وجہ سے خود ظاہر الصداقت ہے اور اس کا کلام اللہ ہونا پوشیدہ نہیں ہے اور (افکار و اعمال کو روشن کرنے والے) احکام کو ظاہر کرنے والا بھی ہے یا یوں کہا جائے کہ قرآن حقائق کے چہرہ سے پردہ اٹھا دینے والا ہے اس لئے اس کو نور کہا گیا۔
مَعَهٗ کا تعلق اِتَّبَعُوْا سے ہو (اُنْزِلَ سے نہ ہو) اس وقت یہ مطلب ہوگا کہ نازل شدہ نور یعنی قرآن کا بھی اتباع کرو اور نبی کا بھی اتباع کرو، قرآن اور سنت دونوں کی پیروی کرو۔ الْمُفْلِحُوْنَ یعنی ابدی فلاح پانے والا اور لازوال دائمی رحمت سے سرفراز ہونے والے۔ الْمُفْلِحُوْنَ تک حضرت موسیٰؑ کی دعا کا جواب تھا۔
نوف بکالی حمیری کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم سے ستر آدمی چھانٹے، پھر اللہ نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا میں تم لوگوں کیلئے تمام زمین کو عبادت گاہ اور پاک قرار دے دوں گا جہاں نماز کا وقت ہو جائے تم نماز پڑھ سکو گے ہاں پاخانہ یا غسل خانہ یا قبر کے پاس پڑھنے کی ممانعت ہوگی اور تمہارے دلوں میں ٹھہراؤ (اطمینان ایمانی) پیدا کردوں گا تم تہ دل سے (یعنی حفظ)

توریت پڑھا کرو گے۔ مرد عورت، آزاد، غلام، چھوٹا بڑا ہر شخص توریت حفظ پڑھے گا۔ حضرت موسیٰؑ نے یہ فرمان اپنی قوم کو سنایا وہ لوگ کہنے لگے ہم نہیں چاہتے کہ گرجا کے علاوہ کہیں اور نماز پڑھیں نہ ہم تہ دل سے توریت پڑھنے کی طاقت رکھتے ہیں ہم تو صرف دیکھ کر پڑھنا چاہتے ہیں۔ اس پر اللہ نے فرمایا فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ سے الْمُفْلِحُوْنَ تک۔

چنانچہ اس امت کے لئے اللہ نے یہ بات مخصوص کر دی، حضرت موسیٰؑ نے دعا کی اے میرے رب مجھے اس امت کا پیغمبر بنا دے اللہ نے فرمایا ان کا نبی انہی میں سے ہوگا۔ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا تو مجھے اس امت میں سے ہی کر دے اللہ نے فرمایا تم ان کے زمانہ کو نہیں پہنچ سکتے (یعنی وہ امت آخری زمانہ میں آئے گی تم اس وقت تک زندہ نہیں رہو گے) حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا اے میرے رب میں بنی اسرائیل کا وفد لے کر حاضر ہوا تھا اور ان کی نمائندگی کا فائدہ دوسروں کو تو نے عطا کیا (یہ محروم رہ گئے) اس پر اللہ نے نازل فرمایا وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ حضرت موسیٰؑ اس پر خوش ہوگئے۔ نوف بکالی کی یہ تشریح اور تفصیل آیت کے صریحی الفاظ اور کلام کی رفتار کے خلاف ہے آیت! اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ ...... فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ صراحت کے ساتھ بتا رہی ہے کہ یہ آیت صرف مؤمنین اہل کتاب کے حق میں ہے (ان مؤمنوں سے اس کا تعلق نہیں جو پہلے مشرک تھے)۔

بغویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ، قتادہ اور ابن جریج نے فرمایا جب آیت وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ نازل ہوئی تو ابلیس کہنے لگا میں بھی كُلَّ شَيْءٍ میں داخل ہوں (میں بھی رحمت سے محروم نہیں رہوں گا) اس پر اللہ نے فرمایا فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ یہ آیت سن کر یہودی اور عیسائی بھی آرزومند ہوگئے اور کہنے لگے ہم بھی تقویٰ رکھتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ پر ہمارا ایمان ہے اس پر اللہ نے رحمت کو محض اس امت کے لئے محدود کر دیا اور فرمایا اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الخ

اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں خطاب کا رخ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے حالانکہ آیت کا سیاق چاہتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی دعا کے جواب میں اللہ نے ان الفاظ سے حضرت موسیٰؑ کو خطاب فرمایا اور رسول اللہ ﷺ پر اس آیت کا نزول بطور نقل ہوا (گویا رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ موسیٰؑ نے یہ دعا کی تھی اور ہم نے ان کی دعا کا یہ جواب دیا) واللہ اعلم۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨالَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ

(آپ کہہ دیجئے کہ اے تمام لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں جس کی بادشاہی تمام آسمانوں اور زمین میں ہے اسکے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے)۔

قُلْ اے محمد آپ کہہ دیجئے اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اس میں اضافت عہد خارجی کی ہے یعنی میں وہی رسول نبی امی ہوں جس کا ذکر اوپر گزر گیا اور جس کے اتباع کا عہد لیا گیا تھا۔ اِلَيْكُمْ یہ تمام لوگوں کو خطاب ہے اسی لئے آگے جَمِيْعًا بطور تاکید فرمایا لفظ جَمِيْعًا، كُمْ سے حال ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت تمام انسانوں کے لئے بلکہ جنات کے لئے بھی تھی باقی انبیاء کو صرف اپنی اپنی قوم کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے چھ باتوں کی وجہ سے انبیاء پر برتری عطا فرمائی گئی، مجھے جامع الفاظ عطا کئے گئے (یعنی کثیر معانی کو ادا کرنے والے مختصر ترین الفاظ بولنے کا ملکہ عطا کیا گیا) میرا رعب ڈال کر میری مدد کی گئی (دشمنوں پر دور دور تک میرا رعب ڈالا گیا) میرے لئے مال غنیمت حلال کر دیا گیا، میرے لئے تمام زمین کو عبادت گاہ بنا دیا گیا اور پاک کر دیا گیا، مجھے سب مخلوق کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا، مجھ پر نبوت ختم کر دی گئی، رواہ مسلم والترمذی عن ابی ہریرہ۔

طبرانی نے الکبیر میں صحیح سند سے حضرت سائب بن یزید کی روایت سے مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے مجھے پانچ باتوں کی وجہ سے انبیاء پر برتری عطا کی گئی۔ مجھے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا، میری امت کے لئے میری شفاعت جمع رکھ لی گئی، ایک ماہ (کی راہ) آگے تک اور ایک ماہ (کی راہ) پیچھے تک رعب ڈال کر میری مدد کی گئی، میرے لئے تمام زمین کو

عبادت گاہ اور طاہر بنادیا گیا، میرے لئے مال غنیمت حلال کر دیا گیا، مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں کیا گیا۔ بیہقی نے صحیح سند سے حضرت ابو امامہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے مجھے چار باتوں کی وجہ سے برتری عطا کی گئی اس روایت میں شفاعت کا ذکر نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں آیت میں خطاب اگرچہ عام طور پر سب لوگوں کو ہے لیکن بیان کی رفتار بتا رہی ہے کہ عام کے ذیل میں مدینہ کے یہودی اور بعض عیسائی خصوصیت کے ساتھ مخاطب ہیں انہی کے خلاف بطور دلیل مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ فرمایا اس کے بعد عناد و خصومت کے زیر اثر ان کا انکار اللہ کے دربار میں بے سود ہوگا (انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں) اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ یہ اَللّٰهُ کی صفت ہے یعنی میں اس اللہ کا رسول ہوں جس کی حکومت سارے جہان پر ہے یا اَلَّذِيْ مبتدا ہے اور لا اله الا هو خبر ہے یعنی جس اللہ کی بادشاہت تمام جہان میں ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس آخری صورت میں اَلَّذِيْ له الخ پیام رسالت کا بیان ہوگا یعنی مجھے یہ پیام پہنچانے کے لئے بھیجا گیا ہے کہ جو بادشاہ کائنات ہے وہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

(پس تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اللہ کے اس رسول نبی امی پر بھی جو خود اللہ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتا ہے اور اس رسول کا اتباع کرو تاکہ تم، راہ مقصد پر آلگو)۔

رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ یعنی اس امی پیغمبر ﷺ کا اتباع کرو جس کے اتباع کا پکا وعدہ تم سے گزشتہ کتابوں میں لے لیا گیا ہے۔ وَكَلِمٰتِهٖ اور اللہ کے احکام پر یعنی ان کتابوں پر اور وحی پر جن کا نزول اللہ کی طرف سے نبی امی اور دوسرے پیغمبروں پر ہوا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ یعنی ہدایت یاب ہونے کی امید رکھتے ہوئے۔ ہدایت یابی کی امید کی دونوں باتوں کے مجموعہ کا نتیجہ قرار دیا (ایمان اور اتباع دونوں کے مجموعہ پر امید ہدایت کو مرتب کیا) تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جو شخص صرف تصدیق تو کرتا ہو رسول اللہ ﷺ پر اس کا ایمان تو ہو مگر شریعت کی پابندی نہ کرتا ہو اور رسول اللہ ﷺ کا پیرو نہ ہو تو وہ (فکر و عقیدہ کے لحاظ سے اگرچہ ہدایت یافتہ ہو جائے گا مگر عمل کے اعتبار سے) برابر گمراہی میں گھرا رہے گا۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا

(اور قوم موسیٰؑ میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو دین حق کے موافق ہدایت کرتے ہیں اور اسی کے موافق انصاف بھی کرتے ہیں۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ خاندانوں میں تقسیم کر کے سب کی الگ الگ جماعت مقرر کر دی)۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى موسیٰؑ کی قوم میں سے یعنی بنی اسرائیل میں سے۔ اُمَّةٌ یعنی ایک جماعت۔ بِالْحَقِّ (یہ لفظ یا حال ہے) یعنی ایسی حالت میں کہ وہ خود برحق ہیں، اصحاب حق ہیں یا بِالْحَقِّ سے مراد ہے بِكَلِمَةِ الْحَقِّ یعنی وہ لوگوں کو حق بات کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔ اس حق کے سبب جس پر وہ خود قائم ہیں لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں۔ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ یعنی آپس کے معاملات میں بھی حق کے ساتھ ہی انصاف کے فیصلے کرتے ہیں۔

ضحاک، کلبی اور ربیع کا بیان ہے کہ جس جماعت کا اس آیت میں تذکرہ ہے وہ انتہائی مشرق میں چین سے بھی آگے ایک دریا کے کنارے جس کا نام دریاء اوراق ہے رہتی ہے۔ ان میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں کہ اس کے پاس مال ہو اور اس کے ساتھی کے پاس نہ ہو وہاں (روز) رات کو بارش ہوتی ہے اور دن کو ابر کھل جاتا ہے وہ لوگ کھیتی کرتے ہیں ہم میں سے کوئی وہاں نہیں پہنچ سکتا۔ وہ سب دین حق پر ہیں۔

روایت میں آیا ہے کہ شب معراج میں حضرت جبرئیل رسول اللہ ﷺ کو لے کر ان کی طرف پہنچے اور ان سے پوچھا تھا کہ کیا تم ان کو پہچانتے ہو جن سے کلام کر رہے ہو، انہوں نے انکار کیا، تو جبرئیلؑ نے کہا یہ محمد نبی امی ﷺ ہیں۔ یہ بات سن کر وہ سب آپ پر ایمان لے آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ حضرت موسیٰؑ نے ہم کو وصیت کی تھی کہ تم میں سے جو کوئی بھی احمد

کو پالے میرا ان سے سلام کہہ دے۔ رسول اللہ ﷺ نے موسیٰؑ کے سلام کا جواب دیا، پھر ان کو دس مکی سورتیں سکھائیں اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا اور یہ بھی حکم دیا کہ اپنی جگہ پر ہی قیام پذیر رہیں وہ لوگ سنیچر کے دن عبادت کرتے تھے آپ نے ان کی سنیچر کی جگہ جمعہ کی تعلیم دی۔

بعض علماء کا قول ہے کہ آیت میں وہ یہودی مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے اور مسلمان ہو گئے تھے بغویؒ کے نزدیک اول قول زیادہ صحیح ہے۔ میرے نزدیک اول روایت غریب ہے، مکہ میں معراج کے وقت جمعہ کی نماز کا حکم ہوا ہی نہ تھا اور نہ کوئی دس مکی سورتیں ایسی ہیں جن میں اسلام کے پورے احکام مذکور ہوں۔ زیادہ ظاہر یہ بات ہے کہ آیت میں مراد وہ مومن ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے اور جو یہودی رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے ان میں سے جو لوگ مسلمان ہو گئے وہ بھی مراد ہیں جیسے عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ۔

قَطَّعْنَا هُمُ یعنی ہم نے بنی اسرائیل کے فرقے بنا دیئے۔ اِثْنَتَیْ عَشْرَةَ بارہ یعنی ان کی جماعت بارہ حصوں میں بانٹ دیا۔ اَسْبَاطًا یہ بدل ہے تمیز نہیں ہے اولاد (لڑکی ہو یا لڑکا) کی اولاد کو سبط کہتے ہیں۔ حضرت اسرائیل کے بارہ بیٹوں کی اولاد یہ بارہ اسباط تھے۔ اُمَمًا اسباط کی صفت ہے یا دوسرا بدل۔ زجاج نے کہا آیت کا معنی ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کے بارہ فرقے یعنی جماعتیں بنا دیں۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰۤى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ (اور ہم نے موسیٰؑ کو حکم دیا جبکہ ان کی قوم نے ان سے پانی مانگا کہ اپنی اس لاٹھی کو فلاں پتھر پر مارو، پس (مارتے ہی) اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر ہر شخص (یا ہر جماعت) نے اپنا پانی پینے کا مقام (یعنی گھاٹ) جان لیا)۔

اِذِ اسْتَسْقٰىهُ یعنی جب تیہ میں بنی اسرائیل نے موسیٰؑ سے پانی طلب کیا۔ فَانْۢبَجَسَتْ یعنی موسیٰؑ نے جوں ہی لاٹھی ماری فوراً چشمے پھوٹ نکلے۔ لاٹھی مارنے کا لفظ یہ بتانے کے لئے حذف کر دیا کہ حکم کے بعد موسیٰؑ نے فوراً تعمیل کی جس کے ذکر کی ضرورت نہیں اور تعمیل حکم کرتے ہی چشمے بہ نکلے۔ ایک بات یہ بھی معلوم ہو گئی کہ موسیٰؑ کا لاٹھی مارنا بذات خود موثر نہ تھا (اسی لئے اس کو حذف کر دیا) کہ اس پر چشموں کا پھوٹ نکلنا موقوف ہوتا۔ انبجاس کا معنی ہے پھٹ جانا، لیکن ابو عمرو بن علاء نے اِنْۢبَجَسَتْ کا ترجمہ کیا ہے عرقت یعنی پسیج کر اور پھوٹ کر نکلے بارہ چشمے، ہر خاندان کے لئے ایک چشمہ۔ كُلُّ اُنَاسٍ یعنی ہر سبط نے، بارہ اسرائیلی قبائل میں سے ہر قبیلہ نے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

(اور سایہ کر دیا ہم نے ان پر ابر کا اور پہنچائیں ان کو ترنجبین اور بٹیریں (اور اجازت دے دی کہ) ہماری عطا کردہ نفیس چیزوں میں سے (جو دل چاہے) کھاؤ اور انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ تم لوگ اسی بستی میں جا کر رہو اور بستی میں سے جہاں چاہو (رہ کر) کھاؤ اور (داخلہ کے وقت) زبان سے حِطَّةٌ (توبہ ہے توبہ ہے) کہتے جاؤ اور جھکے جھکے دروازہ میں داخل ہو، ہم تمہاری (پچھلی) خطائیں معاف کر دیں گے اور جو لوگ نیک کام کریں گے ان کو مزید عنایت کریں گے)۔

كُلُوْا یعنی ہم نے کہا کھاؤ۔ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ عمومی مغفرت گناہ کے ساتھ نیکوکاروں سے مزید ثواب دینے کا وعدہ فرمایا۔ بغیر عطف کے اس جملہ کو ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی طرف سے یہ ثواب محض مہربانی ہے، ان احکام کی تعمیل کے عوض نہیں ہے جو ان کو دیئے گئے تھے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا
يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ (سو بدل دیا ان میں سے ظالموں نے اس لفظ کو جو ان سے کہا گیا تھا غیر لفظ کے ساتھ، اس پر ہم نے ان پر ایک آفت آسمان سے بھیجی اس وجہ سے کہ وہ حکم کو ضائع کرتے تھے)۔ آیات مذکورۂ بالا کی تفسیر سورۂ بقرہ میں مفصل گزر چکی ہے۔ سورۂ بقر کی آیات اور ان آیات میں فرق صرف یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں فَكُلُوْا، فاء کے ساتھ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سکونت قریہ سبب اکل ہے (وہاں جا کر رہو تو کھاؤ) اور اس جگہ فاء نہیں ہے۔ وہاں فاء کا ذکر کافی سمجھا گیا یا یہ کہ آیات کی رفتار خود بتا رہی ہے کہ سکونت سبب اکل ہے، کذا قال بیضاوی۔

میں کہتا ہوں کے سورۂ بقرہ میں اُدْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کھانا داخل ہونے کے بعد ہی ہوگا اس لئے فاء (تعقیبیہ) ذکر کر دی گئی اور اس جگہ اُسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ آیا ہے اس جگہ کلوا پر فا (تعقیبیہ) لانا مناسب نہیں کیونکہ سکونت کے ساتھ ہی کھانا بھی ہو سکتا ہے۔ دونوں فعل ایک وقت میں جمع ہو سکتے ہیں اس لئے واؤ جو محض جمعیت پر دلالت کرتا ہے ذکر کیا اور وَادْخُلُوْا سے پہلے قُوْلُوْا ذکر کرنے سے معنی پر کوئی جدید اثر نہیں پڑتا۔

وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾
(اور آپ ان یہودیوں سے اس بستی کے متعلق دریافت کریں جو سمندر بحر شور کے کنارے آباد تھی جب کہ وہ سنیچر کے دن کے احکام کے بارہ میں حد شرعی سے نکل رہے تھے یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ سنیچر کے دن سمندر کی مچھلیاں ظاہر ہو کر ان کے سامنے آجاتی تھیں اور سنیچر نہ ہوتا تھا تو نہ آتی تھیں ہم اسی طرح ان کی آزمائش کرتے تھے کیونکہ وہ (پہلے سے) بے حکمی کیا کرتے تھے)۔

وَاسْئَلْهُمْ یعنی اے محمد ﷺ یہودیوں سے دریافت کرو، یہودیوں سے اقرار کرانے اور کفر و معصیت پر تنبیہ کرنے کے لئے سوال کرنے کا حکم دیا، ایک غرض یہ بھی تھی کہ اس سوال کا معجزۂ رسول ہونا ظاہر ہو جائے یہودیوں کو اپنے واقعات کا علم تھا مکہ والے ان سے واقف نہ تھے۔ اب رسول اللہ ﷺ کی زبان سے ان واقعات کا اظہار معجزہ نہ تھا تو اور کیا تھا۔ عَنِ الْقَرْيَةِ یعنی بستی والوں کا واقعہ (مضاف محذوف ہے) حَاضِرَةَ الْبَحْرِ سمندر کے قریب۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس بستی کا نام ایلہ تھا یہ آبادی مدین اور طور کے درمیان سمندر کے کنارے پر تھی۔ ازہری نے کہا شام کی جھیل طبریہ کے کنارہ پر تھی۔ اِذْ يَعْدُوْنَ اس کی ضمیر اہل قریہ کی طرف راجع ہے۔ اَهْل کا لفظ اگرچہ مذکور نہیں (مگر مذکور کے حکم میں ہے) مطلب یہ ہے کہ وہ مچھلی کے شکار میں حد جواز سے آگے بڑھتے تھے (سنیچر کے دن بھی شکار کرتے تھے) اِذْ تَاْتِيْهِمْ اس ظرف کا تعلق يَعْدُوْنَ سے ہے یا یہ دوسرا بدل ہے۔ يَوْمَ سَبْتِهِمْ (سبت مصدر ہے) یعنی سنیچر کی تعظیم کا دن۔ عربی میں کہا جاتا ہے سَبَتَ الْيَهُوْدُ، یہودیوں نے سبت کی تعظیم کی یعنی عبادت کے لئے سنیچر کے دن تمام مشاغل ترک کر دیئے۔ اس قول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ آگے لَا يَسْبِتُوْنَ (بصیغۂ مضارع بصورت اشتقاق) آیا ہے (جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ يَوْمَ سَبْتِهِمْ میں بھی سبت کا مصدری معنی مراد ہے) بعض کے نزدیک سبتہم میں سبت سے سنیچر کا دن مراد ہے۔ اس صورت میں سبت کو مضاف کی شکل میں ذکر کرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ سنیچر کے احکام کی خصوصیت صرف یہودیوں کے ساتھ ہے اس لئے سنیچر صرف یہودیوں کا ہوا۔

شُرَّعًا یہ شارع کے جمع ہے یعنی پانی کی سطح پر بکثرت جمع ہونے والیاں۔ شرع قریب ہو گیا اوپر آگیا۔ ضحاک نے شُرَّعًا کا ترجمہ کیا ہے پے در پے متواتر۔ روایت میں آیا ہے کہ سنیچر کے دن مچھلیاں پانی کے اوپر بڑے سفید دنبوں یا مینڈھوں کی طرح آجاتی تھیں۔

يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ اور جس روز وہ سنیچر نہیں مناتے تھے (یعنی سنیچر نہ ہوتا تھا) كَذٰلِكَ یعنی سنیچر کے دن جیسی حرکت وہ

کرتے تھے ویسی ہی ہم ان کی جانچ کرتے تھے یا یہ مطلب ہے کہ ان کی نافرمانی کی وجہ سے ہم ان کی جانچ اس سخت امتحان کی صورت میں کرتے تھے۔ روایت میں آیا ہے کہ شیطان نے ان کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ اللہ نے سنیچر کے دن شکار کرنے سے منع نہیں کیا ہے کھانے سے منع کیا ہے اس لئے وہ شکار کرنے لگے یا یہ وسوسہ پیدا کیا کہ مچھلیاں پکڑنے کی ممانعت کی ہے لہٰذا انہوں نے لب ساحل بڑے بڑے حوض کھود لئے جن کے اندر سمندر سے پانی کے ساتھ سنیچر کے دن مچھلیاں آجاتی تھیں اور اتوار کے دن لوگ ان کو پکڑ لیتے تھے ایسی حرکت بہت دنوں تک کرتے رہے پھر سنیچر کے دن بھی شکار کرنے کی جرأت کرنے لگے اور بولے ہمارے خیال میں اب سنیچر کے دن مچھلیاں پکڑنا بھی ہمارے لئے حلال کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس خیال کے بعد وہ سنیچر کے دن مچھلیاں پکڑنے بھی لگے اور خرید فروخت بھی کرنے لگے اور کھانے بھی لگے۔ ایک تہائی آدمی تو اس نافرمانی میں مبتلا ہو گئے مگر ایک تہائی آدمیوں نے ان کو روکا اور باز داشت کی باقی ایک تہائی نے نہ تو جرم میں شرکت کی نہ ممانعت کی، خاموش رہے۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ اور (اس وقت کا حال دریافت کرو) جب کہ ان میں سے ایک جماعت نے (اپنے ساتھیوں سے) کہا تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کئے جاتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہی ہے یا سخت عذاب دینے والا ہے انہوں نے جواب دیا تمہارے رب کے سامنے عذر پیش کرنے کے لئے اور اس لئے بھی کہ شاید یہ پرہیز گار ہو جائیں)۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ یعنی خاموش رہنے والے گروہ نے نصیحت کرنے اور (سنیچر کے دن مچھلیاں پکڑنے سے) روکنے والے گروہ سے کہا۔ اَللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ یعنی جن کو اللہ دنیا میں ہلاک کرنے والا ہے یا آخرت میں سخت سزا دینے والا ہے۔ قَالُوْا نصیحت کرنے والوں نے کہا۔ مَعْذِرَةً یعنی اس لئے ہم نصیحت کرتے ہیں کہ ہماری طرف سے باز داشت میں کوتاہی نہ ہونے پائے۔ اور اللہ کے سامنے ہم عذر پیش کر سکیں۔ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اور شاید یہ لوگ باز ہی آجائیں (ہم ناامید نہیں ہیں) ناامیدی تو ہلاکت کے بعد ہی ہو گی۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَـئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـئِيْنَ ﴿۱۶۶﴾

(آخر جو بات ان کو سمجھائی جاتی تھی جب وہ اس کے تارک ہی رہے (یعنی نصیحت نہ مانی) تو ہم نے بری بات سے روکنے والوں کو تو بچا لیا اور جو لوگ بے جا حرکت کرتے تھے ان کی نافرمانی کی پاداش میں ان کو سخت عذاب میں پکڑ لیا یعنی جب وہ اس کام میں حد سے نکل گئے جس سے ان کو روکا گیا تھا تو ہم نے (براہ قہر) ان کو کہہ دیا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ (وہ ذلیل بندر ہو گئے)۔

فَلَمَّا نَسُوْا پھر جب نافرمان فرقہ، واعظ و صالح فرقہ کی نصیحت بھول گیا یعنی نصیحت کا تارک رہا، سمجھانے پر عمل نہ کیا۔ اَلَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ تو نصیحت کرنے والے نیکوکار فرقہ کو ہم نے ہلاکت سے بچا لیا۔

وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ اور نافرمان گروہ کو سخت عذاب میں گرفتار کر لیا۔ بَئِيْسٍ بروزن شَدِيْدٍ بمعنی شدید بؤس، باسا شدید ہو گیا (باب نصر)۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا میں سن رہا ہوں کہ اللہ نے اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ تو فرمادیا (یعنی بری باتوں سے روکنے والوں کے بچانے کی اور ظالموں کے گرفتار عذاب ہونے کی تو صراحت فرمادی) مگر معلوم نہیں خاموش رہنے والے (نیکوکار) گروہ کا کیا ہوا۔ عکرمہ نے کہا، میں نے عرض کیا۔ حضرت پر میری جان قربان کیا آپ نے ملاحظہ نہ فرمایا کہ اس خاموش رہنے والے گروہ نے ظالموں کی حرکت سے اپنی نفرت اور بیزاری کا اظہار کر دیا اور ان کے عمل کو برا قرار دیا اور نصیحت کرنے والوں سے کہہ دیا لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ ایسے لوگوں کو

کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے۔ ان کے متعلق اللہ نے اگرچہ یہ نہیں فرمایا کہ میں نے ان کو بچالیا مگر یہ بھی نہیں فرمایا کہ میں نے ان کو ہلاک کر دیا۔ حضرت ابن عباسؓ کو میری یہ بات پسند آئی اور مجھے دو چادریں پہنانے کا حکم دے دیا یعنی پورا خلعت بطور انعام عنایت فرمایا اور فرمایا خاموش رہنے والے گروہ نے (یقیناً) نجات پائی، رواہ الحاکم۔

یمان بن رباب نے کہا دونوں گروہوں نے نجات پائی اس گروہ نے بھی جس نے لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَانِ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ کہا تھا اور ان لوگوں نے جنہوں نے مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ کہا تھا اور مچھلیاں پکڑنے والوں کو اللہ نے غارت کر دیا۔ یہ قول حسن اور مجاہد کا ہے۔ ابن زید نے کہا صرف روکنے اور باز داشت کرنے والے گروہ نے نجات پائی۔ باقی دونوں گروہ ہلاک ہو گئے۔ نھی عن المنکر کو ترک کرنے کے سلسلہ میں یہ سخت ترین آیت ہے۔ فَلَمَّا عَتَوْا یعنی گناہ گار مجرم گروہ ممنوع کے ترک کی حد سے بڑھ گیا۔ عَنْ مَّا نُهُوْا میں مضاف محذوف ہے یعنی عَنْ تَرْكِ مَا نُهُوْا۔

خٰسِئِيْنَ دور (یعنی پھٹکار والے ذلیل) یہ امر (ایجاب عمل کے لئے نہیں ہے کیونکہ عمل کرنا اور بندر بن جانا ان کے اختیار میں نہ تھا بلکہ) تکوین اور تسخیر کے لئے ہے (یعنی تم کو ہونا پڑے گا بندر ذلیل) ظاہر کلام بتا رہا ہے کہ اللہ نے پہلے ان کو کوئی سخت سزا دی لیکن اس پر بھی انہوں نے سرکشی جاری رکھی اور باز نہ آئے تو اللہ نے ان کی صورتیں مسخ کر دیں یہ بھی جائز ہے کہ آیت فَلَمَّا عَتَوْا آیت فَلَمَّا نَسُوْا کی تاکید اور تفصیل ہو (ہم نے ترجمہ اسی شق کے مطابق کیا ہے)۔

بعض اہل تفسیر کا قول ہے کہ وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ سے مراد یہ ہے کہ نیکوکار فرقہ میں سے بعض نے بعض سے کہا تم کیوں ان کو نصیحت کرتے ہو یعنی بطور افسوس انہوں نے وعظ کے بے سوز ہونے کا اظہار کیا اور آپس میں ہی انہوں نے جواب دیا اور کہا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ۔

یا یوں کہو کہ (وعظ کرتے کرتے) جو لوگ نصیحت کرنے سے رک گئے تھے انہوں نے ان لوگوں سے جو نصیحت کرنے سے نہیں رکے تھے (برابر وعظ کئے جا رہے تھے) کہا لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا اِۨللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ۔ بعض اہل علم کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ بطور استہزاء اور مذاق بناتے ہوئے خطاکار لوگوں نے نصیحت کرنے والے گروہ سے کہا کہ جب تمہارے خیال میں اللہ ہم کو ہلاک کرنے والا ہی ہے تو پھر ایسے لوگوں کو تم نصیحت کیوں کرتے ہو۔ اس کے جواب میں نیک گروہ نے کہا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ مگر لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ میں غائب کی ضمیر اس مطلب کو غلط قرار دے رہی ہے اگر یہی مطلب تھا تو لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ مخاطب کی ضمیر کے ساتھ کہنا چاہئے تھا (ممکن ہے کہ گناہ گار گروہ نے جب اپنے کو بصیغہ غائب ذکر کیا اور قَوْمَا اِۨللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ کہا تو نصیحت کرنے والوں نے بھی اسی رعایت سے مخاطب کو بصیغہ غائب ذکر کر دیا، مترجم)۔

روایت میں آیا ہے کہ جب واعظ نا امید ہو گئے تو خطاکاروں کے ساتھ رہنا بھی ان کو گوارا نہ ہوا اور انہوں نے بستی کو تقسیم کر لیا مسلمانوں کی آبادی کا دروازہ الگ ہو گیا اور مجرموں کی آبادی کا دروازہ الگ ہو گیا اور دونوں آبادیوں میں دیوار حائل ہو گئی اور حضرت داؤد نے مجرموں کے لئے بد دعا کی ایک روز صبح کو جب نیکوکار گروہ اٹھا اور بدکاروں میں سے کوئی گھر سے نہیں نکلا تو انہوں نے کہا آج ضرور ان پر کوئی افتاد ہوئی ہے، چنانچہ گھروں کے اندر جا کر دیکھا تو سب بندر نظر آئے یہ لوگ اپنے قرابتداروں کو نہ پہچان سکے۔ مگر بندروں نے ان کو پہچان لیا اور پاس آ کر ان کے کپڑے سونگھنے لگے، روتے تھے اور ان کے آس پاس لوٹتے پھرتے تھے۔ نیک گروہ والے ان سے کہنے لگے کیا ہم تم کو منع نہیں کرتے تھے بندر جواب میں میں سر ہلا دیتے تھے۔ تین روز تک اسی حال میں رہے لوگ ان کو دیکھتے تھے اور تین روز کے بعد سب مر گئے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ښ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۶۷ (اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے جب آپ کے رب نے بتا دیا تھا کہ وہ ان (یہودیوں) پر روز قیامت کے قریب تک ایسے لوگوں کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سخت دکھ پہنچائیں گے بلاشبہ آپ کا رب واقعی جلد سزا دینے والا ہے اور بلاشبہ وہ واقعی غفور رحیم ہے)۔ وَاِذْ تَاَذَّنَ، تَاَذَّنَ ماضی باب تفعل، اِذْنٌ سے مشتق ہے اس

کا معنی ہے اٹل ارادہ کیونکہ کسی کام کا عزم کرنے والا اپنے نفس کو اس کام کی محکم اطلاع دے دیتا ہے چیلنج کر دیتا ہے اسی لئے فعل قسم عَلِمَ اللّٰهُ، شَهِدَ اللّٰهُ وغیرہ کے قائم مقام اس کا استعمال کیا جاتا ہے اور جواب قسم کی طرح اس کا جواب ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے تَاَذَّنَ کا ترجمہ قال (فرمایا) کیا ہے اور مجاہدؒ نے امر (امر کیا) اور عطاء نے حکم (حکم دیا) لَيَبْعَثَنَّ آخری تینوں اقوال پر جواب قسم محذوف ہوگا یعنی خدا کی قسم اللہ روز قیامت تک یہودیوں پر مسلط کرتا رہے گا۔ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ سوء عذاب سے مراد ہے قتل کرنا قید کرنا جزیہ لینا چنانچہ اول اللہ نے حضرت سلیمانؑ کو یہودیوں پر مسلط کیا، پھر بخت نصر کو، بخت نصر نے ان کی بستیوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی، جوانوں کو قتل کیا، عورتوں اور بچوں کو باندی غلام بنایا جو باقی رہے تھے ان پر ٹیکس مقرر کیا اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک مجوسیوں کو وہ ٹیکس دیتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ کو قتل کرایا ان کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کیا اور بنی نضیر و قینقاع کو مدینہ سے نکال دیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے خیبر اور فدک سے بھی ان کو نکال باہر کر دیا اور اللہ نے قیامت تک کے لئے حکم دے دیا کہ یہودیوں سے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے جب تک ذلت کے ساتھ یہ جزیہ ادا نہ کریں۔

لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ یعنی نافرمانوں کو جلد سزا دینے والا ہے اسی لئے دنیا میں ہی اس نے سزا دے دی وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ لیکن ان میں سے جو شخص توبہ کرلے اور ایمان لے آئے اس کو اللہ معاف کرنے والا مہربان بھی ہے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۫ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۶۸﴾ (اور ہم نے دنیا میں ان کی متفرق جماعتیں کر دیں، بعض ان میں نیک تھے اور بعض ان میں اور طرح کے بھی تھے اور ہم ان کو خوش حالیوں (صحت، دولت حکومت اور بدحالیوں (بیماری، مفلسی، محکومی) سے آزماتے رہے کہ شاید باز آجائیں۔

قَطَّعْنٰهُمْ یعنی ہم نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے فرقے فرقے بنا دیئے، اس سے ان کی طاقت ایسی منتشر ہوگئی کہ آئندہ کبھی باہم اتفاق نہ ہوگا اور نہ اجتماعی قوت حاصل ہوگی۔ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ ان میں سے کچھ صالح ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ نے فرمایا اَلصَّالِحُوْنَ سے مراد ہیں وہ یہودی جو مسلمان ہو گئے۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہر کلام کا تقاضا ہے کہ وہ لوگ مراد ہوں کہ شریعت موسوی کے منسوخ ہونے سے پہلے حضرت موسیٰؑ کی شریعت پر تھے کیونکہ آگے فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ آیا ہے، یہ قرینہ ہے اس بات کا کہ اَلصّٰلِحُوْنَ سے مراد وہ یہود ہیں جو (حضرت عیسیٰؑ سے پہلے) حضرت موسیٰؑ کے صحیح دین پر تھے۔

وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ اور کچھ لوگ ان سے گرے ہوئے تھے یعنی درجۂ صلاح پر فائز نہ تھے یہ لوگ (حضرت ابن عباسؓ کے قول پر) وہ یہودی ہیں جو رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لائے یا (ظاہر کلام کے اعتبار سے) وہ یہودی ہیں جو شریعت موسوی کے منسوخ ہونے سے پہلے اس کو مانتے تھے مگر بد اعمال تھے یا وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا انکار کیا۔

وَبَلَوْنٰهُمْ اور ہم نے ان کو جانچا بِالْحَسَنٰتِ نعمتیں دے کر وَالسَّيِّاٰتِ اور تکلیفیں دے کر لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ تاکہ وہ متنبہ ہو کر کفر و بدکاری سے لوٹ جائیں، نعمت کے وقت اللہ کا شکر ادا کریں اور تکلیف کے وقت توبہ کریں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

(پھر ان کے بعد ان کے جانشین ایسے لوگ ہوئے جنہوں نے ان سے کتاب توریت کو حاصل کیا یہ لوگ دنیاء دنی کے حقیر متاع کو حکم کتاب کے عوض) لے لیتے ہیں اور (اس گناہ کو حقیر سمجھ کر) کہتے ہیں کہ ہماری ضرور مغفرت ہو جائے گی حالانکہ اگر

ان کے پاس ویسا ہی مال و متاع پھر آجائے تو اس کو بھی لے لیتے ہیں کیا ان سے توریت کے اس مضمون کا عہد نہیں لیا گیا تھا کہ خدا کی طرف بجز سچی بات کے اور کسی بات کی نسبت نہ کریں (یعنی خود تراشیدہ بات کی نسبت اللہ کی طرف نہ کریں بلکہ جو اللہ کا حکم ہے اسی کی نسبت اللہ کی طرف کریں) اور کتاب میں جو کچھ تھا اس کو انہوں نے پڑھ بھی لیا۔ اور آخرت والا گھر (اس دنیا سے) ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو (نافرمانی سے) بچتے ہیں، پھر اے یہود یو تم یہ بات کیوں نہیں سمجھتے۔

مِنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی جن لوگوں کا ذکر پہلے کر دیا گیا ان کے بعد جانشین ہوئے۔ خَلْفٌ خلف ایک دور کے بعد دوسرا آنے والا دور، کذافی القاموس۔ ابو حاتم نے کہا خَلْفٌ بسکون لام اولاد۔ اس میں واحد و جمع برابر ہیں اور خَلَف کے معنی ہیں قائم مقام خواہ اولاد ہو یا غیر۔ ابن اعرابی کا قول ہے خَلَفٌ بفتح لام اچھا جانشین اور بسکون لام برا جانشین۔ نضر بن شمیل کا قول ہے کہ برے جانشین کے لئے خَلَف بفتح لام بھی آتا ہے اور بسکون لام بھی اور اچھے جانشین کے لئے صرف لام کے فتح کے ساتھ آتا ہے۔ محمد بن جریر کا قول ہے کہ مدح کے لئے اکثر بفتح لام آتا ہے اور ذم کے لئے بسکون لام لیکن کبھی قلت کے ساتھ اس کے برعکس بھی استعمال ہوا ہے۔ بیضاوی نے لکھا خَلْف مصدر ہے اور صفت (اسم فاعل یا اسم مفعول) کے معنی میں مستعمل ہے مصدر ہونے کی وجہ سے ہی اس کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی۔ بعض اہل علم اس کو جمع کہتے ہیں۔ یہاں خلف سے وہ یہودی مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے۔ وَرِثُوا الْكِتٰبَ یعنی باپ دادا سے توریت ان کو ملی، اسلاف سے منتقل ہو کر ان کے پاس پہنچی جس کو وہ خود پڑھتے اور اس کا مطلب سمجھتے ہیں۔ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى یعنی اس ادنیٰ عالم کا حقیر سامان۔ عالم ادنیٰ سے مراد ہے دنیا۔ لفظ اَدْنٰی، دنو قرب سے مشتق ہے یا دنائت (حقارت) سے۔

ہر سامان کو سوائے سونے چاندی (یعنی روپیہ پیسہ، کرنسی، سکہ) کے متاع کہا جاتا ہے یا ہر مال کو متاع کہتے ہیں خواہ کم ہو یا زیادہ، سامان ہو یا روپیہ، کرنسی۔ اس جگہ یہی معنی مراد ہے۔ بعض علماء کا قول ہے عرض کا معنی ہے ناپائیدار۔ باقی نہ رہنے کی چیز جس چیز کا بذات خود (بغیر کسی جوہر کے) قیام نہ ہو۔ متکلمین کے نزدیک اس کو عرض اسی لغوی مناسبت کی وجہ سے کہا جاتا ہے جیسے رنگ کسی طرح کا ہو، بو اچھی ہو یا بری وغیرہ اسی لئے دنیا کو عرض حاضر کہا جاتا ہے یعنی ناپائیدار۔ یہاں عرض سے مراد ہے وہ مال جو یہودی عالم جاہل لوگوں سے لے کر کھاتے اور شرعی فیصلہ کو توڑنے موڑنے کی رشوتیں لیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے وہ اوصاف امتیازی جو توریت میں مذکور تھے یہودی عالموں نے اسی ڈر سے چھپا دیئے تھے اور اللہ کے کلام میں (لفظی اور معنوی) تحریف اسی خوف سے کر دی تھی کہ کہیں ان کی روٹی میں فرق نہ آجائے اور سیادت قومی نہ جاتی رہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا یعنی توبہ نہیں کرتے گناہ پر جمے رہتے ہیں اور اس کے باوجود مغفرت کا یقین رکھتے ہیں۔ اور یہ بہت بری حرکت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ دانشمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو مطیع رکھا اور مرنے کے بعد کے لئے کام کئے اور بیوقوف وہ ہے جس نے نفس کی خواہشات کی اطاعت کی اور اللہ سے (بے بنیاد جھوٹی) تمنائیں رکھیں۔ رواہ احمد و الترمذی و ابن ماجہ والحاکم والبغوی عن شداد بن اوس۔

وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ یہ يَقُوْلُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ پر اصرار کرتے ہوئے، دوسری مرتبہ گناہ کا ارادہ رکھتے ہوئے بغیر توبہ کئے مغفرت کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ سدی کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل میں جب کوئی قاضی ہوتا تھا اور اہل معاملہ اس سے کسی مقدمہ کا فیصلہ طلب کرتے تھے تو وہ بغیر رشوت لئے فیصلہ نہیں دیتا تھا، جب اس سے رشوت لینے کی وجہ دریافت کی جاتی تو کہتا یہ (حقیر بات ہے اس کو) اللہ معاف کر دے گا فریق مخالف اس پر نکتہ چینی کرتا تھا پھر جب وہ قاضی مر جاتا یا معزول کر دیا جاتا تھا اور نکتہ چیں جماعت میں سے کوئی فرد قاضی بنا دیا جاتا تھا تو وہ بھی رشوت لیتا تھا آیت وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ کا یہی مطلب ہے یعنی نکتہ چیں فریق مخالف کو اگر رشوت کا مال ہاتھ لگ جاتا تھا تو وہ بھی نہیں چھوڑتے تھے۔

مِيْثَاقُ الْكِتٰبِ یعنی وہ عہد جو توریت میں مذکور ہے کہ اللہ کی طرف کسی غلط بات کی نسبت نہیں کریں گے اور یہ بات

غلط ہے توریت میں یہ نہیں بیان کیا گیا کہ گناہ پر جمار ہنے کے باوجود مغفرت کردی جائے گی۔

وَدَرَسُوْا مَافِيْهِ اس کا عطف اَلَمْ يُؤْخَذْ پر ہے یا وَرِثُوْا پر۔ درس کتاب سے مراد ہے پڑھنا اور بار بار غور کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کو جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ گناہ ہے۔ يَتَّقُوْنَ یعنی جو لوگ اللہ سے ڈرتے اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں، ان کے لئے آخرت دنیا کے اس حقیر مال سے بہتر ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ اس جملہ کا عطف محذوف جملہ پر ہے اصل کلام اس طرح تھا کیا تم برائی کو پسند کرتے ہو اور بھلائی کو چھوڑتے ہو اور سمجھتے نہیں (کہ شر کو اختیار کرنا اور خیر کو ترک کرنا براہے) یعنی تمہارے پاس عقل ہی نہیں ہے (ہم نے "سمجھتے نہیں" کے بعد قوسین کے درمیان کچھ عبارت بڑھادی ہے جو سمجھتے نہیں کا مفعول ہے، لیکن حضرت مؤلف نے جو یعنی کے بعد "تمہارے پاس عقل ہی نہیں ہے" عبارت لکھی ہے اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کا کوئی خاص مفعول محذوف نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ تم اہل عقل ہی نہیں ہو) کیونکہ عقل کا تقاضا تو یہ ہے شر کو ترک اور خیر کو اختیار کیا جائے بلکہ دو خیروں میں بھی جو بہترین ہو اس کو لیا جائے اور تم ادنیٰ کو اعلیٰ کے مقابلہ میں لیتے ہو۔ وہ زوال پذیر فائدہ جس کا نتیجہ دوامی عذاب ہے اختیار کرتے ہو اور لازوال ابدی نعمت کو ترک کرتے ہو۔

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ (اور (ان میں سے) جو لوگ کتاب کے پابند ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں ہم ان اہل اصلاح کا ثواب ضائع نہیں کریں گے)

مجاہد نے کہا ان سے مراد حضرت عبد اللہ بن سلام اور ان کے ساتھی دوسرے مؤمنین اہل کتاب ہیں جو توریت پر بھی ایمان لائے تھے اور توریت میں انہوں نے کسی طرح کی تحریف نہیں کی تھی اور نہ اس کے احکام کو بگاڑ کر کمائی کا ذریعہ بنایا تھا بلکہ خالص حکم توریت پر عمل کرتے تھے، پھر حضور اقدس ﷺ کی بعثت ہوئی تو آپ پر بھی ایمان لائے اور آپ کا اتباع کیا۔ عطاء نے کہا ان سے مراد امت محمدیہ ہے۔

اِنَّا لَا نُضِيْعُ یعنی ان میں سے اہل اصلاح کا ثواب ہم ضائع نہیں کریں گے۔ یا یوں کہا جائے کہ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَهُمْ کی جگہ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے کہا کہ ان کا مصلح ہونا اجر کو ضائع کرنے سے مانع ہے (گویا لفظ مُصْلِحِيْنَ علت حکم کی طرف اشارہ کر رہا ہے)۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ (اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر چھت کی طرح ان کے اوپر معلق کر دیا تھا اور ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ ان پر گرنے ہی والا ہے اور (ان سے کہہ دیا تھا کہ) مضبوطی کے ساتھ جلد قبول کرو اس کتاب کو جو ہم نے تم کو دی ہے اور جو احکام اس میں ہیں ان کو یاد رکھو اس امید پر کہ تم متقی ہو جاؤ گے) گناہوں سے اور عذاب سے بچ جاؤ گے۔

ع ۲۱
۱۱

وَاِذْ نَتَقْنَا، اُذْكُرُوْا محذوف ہے اذ کا اسی محذوف سے تعلق ہے۔ نَتَقَ کا لغوی معنی ہے کھینچنا یہاں مراد ہے اکھاڑ کر اوپر کو اٹھانا۔ فَوْقَهُمْ بنی اسرائیل کے اوپر۔ بنی اسرائیل نے توریت کے احکام کو شدت و سختی کی وجہ سے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا تو اللہ نے پہاڑ کو زمین سے اکھاڑ کر ان کے سروں کے اوپر معلق کر دیا (تاکہ ڈر کر) قبول کرلیں) كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ، ظلة چھت، سائبان۔ ظَنُّوْا یعنی ان کو یقین ہو گیا تھا۔ یقین کو لفظ ظن سے تعبیر کیا کیونکہ اس یقین کا نتیجہ واقع نہ ہوا تھا (تو گویا یقین صرف گمان ہو کر رہ گیا) خُذُوْا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ توریت کے احکام کو قبول کرو ورنہ پہاڑ تمہارے اوپر گرا دیا جائے گا۔ بِقُوَّةٍ کوشش کے ساتھ اور احکام توریت کو برداشت کرنے کے پختہ ارادہ کے ساتھ۔ یہ خُذُوْا کی ضمیر سے حال ہے۔ واذکروا اور یاد رکھو یعنی ان پر عمل کرو اور بھولی بسری چیز کی طرح ترک نہ کر دو۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ اس امید پر کہ برے اعمال بد عادات اور گناہوں سے تم بچ جاؤ گے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ

قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

اور جب آپ کے رب نے (آدمؑ اور) اولاد آدم کی پشت سے ان کی نسل کو نکالا اور ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے جواب دیا کیوں نہیں ہم سب (اس واقعہ کے) گواہ بنتے ہیں (یہ اس لئے کیا) تاکہ تم لوگ قیامت کے دن یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس توحید سے بے خبر تھے یا یوں کہنے لگو کہ اصل شرک تو ہمارے بڑوں نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد ان کی نسل میں ہوئے تو کیا ان غلط راہ نکالنے والوں کے فعل پر تو ہم کو ہلاکت میں ڈالے دیتا ہے)۔

مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ کلام میں اختصار ہے اصل کلام یوں تھا مِنْ اٰدَمَ وَ بَنِیْ اٰدَمَ آدم اور اولاد آدم سے۔ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ یہ بنی آدم سے بدل ہے یعنی ہم نے آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا۔ وَاَشْهَدَهُمْ یعنی بعض کو بعض کا شاہد بنایا ایک پر دوسرے کو گواہ بنادیا اور ان سے کہا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ، قَالُوْا بَلٰى۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے آدم کو پیدا کرنے کے بعد ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا تو جو انسان ان کی نسل سے قیامت تک پیدا ہونے والا تھا وہ برآمد ہو گیا اور اللہ نے ہر انسان کی دونوں آنکھوں کے درمیان نور کی ایک چمک پیدا کر دی، پھر سب کو آدمؑ کے روبرو کیا، آدمؑ نے عرض کیا اے میرے رب یہ کون ہیں، اللہ نے فرمایا یہ تیری اولاد ہیں۔ آدم نے ان میں سے ایک شخص کی دونوں آنکھوں کے درمیان چمک دیکھی تو ان کو بہت اچھی معلوم ہوئی اور عرض کیا پروردگار یہ کون ہے، اللہ نے فرمایا یہ داؤد ہے، آدم نے عرض کیا پروردگار تو نے اس کی عمر کتنی مقرر کی ہے، اللہ نے فرمایا ساٹھ سال، عرض کیا پروردگار میری عمر میں سے اس کو چالیس برس اور عطا فرمادے، چنانچہ حضرت آدمؑ کی عمر جب پوری ہو گئی صرف وہی چالیس برس رہ گئے، جو انہوں نے حضرت داؤد کو دے دیئے تھے تو موت کا فرشتہ آگیا، آدمؑ نے کہا ابھی تو میری عمر کے چالیس برس باقی ہیں، ملک الموت نے کہا کیا آپ نے اپنے بیٹے داؤد کو چالیس برس نہیں دیئے تھے، آدمؑ نے انکار کیا اسی لئے ان کی اولاد بھی (کئے ہوئے وعدہ کا) انکار کرتی ہے اور آدمؑ نے اللہ کے حکم کو بھول کر ممنوعہ درخت کا پھل کھالیا تھا اسی لئے ان کی اولاد بھولتی ہے اور آدمؑ نے خطا کی تھی اسی لئے ان کی اولاد خطا کرتی ہے۔

ترمذی نے اس حدیث کو حضرت ابو درداءؓ کی روایت سے اس طرح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے آدمؑ کو جس وقت پیدا کیا تو ان کے دائیں شانہ پر ہاتھ مارا جس سے چھوٹی چینٹیوں کی طرح ان کی ساری گوری نسل نکل پڑی اور بائیں شانہ پر ہاتھ مارا تو کوئلہ کی طرح سیاہ نسل نکل پڑی۔ دائیں طرف والوں کے متعلق اللہ نے فرمایا یہ جنت کی طرف (جانے والے) ہیں اور مجھے (ان کی اطاعت کی) پروا نہیں اور بائیں شانہ والوں کے متعلق فرمایا یہ دوزخ کی طرف (جانیوالے) ہیں اور مجھے (ان کی نافرمانی کی) پروا نہیں، رواہ احمد۔ مقاتل اور دوسرے اہل تفسیر نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔ مقاتل کی روایت کے آخر میں اتنا زائد بھی ہے کہ اللہ نے پھر سب کو آدم کی پشت میں لوٹا دیا جب تک تمام میثاق ازل والے باپوں کی پشت اور ماؤں کے پیٹ سے برآمد نہ ہو جائیں گے، قبروں والے قبروں کے اندر بند رہیں گے (قیامت نہ آئے گی اور حشر نہ ہوگا) اسی میثاق ازل کو توڑنے والوں کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ۔

مسلم بن یسار کی روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ سے آیت وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْٓ اٰدَمَ الخ کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا میں نے خود سنا کہ جب رسول اللہ ﷺ سے اس کا مفہوم دریافت کیا گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا اللہ نے آدم کو پیدا کرنے کے بعد اپنا دایاں ہاتھ ان کی پشت پر پھیرا تو اس سے ان کی کچھ اولاد نکل پڑی اور اللہ نے فرمایا ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ اہل جنت کے عمل کریں گے، پھر آدم کی پشت پر بایاں ہاتھ پھیر تو (کچھ اور) ان کی اولاد برآمد ہو گئی اور اللہ نے فرمایا ان کو میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ دوزخیوں کے عمل کریں گے۔ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ پھر عمل کی کیا ضرورت ہے، فرمایا اللہ نے جس بندہ کو جنت کے لئے پیدا کیا ہے اس سے جنتیوں کے اعمال کراتا ہے یہاں تک کہ وہ

مرنے کے وقت بھی اہل جنت کا کوئی عمل کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے اور جب کسی بندہ کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے دزخیوں کے کام کراتا ہے یہاں تک کہ وہ مرنے کے وقت بھی دوزخیوں کا کوئی کام کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کو دوزخ میں لے جاتا ہے۔ رواہ مالک وابوداؤد والترمذی واحمد فی مسند والبخاری فی التاریخ وابن حبان والحاکم والبیہقی۔ ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ چونکہ مسلم بن یسار کے درمیان ایک اور راوی کا ذکر کیا ہے جس کا نام نہیں بیان کیا۔

حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے آدمؑ کی پشت سے اولاد کو نکال کر ان سے میثاق نعمان یعنی عرفات میں لیا تھا جتنی نسل اس کو آئندہ پیدا کرنی تھی سب کو آدم کو پشت سے بر آمد کیا اور اپنے سامنے چھوٹی چیونٹیوں کی طرح ان کو بکھیر کر روبرو ان سے فرمایا کہ میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیونکہ نہیں ہم اس کے شاہد ہیں الی آخر الآیہ۔ رواہ احمد والنسائی والحاکم۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔ ابن جریر نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی آیت کے بیان میں فرمایا آدم کی پشت سے اللہ نے آدمؑ کی نسل کو اس طرح لے لیا جیسے کنگھی سے سر کی جوئیں لے لی جاتی ہیں۔ پھر فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے جواب دیا کیونکہ نہیں۔ فرشتے بولے ہم اس اقرار کے شاہد ہیں۔ بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ملک ہند میں دہناء کے مقام پر جہاں حضرت آدمؑ اترے تھے اللہ نے آدم کو بر آمد کیا اور ان سے (ربوبیت کا) اقرار لیا تھا۔ کلبی کا قول ہے کہ مقام میثاق مکہ اور طائف کے درمیان تھا۔ سدیؒ کا بیان ہے کہ پیدا ہونے کے بعد حضرت آدمؑ آسمان سے اترے بھی نہیں تھے کہ اللہ نے ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ان کی نسل کو بر آمد کیا تھا۔

حضرت ابیؓ بن کعب کا بیان ہے اللہ نے سب اولاد آدمؑ کو جمع کیا، پھر ان کی قسمیں جدا جدا چھانٹیں، پھر ان کو صورتیں عطا کیں، پھر ان کو گویا کیا چنانچہ سب نے کلام کیا، پھر ان سے عہد و میثاق لیا اور ان سے خود انہی پر اقرار طلب کیا اور فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں (سب نے کہا کیوں نہیں) اللہ نے فرمایا میں (تمہارے اس اقرار پر) ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو شاہد بناتا ہوں اور تمہارے باپ آدمؑ کو بھی گواہ بناتا ہوں، تاکہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہم کو تو اس توحید کا علم بھی نہ تھا، خوب سمجھ لو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں میرا کسی کو شریک نہ بنانا، میں تمہارے پاس اپنے پیغمبر بھیجوں گا جو تم کو میرے اس عہد میثاق کی یاد دہانی کریں گے اور میں تم پر اپنی کتابیں اتاروں گا، سب نے جواب دیا ہم شہادت دیتے ہیں کہ تو ہی بلاشک ہمارا رب ہے ہمارا معبود ہے تیرے سوا نہ ہمارا کوئی رب ہے نہ کوئی معبود۔ اس کے بعد ان کو حضرت آدمؑ کے سامنے لایا گیا حضرت آدم نے اوپر سے ان کا معائنہ کیا۔ مالدار، نادار، خوبصورت بدصورت سب ہی دکھائی دیئے، عرض کیا پروردگار تو نے اپنے بندوں کو یکساں کیوں نہیں کر دیا، اللہ نے فرمایا، میں چاہتا ہوں کہ میرا شکر ادا کیا جائے (امیر فقیر کو دیکھ کر شکر ادا کرے اور خوبصوت بدصورت کو دیکھ کر) حضرت آدمؑ نے اپنی اولاد میں انبیاء کو چراغوں کی طرح نورانی دیکھا انبیاء سے خاص طور پر رسالت و نبوت کے متعلق ایک میثاق علیحدہ لیا گیا اسی میثاق کی بابت اللہ نے فرمایا ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ سے ...... وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ تک۔ عیسیٰؑ بن مریم بھی انہی ارواح میں شامل تھے جن کو اللہ نے مریمؑ کی طرف بھیجا تھا۔ حضرت ابیؓ بن کعبؓ کا قول روایت میں آیا ہے کہ عیسیٰؑ مریمؑ کے منہ سے ان کے اندر داخل ہوئے، رواہ احمد۔

بعض روایات میں یہ الفاظ آئے ہیں کسی چیز کو میرا شریک نہ بنانا جو میرا شریک قرار دے گا اور مجھ پر ایمان نہیں لائے گا میں اس سے انتقام لوں گا اور سب نے اس کا اقرار کیا۔ اس جملہ کے بعد اتنا اور بھی آیا ہے کہ اللہ نے ان کی عمریں، رزق اور مصائب لکھ دیئے اور میں چاہتا ہوں کہ میرا شکر ادا کیا جائے اس کے بعد اس روایت میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ اللہ نے جب ان سے توحید کا اقرار لے لیا اور بعض کو بعض پر گواہ بنا لیا تو سب کو آدمؑ کی پشت کی طرف لوٹا دیا اب اس وقت تک قیامت بپا نہ ہو گی جب تک وہ تمام آدمی نہ پیدا ہو جائیں جن سے میثاق لیا گیا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ جب اللہ نے اولاد آدم کو آدمؑ کی پشت سے بر آمد کیا تو پھر وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ من

ظُهُوْرِهِمْ کا کیا معنی ہے (کیونکہ اس آیت میں اولاد آدم کی پشت سے بر آمد کرنے کا ذکر کیا ہے آدمؑ کی پشت سے نکالنے کا ذکر نہیں ہے) میں کہتا ہوں کہ آدم کی پشت سے بر آمد کرنے کا ذکر احادیث میں آیا ہے۔ بعض علماء نے مذکورہ بالا شبہ کا یہ جواب دیا ہے کہ اللہ نے اولاد آدمؑ میں سے ایک کو دوسرے کی پشت سے بر آمد کیا جیسا کہ دنیا میں ان کی پیدائش ہوتی ہے تو اب آدمؑ کی پشت سے بر آمد کرنے کے ذکر کی کوئی ضرورت نہ رہی کیونکہ سب آدمؑ ہی کی اولاد تھی لہٰذا سب کا خروج آدمؑ ہی کی پشت سے کیا گیا۔ اسی لئے آیت میں آدمؑ کی پشت کا ذکر نہیں کیا گیا۔

میں کہتا ہوں حدیث میں سب کا خروج آدم کی پشت سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ جب بعض لوگ بعض کی پشت میں تھے اور سب کے اصول آدمؑ کی پشت میں تھے تو سب آدمؑ کی پشت میں ہوئے لہٰذا آدمؑ کی پشت سے سب کا برامد ہونا صحیح ہو گیا یا یوں کہا جائے کہ حدیث میں جو لفظ آدمؑ آیا ہے اس سے مراد آدمؑ مع اولاد ہیں، اصل کو ذکر کرنے کے بعد شاخوں کے ذکر کی ضرورت نہیں اس لئے صرف آدم کا نام آگیا۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث میں حضرت آدمؑ کے دائیں بائیں شانہ پر ہاتھ مارنے اور گوری کالی نسل کے بر آمد ہونے کا ذکر آیا ہے۔ اس حدیث میں مراد یہ ہے کہ اللہ نے آدم کے شانہ پر یا ان کی اولاد میں سے بعض کے شانہ پر ہاتھ مارا۔

بغوی نے لکھا ہے اہل تفسیر کا قول ہے کہ اہل سعادت نے تو برضائے قلبی ربوبیت کا اقرار کیا تھا اور اہل شقاوت نے بکراہت خاطر منافقت کے ساتھ۔ آیت وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا کا یہی مطلب ہے۔

شَهِدْنَا ہم گواہی دیتے ہیں۔ سدی نے لکھا ہے یہ اللہ کا قول ہے (بندوں کا جواب بَلٰى پر ختم ہو گیا) اللہ نے اپنی طرف سے اور اپنے ملائکہ کی طرف سے فرمایا کہ ہم اس میثاق ازل کے شاہد ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ فقرہ بھی بندوں کے کلام کا جز ہے اور بَلٰى کے بعد شَهِدْنَا بھی بندوں نے ہی کہا تھا) جب اللہ نے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ فرمایا تو بندوں نے بَلٰى کہا اور جب ایک کو دوسرے کے اقرار کا شاہد بنایا تو سب نے شَهِدْنَا کہا۔ کلبی کا بیان ہے کہ یہ ملائکہ کا قول ہے کلام کا کچھ حصہ محذوف ہے۔ اصل کلام اس طرح تھا اولاد آدمؑ نے جب بلیٰ کہا تو اللہ نے فرشتوں سے فرمایا اس اقرار کے شاہد رہو فرشتوں نے عرض کیا ہم شاہد ہیں۔

اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یہ جملہ کلام سابق کی علت ہے گویا مفعول لہ ہے یعنی تم کو اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کہہ کر خطاب اس لئے کیا کہ قیامت کے دن تم کہیں یہ نہ کہنے لگو۔ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ہم اس اقرار یا اس میثاق سے بے خبر تھے۔ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ یعنی ہم ان کے بعد آئے تھے اور ان کے تابع تھے ہم نے تو ان کی پیروی کی تھی (مجرم تو ہمارے بڑے تھے) اَفَتُهْلِكُنَا کیا تو ہم کو عذاب دے گا سزا دے گا۔ الْمُبْطِلُوْنَ یعنی مشرک اسلاف۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن کہیں تم اپنی بے خبری کو یا تقلید اسلاف کو عذر میں نہ پیش کرنے لگو۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾ (اور ہم آیات کو اسی طور پر صاف صاف بیان کیا کرتے ہیں (تا کہ وہ غور کریں) اور تا کہ وہ باز آجائیں)۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ یعنی ہم یوں ہی آیات کو واضح طور پر کھول کر بیان کرتے ہیں تا کہ بندے ان پر غور کریں اور بھولے ہوئے عہد کو یاد رکھیں اور کفر سے توحید کی طرف لوٹ آئیں۔ اس مطلب پر لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ کا عطف ایک محذوف جملہ پر ہو گا یعنی لعلهم يتدبرون ويتذكرون مانسوا ويرجعون۔

جمہور مفسرین اور علمائے سلف نے احادیث کی روشنی میں آیات مذکورہ کا مطلب حسب تفسیر مندرجہ بالا بیان کیا ہے۔

بیضاوی اور بیضاوی کے مقلدوں نے (جمہور سلف کے خلاف) آیات مذکور کی تفسیر اس طرح کی ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ اور جب آپ کے رب نے لیا یعنی آدم اور نسل آدم کی پشت سے مختلف زمانوں میں انسانوں کو ایک کے بعد ایک کو پیدا کیا۔ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ یعنی دلائل ربوبیت قائم کر دیں اور لوگوں کے دماغوں کے اندر وہ قوت

فہم پیدا کردی جو اقرار توحید کی دعوت دے رہی ہے گویا وہ اس درجہ پر پہنچ گئے اور تقاضائے فطرت یہ ہو گیا کہ جب ان سے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کہا گیا تو انہوں نے بَلٰی کہہ دیا (یعنی یہ سوال وجواب اگرچہ واقع نہیں ہوئے لیکن جب اللہ نے ان کو علم عطا کر دیا اور دلائل ربوبیت کی فطری تخلیق کردی تو یہی تخلیق اور عطاء قوت بطور تشبیہ گواہ بنانا اور اقرار کرنا ہو گیا۔ بیضاوی نے اس مطلب کی تائید میں لکھا ہے کہ آیت کے الفاظ خود اسی مطلب پر دلالت کر رہے ہیں اِنَّا کُنَّا عَنْ ھٰذَا غٰفِلِیْنَ یعنی کہیں قیامت کے دن تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے غافل تھے تو نے کسی دلیل سے ہم کو آگاہ نہیں کیا تھا۔ شرک تو ہمارے اسلاف نے کیا تھا وہی شرک کے مؤسس تھے ہم تو ان کے مقلد و پیرو تھے، ہم نے ان کی اقتداء کی۔ قیامت کے دن پر عذر اس وجہ سے نہیں پیش کیا جاسکتا کہ جب دلائل موجود ہیں اور دلائل توحید کا علم حاصل کرنے کی قدرت ہے تو پھر کورانہ اتباع اسلاف نا قابل معذرت ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے اس کلام کی اصل غرض یہ ہے کہ ایک تو توریت کے اندر یہودیوں سے میثاق خاص طور پر لیا گیا تھا، دوسرے فطری عمومی میثاق توحید بھی موجود ہے اس طرح نقلی دلیل کی بھی تکمیل ہو گئی اور عقلی شہادت بھی کافی ہو گئی لہٰذا خود نظر اور استدلال سے کام لینے کی ضرورت ہے اور تقلید اسلاف کے بندھن کاٹ دینے لازم ہیں (گویا ان آیت کے مخاطب خاص طور پر یہودی ہیں جن کو فطرت سلیمہ قوت عقلیہ اور فہم و دانش کی تمام طاقتیں عطا کی گئی تھیں جیسے دوسرے لوگوں کو عطا کی گئی ہیں پھر توریت میں بھی ان سے میثاق لے لیا گیا تھا) اسی مضمون پر دلالت کر رہی ہے آخری آیت وَکَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وَلَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ۔

میثاق اَلَسْتُ کے متعلق جو احادیث آئی ہیں بیضاوی اور ان کے متبعین ان احادیث کی اسی نہج پر تاویل کرتے ہیں۔

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ فَکَانَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰکِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (اور آپ ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنایئے جس کو ہم نے اپنی آیتیں عطا کیں، پھر وہ ان سے بالکل ہی نکل گیا، پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، سو وہ گمراہ لوگوں میں سے ہو گیا۔ اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور اپنی نفسانی خواہش کے پیچھے ہو لیا)۔

عَلَیْهِمْ یعنی یہودیوں کو۔ فَانْسَلَخَ مِنْهَا پس وہ آیتوں سے نکل گیا یعنی آیات سے روگرداں ہو گیا اور انکار کر دیا۔ یہ قصہ بقول حضرت ابن عباسؓ بلعم بن باعور کا اور بقول مجاہد بلعام بن باعور کا ہے۔ عطیہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ بلعم اسرائیلی تھا۔ ابو طلحہؓ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ کنعانی تھا اور جبارون (یعنی عمالقہ) کے شہر کا رہنے والا تھا۔ مقاتل نے کہا وہ شہر بلقاء کا باشندہ تھا۔ حضرت ابن عباس، محمد بن اسحٰق اور سدی وغیرہ نے اس کا قصہ حسب تفصیل ذیل بیان کیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے جب عمالقہ سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا اور ملک شام میں علاقہ کنعان میں جا کر قیام کیا تو کچھ (کنعان کے) آدمی بلعم کے پاس گئے کیونکہ بلعم کو اسم اعظم معلوم تھا اور اس سے کہا، موسیٰؑ تیز مزاج کے آدمی ہیں ان کے پاس لشکر بھی بہت ہے وہ اس لئے ہمارے ملک میں آئے ہیں کہ ہم کو ہماری بستیوں سے نکال دیں اور ہم کو قتل کر دیں اور ہماری جگہ بنی اسرائیل کو آباد کر دیں، آپ کی دعا قبول ہوتی ہے ہماری لئے آپ دعا کر دیجئے کہ اللہ بنی اسرائیل کو ہماری طرف سے پھیر دے۔ بلعم نے جواب دیا ارے کم بختو موسیٰؑ نبی ہیں ان کے ساتھ فرشتے اور مؤمن ہیں میں ان کے خلاف کس طرح دعا کر سکتا ہوں، اللہ کی طرف سے جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے اگر میں تمہارے کہنے کے موافق کروں گا تو دنیا اور آخرت دونوں میری تباہ ہو جائیں گی۔ لوگوں نے پھر اصرار کیا اور بہت زاری کی تو بلعم نے کہا اچھا میں اپنے رب سے استخارہ کر لوں۔ بلعم کا قاعدہ تھا کہ جب تک خواب میں کسی بات کی اجازت اس کو نہیں مل جاتی تھی وہ دعا نہیں کرتا تھا، چنانچہ بنی اسرائیل کے خلاف بد دعا کرنے

کے معاملہ میں بھی اس نے استخارہ کیا مگر خواب میں اس کو بددعا نہ کرنے کی ہدایت کر دی گئی بیدار ہو کر اس نے قوم والوں سے کہہ دیا کہ میں نے استخارہ کیا تھا مجھے بددعا کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے یہ انکاری جواب سن کر لوگوں نے اس کو کچھ تحفے ہدیہ پیش کئے اس نے قبول کر لئے تو لوگوں نے پھر بددعا کرنے کی مکرر درخواست کی اور بلعم نے حسب سابق جواب دیا کہ میں اپنے رب سے استخارہ کر لوں چنانچہ اس نے استخارہ کیا مگر اس مرتبہ اس کو کوئی جواب نہیں ملا بیدار ہو کر اس نے قوم سے کہہ دیا کہ میں نے استخارہ کیا تھا مگر مجھے کوئی جواب نہیں ملا، لوگوں نے کہا اگر آپ کا بددعا کرنا اللہ کو پسند نہ ہوتا تو وہ ضرور اول مرتبہ کی طرح ممانعت فرما دیتا (اور اس مرتبہ کی طرح ممانعت نہیں فرمائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بددعا کرنا ناپسند نہیں ہے لہٰذا آپ بنی اسرائیل کے لئے بددعا کر دیجئے) لوگ اپنی درخواست پر برابر اصرار کرتے رہے اور اتنی زاری اور عاجزی کی کہ بلعم فریب کھا گیا اور قوم والے بہکانے میں کامیاب ہو گئے چنانچہ

بلعم ایک خچر پر سوار ہو کر کوہ حیتان کی طرف گیا تاکہ اوپر چڑھ کر بنی اسرائیل کے لشکر کا معائینہ کر لے مگر پہاڑ پر کچھ ہی چڑھا تھا کہ خچر بیٹھ گیا۔ بلعم نے اتر کر خچر کو مارا، خچر اٹھ کھڑا ہوا، بلعم پھر سوار ہو گیا مگر زیادہ نہ چلا تھا کہ پھر بیٹھ گیا، بلعم نے پھر اسے مارا اب اللہ نے خچر کو بات کرنے کی طاقت عنایت کر دی اور خچر نے (اللہ کی طرف سے) حجت تمام کرتے ہوئے کہا کم بخت بلعم تو کہاں جا رہا ہے کیا تجھے میرے سامنے ملائکہ نظر نہیں آتے جو مجھے لوٹا رہے ہیں تو اللہ کے نبی اور مومنوں کے خلاف دعا کرنے جا رہا، بلعم نے پھر بھی خچر کو نہیں چھوڑا اور اس پر سوار ہو کر ہی کوہ حیتان کے اوپر بددعا کرنے کے لئے پہنچ گیا لیکن بددعا کا جو کلمہ زبان سے نکالتا تھا وہ قوم کے لئے نکلتا تھا اور خیر کی دعا جو اپنی قوم کے لئے مانگنے کا ارادہ کرتا تھا اس وقت زبان بنی اسرائیل کی طرف پھر جاتی تھی (گویا بنی اسرائیل کا لفظ زبان سے نکالتا تھا مگر اپنی قوم کا نام زبان سے نکلتا تھا اور اپنی قوم کا نام زبان سے لیتا تھا تو بنی اسرائیل کا لفظ زبان پر آجاتا تھا) قوم والوں نے کہا بلعم آپ کو معلوم بھی ہے آپ کیا کر رہے ہیں، بنی اسرائیل کے لئے دعا اور ہمارے لئے بددعا کر رہے ہیں، بلعم نے جواب دیا اس پر میرا کچھ اختیار نہیں ہے یہ تو اللہ ہی کی طرف سے کرا دیا جاتا ہے میں مجبور ہوں (بددعا کرنے کے وبال میں) بلعم کی زبان سینہ پر لٹک آئی کہنے لگا لو اب میری دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہو گئیں اب سوائے چالبازی اور مکاری کے تمہارے کام کا اور کوئی راستہ نہیں رہا اب مجھے تمہارے لئے مکاری سے کام لینا پڑے گا جاؤ کچھ عورتوں کو بناؤ سنگھار کرا کے کچھ تجارتی سامان ان کے ہاتھوں میں دے کر بنی اسرائیل کے لشکر میں بیچنے کے لئے بھیج دو اور حکم دے دو کہ اگر بنی اسرائیل میں سے کوئی شخص اگر تمہاری طرف دست درازی کرے تو وہ انکار نہ کریں کیونکہ اگر ان میں سے کسی ایک نے بھی زنا کر لیا تو پھر سب لشکر کے مقابلہ میں تم کو کامیابی ہو جائے گی۔ لوگوں نے اس مشورہ کو مان لیا۔ جب عورتیں لشکر میں پہنچیں تو ایک کنعانی عورت جس کا نام کشتی بنت صور تھا۔ ایک اسرائیلی سردار کی طرف سے گزری اس سردار کا نام زمری بن شلوم تھا یہ سبط شمعون کا سرگروہ تھا زمری عورت کے حسن پر ریجھ گیا اور اٹھ کر اس نے عورت کا ہاتھ پکڑ لیا اور عورت کو لے جا کر حضرت موسیٰؑ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا میرا خیال ہے کہ آپ یہی کہیں گے کہ یہ عورت تیرے لئے حرام ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا ہاں یہ تیرے لئے حرام ہے، تو اس کے قریب بھی نہ جا۔ زمری بولا، خدا کی قسم اس کے معاملہ میں آپ کی بات نہیں مانوں گا، چنانچہ عورت کو لے کر خیمہ کے اندر چلا گیا اور اس سے قربت کی۔ زنا کرنا تھا کہ فوراً اللہ نے طاعون کو بنی اسرائیل پر مسلط کر دیا جس سے ستر ہزار آدمی ایک گھنٹہ میں مر گئے۔

فیحاص بن عیزار بن مرون حضرت موسیٰؑ کا مقرر کردہ ایک سردار تھا جو حاکم لشکر تھا، یہ شخص قوی الجثہ اور طاقتور بھی تھا زمری نے جس وقت یہ حرکت کی تھی اور اس وقت فیحاص لشکر میں موجود نہ تھا جب لشکر میں لوٹ کر آیا اور فوج میں طاعون پھیلا ہوا دیکھا اور زمری کی حرکت معلوم ہوئی تو فوراً اپنا چھوٹا برچھا جو پورے لوہے کا تھا لے کر زمری کے خیمہ میں گھس گیا زمری اور وہ عورت دونوں ہم خواب تھے فیحاص نے نیزہ چبھو کر دونوں کو ایک ہی نیزہ میں پرو لیا اور دونوں کو اسی حالت میں اٹھائے ہوئے باہر آیا، ہاتھ میں نیزہ پکڑے ہوئے تھا، ہاتھ اوپر کو تھا اور کہنی پہلو سے لگی ہوئی تھی اور دونوں لاشیں فیحاص

کے جبڑوں سے لگی ہوئی تھیں اسی حالت میں رو کر دعا کرنے لگا الٰہی جو تیری نافرمانی کرتا ہے اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے اس پر (اللہ کو رحم آ گیا اور اس نے) بنی اسرائیل سے طاعون اٹھا لیا یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل جو ذبیحہ ذبح کرتے ہیں اس کا دست، جبڑا اور پہلو فیحاص کی اولاد کو دیتے ہیں کیونکہ فیحاص نے زمری اور عورت کو نیزہ میں پرو کر نیزہ ہاتھ میں اٹھا کر کہنی کو اپنے پہلو سے ٹیکا تھا اور لاشوں کو اپنے جبڑوں سے لگا کر روک رکھا تھا اور بنی اسرائیل اپنے اونٹوں میں سے ایک نوجوان اونٹنی بھی فیحاص کی اولاد کو دیتے ہیں کیونکہ فیحاص عیزار کا جیٹھا بیٹا تھا۔ بلعم ہی کے متعلق اللہ نے آیت وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا الخ نازل فرمائی۔

مقاتل کا بیان ہے کہ شاہ بلقاء نے بلعم سے کہا کہ موسیٰؑ کے لئے بددعا کرو، بلعم نے کہا وہ میرے ہم مذہب ہیں میں ان کے لئے بددعا نہیں کروں گا۔ بادشاہ نے صلب کے تختے نصب کرائے (اور حکم دیا کہ بددعا کرو، ورنہ تم کو صلیب پر لٹکا دوں گا) بلعم نے یہ حالت دیکھی تو خچر پر سوار ہو کر بددعا کرنے کے لئے بستی سے باہر نکلا بنی اسرائیل کے لشکر کے سامنے پہنچا تو خچر رک گیا، بلعم نے خچر کو مارا خچر نے کہا "تو مجھے کیوں مارتا ہے مجھے تو حکم ہی یہ ملا ہے میرے آگے یہ آگ ہے جو مجھے چلنے سے روک رہی ہے" بلعم لوٹ آیا اور بادشاہ سے واقعہ بیان کر دیا۔ بادشاہ نے کہا تم کو بددعا تو کرنی ہوگی ورنہ میں صلیب پر لٹکا دوں گا۔ آخر بلعم نے اسم اعظم پڑھ کر حضرت موسیٰؑ کے لئے بددعا کی کہ وہ اس شہر میں داخل نہ ہوں، بددعا قبول ہو گئی اور اس کی بددعا کی وجہ سے بنی اسرائیل تیہ میں پھنس گئے۔ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا پروردگار جس طرح تو نے اس کی بددعا میرے متعلق قبول فرمائی میری بددعا اس کے متعلق بھی قبول فرما لے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے بددعا کی کہ بلعم سے اسم اعظم اور ایمان چھین لیا جائے۔ موسیٰؑ کی بددعا سے اس کی معرفت سلب کر لی اور ایمان اس طرح کھینچ لیا جیسے بکری کی کھال کھینچ لی جاتی ہے، سفید کبوتر کی شکل کی ایک صورت اس کے اندر سے نکل گئی آیت فَانْسَلَخَ مِنْهَا سے یہی مراد ہے۔

حضرت عبداللہ عمرو بن عاصؓ، سعید بن مسیب، زید بن اسلم اور لیث بن سعد کا قول روایت میں آیا ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول امیہ بن صلت ثقفی کے متعلق ہوا اس شخص نے (آسمانی) کتابیں پڑھی تھیں اور اس کو معلوم تھا کہ اللہ ایک پیغمبر ضرور بھیجے گا مگر اس کو امید لگی ہوئی تھی کہ وہ پیغمبر میں ہی ہوں گا۔ جب محمد ﷺ کو پیغمبر بنا دیا گیا تو امیہ کو حسد ہو گیا اور آپ کی بعثت کا اس نے انکار کر دیا تھا۔ یہ بڑا دانشمند اور اچھا واعظ۔ ایک بادشاد کے پاس سے لوٹ رہا تھا تو مقام بدر کی طرف سے اس کا گزر ہوا اور بدر کے مقتولوں کو اس نے دیکھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ محمد ﷺ نے ان کو قتل کیا ہے کہنے لگا اگر محمد ﷺ نبی ہوتے تو اپنے قرابت داروں کو قتل نہ کرتے۔

امیہ کے مرنے کے بعد اس کی بہن فارعہ رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو حضور ﷺ نے اس کے بھائی کے مرنے کے متعلق دریافت کیا فارعہ نے عرض کیا۔ امیہ نے سوتے میں دیکھا کہ دو آنے والے چھت پھاڑ کر نیچے اترے، ایک اس کے پائیں بیٹھ گیا اور دوسرا سرہانے۔ پائیں والے نے سرہانے والے سے پوچھا کیا (اس کا دل) ہوشیار ہے اس نے کہا ہوشیار ہے بائیں والے نے کہا کیا (نفسانی جذبات سے) پاک ہے، اس نے کہا مغرور ہے۔ فارعہ کا بیان ہے کہ میں نے امیہ سے اس کی تعبیر پوچھی تو اس نے جواب دیا کسی بھلائی کا میرے بارے میں ارادہ کیا گیا تھا مگر وہ بھلائی لوٹا دی گئی اتنا کہنے کے بعد اس پر بیہوشی طاری ہو گئی جب ہوش آیا تو کہنے لگا۔

زندگی کتنی ہی مدت تک لمبی ہو اس کو کبھی زوال کی طرف جانا ہی ہے۔ جو حالت میرے سامنے آئی کاش اس سے پہلے ہی میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہاڑی بکرے چراتا (یعنی گوشہ گیر ہو کر سب انسانوں سے الگ جا رہتا)۔ بلاشبہ حساب فہمی کا دن بڑا دن ہو گا ایسا بھاری دن ہو گا کہ (شدت ہول سے) بچے بھی بوڑھے ہو جائیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے اپنے بھائی کے کچھ اور شعر سناؤ۔ فارعہ نے بعض قصائد سنائے حضور ﷺ نے فرمایا اس کے شعر مؤمن ہیں مگر دل کافر تھا۔ امیہ ہی کے بارہ میں اللہ نے نازل فرمایا اُتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا الخ

حضرت ابن عباسؓ کا قول ایک روایت میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول بنی اسرائیل کے ایک شخص بسوس کے متعلق ہوا اس شخص کو تین دعائیں کرنے کا حق دیا گیا تھا (یعنی اطلاع دے دی گئی تھی کہ تیری تین دعائیں قبول کرلی جائیں گی) اس کی بیوی بھی تھی اور بیوی سے کچھ اولاد بھی۔ بیوی نے ایک دن اس سے کہا اپنی ایک دعا میرے لئے کر دے۔ بسوس نے پوچھا کہ تو کیا چاہتی ہے بیوی نے کہا اللہ سے دعا کر دے کہ میں بنی اسرائیل کی سب عورتوں سے حسین ہو جاؤں بسوس نے دعا کر دی۔ عورت سب سے زیادہ خوبصورت ہو گئی۔ خوبصورت ہونے کے بعد عورت کو احساس ہونے لگا کہ میری طرح حسین بنی اسرائیل میں کوئی بھی نہیں ہے، یہ احساس ہوتے ہی اس نے شوہر سے بے التفاتی شروع کر دی شوہر کو غصہ آیا اور اس نے بد دعا کی عورت فوراً کتیا بنا دی گئی جو پڑی بھونکتی رہتی تھی۔ بسوس کی دو دعائیں ختم ہو گئیں۔ ماں کی یہ حالت دیکھ کر اس کے لڑکے آئے اور کہنے لگے ہم صبر نہیں کر سکتے ہم کو چین نہیں آتا کہ ہماری ماں کتیا بنی رہے اور لوگ ہمیں عار دلاتے ہیں آپ دعا کیجئے کہ اللہ ہماری ماں کو اصلی حالت پر کر دے مجبوراً بسوس نے دعا کی اور بیوی اصلی حالت پر آ گئی اس طرح اس کی تینوں دعائیں بے کار گئیں۔

بغویؒ نے لکھا ہے پہلے دونوں قول (یعنی بلعم یا امیہ کے متعلق آیت کا نزول) زیادہ ظاہر ہے۔ میں کہتا ہوں دوسرے قول کی تردید تو خود آیات کر رہی ہیں اللہ نے فرمایا ہے قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ الخ یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ بنی اسرائیل کا تیہ میں سرگرداں پھرنا بلعم کی بد دعا کی وجہ سے نہ تھا بلکہ خود انہی کے قول (اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا الخ) کی وجہ سے تھا۔ حسن اور ابن کیسان کا قول ہے کہ اس آیت کا نزول منافقین اہل کتاب کے متعلق ہوا جو اپنے بیٹوں کی طرح بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کو پہچانتے تھے اور پھر بھی سچے دل سے ایمان نہیں لائے۔ قتادہ نے کہا (آیت میں کوئی خاص شخص یا گروہ مراد نہیں ہے بلکہ) اللہ نے بطور تمثیل اس شخص کی حالت بیان کی ہے جس کے سامنے ہدایت کو اللہ لے آیا لیکن وہ استقبال ہدایت کے لئے تیار نہ ہوا اور قبول کرنے سے انکار کر دیا (گویا اٰيٰتِنَا سے مراد ہے ہدایت)۔

حضرت ابن عباسؓ اور سدیؒ کے نزدیک آیات سے مراد اسم اعظم ہے۔ دوسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے اس کو اللہ کی کوئی کتاب دی گئی تھی مگر وہ کتاب (کے احکام) سے اس طرح نکل گیا جیسے سانپ کینچلی سے نکل جاتا ہے۔ ابن زید نے کہا وہ اللہ سے جو کچھ مانگتا وہ اللہ عطا فرما دیتا تھا (آیات سے مراد ہے)۔

فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا یا شیطان نے اس کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ پھر وہ گمراہوں میں شامل ہو گیا۔ لَرَفَعْنٰهُ بِهَا یعنی آیت کے ذریعہ سے ہم چاہتے تو اس کا مرتبہ ابرار کے مرتبہ کی برابر کر دیتے۔ مجاہد نے یہ مطلب بیان کیا کہ اگر ہم چاہتے تو آیات کے ذریعہ سے ہم اس کو کفر سے اٹھا لیتے اور بچا لیتے۔ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ مگر وہ دنیا اور پستی کی طرف مائل ہو گیا۔ زمین پست ہے، دنیا بھی پست ہے، پستی کی مناسبت سے بطور کنایہ دنیا کو ارض فرمایا۔ یا یوں کہا جائے کہ دنیا کا سارا مال متاع اسباب جائیداد زمین ہی کی پیداوار ہے۔ اس لئے زمین بول کر دنیا مراد لی۔ زجاج نے کہا خَلَدَ (مجرد) اور اَخْلَدَ (مزید) دونوں ہم معنی ہیں۔ خُلْد کا اصل (لغوی) معنی ہے دوام اور قیام۔ اَخْلَدَ فُلَانٌ بِالْمَكَانِ فلاں شخص نے فلاں جگہ قیام کیا۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ اور وہ اپنی نفسانی خواہش کے پیچھے لگ گیا یعنی دنیا کو اس نے اختیار کیا اور اپنی قوم کی رضامندی کا خواستگار رہا اور آیات کے تقاضوں سے اعراض کیا۔

انسان کے لئے امکان اور عدم ذاتی ہے اسکی فطرت کا تقاضا ہے کہ پستی کی طرف مائل ہو یعنی زمین پر رہنا، دنیا کی طرف مائل ہونا اس کا ذاتی اقتضاء ہے اور بلند درجات کے طرف اٹھایا جانا ایک امر وہبی ہے جو اللہ کی مہربانی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے اونچے مراتب کی طرف اٹھانے کی نسبت اللہ کی طرف کی اور زمین کی طرف مائل ہونے یعنی دنیا کی طرف راغب ہونے کی نسبت بندہ کی جانب کی گئی۔ بیضاوی نے کہا رفع درجات کو اللہ نے اپنی مشیت سے وابستہ کیا (لیکن شبہ ہو سکتا تھا کہ

بلندی حاصل کرنے یا پستی میں پڑے رہنے کے لئے اعمال بے سود ہیں) تو اس وہم کو دفع کرنے کے لئے فعل عبد اَخْلَدَ اور اِتَّبَعَ کا ذکر کیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ مشیت خداوندی انسان کے اس فعل کی سبب ہے جو موجب رفعت ہے اور جب انسان موجب رفعت فعل نہیں کرتا تو اس عدم فعل سے عدم مشیت خداوندی معلوم ہوتا ہے۔ انتفاء مسبب انتفاء سبب پر دلالت کرتا ہے۔ سبب حقیقی تو اللہ کی مشیت ہے باقی جو ظاہری اسباب ہم دیکھتے ہیں وہ حقیقت میں اسباب نہیں بلکہ درمیانی ذرائع ہیں جن سے مسبب (نتیجہ) کا وجود وابستہ ہے یعنی اللہ کی مشیت کے ساتھ جو نتائج کی وابستگی ہے وہ انہی ظاہری اسباب و ذرائع کی وساطت سے ہے۔ اصل کلام تو یوں ہونا چاہئے تھا وَلٰكِنَّهٗ اَعْرَضَ عَنْهَا لیکن اس کی جگہ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اِعْرَاض عَنِ الْآيَات کا باعث کیا ہے اور اس بات پر بھی تنبیہ ہو جائے کہ دنیا کی محبت ہر گناہ کا سرچشمہ ہے۔ یہ حدیث مرفوع ہے جس کو بیہقی نے بروایت حسن مرسلاً بیان کیا ہے (صحابی کا نام ذکر نہیں کیا)۔

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَآءَ مَثَلَا ۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

(سو اس کی حالت کتے کی سی ہو گئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپے یا اس کو چھوڑ دے تب بھی ہانپے، یہی حالت عام طور پر ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، سو آپ اس حال کو بیان کر دیجئے شاید وہ لوگ کچھ سوچیں۔ ان لوگوں کی حالت بھی بری حالت ہے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور اس سے وہ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ جس کو اللہ ہدایت کرتا ہے سو ہدایت پانے والا وہی ہوتا ہے اور جس کو وہ گمراہ کر دے تو ایسے ہی لوگ خسارہ میں رہتے ہیں)۔

فَمَثَلُهٗ یعنی اس کی ذلت کی حالت ایسی ہے۔ كَمَثَلِ الْكَلْبِ جیسی کتے کی ذلیل ترین حالت۔ يَلْهَثْ کہ وہ ہر حال میں زبان باہر نکال دیتا ہے ہانپتا ہے، پیاس ہو، تھکان ہو، اس کو ڈانٹ ڈپٹ کی جائے اور دھتکار کر باہر نکالا جائے یا ایسا نہ کیا جائے، بہر حال وہ ذلت کے ساتھ زبان باہر نکالے رہتا ہے۔ دوسرے جانوروں کی حالت ایسی نہیں ہے وہ اسی وقت ہانپتے اور زبان باہر نکالتے ہیں جب کوئی خاص سبب ہو، تھک جائیں، پیاس لگی ہو یا کوئی اور محرک ہو تب وہ زبان باہر نکال دیتے ہیں۔

مجاہد نے کہا یہ حالت اس شخص کی ہوتی ہے جو قرآن پڑھتا تو ہے مگر اس پر عمل نہیں کرتا مطلب یہ ہے کہ کافر کو تم تنبیہ کرو نصیحت کرو یا کچھ کرو وہ کفر سے باز نہیں آتا کچھ نہ کرو تب بھی ہدایت نہیں حاصل کرتا ہمیشہ ہر حال میں گمراہ اور ذلیل رہتا ہے وہ ذلت میں ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کتا جو ہمیشہ زبان باہر لٹکائے رہتا ہے۔ اسی کی ہم معنی ایک اور آیت آئی ہے فرمایا ہے وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ۔

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا یعنی یہ حالت ہے ان یہودیوں کی جنہوں نے آیات کی تکذیب کی، رسول اللہ ﷺ کے احوال و صفات کو خود توریت میں پڑھا اور لوگوں کو پیغمبر آخر الزماں کی بعثت قریب ہونے کی بشارت دیتے رہے لیکن جب آپ مبعوث ہو گئے اور ان کے سامنے آ گئے اور معجزات ظاہر کر دیئے اور قرآن پیش کیا جو عظیم الشان معجزہ ہے اور یہودیوں نے آپ کو یقینی طور پر بغیر کسی شبہ کے پہچان بھی لیا جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں، تو توریت کی آیات سے صاف نکل گئے اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا انکار کر دیا اور زبان لٹکائے ہوئے کتے کی طرح ذلیل ہو گئے توریت کی تنبیہات اور نصیحتوں نے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔

تمثیل مذکور کے حکم میں عام طور پر وہ تمام لوگ داخل ہیں جو آیات الٰہیہ کی تکذیب کرتے ہیں۔

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ پس یہودیوں کے سامنے آپ وہی حال بیان کیجئے جو اوپر ذکر کر دیا گیا تاکہ وہ سوچیں اور غور کر کے نصیحت پذیر ہو جائیں اور شخص مذکور کی بد انجامی سے عبرت اندوز ہو کر اس کی رفتار پر نہ چلیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ تمثیل

مذکور میں کفار مکہ مراد ہیں ان کو پہلے آرزو تھی کہ کوئی ہادی ہوتا جو ان کو سیدھا راستہ دکھاتا اور کوئی داعی اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیتا لیکن جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوگئے تو باوجودیہ کہ کافروں کو آپ کی صداقت میں پہلے کبھی شک نہ تھا لیکن رسالت کے دعوے کی تکذیب کرنے لگے اور ہدایت یاب نہ ہوئے، دعوت دینا نہ دینا دونوں ان کے لئے یکساں ہوگیا۔

وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا اس کا عطف کَذَّبُوْا پر ہے یا سابق کلام سے یہ بالکل جدا ہے (اور تقدیم مفعول حصر کے لئے ہے) مطلب اس طرح ہوگا وہ نہیں ظلم کرتے ہیں مگر اپنے ہی اوپر وبال تکذیب انہیں پر پڑے گا۔

فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ چونکہ مَنْ کا لفظ مذکر تھا اس رعایت سے مذکر غائب کی ضمیر ذکر کی لیکن مَنْ يُّضْلِلْ معنی کے اعتبار سے جمع ہے اس لئے اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ بصیغہ جمع فرمایا۔ چونکہ تمام ہدایت پانے والوں کا طریقہ ایک ہی ہے۔ (توحید نبوت اور قیامت کا اقرار اور ایمان بالقدر وغیرہ) اس لئے فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ فرمایا گویا اس بات پر تنبیہ کی کہ جتنے ہدایت پانے والے افراد ہیں وہ ایک شخص کی طرح ہیں اور چونکہ گمراہی کے راستے جدا جدا متعدد ہیں اس لئے اَلْخٰسِرُوْنَ بصیغہ جمع فرمایا۔

آیات میں صراحت ہے کہ ہدایت ہو یا گمراہی دونوں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں اور اللہ کی ہدایت کرنے کا معنی ہے ہدایت یاب بنا دینا، خالی راہ ہدایت بتا دینا اور بیان کرنا نہیں ہے جس کو اللہ ہدایت کرتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ معتزلہ کے نزدیک ہدایت الٰہی کا معنی ہے بتا دینا۔ بیان کر دینا۔ مگر آیات کی صراحت اس کے خلاف ہے۔

فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ کا لفظ اس امر کو بھی بتا رہا ہے کہ ہدایت یاب ہو جانا ہی درحقیقت بہت بڑا کمال اور عظیم الشان نفع ہے کیونکہ اس سے آئندہ عظیم الشان نعمتوں کا حصول لازمی ہے، پس آئندہ زندگی کی کامرانی اور کامیابی کا ذکر کرنے کے بجائے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ جس کو اللہ ہدایت کرتا ہے وہی ہدایت یاب ہوتا ہے۔

مقام جابیہ میں حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک روز خطبہ دیا اور حمد وثنا کے بعد فرمایا مَن يهده الله فلا مُضلَّ له ومَن يُضلله فلا هادِىَ له کوئی عیسائی یا یہودی یا مجوسی مذہبی عالم سامنے بیٹھا تھا اس نے آخری لفظ سن کر فارسی زبان میں کچھ کہا حضرت عمرؓ نے مترجم سے پوچھا یہ کیا کہتا ہے مترجم نے کہا یہ کہہ رہا ہے کہ خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اے دشمن خدا تو جھوٹا ہے۔ اللہ ہی نے تجھے پیدا کیا اور تجھے گمراہ کر دیا اور وہی انشاء اللہ تجھے دوزخ میں داخل کرے گا، اگر ہمارا معاہدہ نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا۔ اس بیان کے بعد لوگ اٹھ گئے اور تقدیر کی بابت کسی کو اختلاف نہ رہا۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

(ہم نے بلاشبہ جہنم کے لئے ایسے بہت سے جنات اور انسان پیدا کئے ہیں جن کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سمجھتے نہیں وہ جانوروں کی طرح ہیں۔ بلکہ جانوروں سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ ایسے سب لوگ غافل ہیں) حقیقت اور انجام سے بے خبر۔

ذَرَاْنَا ہم نے پیدا کئے۔ كَثِيْرًا بکثرت جنات وانسان۔ یعنی وہ لوگ جن کا پیدائش کے بعد کفر پر جمار ہنا اللہ کو پہلے سے ہی معلوم ہے۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے جنت پیدا کی اور اس کے مستحق بھی پیدا کر دیئے جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں ہی تھے یعنی حضرت آدمؑ کی پشت میں اور جہنم کو پیدا کر دیا اور اس کے مستحق بھی پیدا کر دیئے جبکہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے (یعنی دنیا میں آئے بھی نہ تھے)، رواہ مسلم۔ اسی مضمون کی حدیث اوپر گزر گئی جس میں حضرت آدم کی پشت سے سب کا برآمد ہونا بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ راوی ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ دو تحریریں دونوں ہاتھوں میں لئے ہوئے برآمد ہوئے اور فرمایا جانتے ہو یہ دو تحریریں کیسی ہیں، ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ ہم کو کچھ نہیں معلوم البتہ آپ بیان فرما دیں تو معلوم ہو جائے گا، حضور ﷺ نے دائیں ہاتھ والی تحریر کی طرف

اشارہ کر کے فرمایا یہ رب العلمین کی طرف سے تحریر ہے اس میں جنتیوں کے نام، ان کے باپ اور قبائل کے نام درج ہیں اور آخر میں اس کو ختم کر دیا گیا ہے، آئندہ کبھی اس میں کمی ہو گی نہ بیشی، پھر بائیں ہاتھ والی تحریر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا یہ رب العلمین کی طرف سے تحریر ہے اس میں تمام دوزخیوں کے اور ان کے باپوں کے اور قبائل کے نام درج ہیں اور آخر میں اس کو ختم کر دیا گیا ہے، آئندہ کبھی اس میں اضافہ ہو گا نہ کمی۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ پھر عمل کس غرض سے ہے جب کہ یہ اہل جنت و اہل جہنم کا معاملہ ختم ہو چکا، فرمایا سیدھی چال چلتے رہو۔ جنتی کا خاتمہ اہل جنت کے عمل پر ہو گا خواہ اس نے (زندگی میں) کوئی عمل کیا ہو اور دوزخی کا خاتمہ دوزخیوں کے عمل پر ہو گا خواہ اس نے (زندگی میں) کیسا ہی عمل کیا ہو۔ پھر حضور ﷺ نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا اور دونوں تحریروں کو گویا پھینک دیا، پھر فرمایا تمہارا رب بندوں کے فیصلہ سے فارغ ہو گیا، ایک گروہ جنت میں اور ایک گروہ دوزخ میں کر دیا گیا، رواہ الترمذی۔

ایک شبہ

آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ میں اور اس آیت میں تضاد ہے (اس جگہ کی آیت بتا رہی ہے کہ اللہ نے کچھ لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے کفر و معصیت کے لئے ہی ان کو پیدا کیا ہے جن کو کوئی ہدایت یاب نہیں کر سکتا اور آیت وَمَا خَلَقْتُ بتا رہی ہے کہ انسان کی تخلیق عبادت اور معرفت کے لئے ہوئی ہے، ہر انسان کو معرفت اور عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے) دونوں میں موافقت کیسے ہو سکتی ہے۔

جواب

تخلیق کے لحاظ کے وقت اس بات کا کوئی لحاظ نہیں کہ اللہ کا علم بندہ کے متعلق کیا ہے اور وہ بندہ کو جنتی جانتا ہے یا دوزخی (یعنی واقع میں بندہ دوزخی ہے یا جنتی اس کا علم تو اللہ کو ہے تخلیق کا تقاضا اور مصلحت تو یہی ہے کہ ہر شخص عبادت گزار اور صاحب معرفت ہو) رہی یہ بات کہ بہت انسانوں اور جنوں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے تو اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ (ان کی تخلیق کی غرض یہ ہے کہ وہ جہنمی ہوں بلکہ مقصد یہ ہے کہ) اللہ پہلے سے واقف ہے کہ وہ کفر اختیار کریں گے اور اس طرح اللہ کی بات پوری ہو کر رہے گی کہ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ۔

بعض علماء تفسیر نے یہ جواب دیا ہے کہ آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ اگرچہ عام ہے لیکن اس سے مراد خاص ہے یعنی صرف وہی لوگ معرفت و عبادت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں جن کے متعلق اللہ جانتا تھا کہ یہ ایماندار اور اطاعت گزار ہوں گے، یہ جواب بے دلیل اور غلط ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ لِجَهَنَّمَ میں لام عاقبت کا ہے یعنی کثیر مخلوق کی پیدائش کا نتیجہ جہنمی ہونا ہے اور جس کی پیدائش کا نتیجہ جہنمی ہونا ہے وہ گویا جہنم ہی کے لئے پیدا ہی کیا گیا ہے۔ معتزلہ نے یہ تاویل اس لئے اختیار کی کہ وہ گناہوں کو اللہ کی مشیت و ارادہ کے تحت نہیں مانتے مگر یہ تاویل ظاہر کلام کے خلاف ہے۔

لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا یعنی حق کی شناخت کرنے اور دلائل پر غور کرنے کی ان میں استعداد و صلاحیت ہی نہیں ہے۔ لَا يُبْصِرُوْنَ بِهَا یعنی آنکھیں تو ہیں مگر دلائل کو عبرت اندوز نظر سے نہیں دیکھتے۔ لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا یعنی ان کے کان تو ہیں مگر آیات و مواعظ کو گوش قبول سے نہیں سنتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ یعنی کھانے پینے، جماع کرنے اور اسباب تعیش میں مشغول رہنے کے لئے ہی ان کی ساری قوتیں اور احساسات وقف ہیں۔ وہ بے سمجھی میں اور عبرت اندوز نظر نہ رکھنے میں اور گوش قبول و تامل کے فقدان میں جانوروں کی طرح ہیں۔ بَلْ هُمْ اَضَلُّ بلکہ وہ جانوروں سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہیں۔ جانوروں میں تو کسی قدر ضرر رساں اور فائدہ بخش چیزوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہے اور وہ منافع کو حاصل کرنے اور مضرات کو دفع کرنے کی اپنی انتہائی کوشش کرتے ہیں لیکن کافروں میں کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو محض عناد کی وجہ سے دوامی دوزخ کی طرف دوڑے جاتے ہیں

باوجودیکہ جانتے ہیں کہ یہ راستہ یقینی ہلاکت کا ہے، اللہ نے انہی کے متعلق فرمایا ہے یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا اور بعض کافر ایسے ہیں کہ فطری دانش و شعور کو ضائع کر دیتے ہیں، تقاضائے عقل کا مقابلہ وہم سے کرتے ہیں، یہ دونوں گروہ مکلف ہیں، مامور ہیں اور جانور نہ مکلف ہیں نہ مامور۔ فطری مجبور ہیں اس لئے کافر زیادہ گمراہ ہیں، قابل مواخذہ اور جانور گم کردہ راہ ہیں، معذور و مجبور۔

اُولٰٓئِکَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ یعنی کامل طور پر یہی غافل ہیں کوئی دوسرا کامل غفلت کا حامل نہیں ہے۔ اس آیت (اور حصر) سے معلوم ہو رہا ہے کہ جانوروں کو بلکہ جمادات کو بھی اپنے خالق کا کسی قدر شعور ہے، وہ کامل طور پر اپنے رب سے غافل نہیں ہیں۔ اسی کی تائید دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے فرمایا ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ۔ دوسری آیت ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۔

مقاتل کی روایت ہے کہ ایک شخص نے اللہ کا نام لے کر بھی نماز میں دعا کی اور رحمٰن کا لفظ کہہ کر بھی۔ اس پر کافر کہنے لگے، ان مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم ایک ہی رب کی عبادت کرتے ہیں پھر اس شخص کو کیا ہو گیا کہ دو کو پکار رہا ہے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

(اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں بس انہی ناموں سے اللہ کو پکارا کرو اور ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں ان لوگوں کو ان کے کئے کی سزا ملے گی)۔

یعنی جن ناموں کے معنی تمام معانی سے اچھے ہیں وہ اللہ ہی کے نام ہیں۔ ان سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صرف صفات پر نہیں دلالت کرتے بلکہ اس ذات کو بتاتے ہیں جو صفات کی حامل ہے دونوں میں بڑا فرق ہے (دوسری زبانوں کے اندر جو اللہ کے نام ہیں وہ محض صفات پر دلالت کرتے ہیں جیسے "پرماتما" یعنی روح کائنات، واجب الوجود، علت تامہ، بھگوان وغیرہ) فَادْعُوْهُ بِهَا پس انہی ناموں سے اس کو پکارا کرو۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں جو ان کو یاد کرلے گا جنت میں داخل ہوگا۔ دوسری روایت میں آیا ہے اللہ وتر ہے طاق کو پسند کرتا ہے۔ شیخین نے اس حدیث میں ننانوے ناموں کی تفصیل ذکر نہیں کی کیونکہ شیخین کی شرط کے موافق تفصیل مروی نہیں۔ ترمذی نے اور بیہقی نے الدعوات میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو یاد کرلے گا جنت میں جائے گا۔ هو الله الذى لا اله الا هو الرحمن الرحيم الملک القدوس السلام المؤمن المهيمن العزيز الجبار المتكبر الخالق البارئ المصور الغفار الوهاب الرزاق الفتاح العليم القابض الباسط الخافض الرافع المعز المذل السميع البصير الحكم العدل اللطيف الخبير الحليم العظيم الغفور الشكور العلى الكبير الحفيظ المقيت۔ الحسيب الجليل الكريم الرقيب المجيب الواسع الحكيم الودود المجيد الباعث الشهيد الحق الوكيل القوى المتين الولى الحميد المحصى المبدى المعيد المحى المميت الحى القيوم الواجد الماجد الصمد الواحد القادر المقتدر المقدم المؤخر الاول الاخر الظاهر الباطن الوالى المتعالى البر التواب المنتقم العفو الرؤف مالک الملک ذو الجلال والاكرام الجامع الغنى المغنى المانع الضار النافع النور الهادى البديع الباقى الوارث الرشيد الصبور۔

خوب سمجھ لو کہ اللہ کے اسماء کا حصر انہی مذکورہ بالا اسماء میں نہیں ہے (دوسرے نام بھی ہیں) حدیث مذکور میں جن اسماء کا ذکر ہے ان سے مراد شاید یہ ہے کہ جو ان کو یاد کرے گا وہ جنت میں جائے گا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ان سب کو ایک لڑی

میں پرو دیا ہے (تاکہ لوگ یاد کر لیں)۔

ترمذی کی روایت مذکورہ میں جن اسماء کا ذکر ہے ان میں سے ستائیس ایسے ہیں جو بلفظہ صراحتاً قرآن مجید میں نہیں آئے۔
القابض الباسط الخافض الرافع المعز المذل العدل الجلیل الباعث المحصی المبدی المعید المحی الممیت الواجد الماجد المقدم المؤخر الوالی ذوالجلال والاکرام (ذی الجلال والاکرام آیا ہے) المقسط المغنی المانع الضار النافع الباقی الرشید الصبور۔

مندرجہ ذیل توصیفی اسماء حسب ذیل آیات میں آئے ہیں مگر ترمذی کی روایت میں نہیں آئے۔
ھو خیرٌ و ابقیٰ اِلٰہ شاکر رب العالمین احد مالک یوم الدین الاعلی الاکرم خفے اعلمُ بمن ضل عن سبیلہ واعلمُ بالمُھتدین القریب النصیر القدیر المبین الخلّاق مبتلیکم الموسع الملیک الکافی فاطر السموات والارض القائم بالقسط غافر الذنب قابل التوب شدید العقاب نعم المولیٰ الغالب علیٰ امرہ سریع الحساب فالق الحب والنوی خالق الاصباح جاعل اللیل سکنا علّام الغیوب عالم الغیب والشھادۃ ذوالطول ذوانتقام رفیع الدرجات ذوالعرش ذوالمعارج ذوالفضل العظیم ذوالقوۃ ذوالمغفرۃ جامع الناس لیوم لاریب فیہ متم نعمتہ متم نورہ عدوٌّ للکافرین ولی المؤمنین القاھر فوق عبادہ اسرع الحاسبین مخرج المیت من الحی محی الموتیٰ ارحم الراحمین احکم الحکمین خیر الرازقین خیر الماکرین خیر الفاتحین مخزی الکافرین موھن کید الکافرین فعّال لمایرید المستعان نور السموات والارض اھلُ التقوی اھل المغفرہ نعم الماھدون ربُّ الناس ملک الناس اِلٰہ الناس اقربُ الیہ من حبل الورید القائم علیٰ کلّ نفس بماکسبت احق ان تخشاہ الذی ھواغنیٰ واقنیٰ والذی ھوامات واحییٰ والذی ھواضحک وابکے والذی خلق الزوجین الذکر والانثیٰ والذی اھلک عاد الاولیٰ الذی لم یکن لہ ولدٌ (لم یلد ولم یولد ولم یکن لہٗ کفواً احدٌ) ولم یکن لہ شریکٌ فی الملک ولم یکن لہٗ ولی من الذل الذی انزل علیٰ عبدہ الکتاب الذی بیدہ ملکوت کلّ شیئٍ الذی یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر الذی یبدأ الخلق ثم یعیدہٗ الذی بیدہ الملکُ الذی بعث فی الامیین رسولاً لاالٰہ الاانت سبحانک انی کنت من الظٰلمین۔ اس آیت کو حدیث میں اللہ کا اسم اعظم فرمایا گیا ہے اس کے علاوہ قرآن مجید میں اللہ کی صفات اور بھی بیان کی گئی ہیں۔

بعض اسماء ایسے بھی دوسری احادیث میں آئے ہیں جو نہ قرآن مجید میں مذکور ہیں نہ ترمذی کی روایت مذکورہ میں مثلاً
الحنان المنان الجواد الاجود الفرد الوتر الصادق الجمیل القدیم البار الوافی العادل المعطی المغیث الطیب الطاہر المبارک خالق الشمس والقمر المنیر رازق الطفل الصغیر جابر عظم الکسیر کبیر کل کبیر الذی نفسی بیدہ وغیرہ پھر یہ بھی نہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ کے جتنے نام قرآن مجید اور احادیث میں آئے ہیں بس یہ ہی اللہ کے نام ہیں ان کے علاوہ اور کوئی نام اللہ کا نہیں ہے کیونکہ روایت میں آیا ہے کہ اللہ نے توریت میں اپنے ایک ہزار نام نازل فرمائے تھے۔ رسول اللہ ﷺ بھی دعا کیا کرتے تھے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اسْمٍ ھُوَلَکَ سَمَّیْتَ بِہٖ نَفْسَکَ اَوْاَنْزَلْتَہٗ فِیْ کِتَابِکَ اَوْعَلَّمْتَہٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِکَ اَوِاسْتَأْثَرْتَ بِہٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ۔ اے اللہ میں تجھ سے دعا کرتا ہوں تیرے ہر نام کے ساتھ جو تو نے اپنی ذات کا مقرر کیا ہے اور اس کو کتاب میں نازل کر دیا ہے یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے یا اپنے علم غیب میں تو نے خاص طور پر رکھ چھوڑا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اللہ کے تمام ناموں پر جو اللہ کو معلوم ہیں اجمالی ایمان رکھا جائے۔

وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ۔ الحاد (مزید) اور لحد (مجرد) دونوں کا لغوی معنی ہے سیدھے راستہ سے

مڑ جانا، کج راہ ہو جانا۔ یعقوب بن سکیت کا قول ہے کہ اِلْحَاد کا معنی ہے حق سے مڑ جانا اور جو چیز حق نہیں ہے اس کو حق کی فہرست میں شامل کر دینا اَلْحَدَفِی الدِّیْنِ اور لَحَدَ فِی الدِّیْنِ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔

آیت میں مشرک مراد ہیں جنہوں نے اللہ کے ناموں کو اصل مصداق سے موڑ کر بتوں کو ان ناموں سے موسوم کر دیا پھر ان میں کمی بیشی بھی کر لی۔ اَللّٰہُ سے اللات، اَلْعَزِیْزُ سے العزی اور مَنَّان سے منات بنا لیا۔ حضرت ابن عباسؓ و مجاہد نے یہی تفسیر فرمائی۔

بعض علماء نے کہا کہ الحاد فی الاسماء سے مراد یہ ہے کہ مشرکوں نے بتوں کا نام الٰہ رکھ دیا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ کی تشریح میں فرمایا یُکَذِّبُوْنَ۔ اہل معنی کہتے ہیں کہ اللہ کے ناموں میں الحاد کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے وہ نام رکھ چھوڑے ہیں جو اللہ نے اپنے لئے نہیں اختیار کئے، نہ اللہ کی کتاب میں آئے، نہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں۔ خلاصہ یہ کہ اللہ کے نام صرف توقیفی (تنزیلی) ہیں اللہ کا نام جوّاد ہے سخی نہیں، عالم ہے عاقل نہیں، رَحِیْم ہے رفیق نہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ۔ دوسری آیت وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ لیکن اللہ کو خادع اور ماکر یا مکّار نہیں کہا جاسکتا یا قَائِمٌ بِالْقِسْطِ کہا جاسکتا ہے قائم نہیں کہا جاسکتا یا خَالِق کہا جاسکتا ہے۔ خَالِقُ الْقِرَدَۃِ وَالْخَنَازِیْر (بندروں اور سوروں کے خالق) کے نام سے موسوم نہیں کیا جاسکتا۔ زید اگرچہ تمام بادشاہوں سے بڑا بادشاہ ہو مگر اللہ کو کبیر من زید نہیں کہا جاسکتا (مطلب یہ کہ کسی صفت کے موجود ہونے کی بنا پر اللہ کا وصفی نام از خود نہیں بنایا جاسکتا) بلکہ اللہ کو انہی ناموں سے پکارا جائے گا جو بطور تعظیم قرآن یا حدیث میں آگئے ہیں (یعنی اللہ نے اظہار عظمت کے نشان کے طور پر جن کو نازل کیا ہے۔ جہاں صرف تقابلی صورت میں آئے ہیں، اظہار عظمت کے لئے نہیں آئے جیسے ھُوَ خَادِعُھُمْ یا مَکَرَ اللّٰہُ تو ایسے ناموں سے بھی اللہ کو نہیں پکارا جاسکتا) توریت میں ذکر کئے ہوئے نام بھی لینا درست نہیں کیونکہ یہودیوں کی معرفت جو نام آئے ہیں ان کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں علماء یہود میں سے جو لوگ مسلمان ہو گئے اور دل سے مسلمان ہو گئے ان کی روایت سے توریت میں ذکر کئے ہوئے ناموں کے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور بعض دوسرے صحابیؓ حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور بعض دوسرے مسلمان علماء یہود سے توریت کی اطلاعات دریافت کرتے تھے اور کوئی اس کی مخالفت نہیں کرتا تھا۔ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جو لوگ اللہ کے ناموں کے متعلق کجراہی اختیار کرتے ہیں۔ شریعت نے اللہ کا جو نام نہیں بتایا وہ نام اللہ کا رکھتے ہیں ان کو چھوڑ دو یا یہ مطلب ہے کہ اللہ نے جو نام اپنا مقرر کیا ہے اور مشرک اس نام کو نہیں مانتے تو تم ان مشرکوں کی پروانہ کرو جیسے اللہ نے اپنا نام رحمٰن فرمایا تو مشرک کہنے لگے ہم تو رحمٰن یمامہ کے علاوہ کسی رحمٰن سے واقف نہیں (یعنی اللہ کا نام رحمٰن نہیں ہے) یا یہ مطلب ہے کہ اگر مشرک اللہ کے ناموں کا اطلاق بتوں پر کرتے ہیں اور اس کے ناموں سے (موئنث کے) صیغے مشتق کرتے ہیں تو ان کو کرنے دو تم ان کی موافقت نہ کرو۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم ان سے اعراض کرو اللہ خود ان کو سزا دیدے گا ان کے کئے کی سزا ان کو دی جائے گی۔

۲۲ ع ۱۲ وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّۃٌ یَّھْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِہٖ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ ع وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ (اور ہماری مخلوق میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حق (یعنی اسلام) کے مطابق ہدایت کرتا ہے اور حق ہی کے موافق عدل کرتا ہے اور جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں، ہم ان کو (جہنم کی طرف) آہستہ آہستہ لئے جا رہے ہیں اس طور پر کہ ان کو خبر بھی نہیں اور ان کو میں ڈھیل دیتا ہوں، بے شک میری پوشیدہ تدبیر بڑی مضبوط ہے)۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّۃٌ بغوی نے لکھا ہے کہ عطاء نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت میں امت سے مہاجرین، انصار اور وہ لوگ جو ان کے پیرو ہوں مراد ہیں۔ قتادہؒ نے کہا ہم کو اطلاع ملی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس آیت کو پڑھ کر

فرماتے یہ تمہارے لئے ہے اور اسی کی طرح اس امت کو بھی دیا گیا تھا جو تمہارے سامنے موجود ہے (یعنی یہودی، یہودیوں کے متعلق آیا تھا) وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ- کلبی نے کہا (کوئی خاص امت مراد نہیں ہے بلکہ آیت عام ہے) تمام لوگوں میں ایسا گروہ ہوتا ہے۔ بہر حال (آیت میں خاص امت مراد لی جائے یا عام) اللہ نے پہلے ذکر کیا کہ ایک گروہ کو دوزخ کے لئے پیدا کیا گیا ہے جو ظالم اور حق سے اعراض کرنے والے ہیں پھر (اس آیت میں) ذکر کیا کہ ایک گروہ کو جنت کے لئے پیدا کیا ہے جو حق کے موافق ہدایت کرتا اور عدل کرتا ہے۔

بعض لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ ہر زمانہ میں اجماع اہل ہدایت صحیح (بلکہ بنص قرآنی ضروری الوقوع) ہے اور اس آیت سے وہ حدیث تعلق رکھتی ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت میں برابر ایک گروہ پیدا ہوتا رہے گا جو اللہ کے امر کو پورے طور پر ادا کرتا رہے گا، ان کی مدد نہ کرنے والے اور ان کی مخالفت کرنے والے ان کو کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ اسی حالت میں قیامت آجائے گی۔ متفق علیہ من حدیث معاویۃ بن ابی سفیان و مغیرہ بن شعبہ۔ مگر یہ استدلال غلط ہے اور حدیث مذکور کا بھی اس آیت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ ہر امت میں ایک گروہ ایسا ضرور ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اس سے مراد مکہ کے کافر ہیں۔ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ ہم آہستہ آہستہ ان کو ہلاکت کے قریب لئے جارہے ہیں۔ استدراج کا لغوی معنی ہے آہستہ آہستہ چڑھانا یا درجہ بدرجہ اتارنا۔ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ عطاء نے کہا مراد یہ ہے کہ ہم ان کے متعلق ایسی پوشیدہ تدبیر کریں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ کلبی نے کہا ہم ان کے اعمال ان کی نظر میں مرغوب بنادیں گے پھر ان کو ہلاک کردیں گے۔ ضحاک نے کہا جس قدر وہ نو بنو گنا کریں گے ہم نو بنو ان کو نعمتیں دیں گے۔ سفیان ثوری نے کہا ہم ان کو پوری پوری نعمت دیں گے اور شکر ادا کرنا فراموش کرادیں گے۔

وَاُمْلِيْ لَهُمْ اس کا عطف سَنَسْتَدْرِجُهُمْ پر ہے یعنی میں ان کی عمریں لمبی کردوں گا اور ان کے برے اعمال کو ان کی نظر میں مرغوب بنادوں گا اور ان کو بداعمالی کی سہولت عطا کروں گا، تاکہ وہ گناہوں میں بڑھتے چلے جائیں اور آخر ہلاک ہوجائیں۔ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ یعنی میری گرفت سخت ہے۔ گرفت کو کَید سے اس لئے تعبیر کیا کہ اللہ کی گرفت بظاہر انعام نظر آتی ہے اور حقیقت میں تباہی آفریں ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے ترجمہ کیا میری پوشیدہ تدبیر سخت ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول ان لوگوں کے حق میں ہوا جو اللہ کا، اللہ کے رسول کا اور اہل ایمان کا مذاق اڑاتے تھے، چنانچہ ایک ہی رات میں اللہ نے سب کو قتل کرادیا۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے قتادہؒ کی روایت سے بیان کیا کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کے ایک ایک کنبہ اور شاخ کو نام بنام یا بنی فلاں یا بنی فلاں کہہ کر پکار اور اللہ کے عذاب و حوادث الہیہ سے برابر ڈراتے رہے۔ ایک شخص بولا تمہارا یہ ساتھی یقیناً دیوانہ ہے رات بھر صبح تک چیختا رہا ہے۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۚ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۜ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

(کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی کو ذرا بھی جنون نہیں ہے وہ تو بس صاف صاف (نافرمانی کے عذاب سے) ڈرانے والا ہے اور کیا انہوں نے آسمانوں کی اور زمین کی اور ان دوسری چیزوں کی حکومت پر جن کو اللہ نے پیدا کیا ہے غور نہیں کیا اور اس بات پر بھی غور نہیں کیا کہ ممکن ہے ان کی اجل قریب ہی آپہنچی ہو۔ پھر قرآن کے بعد کس بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے، جس کو اللہ گمراہ کردے اس کو کوئی راہ پر لانے والا نہیں اور اللہ ان کو ان کی گمراہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے)۔

صَاحِبِكُمْ سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ۔ جِنَّةٌ بمعنی جنون۔ مُبِيْنٌ صاف صاف، کھول کر، واضح طور پر ڈرانے والا کہ کسی سے کوئی بات چھپی نہ رہے (سب کی سمجھ میں آجائے) اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا کیا دلیل آفریں اور استدلال کی نظر سے انہوں نے نہیں دیکھا۔ مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ یعنی جس پر لفظ شَيْءٍ کا اطلاق ہوتا ہے کوئی چیز ہو۔ شَيْءٍ کے افراد واجناس ان گنت ہیں اور سب اپنے بنانے والے کی ہمہ گیر قدرت اور توحید پر دلالت کررہی ہیں۔ ان کو استدلال کی نظر سے کائنات عالم کو دیکھنا چاہئے تاکہ ان پر واضح ہوجائے کہ رسول اللہ ﷺ جس چیز کی ان کو دعوت دے رہے ہیں وہ صحیح ہے۔

وَاَنْ عَسٰی اس کا عطف مَلَكُوْت پر ہے اَنْ مصدری ہے یا خفیفہ ہے اور ضمیر شان اس کا اسم ہے اسی طرح اَنْ يَّكُوْنَ میں اَنْ مصدری ہے یا خفیفہ دونوں جگہ استفہام انکاری ہے اور تعجب پر دلالت کررہا ہے۔ کلام کا مطلب اس طرح ہے تعجب ہے یہ لوگ قرآن اور پیغمبر پر ایمان نہیں لائے اور پیغمبر ﷺ کو دیوانہ بنانے لگے اور اس بات پر غور نہیں کیا کہ شاید ان کی اجل قریب آگئی ہو، اگر اس پر غور کرتے تو طلب حق کی طرف تیزی سے بڑھتے اور ایسی چیز کی طرف توجہ کرتے جو مرنے سے پہلے ان کی نجات کا باعث ہوجاتی۔

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ یعنی جب انہوں نے اس قرآن کو نہیں مانا جو علم وحکمت سے بھرا ہوا ہے اور معجزہ ہے تو اس کے بعد اور کون سی بات کا یقین کریں گے یعنی ممکن ہے ان کی موت قریب ہو پھر قرآن پر ایمان لانے کی طرف کیوں نہیں بڑھتے اور قرآن سے بڑھ کر اور کون سی واضح دلیل چاہتے ہیں قرآن سے بڑھ کر اور کون سی بات ہے جس پر یہ ایمان لانا چاہتے ہیں۔ حقیقت میں ان کی روگردانی کی علت یہ ہے کہ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ جس کو اللہ گمراہ چھوڑ دے اس کو راہ پر لانے والا کوئی نہیں وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۔ يَعْمَهُوْنَ يَذَرُهُمْ کی ضمیر مفعول سے حال ہے۔

ابن جریر نے قتادہ وغیرہ کی روایت سے لکھا ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا آپ ہمارے قرابت دار ہیں، ہم کو بطور اشارہ بتادیجئے کہ قیامت کب آئے گی ابن جریر وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حمل بن ابی قشیر اور سمول بن زید نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اگر آپ نبی ہیں جیسا کہ آپ کا دعوی ہے تو بتائیے کہ قیامت کب آئے گی ہم بھی تو جان لیں قیامت کیا ہے اس پر آیات ذیل کا نزول ہوا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ڤ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ١٨٧ (یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا آپ کہہ دیجئے کہ اس کا (تعیینی) علم تو میرے رب کے پاس (محفوظ) ہے اس کے وقت پر بس وہی اس کو ظاہر کردے گا وہ آسمان وزمین کا سب سے بھاری حادثہ ہوگا بس وہ تم پر اچانک ہی آپڑے گی وہ آپ سے اس طرح پوچھتے ہیں گویا آپ اس کی تحقیقات کرچکے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اس کا (تعیینی) علم تو بس اللہ ہی کو ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)۔

وقف لازم

اَلسَّاعَة قیامت کے اسماء غالبہ میں سے ہے یا تو قیامت کو ساعت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اچانک آجائے گی یا اس وجہ سے کہ قیامت کے دن حساب بہت جلد ہوجائے گا یا اس وجہ سے کہ قیامت کا دن باوجودیکہ بہت لمبا ہوگا مگر اللہ کے نزدیک گھڑی بھر ہوگا۔ اَيَّانَ کب۔ مُرْسٰىهَا مُرْسًا مصدر میمی ہے اِرْسَاء بھی مصدر ہے یعنی استقرار قیامت کب ہوگا۔ رَسُوْ الشَّيْءِ کسی چیز کا ثبات اور استقرار رِسَاءُ الْجَبَلِ پہاڑ جما ہوا ہے۔ اَرْسَی السَّفِيْنَة کشتی لنگر انداز ہوگئی رک گئی۔ حضرت ابن عباسؓ نے مُرْسًا کا لفظی ترجمہ کیا منتہی اور قتادہ نے کہا وقوع۔ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ یعنی اللہ نے قیامت کا علم اپنے پاس ہی رکھا ہے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اس نے کسی کو نہیں بتلایا نہ کسی مقرب فرشتہ کو واقف کیا، نہ کسی نبی مرسل کو۔

لَا يُجَلِّيْهَا یعنی اس کا پردہ نہیں کھولے گا، اس کو ظاہر نہیں کرے گا۔ لِوَقْتِهَا لام بمعنی فی ہے یعنی اس کے وقت پر۔

ثَقُلَتْ یعنی قیامت کا علم ثقیل اور اس کا معاملہ زمین وآسمان کے رہنے والوں سے پوشیدہ ہے۔

ہر پوشیدہ چیز کا حصول ثقیل ہوتا ہے یا یہ مطلب کہا جائے کہ آسمانوں کے ملائکہ اور زمین کے باشندے سب کے پیش نظر قیامت کی حالت کو جاننا ہی ہے ہر ایک کی تمنا ہے کہ قیامت کا علم اس کو حاصل ہو جائے۔ علم قیامت کا مخفی رہنا سب پر بار ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ قیامت کی شدتیں اور ہولناکیاں زمین و آسمان میں بھاری ہیں۔ جس نے ثقلت کا مطلب یہ بیان کیا کہ ملائکہ اور جن وانس غرض تمام زمین آسمان والوں پر قیامت ثقیل اور عظیم ہے (اسی لئے قیامت کو مخفی رکھا گیا ہے) گویا ثَقُلَتْ کے لفظ سے قیامت کو مخفی رکھنے کی حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اِلَّا بَغْتَةً مگر اچانک، غفلت کی حالت میں۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو شخص (یعنی بائع اور مشتری) اپنے بیچ میں کپڑا پھیلائے ہوں گے اور خریدنے بیچنے نہ پائیں گے کہ قیامت آجائے گی، کوئی آدمی اپنا حوض درست کرتا ہوگا اور اس کا پانی پلانے نہ پائے گا کہ قیامت بپا ہو جائے گی، کوئی آدمی اونٹنی کا دودھ دوہ کر لے کر لوٹ رہا ہوگا اور پینے نہ پائے گا کہ قیامت بپا ہو جائے گی، کوئی شخص لقمہ اٹھا کر منہ میں لے جانا چاہتا ہوگا اور کھانے نہ پائے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی (یعنی قیامت کا وقوع اچانک ہو جائے گا اگرچہ اس کی نشانیاں مدت سے ظاہر ہو رہی ہوں گی)۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے صور میں پھونک ماردی جائے گی جبکہ لوگ راستوں، بازاروں اور اپنی اپنی مجلسوں میں ہوں گے یہاں تک کہ بیچنے خریدنے والے آپس میں بھاؤ چکا رہے ہوں گے اور ایک اپنے ہاتھ سے اس چیز کو چھوڑنے نہ پائے گا کہ صور پھونک دیا جائے گا جس کی آواز سے وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا یہی مطلب ہے آیت مَا يَنظُرُونَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً کا، لوگ بازاروں میں خرید فروخت کر رہے ہوں گے، کپڑے ناپ رہے ہوں گے، اونٹنیوں کا دودھ دوہ رہے ہوں گے، اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہوں گے کہ قیامت آجائے گی اور کوئی کسی کو وصیت کر سکے گا نہ گھر لوٹ سکے گا۔

عبد اللہ بن احمد نے الزہد کی روایت میں حضرت زبیر بن عوام کا بیان نقل کیا ہے کہ قیامت ایسی حالت میں آجائے گی کہ کچھ لوگ کپڑا ناپ رہے ہوں گے کچھ لوگ اونٹنیوں کا دودھ دوہ رہے ہوں گے، پھر آپ نے پڑھا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَّلَا اِلٰى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ۔ طبرانی نے کھری سند سے حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت سے پہلے ڈھال برابر ایک کالا ابر مغرب کی طرف سے اٹھے گا اور اونچا ہوتا جائے گا پھیلتا جائے گا یہاں تک کہ آسمان کو بھر دے گا پھر ایک (غیبی) منادی ندا دے گا لوگو! اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ دو آدمی اپنے بیچ میں کپڑا پھیلائے ہوئے ہوں گے اور لپیٹنے نہ پائیں گے (کہ قیامت آجائے گی) کوئی آدمی اپنا حوض درست کر رہا ہوگا اور اس سے پانی پلانہ پائے گا (کہ قیامت آجائے گی) اور کوئی آدمی اونٹنی دوہ رہا ہوگا اور دودھ پینے نہ پائے گا کہ قیامت آجائے گی۔

يَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا، حَفِيٌّ بروزن فَعِيْلٌ تحقیقات کرنے والا۔ حَفِيَ الشَّيْئَ اس چیز کی پوری تفتیش کی۔ حَفِيٌّ سے اس جگہ مراد ہے عالم ہونا کیونکہ کسی چیز کی پوری تحقیقات اور کامل تفتیش کرنے والا اس سے واقف ہو ہی جاتا ہے اور اس چیز کا پورا پورا علم اس کو حاصل ہو ہی جاتا ہے۔ علمی تحقیقات کے مضمون کو ظاہر کرنے کے لئے ہی حَفِيٌّ کے بعد عَنْ کا استعمال کیا ہے (ورنہ حَفِيٌّ کا استعمال بغیر عن کے ہوتا ہے) بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ عَنْهَا کا تعلق يَسْئَلُوْنَكَ سے ہے یعنی وہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں گویا آپ قیامت کا پورا علم رکھتے ہیں۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک حَفِيٌّ، حَفَاوَةٌ سے مشتق ہے حَفَاوَة کا معنی ہے شفقت و مہربانی کیونکہ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا ہماری آپ سے قرابت داری ہے، ہمیں آپ بتادیجئے کہ قیامت کب آئے گی۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا وہ آپ سے قیامت کے متعلق (خصوصی) سوال اس طرح کرتے ہیں گویا آپ قریش سے اپنی قرابتداری کی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ ان کو بتادیں گے کہ قیامت کب آئے گی۔

قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ چونکہ یَسْئَلُوْنَکَ دوبارہ ذکر کیا تھا کیونکہ ثانی یَسْئَلُوْنَکَ سے کَاَنَّکَ حَفِیٌّ عَنْهَا کا تعلق تھا اس لئے قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ کو بھی دوبارہ ذکر کیا یا تکرار ذکر سے مراد صرف کلام میں زور پیدا کرنا ہے۔ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ یعنی اکثر لوگ نہیں جانتے کہ قیامت کا تعینی علم اللہ نے صرف اپنے لئے خاص کر رکھا ہے، مخلوق میں سے کسی کو عطا نہیں فرمایا۔

قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ (آپ کہہ دیجئے کہ میرے بس میں تو اپنے لئے بھی نہ کوئی نفع ہے نہ نقصان مگر صرف اتنا ہی جتنا اللہ نے چاہا، اگر میں غیب کی (سب) باتیں جانتا تو میں بہت سے منافع کی باتیں حاصل کر لیا کرتا اور مجھے دکھ ہی نہ پہنچتا میں (عالم الغیب نہیں، کارساز اور قادر مطلق نہیں) صرف (اللہ کے عذاب و نافرمانی سے) ڈرانے والا ہوں اور ایمان والوں کو خوشخبری دینے والا ہوں)۔

قُلْ لَا اَمْلِکُ یعنی کسی دینی دنیوی منفعت کو حاصل کرنے اور مضرت کو دفع کرنے کی مجھے خود اپنے لئے بھی قدرت نہیں ہے۔ یہ قول عبدیت کے اظہار اور غیب دانی کے دعوے سے بیزاری پر دلالت کر رہا ہے۔ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ الخ یعنی کثرت سے منافع حاصل کر لیتا اور ضرر رساں چیز کو دفع کر دیتا یہاں تک کہ پھر مجھے کوئی دکھ ہی نہ پہنچتا نہ لڑائیوں میں کبھی مغلوب اور کبھی غالب ہوتا۔ بعض علماء نے آیت کا تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر میں غیب کی باتیں جانتا یعنی یہ معلوم ہوتا کہ میں کب مروں گا تو کثرت سے اچھے اچھے کام کر لیتا اور مجھے کچھ نقصان نہ پہنچتا یعنی ہر شر اور فتنہ سے بچا رہتا۔

بعض اہل تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا یعنی اگر مجھے معلوم ہوتا کہ قیامت کب آئے گی تو میں تم کو بتا دیتا تم ایمان لے آتے اور تمہاری تکذیب کا مجھے دکھ نہ پہنچتا۔ بعض کے نزدیک مَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ الگ مستقل کلام ہے (پہلے کلام سے مربوط نہیں ہے) اس سے مشرکوں کے قول کی تردید کرنا مقصود ہے کہ تم جو مجھے دیوانہ کہتے ہو یہ غلط ہے مجھے تو کوئی دکھ چھو بھی نہیں گیا ہے۔ اِلَّا نَذِیْرٌ یعنی کافروں کو ڈرانے والا۔ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ یعنی تصدیق کرنے والوں کو خوشخبری دینے والا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لِقَوْمٍ کا تعلق نَذِیْر اور بَشِیْر دونوں سے ہو کیونکہ عذاب سے ڈرانا ہو یا ثواب کی بشارت دونوں کا فائدہ اہل تصدیق ہی کو پہنچ سکتا ہے (کافروں کو نہ دھمکی فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ خوشخبری۔ اس صورت میں لِقَوْمٍ میں لام انتفاع کا ہوگا۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْکُنَ اِلَیْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَکَآءَ فِیْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَی اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

(اللہ وہی ہے جس نے تم کو ایک تن واحد (آدم) سے پیدا کیا اور اسی (کے اندر) سے اس کا جوڑ (حواء کو) پیدا کیا تاکہ وہ اپنے جوڑے سے سکون خاطر حاصل کرے، پھر جب میاں نے بیوی سے قربت کی تو اس نے ہلکا سا بوجھ اٹھا لیا اتنا کہ اس کو لئے پھرتی رہی، پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں میاں بی بی نے اللہ سے جو ان کا رب تھا دعا کی کہ اگر تو نے ہمیں صحیح سالم بچہ دیدیا تو ہم بڑے شکر گزار ہوں گے لیکن جب اللہ نے ان کو صحیح سالم بچہ دیدیا تو اللہ کی دی ہوئی چیز میں دوسروں کو ساجھی قرار دینے لگے سو ان کے شرک سے اللہ پاک ہے)۔

مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ایک شخص سے یعنی حضرت آدمؑ سے۔ وَجَعَلَ مِنْهَا یعنی اس ایک شخص کے تن سے اس کی پسلی سے۔ زَوْجَهَا یعنی حوا کو۔ یَسْکُنُ اِلَیْهَا تاکہ اس زوج سے اس کو سکون خاطر اور انس حاصل ہو چونکہ نفس سے شخص مراد ہے اس لئے یَسْکُنُ بصیغۂ مذکر ذکر کیا۔ تَغَشّٰىهَا قربت کی، جماع کیا۔ حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا تو حواء نے ہلکا سا بار اٹھا لیا یعنی نطفہ اس صورت میں حَمْلًا مصدر بمعنی محمول (اسم مفعول کے) ہوگا اور مراد نطفہ ہو گا یا حَمْلًا مفعول مطلق ہے یعنی

حاملہ عورتوں کو حالت حمل میں عام طور پر جو دکھ اور تکلیف کا احساس ہوتا ہے حضرت حوا پر وہ دکھ نہیں پڑا مَرَّتْ بِهٖ وہ اس کو لئے چلتی پھرتی رہی اٹھنے بیٹھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کی، یا یہ مطلب کہ پیدائش کے وقت تک وہ حمل کو لئے رہی اس نے صحیح سالم حمل کے ساتھ یہ مدت گزار دی نہ اخراج ہوا نہ اسقاط۔ فَلَمَّاۤ اَثْقَلَتْ یعنی جب بچہ بڑا ہو گیا اور وہ عورت بار دار ہو گئی، بچہ کا بوجھ اس پر پڑنے لگا۔ دَّعَوَا تو آدم حوا دونوں نے دعا کی۔ صَالِحًا صحیح سالم ہماری طرح۔ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ تم ہم تیری اس نئی نعمت کے شکر گزار ہوں گے۔

بغوی نے لکھا ہے اہل تفسیر کا بیان ہے کہ جب حوا حاملہ ہو گئیں تو ابلیس مرد کے بھیس میں ان کے پاس آیا اور پوچھا تیرے پیٹ میں کیا ہے حواء نے کہا مجھے نہیں معلوم۔ ابلیس نے کہا مجھے اندیشہ ہے کہیں یہ کوئی چوپایہ یا کتا یا خنزیر نہ ہو اور یہ بھی نہیں معلوم کہ کس طرح باہر آئے گا اگر پیچھے سے بر آمد ہوا تو تیری ہلاکت کا سبب ہو جائے گا ممکن ہے منہ سے بر آمد ہو یا تیرا پیٹ پھٹ جائے۔ حوا کو ڈر لگنے لگا اور آدمؑ سے اس کا تذکرہ کیا ان کو بھی فکر ہو گئی ابلیس دوبارہ لوٹ کر آیا اور حواء سے کہا میر اللہ کی بارگاہ میں مرتبہ ہے اگر میں دعا کر دوں کہ بچہ صحیح سالم تیری طرح خدا پیدا کر دے اور اس کا بر آمد ہونا بھی بسہولت ہو تو کیا تو اس کا نام عبد الحارث رکھ دے گی۔ ابلیس کا نام ملائکہ میں حارث تھا۔ حواء نے اس کا ذکر حضرت آدم سے کیا۔ حضرت آدمؑ نے فرمایا شاید یہ وہی شخص ہے جس کو میں پہلے سے جانتا ہوں (یعنی شاید یہ وہی ابلیس ہے) لیکن ابلیس (بصورت مرد) برابر دونوں کے پاس آتا رہا آخر دونوں فریب کھا گئے اور بچہ پیدا ہونے کے بعد اس کا نام عبد الحارث رکھا۔ کلبی کا بیان ہے کہ ابلیس نے حواء سے کہا تھا اگر میں اللہ سے دعا کروں اور تو انسان کا بچہ جنے تو کیا میرے نام پر تو اس کا نام رکھ دے گی حواء اس کے نام سے واقف نہ تھیں نادانی کی وجہ سے اقرار کر لیا بچہ پیدا ہو گیا تو ابلیس نے کہا میرے نام پر اس کا نام رکھو۔ حواء نے پوچھا تیرا کیا نام ہے ابلیس نے کہا الحارث۔ حواء جانتی نہ تھیں کہ جس ابلیس کی وجہ سے جنت سے دونوں کو نکالا گیا اس کا نام حارث تھا اس لئے بچہ کا نام عبد الحارث رکھ دیا۔ ایک راویت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ حواء کے بطن سے ایک کے بعد ایک متعدد بچے ہوتے رہے حضرت آدمؑ کسی کا نام عبد اللہ کسی کا عبید اللہ اور کسی کا عبد الرحمٰن رکھتے رہے لیکن سب مرتے رہے آخر ایک بچہ کا نام عبد الحارث رکھا تو وہ جیتا رہا۔

حضرت سمرہ بن جندب کی روایت سے امام احمد اور ترمذی اور حاکم نے بیان کیا ہے ترمذی کے نزدیک یہ روایت حسن غریب اور حاکم کے نزدیک صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حواء کے بچے پیدا ہوتے مگر زندہ نہ رہتے تھے ایک بچہ جو پیدا ہوا تو ابلیس نے ادھر کا چکر لگایا اور حوا سے کہا اس کا نام عبد الحارث رکھو۔ حوا نے عبد الحارث نام رکھ دیا اور وہ بچہ زندہ رہا یہ حرکت شیطان کے مشورہ اور وسوسہ سے ہوئی۔

بغوی نے لکھا ہے حدیث میں آیا ہے کہ حواء کے پاس ابلیس دوبار آیا (اور حوا، اس کے بہکاوے میں آگئیں) ایک بار جنت میں اور ایک بار زمین پر۔ ابن زید کا بیان ہے کہ حضرت آدم کا ایک بچہ پیدا ہوا آپ نے اس کا نام عبد اللہ رکھا۔ ابلیس نے آکر پوچھا تم نے بچہ کا کیا نام رکھا، حضرت آدمؑ اور حواء نے کہا عبد اللہ۔ اس سے پہلے حضرت آدمؑ کا ایک بچہ پیدا ہوا تھا جس کا نام آپ نے عبد اللہ رکھا تھا اور وہ مر چکا تھا۔ ابلیس نے کہا کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اللہ بندہ کو تمہارے پاس چھوڑ دے گا ایسا نہیں ہو سکتا خدا کی قسم جس طرح پہلے بچہ کو اس نے لے لیا اس کو بھی لے لے گا۔ میں تم کو ایسا نام بتاتا ہوں کہ اگر وہ تم رکھ دو گے تو جب تک تم زندہ رہو گے وہ بچہ بھی جیتا رہے گا چنانچہ دونوں نے اس کا بچہ نام عبد الشمس رکھا۔ بغوی نے لکھا ہے اول روایت زیادہ صحیح ہے۔ صَالِحًا پورا انسان صحیح سالم، جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ بغوی نے لکھا ہے شُرَكَآءَ جمع کا صیغہ ہے مگر مراد واحد ہے یعنی عبد الحارث نام رکھ کر غیر کو اللہ کا شریک قرار دے دیا، لیکن یہ شرک نہ عقیدہ میں تھا نہ عبادت میں کیونکہ حضرت آدم نبی معصوم تھے شرک نہیں کر سکتے تھے بلکہ یہ شرک صرف نام رکھنے میں تھا۔ اس سے آپ کی مراد یہ تھی کہ حارث بچہ کی صحت اور ماں کی سلامتی کا سبب ہے کبھی عبد کا اطلاق ایسے شخص پر ہوتا ہے جو مملوک نہ ہو (یعنی بمعنی خادم) جیسے رب کا اطلاق کبھی

ایسے (مربی اور سرپرست) شخص پر ہو جاتا ہے جو معبود نہیں ہوتا، بعض لوگ اپنے مہمان کی تواضع کرنے کے لئے اپنے آپ کو عبد الضیف کہتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ضیف اس کا معبود ہے اور وہ ضیف کا بندہ۔

بعض لوگ دوسروں سے کہتے ہیں میں آپ کا بندہ ہوں۔ حضرت یوسف نے عزیز مصر کے متعلق کہا تھا اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ آپ کی مراد اس سے یہ نہ تھی کہ عزیز مصر آپ کا معبود ہے۔ عبد الحارث نام بھی اسی طرح رکھا گیا۔ حسن اور عکرمہ نے کہا جَعَلَا سے مراد ہے جَعَلَ اَوْلَادُهُمَا یعنی آدم اور حوا کی اولاد نے اللہ کے شریک بنا رکھے اس سے مراد مکہ کے کافر اور دوسرے مشرک ہیں، مضاف محذوف ہے، جیسے ان یہودیوں کو جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تھے خطاب کر کے فرمایا ہے ثُمَّ اتَّخَذْتُمْ، وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا، حالانکہ گوسالہ پرستی اور قتل نفس ان کا فعل نہ تھا بلکہ ان کے اسلاف کا تھا اس مطلب کی تائید لفظ شرکاء سے بھی ہو رہی ہے (کیونکہ حضرت آدم و حواء نے عبد الحارث نام رکھا یعنی نام رکھنے میں شرک کیا اگر یہ مطلب ہے تو شرکاء کا لفظ کیوں استعمال کیا، حارث تو واحد ہے اور فعل بھی واحد ہے ہاں کفار بہت ہیں اور انہوں نے بکثرت شرکاء بھی بنا رکھے ہیں اس لئے جَعَلَا کی اسناد حضرت آدم و حواء کی طرف حقیقی نہیں بلکہ مضاف محذوف ہے یعنی جَعَلَ اَوْلَادُهُمَا شُرَكَآءَ

فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ پس اللہ برتر ہے ان چیزوں سے جن کو وہ شریک کرتے ہیں یعنی بتوں سے (اس صورت میں ما مصدری نہ ہوگا بلکہ موصولہ ہوگا) بغوی نے لکھا ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ کلام ابتدائی ہے (پہلے کلام سے مربوط نہیں ہے) اور مشرکوں سے مراد ہیں کفار مکہ اور اگر پہلے کلام سے اس کو مربوط بھی قرار دیا جائے اور مذکورہ بالا اشخاص ہی مراد ہوں تب بھی مطلب صحیح ہو جائے گا (اور شرک سے مراد ہوگا نام رکھنے میں شرک کرنا) کیونکہ حضرت آدم و حواء کے لئے بہتر یہی تھا کہ نام میں بھی شرک نہ کرتے۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ اس جملہ کا عطف خَلَقَكُمْ پر ہے اور درمیانی کلام بطور معترضہ ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ يُشْرِكُوْنَ کی ضمیر یہود و نصاریٰ کی طرف راجع ہے یعنی اللہ نے ان کو اولاد عنایت فرمائی (جو موحد اور مسلم تھی) مگر انہوں نے اس کو یہودی اور عیسائی بنایا اللہ ان کے اس فعل سے بزرگ و برتر ہے۔ ابن کیسان نے کہا يُشْرِكُوْنَ سے مراد وہ کفار ہیں جو اپنی اولاد کا نام عبد العزیٰ، عبد اللات عبد المناۃ اور عبد الشمس رکھتے تھے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ عکرمہ اور حسن کے نزدیک آیات کی تفسیر سب سے الگ ہے۔ ان بزرگوں کے نزدیک خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ سے مراد ہے کہ اللہ نے تم سب کو ایک شخص سے یعنی ہر ایک کو اس کے باپ سے پیدا کیا پھر اس نفس سے یعنی اس کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا اور دونوں کے ملنے سے اولاد عطا کی مگر وہ شرک کرنے لگے اگرچہ یہ قول حضرت ابن عباسؓ، مجاہد، سعید بن مسیب اور جمہور مفسرین کی تفسیر کے خلاف ہے مگر میرے نزدیک یہی صحیح ترین قول ہے اس کی دلیل حسب ذیل ہے۔

اللہ نے حضرت آدم و حواء کو اکل شجرہ کی ممانعت فرما دی لیکن جب دونوں نے شجرہ کو کھا لیا تو چند مقامات پر بطور تشنیع اس کا اظہار کیا مثلاً فرمایا وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى، حضرت آدم کو بھی اپنے اس قصور پر بڑی ندامت ہوئی اور انہوں نے دعا کی رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ، اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی فرمایا ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى، حضرت آدمؑ کو توبہ قبول ہونے کے بعد بھی اپنی اس لغزش پر پشیمانی رہی۔ صحیحین میں آیا ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن مؤمنوں کو روک لیا جائے گا ان کو سخت پریشانی ہوگی اور کہیں گے کاش اس وقت کوئی سفارشی ہوتا جو اللہ سے سفارش کر کے ہم کو اس جگہ سے رہا کرا دیتا چنانچہ لوگ آدم کے پاس جا کر کہیں گے آپ سب آدمیوں کے باپ ہیں اللہ نے خود اپنے ہاتھ سے آپ کو بنایا تھا اور اپنی جنت میں سکونت عطا کی تھی اور اپنے فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا تھا اور تمام چیزوں کے اسماء آپ کو سکھا دیئے تھے آج اپنے رب سے شفاعت کر کے ہم کو اس جگہ سے نجات دلا دیجئے حضرت آدم اپنی اس لغزش کو یاد کریں گے جو ممنوعہ درخت کو کھا لینے کی صورت میں پیدا ہوئی تھی اور کہیں گے

میرا یہ مقام نہیں کہ تمہارے کام آؤں۔ اس حدیث پر غور کرو حضرت آدمؑ سے درخت کو کھا لینے کی صورت میں جو خطا ہوئی تھی اس کو تو اس وقت یاد کریں گے (باوجود یہ کہ وہ لغزش معاف بھی ہو چکی ہے) لیکن دوسری (شرک والی) غلطی کو یاد نہیں کریں گے باوجود یہ کہ پہلی خطا سے دوسری خطا زیادہ سخت تھی (اور اس کی معافی کی بھی کوئی صراحت نہیں کی گئی) لہٰذا آیت مذکورہ کی تفسیر وہی صحیح ہے جو عکرمہ اور حسن نے کی۔

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

(کیا ایسوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہ کر سکیں اور خود ہی (اللہ کی قدرت سے) پیدا کئے جاتے ہوں اور وہ ان کو کسی طرح کی مدد بھی نہ دے سکتے ہوں اور نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں اور اگر تم ان کو راہ راست کی طرف بلاؤ تمہارے کہنے پر نہیں چلتے۔ تمہارے اعتبار سے دونوں امر برابر ہیں خواہ تم ان کو پکارو یا خاموش رہو، واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں اگر تم سچے ہو تو ان کو پکارو پھر ان کو چاہئے کہ تمہارا کہنا کر دیں)۔

اَيُشْرِكُوْنَ کیا اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں۔ مَا لَا يَخْلُقُ جو کسی چیز کو پیدا نہ کر سکیں، یعنی ابلیس اور بت۔ وَهُمْ يُخْلَقُوْنَ هُمْ، ضمیر بتوں کی طرف راجع ہے (اگرچہ هُمْ کی ضمیر جمع اصحاب عقل کی طرف راجع ہونا چاہئے اور بت جامد چیز ہے لیکن) بتوں کو مشرک معبود قرار دیتے تھے (اس لئے بت بھی اصحاب عقل کے حکم میں ہو گئے) وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ اور بت طاقت نہیں رکھتے، لَهُمْ نَصْرًا ان مشرکوں کی مدد کرنے کی جو ان کے پجاری ہیں۔ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ اور نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں کہ نامناسب ناگوار چیز کو دفع کر سکیں مثلاً اگر کوئی ان کو توڑے تو اپنے کو محفوظ رکھ سکیں۔ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى اور اگر تم مشرکوں کو اسلام کی طرف بلاؤ۔ بعض علماء کے نزدیک تَدْعُوْا سے خطاب مشرکوں کو ہے اور هُمْ ضمیر بتوں کی طرف راجع ہے یعنی اے مشرکو اگر تم بتوں کو بلاؤ کہ وہ تم کو ہدایت کریں راستہ بتلا دیں تو وہ تمہارے کہنے پر عمل نہیں کر سکتے، یعنی تم کو راستہ نہیں بتلا سکتے نہ اللہ کی طرح تمہاری دعا قبول کر سکتے ہیں۔

سَوَاۗءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ بجائے (صَمَتُّمْ) فعل کے (صَامِتُوْنَ) اسم فاعل ذکر کیا یا تو صرف آیات کے مقاطع کے لحاظ سے یا غیر مفید ہونے کو پرزور طور پر ظاہر کرنے کے لئے کہ تمہارا ان کو پکارنا بھی خاموش رہنے کے برابر بے سود ہے (نہ پکارنے سے تم کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ خاموش رہنے سے) یا اسلوب ادا کو بدلنے کی یہ وجہ ہے کہ (فعل حدوث و تجدد پر دلالت کرتا ہے اور اسم دوام و استمرار پر اور) مشرک اپنی اغراض کے لئے تو بتوں کو پکارتے نہ تھے (عرض مقاصد کے وقت خاموش رہنا ان کی عادت جاریہ تھی جس پر وہ قائم تھے) اغراض کے لئے پکارنا ایک نئی بات ہو گی اس لئے فرمایا کہ (خلاف معمول اور بر خلاف عادت) ان کو پکارنا یا (حسب معمول) خاموشی پر قائم رہنا دونوں غیر مفید اور بے سود ہونے میں برابر ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی اے مشرکو اللہ کے سوا تم جن کی عبادت کرتے اور ان کو معبود کہتے ہو۔ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ تمہاری طرح بندے ہیں یعنی مخلوق ہیں اللہ کے مملوک اور تابع ارادہ ہیں۔ مقاتل نے کہا خطاب کا رخ ان لوگوں کی طرف ہے جو فرشتوں کو پوجا کرتے تھے اس لئے، اَلَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ سے مراد ملائکہ ہیں اول تفسیر زیادہ صحیح ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم سچے ہو کہ وہ الہ ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مطلب اس طرح ہو کہ چونکہ انسانوں کی شکل کی انہوں مورتیاں بنا رکھی تھیں تو ان سے (گویا) فرمایا کہ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ یہ تمہاری طرح زندہ اور عاقل ہو جائیں اگر ایسا ہو بھی جائے تب بھی وہ تمہاری عبادت کے مستحق نہیں ہو سکتے جس طرح تم میں سے کوئی کسی کی عبادت کا مستحق نہیں ہے اس سے آگے واضح فرمایا کہ وہ تو تم سے کمتر درجہ پر ہیں۔

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ط

(کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہوں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہوں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں یعنی تمہاری طرح نہ ان کے ہاتھ پاؤں ہیں نہ آنکھ کان پھر اپنے سے کمتر درجہ والوں کی پوجا تم کس طرح کرتے ہو)۔

قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۹۶﴾ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۖ وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

(آپ کہہ دیجئے کہ تم اپنے سب معبودوں کو جن کو تم اللہ کا شریک قرار دیتے ہو بلا لو پھر میری ضرر رسانی کی تدبیر کر لو پھر مجھے ذرا مہلت مت دو بے شک میرا حامی اللہ ہی ہے، جس نے کتاب نازل فرمائی ہے اور وہی نیک بندوں کی مدد کیا کرتا ہے اور جن کو اللہ کو چھوڑ کر تم پوجتے ہو وہ تمہاری مدد بالکل نہیں کر سکتے اور نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں اگر ان کو کوئی بات بتانے کو پکارو تو نہیں سنتے آپ کو نظر آتا ہے کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے)۔

ثُمَّ كِيْدُوْنِ یاء متکلم محذوف ہے اسی طرح فَلَا تُنْظِرُوْنَ میں بھی یاء محذوف ہے یعنی تم اور تمہارے معبود جس قدر ہو سکے میرے خلاف تدبیریں کرو اور مجھے دکھ پہنچانے کی کوشش کرو اور قطعاً مجھے مہلت نہ دو چونکہ میرا اعتماد اللہ پر ہے اس لئے مجھے تمہاری کوئی پروا نہیں۔

اِنَّ وَلِيِّۦَ بے شک میرا حامی اور محافظ اللہ ہے جس نے کتاب یعنی قرآن نازل فرمائی ہے اور وہی اپنے نیک بندوں کی حفاظت و مدد کرتا ہے انبیاء کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جو لوگ اللہ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے ان کی مدد کا ذمہ دار اللہ ہوتا ہے دشمنوں کی دشمنی ان کو ضرر نہیں پہنچا سکتی۔ وَالَّذِيْنَ سے يَنْصُرُوْنَ تک پروا نہ کرنے کی علت کی تکمیل ہے۔

لَا يَسْمَعُوْا وہ یعنی بت نہیں سنتے۔ وَتَرٰىهُمْ اور اے مخاطب تجھے وہ نظر آتے ہیں کہ تیری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ کچھ نہیں دیکھتے چونکہ مشرکوں نے اپنے معبودوں کی مورتیاں انسانی شکل کی بنا رکھی تھیں تو دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ یہ ہماری طرف رہے ہیں۔ حسن بصری نے لَا يَسْمَعُوْا اور تَرٰىهُمْ کی ضمیریں مشرکوں کی طرف راجع کی ہیں یعنی اگر مشرکوں کو آپ اسلام کی دعوت دیں تو وہ دلوں سے نہیں سنتے، کچھ نہیں سمجھتے بظاہر آنکھوں سے آپ کی طرف دیکھتے نظر آتے ہیں مگر دل کی آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾

(سرسری برتاؤ قبول کر لیا کیجئے اور نیک کام کی تعلیم کر دیا کیجئے اور جاہلوں سے کنارہ کش ہو جایا کیجئے اور اگر شیطان کی طرف سے وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے، یہ حقیقت ہے کہ وہ خوب سننے والا اور خوب جاننے والا ہے)۔

حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ اور مجاہدؒ کا بیان ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ لوگوں کی طرف سے سرسری برتاؤ اور سہل ترین اعمال کو قبول کریں مثلاً کوئی عذر کرے تو عذر قبول کر لیں عفو اور سہولت سے کام لیں چھان بین اور احوال کا تجسس نہ کریں، ایسی بات کے لوگوں سے طلب گار نہ ہوں جس کو پیش کرنا ان کے لئے دشوار اور ناگوار ہو، اس تفسیر پر عفو کا معنی ہوگا سرسری برتاؤ، کوشش اور جہد کی ضد۔

بعض علماء کے نزدیک عفو سے مراد ہے مجرموں اور گناہ گاروں کو معاف کر دینا۔ بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ عیینہ بن حصین بن حذیفہ اپنے بھتیجے حر بن قیس کے پاس آکر ٹھہرا، حر حضرت عمرؓ کے مقربین میں سے تھے، حضرت عمرؓ کے اہل مجلس اور مشیر قراء ہوتے تھے، جوان ہوں یا بوڑھے عیینہ نے حر سے کہا بھتیجے کسی تدبیر سے تم

ان سے (یعنی حضرت عمرؓ سے) اجازت لے سکتے ہو کہ وہ مجھے اپنے پاس حاضر ہونے کی اجازت دے دیں، حر نے وعدہ کر لیا اور حضرت عمرؓ سے عینیہ کے حاضر ہونے کی اجازت طلب کی، آپ نے اجازت دے دی عینیہ حاضر ہوا اور کہنے لگا ابن خطابؓ خدا کی قسم تم ہم کو کچھ زیادہ مال نہیں دیتے نہ ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ کرتے ہو، (گویا تقسیم مال میں جائر اور فصل مقدمات میں ظالم ہو) حضرت عمرؓ کو یہ سن کر اتنا غصہ آیا کہ قریب تھا عینیہ پر حملہ کر دیں (یا کوئی سخت حکم دے دیں) حسن نے کہا امیر المومنین اللہ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا ہے خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ اور یہ شخص جاہل ہے۔ حضرت عمر آیت کے مطابق فوراً رک جاتے تھے آپ کی یہ عادت ہی تھی۔ جب یہ آیت سنی تو پھر اس آیت کے حکم سے آگے نہیں بڑھے۔

حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بندے حساب کے لئے رک کے کھڑے ہوں گے .... الخ اس حدیث میں ہے پھر ایک منادی ندا کرے گا جس کا اجر اللہ کے ذمہ ہو وہ کھڑا ہو جائے اور جنت میں داخل ہو جائے، لوگ کہیں گے اللہ کے ذمہ کس کا اجر ہو سکتا ہے، منادی کہے گا لوگوں کو معاف کر دینے والوں کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، یہ سن کر اتنے اتنے ہزار لوگ کھڑے ہو جائیں گے اور بلا حساب کے جنت میں چلے جائیں گے، رواہ الطبرانی باسناد حسن۔

روایت میں آیا ہے کہ یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا جبرئیلؑ اس کا مطلب کیا ہے، جبرئیلؑ نے کہا مجھے نہیں معلوم اللہ سے دریافت کر کے بتاؤں گا کچھ دیر کے بعد جبرئیلؑ لوٹ کر آئے اور کہا آپ کے رب نے آپ کو حکم دیا ہے جو تم سے (قرابت) کاٹے تم اس سے جوڑو، جو تم کو محروم رکھے تم اس کو دو، جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کرو، رواہ ابن مردویہ عن جابر و ابن ابی الدنیا و ابن جریر و ابن ابی حاتم عن الشعبی مرسلاً۔

حضرت ابیؓ بن کعبؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص (جنت کے اندر) اپنے مکان کا بلند ہونا اور درجات کا اونچا ہونا پسند کرتا ہو اس کو چاہئے کہ جو شخص اس کی حق تلفی کرے اس سے درگذر کرے اور جو اس سے قرابت منقطع کرے وہ اس سے قرابت جوڑے رکھے، رواہ الحاکم و قال صحیح الاسناد، مگر اس حدیث کی سند منقطع ہے۔

حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا برابر دینے والا واصل (قرابت) نہیں۔ قرابت جوڑنے والا وہ ہے کہ اگر اس کی رشتہ داری توڑی جائے تو وہ جوڑے رکھے، رواہ البخاری۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے کچھ قرابت دار ہیں کہ میں ان سے جوڑتا ہوں تو وہ کاٹتے ہیں، میں ان سے بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں، میں ان کی طرف سے برداشت کرتا ہوں اور وہ میرے خلاف جہالت کرتے ہیں (برداشت سے کام نہیں لیتے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تو ایسا ہی ہے جیسا تو کہہ رہا ہے تو تو ان کو بھوبل (گرم راکھ) پھنکا رہا ہے اور جب تک تو اس سلوک پر قائم رہے گا برابر اللہ کی طرف سے ایک مددگار تیرے ساتھ رہے گا، رواہ مسلم۔

حضرت ابن عباسؓ ضحاک اور کلبی نے آیت کا معنی اس طرح بیان کیا ہے وہ مال لیلو جو عفو ہو یعنی جو مال اہل وعیال کی ضرورت سے فاضل ہو وہ لیلو، آیت یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ میں بھی عفو کا یہی معنی ہے (یعنی وہ پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کیا دیں آپ کہہ دیجئے کہ جو مال اہل وعیال کی ضرورت سے بچا ہوا ہو (وہ سب دے دو) آئندہ زکوٰۃ فرض کر دی گئی تو یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔

وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ یعنی جو فعل شرعاً اور عقلاً اچھا ہے اس کا حکم دیجئے۔ حضرت سعید خدری (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جو شخص کسی بری بات کو دیکھے اس کو اپنے ہاتھ سے بدل ڈالے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان ہی سے روکے، اگر ایسا بھی نہ کر سکتا ہو تو دل سے ہی (اس سے نفرت کرے) اور یہ ضعیف ترین ایمان (کا درجہ) ہے، رواہ مسلم۔

حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے (یا تو) تم بھلائی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے ورنہ اغلب ہے کہ اللہ اپنی طرف سے تم پر عذاب بھیج دے گا اس وقت تم دعا کرو گے مگر تمہاری دعا قبول نہ ہو گی، رواہ الترمذی۔

وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ یعنی اگر کوئی جاہل تمہارے خلاف حماقت کرے تو تم بے وقوفی اور سبک سری سے اس کا مقابلہ نہ کرو اور اس کے برتاؤ کی طرح خود برتاؤ نہ کرو۔ اس مفہوم کو بیان کیا ہے آیت وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا میں۔ حضرت امام جعفرؒ صادق نے فرمایا اللہ نے اپنے پیغمبر کو برگزیدہ اخلاق اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور قرآن میں کوئی اور آیت اس آیت سے بڑھ کر مکارم اخلاق کی جامع نہیں ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے مجھے اخلاق برگزیدہ اور محاسن افعال کی تکمیل کے لئے بھیجا ہے، رواہ البغوی۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ فحش گو نہ تھے، نہ فحش پسند، نہ بازاروں میں چیخ و پکار کرنے والے تھے، نہ آپ برائی کا بدلہ برائی سے دیتے تھے بلکہ معاف فرمادیتے اور درگزر کرتے تھے، رواہ الترمذی والبغوی۔

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ، اِمَّا میں مَا زائدہ ہے اِن شرطیہ ہے، نَزْغٌ کا معنی ہے انگلیوں کے پوروں سے کچوکا دینا، ٹھوکا دینا۔ اس جگہ مراد ہے شر پر برانگیختہ کرنا، ابھارنا، وسوسہ ڈالنا۔

عبدالرحمن بن زید کا بیان ہے جب آیت خُذِ الْعَفْوَ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے عرض کیا میرے رب سخت غصہ (کی حالت) ہو تو عفو کی کیا صورت ہو گی اس پر آیت وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ الخ نازل ہوئی۔

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ تو اللہ سے بچاؤ کی طلب کرو اللہ کی پناہ مانگو، امر کا جواب محذوف ہے یعنی اللہ شیطان کے اغواء اور وسوسہ کو رفع کر دے گا۔

اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ وہ بلاشبہ آپ کی بات کو سنتا اور آپ کی پناہ جوئی کو جانتا ہے اور جس بات میں آپ کے کام کی درستی ہو اس سے واقف ہے یا یہ مطلب ہے کہ آپ کو دکھ پہنچانے والوں کی باتوں کو اللہ سنتا اور ان کے اعمال کو جانتا ہے وہ خود ان کو بدلہ دے گا آپ کو انتقام لینے اور شیطان کا اتباع کرنے کی ضرورت نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾ (بے شک جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں جب ان کو شیطانی وسوسہ آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور جو شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کو گمراہی میں کھینچتے ہیں پھر وہ باز نہیں آتے)۔

طٰٓئِفٌ یہ لفظ یاطاف یَطُوْفُ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اس سے مراد ایک شیطانی وسوسہ ہے گویا یہ وسوسہ اور شیطانی خیال اہل تقویٰ کے چہار سمت گھومتا ہے مگر متقیوں پر اثر انداز ہونے پر اس کا قابو نہیں چلتا یا طَافَ بِهِ الْخَيَالُ سے ماخوذ ہے اس کے اندر ایک تصویر خیالی آگئی (اس وقت طَآئِفٌ کا مادہ طیف ہو گا طوف نہ ہو گا)۔

مِنَ الشَّيْطٰنِ اس سے مراد جنس شیطان ہے خواہ ایک ہو یا چند، اسی لئے اِخْوَانُهُمْ میں جمع مذکر کی ضمیر اَلشَّيْطٰن کی طرف راجع کی ہے۔ تَذَكَّرُوْا وہ یاد میں لگ جاتے ہیں یعنی اللہ کے امر و نہی اور ثواب و عذاب کو یاد کرتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں کہ یہ شیطانی خیال ہے۔ فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ تو یکایک وہ متقی روشن نظر ہو جاتے ہیں وہ گناہ کے مقام اور شیطان کے جال کو دیکھ لیتے ہیں اور اس سے بچ جاتے ہیں، شیطانی خیال کے پیچھے نہیں لگ جاتے۔

سدی نے کہا متقی پھسلتے ہی لوٹ پڑتا ہے۔ مقاتل نے کہا متقی کو اگر کوئی شیطانی کچوکا لگتا ہے تو وہ فوراً یاد کرتا اور سمجھ لیتا ہے کہ یہ گناہ ہے یہ جانتے ہی اس کی (دل کی) آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی سے نکل آتا ہے۔ یہ آیت

سابق کلام کی معنوی تاکید ہے۔
وَاِخْوَانُهُمْ یعنی شیطانوں کے بھائی، مراد فاسق بدکار لوگ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اخون سے مراد شیاطین ہوں اور اِخْوَانُهُمْ کی ضمیر اَلْجَاهِلِیْنَ کی طرف راجع کی جائے جاہلوں کے بھائی یعنی شیطان یَمُدُّوْنَهُمْ یعنی شیاطین ان کی مدد کرتے ہیں ابھارتے ہیں، برانگیختہ کرتے ہیں، سہولت پیدا کرتے ہیں یا وہ شیطانوں کو مدد دیتے ہیں شیاطین کے کہنے پر چلتے ہیں ان کے احکام کا اتباع کرتے ہیں۔
ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ پھر اہل فسق گمراہی سے باز نہیں آتے، ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں، برخلاف اہل تقویٰ کے کہ شیطانی خیال آتے ہی وہ اللہ کے احکام کو یاد کرتے ہیں اور آنکھیں کھول لیتے ہیں۔ ضحاک اور مقاتل نے یہی مطلب بیان کیا ہے یا یہ مطلب ہے کہ وہ شیاطین کو اغوا کرنے سے نہیں روکتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نہ تو انسان اپنی بدکاری سے باز آتے ہیں نہ شیاطین ان سے رکتے اور باز رہتے ہیں۔

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰیَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَیْتَهَاؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ (اور اگر آپ کوئی معجزہ ان پر پیش نہیں کرتے تو کہتے ہیں آپ معجزہ کیوں نہیں لائے۔ آپ کہہ دیجئے کہ میں اس حکم کا اتباع کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے میرے پاس وحی کے ذریعہ سے پہنچتا ہے یہ حکمتوں کا مجموعہ ہے تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں۔

بِاٰیَةٍ آیت سے مراد قرآن مجید کی آیات یا کافروں کا طلب کیا ہوا معجزہ۔
لَوْلَا اجْتَبَیْتَهَا آپ از خود تراش کر کیوں نہیں لائے، عرب کہتے ہیں اِجْتَبَیْتُ الْكَلَامَ میں نے بات خود گڑھ لی۔
کلبی کا بیان ہے کہ مکہ والے محض ضد اور دشمنی کے زیر اثر رسول اللہ ﷺ سے آیات کے طلب گار ہوتے تھے اور جب آیات (کے ظہور یا نزول) میں دیر ہو جاتی تو کہتے آپ نے (حسب سابق) خود اپنی طرف سے آیات کیوں نہ بنالیں اس کی تردید میں اللہ نے یہ کہنے کا حکم دیا کہ آپ کہہ دیجئے اِنَّمَا اَتَّبِعُ میں از خود آیات نہیں بناتا یا اپنی طرف سے آیات طلب نہیں کرتا، جو رب کی طرف سے بھیج دی جاتی ہیں ان کا اتباع کرتا ہوں۔
هٰذَا یہ قرآن بَصَآئِرُ بصیرتوں کا مجموعہ ہے۔ دل اس کے ذریعہ سے حق کا باطل سے اور صحیح کا غلط سے امتیاز کر لیتے ہیں یا یہ قرآن دلائل اور براہین کا مجموعہ ہے جن سے میرے دعوی کی سچائی ظاہر ہوتی ہے۔

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ (اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو اس امید پر کہ تم پر رحمت ہو گی)۔
ابو عیاض کے طریق سے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ لوگ نماز میں باتیں کر لیتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ رواہ ابن جریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم و ابو الشیخ و ابن مردویہ و ابن ابی شیبۃ فی المصنف والبیہقی فی السنن۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے آواز اونچی کرنے کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔
حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں مشغول تھے میں نے جا کر سلام کیا آپ نے جواب نہ دیا، اس سے پہلے لوگ نماز میں کلام کر لیا کرتے تھے اور اپنے کام کے لئے کہہ دیا کرتے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر حضور ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ نازل ہوئی، رواہ ابن ابی حاتم مردویہ۔
حضرت عبداللہ بن مغفل کی روایت ہے کہ لوگ نماز میں کلام کر لیا کرتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے نماز میں بولنے کی ممانعت فرما دی، اخرجہ ابن مردویہ والبیہقی فی السنن۔

قتادہ کی روایت ہے کہ شروع میں جب لوگوں کو نماز کا حکم دیا گیا تو وہ نماز میں بات کر لیا کرتے تھے آدمی آتا لوگ نماز میں مشغول ہوتے تو آنے والا پوچھ لیتا کہ تم کتنی نماز پڑھ چکے پڑھنے والے بتا دیتے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور کان لگا کر سننے اور خاموش رہنے کا حکم دے دیا گیا، اخرجہ عبدالرزاق و عبد بن حمید و ابوالشیخ و ابن جریر و البیہقی۔ ضحاک کا بیان ہے کہ لوگ نماز میں بولا کرتے تھے اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی، اخرجہ عبد بن حمید۔ ان تمام روایات سے ثابت ہو رہا ہے کہ نماز میں بات کرنے کی ممانعت کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔

امام اعظمؒ کا قول ہے اور ایک روایت میں امام احمد کا بھی یہی قول آیا ہے کہ نماز میں کلام کرنا تھوڑا ہو یا بہت قصداً ہو یا بھول کر یا سہو سے ہو یا جہراً یا حرمت کلام سے ناواقفیت کی حالت میں بہرحال نماز کو توڑ دیتا ہے ہاں اگر یہ خیال نہ رہے کہ نماز میں مشغول ہوں اور سلام کر لے تو نماز باطل نہیں ہوتی، باقی تینوں اماموں کے نزدیک اگر بھول کر نماز میں بات کر لی یا سلام کر لیا یا حرمت کلام سے واقف نہیں ہے اور سلام کلام کر لیا یا بے ساختہ منہ سے سلام کلام نکل گیا تو نماز نہیں ٹوٹتی، خواہ کلام کتنا ہی طویل ہو، امام شافعیؒ کا قول صحیح ترین روایت میں یہ آیا ہے کہ بھول کر یا ناواقفیت کی حالت میں اگر طویل کلام کر لے گا تو نماز ٹوٹ جائے گی۔

امام مالکؒ کا قول ایک روایت میں آیا ہے کہ قصداً ایسا کلام کرنا جس کا تعلق نماز سے نہ ہو مثلاً نابینا کو راستہ سے آگاہ کرنا، گمراہ کو راستہ بتانا وغیرہ نماز کو باطل نہیں کرتا، ائمہ ثلثہ کے اتفاقی قول کی دلیل حضرت ابوہریرہؓ کی مندرجہ ذیل روایت ہے جو ابن سیرینؒ کے توسط سے آئی ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ہم کو مغرب یا عشاء کی نمازوں میں سے کوئی نماز پڑھائی، دو رکعتیں پڑھ کر آپ نے سلام پھیر دیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ غصہ کی حالت میں ہیں، مسجد کے اندر ایک تختہ پڑا ہوا تھا آپ نے اس سے کچھ سہارا لگا لیا دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر انگلیوں کا جال بنا لیا اور دایاں رخسار بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ لیا، میں جلد جلد مسجد سے نکل گیا لوگ آپس میں کہنے لگے کیا نماز میں قصر ہو گیا، لوگوں میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ بھی موجود تھے مگر حضور ﷺ کے ڈر سے وہ کچھ نہ بول سکے۔ ایک آدمی اور تھا جس کے ہاتھ کسی قدر لمبے تھے اس لئے ان کو ذوالیدین کہا جاتا تھا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا نماز میں قصر ہو گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا نہ مجھے نسیان ہوا ہے نہ نماز میں قصر ہوا ہے (میں نے پوری نماز پڑھا دی) پھر حضور ﷺ نے (لوگوں سے خطاب کر کے) فرمایا کیا ایسا ہی ہوا ہے جیسا ذوالیدین کہہ رہا ہے صحابہؓ نے عرض کیا جی ہاں فوراً حضور ﷺ آگے بڑھ گئے اور جتنی نماز رہ گئی تھی پوری کی پھر سلام پھیر کر اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کو چلے گئے اور معمولی سجدہ کی طرح یا اس سے لمبا سجدہ کیا پھر سر اٹھایا پھر اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کو چلے گئے اور معمولی سجدہ کی طرح یا اس سے لمبا سجدہ کیا پھر سر اٹھا کر اللہ اکبر کہا پھر سلام پھیر دیا۔

ابن سیرین سے لوگ اکثر پوچھتے تھے تو ابن سیرین جواب دیتے تھے مجھے اطلاع ملی ہے کہ عمران بن حصین نے کہا پھر سلام پھیر دیا (یعنی یہ آخری لفظ ابوہریرہؓ کی روایت میں نہیں ہے) رواہ الشیخان فی الصحیحین حضرت عمران بن حصین کی روایت ہے کہ ایک روز عصر کی تین رکعت پڑھ کر حضور ﷺ اندر گھر میں تشریف لے گئے، ایک شخص نے جس کا نام خرباق تھا اور اس کے ہاتھ کسی قدر لمبے تھے، اٹھ کر حضور ﷺ کو یاد دہانی کی، حضور ﷺ چادر کھینچتے ہوئے باہر تشریف لائے۔ معلوم ہوتا تھا سخت غصہ کی حالت میں ہیں اور فرمایا کیا یہ سچ کہتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا جی ہاں۔ آپ نے فوراً ایک رکعت پڑھ کر سلام پھیر کر دو سجدے کئے پھر سلام پھیرا، رواہ مسلم۔ اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ نے جس وقت کلام کیا اس وقت آپ کو یقین تھا کہ نماز پوری ہوئی ہے اور آپ نماز کی حالت میں نہیں ہیں اور ذوالیدین کی بھی یہی حالت تھی (ان کو بھی یقین تھا کہ نماز پوری ہو گئی اور اسی حالت میں انہوں نے کلام کیا تھا) کیونکہ منسوخ ہو جانے کا (ان کی نظر میں) امکان تھا اس حدیث کی روایت پر حسب ذیل اعتراضات کئے گئے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ ۷ھ میں مسلمان ہوئے اور حضرت ذوالیدین کی شہادت بدر ۲ھ کی جنگ میں ہوئی پھر یہ کہنا کس

طرح صحیح ہوگا کہ رسول اللہ نے ہم کو نماز پڑھائی۔ حدیث میں اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب نماز میں بولنا جائز تھا اسی لئے حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ اور دوسرے لوگوں نے قصداً کلام کیا۔

حدیث کے اول اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ائمہ حدیث کے نزدیک بالاتفاق یہ حدیث صحیح ہے حضرت ذوالشمالین کی شہادت جنگ بدر میں ہوئی تھی حضرت ذوالیدین تو رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی زندہ تھے، ذوالیدین کا نام حضرت عمران بن حصین کی روایت میں خرباق آیا ہے اور حضرت ذوالشمالین کا نام عمیر تھا۔ درحقیقت یہ اعتراض زہری کی روایت پر پڑتا ہے جس میں آیا ہے کہ ذوالشمالین کھڑے ہوئے۔ ابوداؤد سجستانیؒ نے لکھا ہے کہ زہری کو نام میں دھوکہ ہو گیا انہوں نے خیال کر لیا کہ ذوالشمالین اور ذوالیدین دونوں ایک شخص کے نام تھے اس لئے روایت میں بجائے ذوالیدین کے انہوں نے ذوالشمالین کہہ دیا۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں کوئی اختلاف نہیں، تین رکعت پڑھ کر سلام پھیرنے کی حدیث تو حضرت عمران بن حصین کی روایت سے آئی ہے جو مسلم کے روای ہیں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث زیادہ صحیح ہے پھر اگر تعداد میں شک بھی ہو تب بھی کوئی حرج نہیں، اہل حدیث تو محفوظ ہے اور بھول کر بات کرنے کا ثبوت موجود ہے۔

رہا کلام کا نماز میں حرام ہو جانا تو زید بن ارقم (جو مدنی تھے) کا قول ہے کہ ہم نماز میں بات کر لیا کرتے تھے یہاں تک کہ آیت وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ نازل ہوئی اور ہم کو خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ ابو سلیمان خطابی نے لکھا ہے کہ ہجرت سے کچھ مدت کے بعد ہی نماز میں کلام کرنے کی اجازت منسوخ کر دی گئی۔ دونوں قولوں پر حضرت ابو ہریرہؓ کے اسلام سے پہلے یقیناً نماز کے اندر کلام کرنے کی ممانعت ہو گئی تھی باقی حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ اور دوسرے لوگوں کے کلام کرنے سے استدلال تو اس کا جواب دو طرح سے دیا گیا ہے۔

۱...... حماد بن زید نے جو ایوب کی روایت بیان کی ہے اس میں آیا ہے کہ لوگوں نے اشارہ سے ہاں کہنے کا اظہار کیا تھا یعنی زبان سے ہاں نہیں کہا تھا لہٰذا جس روایت میں ہاں کہنے کا ذکر آیا ہے اس سے مراد بھی اشارہ سے ہاں کا اظہار کرنا ہے۔

۲...... رسول اللہ ﷺ کے سوال کا جواب دینا اس وقت تک منسوخ نہیں ہوا تھا کیونکہ حضرت ابو سعید بن معلیٰؓ کا بیان ہے کہ میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا اسی دوران میں رسول اللہ ﷺ نے مجھے آواز دی میں نے جواب نہیں دیا پھر (نماز ختم کرنے کے بعد) جب حاضر خدمت ہوا تو عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا اللہ نے نہیں فرمایا ہے۔ اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ، رواہ البخاری۔

امام ابو حنیفہؒ نے اپنے قول کے استدلال میں حضرت معاویہ بن حکمؓ کی حدیث پیش کی ہے۔ حضرت معاویہؓ کا بیان ہے۔ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ مقتدیوں میں سے کسی کو چھینک آئی میں نے کہا یرحمک اللہ لوگوں نے مجھے گھور کر دیا۔ میں نے کہا ہائے ہائے تم کیوں مجھے گھور کر دیکھ رہے ہو لوگوں نے اپنے ہاتھ رانوں پر مارے۔ جب میں نے دیکھا کہ لوگ مجھے خاموش کر رہے ہیں تو میں چپ ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ چکے تو مجھے طلب کیا میرے ماں باپ حضور ﷺ پر قربان میں نے نہ آپ سے پہلے ایسا اچھی تعلیم دینے والا معلم دیکھا نہ حضور ﷺ کے بعد، آپؐ نے نہ میرے مکا مارا نہ برا کہا نہ ضرب رسید کی بلکہ فرمایا یہ نماز ہے اس میں لوگوں کی کسی طرح کی بات درست نہیں، یہ تو صرف تسبیح، تکبیر اور قرآن کی قرأت ہے، رواہ مسلم۔

حضرت جابر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کلام نماز کو توڑ دیتا ہے وضو کو نہیں توڑتا، رواہ الدار قطنی۔

اول حدیث کا جواب یہ ہے کہ یہ تو امام اعظمؒ کے قول کی تائید میں نہیں بلکہ خلاف جاری ہے اس حدیث میں یہ ذکر نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معاویہؓ کو نماز لوٹانے کا حکم دیا بلکہ ان کو نماز کے احکام کی تعلیم دی اور فرمایا بات کرنا درست نہیں نماز میں کلام ممنوع ہے۔ رہی دوسری حدیث تو اس میں ایک راوی ابو سیبہ ہے جس کا نام عبد الرحمٰن بن اسحاق ہے۔ یحییٰ بن معین نے اس کو ضعیف کہا ہے اور امام احمد نے فرمایا ہے کہ اس کی روایت کچھ نہیں ہے یہ منکر الحدیث ہے اگر یہ منفرد ہو تو اس کی

روایت سے استدلال صحیح نہیں ہے۔ ابن حبان کا بھی بیان ہے۔ سعید بن جبیر عطاء اور مجاہد کا بیان ہے کہ آیت اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ کا نزول جمعہ کے خطبہ کے متعلق ہوا، امام جمعہ کا خطبہ پڑھ رہا ہو تو خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سیوطی نے اسی قول کو پسند کیا ہے ہم نے خطبہ کے دوران خاموش رہنے کا مسئلہ سورۂ جمعہ کی تفسیر میں بیان کر دیا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا ہر واعظ کے وعظ کے وقت خاموش رہنے کا حکم ہے۔ کلبی کا بیان ہے کہ نماز میں جب لوگ جنت اور دوزخ کا تذکرہ سنتے تھے تو چیخ پڑتے تھے۔ یعنی جنت کی دعا اور دوزخ سے پناہ مانگتے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نماز کے اندر امام کے پیچھے آواز سے قرات نہ کرنے کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے۔ بغوی نے بروایت زید بن اسلمؓ، حضرت ابوہریرہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز کے اندر لوگ اونچی آوازیں کرتے یعنی اونچی آواز سے قرأت کرتے تھے تو اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

بغویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت مقدادؓ نے لوگوں کو امام کے ساتھ (نماز پڑھتے وقت) قرات کرتے سنا تو نماز ختم کرنے کے بعد فرمایا کیا ابھی تم کو اتنی سمجھ بھی نہیں ہوئی کہ جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو جیسا کہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حسن، زہری اور نخعی کا قول بھی یہی ہے کہ اس آیت کا نزول امام کے پیچھے قرأت کرنے کے سلسلہ میں ہوا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ آیت کا نزول جمعہ کے خطبہ کے متعلق ہوا ان کے قول سے حسن و زہری کا قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ آیت مکی ہے اور نماز جمعہ کا وجوب مدینہ میں ہوا تھا۔

بیہقیؒ نے لکھا ہے کہ امام احمد نے فرمایا سب لوگوں کا اتفاق ہے کہ اس آیت کا نزول نماز کے متعلق ہوا ھکذا قال ابن ھمام۔

بغوی نے مجاہد کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں قرات کر رہے تھے کہ ایک انصاری جوان کو آپ نے قرأت کرتے سنا اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ ہم نے امام کے پیچھے قرات کرنے کا مسئلہ سورۂ مزمل کی آیت فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کی تفسیر میں مفصل لکھ دیا ہے۔

ابن جریر نے زہری کی روایت نقل کی ہے کہ اس آیت کا نزول ایک انصاری جوان کے حق میں ہوا رسول اللہ ﷺ جب قرأت کر رہے تھے تو وہ بھی اس کی قرأت کر رہا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے مراد نماز سے باہر قرأت کرنا ہے۔ کیونکہ سعید بن منصور کا قول ہے کہ محمد بن کعب نے فرمایا لوگ رسول اللہ ﷺ سے سیکھتے تھے جب حضور کچھ پڑھتے تھے تو لوگ بھی آپ کے ساتھ پڑھتے تھے یہاں تک کہ سورۂ اعراف میں یہ آیت نازل ہوئی۔ لباب النقول فی اسباب النزول کے مولف نے لکھا ہے اس روایت سے بظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ آیت مدنی ہے۔

فصل

اگر کوئی شخص نماز سے باہر ہو اور نماز کے اندر یا نماز سے باہر کسی کو قرآن پڑھتے سنے تو کیا کان لگا کر سننا اور خاموش رہنا واجب ہے، یہ اختلافی مسئلہ ہے علماء کا اس میں اختلاف ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ عام علماء کے نزدیک صورت مذکورہ میں قرآن کا کان لگا کر سننا مستحب ہے (واجب نہیں) ابن ہمام نے لکھا ہے ہمارے علماء کا کلام دلالت کر رہا ہے کہ اگر قرآن آواز سے پڑھا جا رہا ہو تو کوئی نماز کے اندر ہو یا نماز کے باہر بہرحال کان لگا کر سننا واجب ہے۔ خلاصہ میں لکھا ہے اگر کوئی شخص فقہ کی کوئی تحریر لکھ رہا ہے اور اس کے برابر کوئی شخص قرآن ایسی آواز سے پڑھ رہا ہو کہ لکھنے والے کو کان لگا کر سننا ممکن نہ ہو تو گناہ پڑھنے والے پر ہوگا، اسی پر مبنی ہے یہ مسئلہ کہ اگر رات کے وقت چھت پر کوئی شخص چلا کر قرآن پڑھے جب کہ لوگ سو رہے ہوں تو گناہ گار ہوگا، اس میں کان لگا کر سننے کا وجوب صراحتہ مذکور ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سبب نزول خواہ خاص ہو مگر حکم اسی پر محدود نہ ہوگا الفاظ کے عموم کا اعتبار ہے۔

میں کہتا ہوں حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو بلند آواز سے قرآن اس طرح پڑھتے تھے کہ حجرہ سے باہر والے بھی سن لیتے تھے اور اکثر ہمسائے بھی سنتے تھے، رواہ الترمذی والنسائی وابن ماجۃ عن ام ہانیؓ۔

حضرت ام ہانی کا بیان ہے کہ میں اپنی چھت پر ہوتی تھی اور رسول اللہ ﷺ کے رات کو قرآن پڑھنے کی آواز سنتی تھی۔ اس حدیث میں لفظ عریش آیا ہے بغوی نے شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ عریش کا معنی ہے چھت؛ مکہ کے گھروں کو عریش اس لئے کہتے تھے کہ وہ ٹانڈ کی طرح لکڑی کے ستونوں پر نصب کئے جاتے تھے (جن کے اوپر لوگ سوتے لیٹتے بیٹھتے تھے) اور ان کا سائبان ہو جاتا تھا ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ گھر کے اندر رسول اللہ ﷺ کی قرات اس اندازہ پر ہوتی تھی کہ حجرہ سے باہر والے سن لیتے تھے اور حضور ﷺ کے گھروں کے اندر بیبیاں موجود ہوتی تھیں اور حضور ﷺ کے نماز مشغول ہونے کے وقت بعض بیبیاں سوتی بھی ہوتی تھیں۔ بخاری نے صحیح میں حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے سوتی ہوتی تھی میرے دونوں پاؤں آپ ﷺ کے قبلہ کی طرف ہوتے تھے جب آپ سجدہ کرتے تو مجھے دبا دیتے، میں ٹانگیں سمیٹ لیتی پھر جب آپ سجدہ سے کھڑے ہو جاتے تو میں ٹانگیں پھیلا لیتی اس وقت گھروں میں چراغ نہ ہوتے تھے۔ صحابہؓ رات دن بلند آواز سے قرآن پڑھا کرتے تھے اور کوئی مخالفت نہ کرتا تھا۔

مسلم نے حضرت ابو موسیٰؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا مجھے وہ منظر نظر آرہا ہے کہ رات تم قرآن پڑھ رہے تھے اور میں تمہاری قرأت سن رہا تھا۔ صحیحین میں حضرت ابو موسیٰؓ کا بیان منقول ہے آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ میرے ہم سفر اشعری جب رات کو قرآن پڑھتے تھے تو دوران سفر میں، میں ان کی آوازیں پہچان لیتا تھا اور آوازوں سے رات کو ان کی فرودگاہیں بھی پہچان لیتا تھا باوجودیہ کہ دن میں مجھے معلوم نہ ہوتا تھا کہ رات کو انہوں نے کہاں کہاں پڑاؤ کیا اور یہ حقیقت ہے کہ جب اشعری لوگ قرآن پڑھتے ہوں گے تو کچھ لوگ لشکر میں سونے کی حالت میں بھی پڑھنے کی آوازیں سنیں اور فرمایا اور ان لوگوں کے لئے بشارت ہو یہ رسول اللہ ﷺ کو بڑے پیارے تھے۔ یہ تمام احادیث دلالت کر رہی ہیں کہ مصنف خلاصہ کا فتویٰ غلط ہے۔

ابن مردویہ نے ابو اسامہ از سفیان از ابی المقدام ہشام بن زید از معاویہؓ بن قرہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ معاویہؓ نے کہا میں نے صحابہؓ میں سے اپنے بعض مشائخ سے (غالباً معاویہؓ نے حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کا نام لیا تھا) دریافت کیا کہ جو شخص قرآن سنے کیا اس پر کان لگا کر سننا اور خاموش رہنا واجب ہے انہوں نے جواب دیا کہ آیت اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا امام کے پیچھے قرأت کرنے کی ممانعت کے لئے نازل ہوئی تھی۔

میں کہتا ہوں کہ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ میں اَلْقُرْاٰنُ میں الف لام عہد کے لئے ہے جنس کے لئے نہیں ہے اس سے مراد وہ قرآن ہے جو پڑھنے والا تمہارے سنانے کو پڑھ رہا ہو جیسے امام مقتدیوں کو سنانے کے لئے پڑھتا ہے یا خطیب اہل مجلس کو خطاب کرنے کے وقت پڑھتا ہے یا قاری شاگردوں کو سکھانے کے لئے پڑھتا ہے۔ واللہ اعلم۔

فصل

اگر پڑھنے والا خود یا امام نماز میں قرأت کے اندر جنت اور دوزخ کا تذکرہ پڑھے تو (جنت میں داخل ہونے کی) دعا نہ مانگنا اور دوزخ میں داخل ہونے سے) پناہ نہ مانگنا واجب ہے دعا اور تعوذ جائز نہیں۔ کلبی کا قول ہم نے اوپر ذکر کر دیا ہے۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ قرآن سننے کے وقت کان لگانے اور خاموش رہنے والے سے اللہ نے رحمت کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد فرمایا ہے فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اور اللہ کا وعدہ غلط نہیں ہو سکتا اور قرآن کی طرف سے غافل ہو کر دعا کرنا اور اس دعا کا قبول ہونا کوئی قطعی یقین نہیں ہے۔

مسئلہ :- منفرد آدمی فرض نماز میں قرأت کو چھوڑ کر کسی دعا یا تعوذ میں مشغول نہ ہو ہاں نفل نماز میں اگر تلاوت کے وقت جنت یا دوزخ کا ذکر آئے تو جنت کے لئے دعا کرے اور دوزخ سے پناہ مانگے اور آیت پر غور کرے۔ حضرت حذیفہؓ کا بیان ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رات کی یعنی تہجد کی نماز پڑھی جب حضور ﷺ کوئی ایسی آیت پڑھتے تھے جس میں جنت کا ذکر ہوتا تھا تو رک کر اللہ سے جنت کے لئے درخواست کرتے اور اگر ایسی آیت پڑھتے جس میں دوزخ کا ذکر ہوتا تو ٹھہر جاتے اور دوزخ سے محفوظ رہنے کے لئے دعا کرتے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ (اور (آپ ہر شخص سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ) اپنے رب کی یاد کرو اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ صبح اور شام اور غفلت کرنے والوں میں شامل نہ ہو جاؤ)۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ذکر سے مراد نماز کی قرات ہے مطلب یہ ہے کہ سری نماز میں چپکے چپکے اپنے دل میں قرأت کیا کرو۔

وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ، الجہر سے مراد ہے جہری نماز۔ دُوْنَ الْجَهْرِ سے مراد ہے جہر سے کم اور سر سے زیادہ۔ مطلب یہ کہ سری نماز جہر سے کم آواز سے قرأت کرو اور جہری میں کھلی آواز سے کرو، مگر بالکل چیخ کر نہ پڑھو بلکہ سکون اور پست آواز ہی سے پڑھو کہ پیچھے والا سن لے۔ حضرت ابن عباسؓ نے آیت کی تفسیر اسی طرح کی ہے۔ اس صورت میں ودون الجہر کا عطف فِيْ نَفْسِ پر ہوگا۔ **میں کہتا ہوں** یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ قرآن متوسط آواز سے پڑھو، نہ بالکل ہی چپکے چپکے نہ بالکل چلا کر۔ یہی مضمون دوسری آیت میں آیا ہے وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا۔ حضرت ابو قتادہ کی حدیث اس مفہوم کی مؤید ہے۔

حضرت ابو قتادہؓ کا بیان ہے کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ کاشانہ نبوت سے باہر تشریف لے آئے اور ملاحظہ فرمایا کہ حضرت ابو بکرؓ بہت ہی پست آواز سے نماز پڑھ رہے ہیں، پھر حضرت عمرؓ کی طرف سے گزرے تو ملاحظہ فرمایا کہ وہ اونچی آواز سے نماز پڑھ رہے ہیں۔ جب صبح کو دونوں حضرات خدمت گرامی میں جمع ہوئے تو حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا میں تمہاری طرف سے گزرا تھا تم نہایت پست آواز سے نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جس سے میں دعا کر رہا تھا اس کو سنا رہا تھا۔ حضرت عمرؓ سے فرمایا میں تمہاری طرف سے بھی گزرا تھا تم اونچی آواز سے نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں اونگھتے کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا ابو بکرؓ تم اپنی آواز کچھ اٹھاؤ اور عمر تم اپنی آواز کچھ نیچی کرو، رواہ ابوداؤد و ترمذی۔ نے ایسی ہی حدیث حضرت عبد اللہ بن رباح انصاری کی روایت سے بیان کی ہے۔

یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن کو چپکے چپکے بھی پڑھو اور آواز سے بھی مگر آواز زیادہ زور سے نہ ہو۔ یعنی کبھی اسی طرح پڑھو اور کبھی اس طرح دونوں پڑھو۔ ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رات کو رسول اللہ ﷺ کی قرات اس طرح ہوتی تھی کہ آپ کبھی آواز کو اٹھاتے تھے کبھی پست کر کے پڑھتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن ابی قیسؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ ﷺ کی قرات کی کیفیت دریافت کی کہ آپ چپکے چپکے پڑھتے یا آواز سے ام المومنین نے فرمایا ہر طرح قرات کرتے تھے چپکے چپکے بھی پڑھتے تھے اور آواز سے بھی۔ میں نے کہا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہر کام میں گنجائش رکھی ہے۔ رواہ الترمذی، ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح غریب کہا ہے۔

فصل

رات کو نماز میں اور نماز سے باہر قرآن کس طرح پڑھا جائے، علماء کے اقوال اس میں مختلف ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک چپکے چپکے پڑھنا مکروہ ہے آواز سے پڑھنا ضروری ہے۔ حضرت ام ہانیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی مندرجہ سابق حدیثیں اسی

پر دلالت کرتی ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ گھر کے اندر رسول اللہ ﷺ اتنی آواز سے پڑھتے تھے کہ حجرہ سے باہر قرأت سنائی دیتی تھی اور حضرت ام ہانی نے اپنی چھت پر حضور ﷺ کی قرأت کی آواز سنی تھی۔

جمہور کے نزدیک پڑھنے والے کو اختیار ہے آواز سے پڑھے یا چپکے چپکے۔ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کبھی آواز اٹھا کر پڑھتے تھے کبھی پست آواز سے۔ طحاوی نے لکھا ہے کہ حضرت ام ہانی اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیثوں میں رسول اللہ ﷺ کی آواز سے قرأت کرنے کا اظہار ضرور ہے مگر یہ روایات اس بات کے منافی نہیں کہ حضور ﷺ کبھی پست آواز سے قرأت کرتے تھے (یعنی ان روایات میں ہمیشہ اونچی آواز سے پڑھنے کا اظہار نہیں ہے) حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ظاہر کر رہی ہے کہ نمازی کو اختیار ہے چپکے چپکے پڑھے یا آواز سے، جس طرح پڑھے۔ مؤخر الذکر صورت افضل ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ اسی کے قائل ہیں۔ جو لوگ نمازی کو اخفاء وجہر کا اختیار دیتے ہیں ان میں پھر دو گروہ ہیں ایک گروہ اخفاء کو افضل کہتا ہے کیونکہ حضرت عقبہ بن عامرؓ کا بیان ہے کہ میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے آواز سے قرآن پڑھنے والا سب کے سامنے صدقہ دینے والے کی طرح ہے اور چپکے چپکے قرآن پڑھنے والا چھپا کر صدقہ دینے والے کی طرح ہے۔ رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی، ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چھپا کر خیرات کرنا علانیہ خیرات کرنے سے افضل ہے، اللہ نے فرمایا ہے اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ سلف کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔

اعمش کا بیان ہے میں ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قرآن مجید دیکھ کر پڑھ رہے تھے اتنے میں ایک شخص داخلہ کا خواستگار ہوا، آپ نے فوراً قرآن مجید کو الگ رکھ دیا اور فرمایا یہ شخص دیکھنے نہ پائے کہ میں ہر وقت قرآن پڑھتا ہوں۔ ابوالعالیہ کا بیان ہے میں صحابہ کرام کے پاس بیٹھا ہوا تھا ایک شخص نے کہا رات میں نے اتنا قرآن پڑھا صحابہ نے فرمایا قرآن سے تیرا نصیب یہی تھا۔

کثیر علماء کے نزدیک آواز سے پڑھنا افضل ہے، اس قول کی تائید ان احادیث سے ہوتی ہے جن میں آواز سے پڑھنے کا ذکر ہے اس مضمون کی چند احادیث پہلے نقل کی جا چکی ہیں۔

ان کے علاوہ ایک حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے اللہ کسی چیز کو اتنی توجہ سے نہیں سنتا جتنا خوش آواز نبی کی آواز کو توجہ سے سنتا ہے جو آواز سے قرآن کو اچھی لے سے پڑھ رہا ہو۔ سننے سے اشارہ ہے رضامند ہونے اور قبول کرنے کی طرف۔

صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا بیان منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا تجھے داؤد کے سُروں میں سے ایک سُر دیا گیا ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت فضالہ بن عبیدؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس قدر گانے والی عورت کے گانے کی آواز توجہ سے اس کا آقا سنتا ہے اس سے زیادہ توجہ سے اللہ اس خوش آواز شخص کی قرات سنتا ہے جو آواز سے قرآن پڑھتا ہے۔

ابوداؤد اور نسائی وغیرہ نے حضرت براء بن عازب کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی آوازوں سے قرآن کی سجاوٹ کرو (یعنی خوش آوازی سے پڑھو کہ سننے والے کو قرآن مکروہ نہ معلوم ہو حسین محسوس ہو) مختلف احادیث میں مطابقت پیدا کرنے اور تضاد کو دور کرنے کیلئے امام غزالی اور کچھ دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ اگر پڑھنے والے کو خود اپنے متعلق ریاکار ہو جانے کا اندیشہ ہو اور وہ ڈرتا ہو کہ آواز سے قرآن پڑھنا میرے اندر عجب وغرور پیدا کر دے گا تو چپکے چپکے پڑھنا افضل ہے اگر ریاء کا اندیشہ نہ ہو تو آواز سے پڑھنا اولیٰ ہے، جہر کے ساتھ پڑھنے سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے پڑھنے والے کے دل میں بیداری بھی پیدا ہوتی ہے، خیالات کی پراگندگی زائل ہو جاتی ہے، کان بھی قرآن کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، نیند بھاگ

جاتی ہے، چستی بڑھ جاتی ہے، سونے والے اور غافل آدمی بھی اس کے پڑھنے سے بیدار اور ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ ان تمام مقاصد کے پیش نظر آواز سے پڑھنا افضل ہے اور ثواب چند گنا ہو جاتا ہے، اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ قرآن میں دیکھ کر پڑھنا اولے ہے۔

میں کہتا ہوں کوئی شک نہیں کہ آواز سے قرآن پڑھنے کی احادیث بکثرت آئی ہیں اور صحابہؓ و تابعین کے آثار و اقوال بھی اس سلسلہ میں بے شمار ہیں لیکن یہ حکم اسی شخص کے لئے ہے جس کو اپنے اوپر ریا کا شبہ نہ ہو، غرور و عجب پیدا ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو، کسی کو تکلیف بھی نہ ہو، کسی کی نماز میں خلل بھی نہ پڑتا ہو، اگر اس قسم کا کوئی اندیشہ ہو تو آواز سے پڑھنا درست نہیں۔ اندیشہ نہ ہو تو جہر سے قرأت مستحب ہے۔ اگر ایک جماعت سننے کے لئے جمع ہو تب تو آواز سے پڑھنا اور بھی افضل ہے۔ مگر بہت چیخ کر پڑھنا اور اپنے کو تکلیف و مشقت میں ڈال کر جہر کے ساتھ پڑھنا جائز کسی طرح نہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ۔ امام محمد نے مؤطا میں امام مالک کی روایت سے ابو سہیل کے باپ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نماز میں اتنی آواز سے قرأت کرتے تھے کہ میں ابو جہیم کے گھر کے پاس ان کی قرأت سن لیتا تھا، اسی لئے امام محمدؒ نے فرمایا کہ جہری نماز میں آواز سے قرآن پڑھنا چاہئے لیکن پڑھتے وقت زور لگا کر اپنے کو دکھ میں نہ ڈالنا چاہئے۔

ایک شبہ :- اللہ کے ذکر اور دعا میں جہر کرنا بدعت ہے، چپکے چپکے ذکر اور دعا کرنا سنت ہے۔ آیت وَادْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً کی تفسیر میں یہ مسئلہ آچکا ہے، پھر قرأت اور ذکر میں کیا فرق ہے قرأت بھی ذکر ہی ہے۔

جواب :- قرآن میں نصیحتیں بھی ہیں۔ عبرت انگیز سبق آموز قصے بھی ہیں اور احکام بھی ہیں، اس کی عبارت معجز، میٹھی اور دلکش بھی ہے۔ یہ چیزیں ذکر سے زائد ہیں، ذکر سے تو دل سے غفلت دور ہو جاتی ہے بجائے خود یہ عبادت ہے لیکن دوسرے کو سنانا اور اس میں بیداری پیدا کرنا مزید عبادت ہے۔ دعا کی غرض صرف قبولیت ہے اور ذکر کا مقصد ازالہ غفلت اور اتنا انہماک کہ خود ذاکر کو اپنا بھی ہوش نہ رہے، وہ اپنے کو بھول جائے اور بصیرت کے اندر خدا ہی خدا رہ جائے۔ قرأت میں یہ بات نہیں ہے۔

فائدہ :- شعبہ کا بیان ہے مجھے ابو عبیدہؓ نے حدیث زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِاَصْوَاتِكُمْ بیان کرنے سے منع کر دیا تھا۔ ابو عبیدہ نے کہا ممانعت کی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہو گی کہ اس حدیث کو سن کر لوگوں کو ان نوخیز بدعتی لہجوں کا جواز ہاتھ لگ جائے گا جو لوگوں نے ایجاد کر رکھے ہیں۔ اس کے بعد ابو عبیدہ نے قرآن کو خوش آوازی سے پڑھنے کے سلسلہ کی بکثرت احادیث نقل کیں اور فرمایا ان تمام احادیث کا مقصد یہ ہے کہ غم انگیز، خوف آفریں اور شوق افزا طریق ادا اختیار کیا جائے، یہ تفریحی لہو آگیں لہجے اور لے مراد نہیں ہیں۔ ابو عبیدہ نے اپنے اس قول کے ثبوت میں مرفوع اور غیر مرفوع متعدد احادیث بیان کیں، جن میں اسی مفہوم کی تشریح تھی۔ مثلاً طاؤس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا سب سے زیادہ اچھی آواز سے قرآن پڑھنے والا یا سب سے اچھی قرأت کرنے والا کون ہے، فرمایا (سب سے اچھا پڑھنے والا) وہ شخص ہے کہ جب تم اس کی قرأت سنو تو سمجھ لو کہ یہ اللہ سے ڈر رہا ہے (یعنی اس پر اس وقت خشیت کی کیفیت طاری ہے)۔

دارمی نے طاؤس کا قول مرسلاً بیان کیا ہے کہ قرآن پڑھنے میں سب سے زیادہ خوش آواز وہ شخص ہے جو پڑھتے وقت سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہو۔

حضرت حذیفہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عرب کی لے اور آوازوں میں قرآن پڑھو۔ اہل عشق کی لے اور ان دونوں کتابوں والوں کے ترانوں سے پرہیز رکھو۔ آئندہ میرے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو گانے کی گٹکری سے اور نوحہ کے طرز سے قرآن پڑھیں گے، مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہ اترے گا۔ ان کے اور ان کی کیفیت کو پسند کرنے والوں کے دل فتنہ میں مبتلا ہوں گے۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان ورزین فی کتابہ۔

مجاہدؒ نے کہا آیت کا مطلب یہ ہے کہ دلوں کے اندر ذکر کریں یعنی دعا میں عاجزی اور تضرع کریں، آوازیں نہ اٹھائیں، چیخ پکار نہ مچائیں، چپکے چپکے دعا کرنے سے خلوص قلبی میں اضافہ ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں اس تفسیر پر وَدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ

الْقَوْلِ کا فِيْ نَفْسِکَ پر عطف تفسیری ہوگا (جو مطلب فِيْ نَفْسِکَ کا ہوگا وہی مطلب دُوْنَ الْجَهْرِ کا) ذکر خفی وجہری کا مسئلہ آیت اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔

بیضاوی نے لکھا کہ یا یہ مقتدی کو حکم ہے کہ جب امام قرأت سے فارغ ہو جائے تو مقتدی چپکے چپکے پڑھ لے جس طرح امام شافعی کا قول ہے مگر بیضاوی کا یہ قول غلط ہے کیونکہ آیت میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے آپ ﷺ امام تھے مقتدی نہ تھے اور اگر مقتدیوں کو خطاب ہوتا تو جمع کا صیغہ استعمال کیا جاتا جیسے فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ میں ہے۔ پھر یہ بھی ایک بات ہے کہ قرأت جہری ہو یا سری کان لگا کر سننے اور خاموش رہنے کے تو بہر حال منافی ہے اور امام کی فراغت کے بعد مقتدی کا پڑھنا آیت سے مستفاد نہیں ہے لہٰذا آیت فَاسْتَمِعُوْا اور آیت دُوْنَ الْجَهْرِ میں تضاد لازم آئے گا، دونوں پر عمل ایک وقت میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ امام قرأت سے فارغ ہو کر رکوع کو چلا جائے گا اتنا موقع ہی کہاں ہو سکتا ہے کہ مقتدی بھی قرأت کر لے اور امام کے رکوع کی حالت میں مقتدی کا قرأت کرنا باجماع علماء درست نہیں ہے اور اگر امام مقتدی کی قرأت کے انتظار میں کھڑا رہے گا تو امام نہ رہے گا مقتدی کا تابع ہو جائے گا۔

بِالْغُدُوِّ غدو مصدر ہے تڑکے میں داخل ہو جانا۔ غَدَا يَغْدُوْا اس کا فعل آتا ہے۔ یہاں مراد ہے دن کا ابتدائی وقت۔ قاموس میں ہے الغدوہ بالضم تڑکا یا دن کی پو پھٹنے سے طلوع آفتاب تک کا وقت۔

وَالْاٰصَالِ یعنی دن کا آخری وقت یہ اَصِيْلٌ کی جمع ہے۔ بغوی نے لکھا ہے اَصِيْلٌ کا وقت عصر سے مغرب تک ہوتا ہے ان دونوں وقتوں کو فضیلت حاصل ہے، اس لئے خصوصیت سے ان کا ذکر کیا ورنہ مراد ہے دوام ذکر، ہر وقت اللہ کا ذکر کرنا۔ آیت وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ دوام ذکر پر ہی دلالت کر رہی ہے۔

وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ یعنی کسی وقت اللہ سے غافل نہ ہو۔ میں کہتا ہوں آیت وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ کے بعد بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ فرمانا اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ ذکر سے مراد عام مفہوم ہے، خواہ قرأت قرآن ہو یا کوئی اور ذکر، مقصد یہ ہے کہ غفلت دور ہو جائے جس طرح بھی ممکن ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾

(بے شک وہ لوگ جو تیرے رب کے پاس ہیں (یعنی مقرب ہیں) اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی پاکی بیان کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ، اَلَّذِيْنَ سے مراد ہیں ملائکہ، انبیاء اور نیک بندے۔ اللہ کا قرب جسمانی طور پر محال ہے۔ اللہ جسم نہیں ہے اس کے پاس ہونے اور مقرب ہونے کے معنی ہیں معزز، مکرم ہونا۔ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ اللہ کی عبادت سے اپنے کو بڑا نہیں سمجھتے، غرور نہیں کرتے بلکہ عبادت کی وجہ سے بڑے بنتے ہیں۔ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ اور نازیبا غیر مناسب صفات سے اس کو پاک سمجھتے اور پاک قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں سُبحان ربی الاعلیٰ۔ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں اسی کی عبادت کرتے ہیں کسی دوسرے کو سجدہ میں شریک نہیں کرتے۔

معدان بن طلحہ کا بیان ہے میں حضرت ثوبانؓ سے ملا جو رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ تھے اور عرض کیا مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے کہ جس کی وجہ سے میں جنت میں پہنچ جاؤں، آپ خاموش رہے۔ میں نے دوبارہ درخواست کی، آپ پھر بھی خاموش رہے۔ میں نے تیسری بار سوال کیا، تو فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہی سوال کیا تھا حضور ﷺ نے فرمایا تھا اللہ کو بکثرت سجدہ کرنے کا التزام کرو، تم جو سجدہ بھی اللہ کو کرو گے اللہ اس سے تمہارا ایک درجہ اونچا کر دے گا اور ایک گناہ ساقط کر دے گا۔ معدان کا بیان ہے پھر میں حضرت ابو درداءؓ سے ملا اور ان سے بھی یہی سوال کیا تو انہوں نے بھی یہی جواب دیا جو حضرت ثوبان نے فرمایا تھا، رواہ مسلم۔ دوسری روایت میں حدیث ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے جو بندہ بھی اللہ کو کوئی سجدہ کرتا ہے تو اللہ اس سجدہ کے سبب سے ضرور اس کا ایک درجہ اونچا کرتا اور ایک گناہ گراتا ہے۔ رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن حبان والبغوی۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب ابن آدم سجدہ کی آیت پڑھ کر سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتا ہوا الگ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے، ہائے ابن آدم کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کیا اور اس کے لئے جنت ہو گئی اور مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا تو میں نے سجدہ سے انکار کر دیا میرے لئے دوزخ ہو گئی، رواہ مسلم۔

حضرت ربیعہ بن کعبؓ کا بیان ہے میں رات کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہتا تھا، حضور ﷺ کے لئے وضو کا پانی اور دوسری ضروریات کی چیزیں فراہم کر دیتا تھا، ایک روز حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا مانگ (کیا مانگتا ہے) میں نے عرض کیا میں حضور ﷺ کی رفاقت جنت میں چاہتا ہوں، فرمایا اس کے علاوہ کچھ سوال کرو، میں نے عرض کیا میرا سوال تو یہی ہے، فرمایا تو سجود کی کثرت سے اپنے لئے میری مدد کرو (یعنی سجود کی کثرت کرو تاکہ جنت میں، میں تم کو اپنے ساتھ رکھ سکوں)، رواہ مسلم۔

ہم نے سجدہ تلاوت کے مسائل سورۂ انشقت کی تفسیر میں بیان
کر دیئے ہیں واللہ اعلم۔ ۱۶ محرم ۱۲۰۰ھ کو سورۂ
اعراف ختم ہوئی۔ اور ۳ رمضان ۱۳۸۴ھ
کو فجر کے وقت بحمد اللہ ترجمہ کی تکمیل ہوئی۔